دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

کراچی

فروری 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

http://digestpk.b

[illegible] — مدیر اعلیٰ — 11
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں
مدیر کے نام محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

ستم زادہ — محی الدین نواب — 18
ایک لمحہ... ایک خواب... گمان و یقین
کے درمیان معلق تعبیر کی جستجو کا فسانہ عجب

دوسرا پاگل — فوزیہ ظہیر — 63
ایک کج فہم شخص کے ذہنی تغیرات... جو
دوسروں کے لیے باعث تکلیف تھے

گڑیا گھر — رضوانہ منظر — 71
وہ اپنی ہر تخلیق کو لازوال فن پارے کی
صورت دینے کا شدید خواہش مند تھا

یہ گھر مرا گلشن ہے — شہزاد خان — 83
پُرمزاح انداز میں شعور و آگہی کے در وا کر
دینے والی انوکھے انداز کی تحریر

للکار — طاہر جاوید مغل — 88
محبت کے محاذ پر بکھرے ہوئے شخص کی جدوجہد...
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

مالِ غنیمت — تنویر ریاض — 131
دولت و ہوس کا کھیل... جہاں
سب سے ارزاں انسانی زندگی تھی

مشکوک قاتل — مریم کے خان — 143
اندھیروں اور اجالوں کی کشمکش سے
نبرد آزما کرداروں کی معرکہ آرائیاں

جلد 40 • شمارہ 02 • فروری 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

انتظار — محمد عفان آزاد — 157
اس حادثے کا ماجرا جس کی تہ میں
مجرمانہ غفلت کی باریکیاں مدفن تھیں

گرداب — اسعد قدری — 164
تقدیر کی آنکھ مچولی، قسمت کی چالبازی یا مقدر
کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

مقروض — مختار آزاد — 195
اس کم رو، تنگ دست کی کم پری جس
نے حالات بدلنے کے لیے ہمت کرلی تھی

دیر آید — بابر نعیم — 205
ایک اتفاق کے نتیجے میں رونما
ہونے والی صورت حال کا سنگین ماجرا

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

چانس — آصف ملک — 215
ان انسانوں کی تصویر کشی جن کے
چہرے پُرفریب نقاب میں پوشیدہ تھے

ابلیس دوراں — منظر امام — 226
ایک نفس پرور... ابلیس صفت کی
داستان جو خدائی فوج داری پر اتر آیا تھا

بھول — سلیم فاروقی — 254
جاسوسوں کے خاص محاذ کی سمت... ایک
تیز رفتار ناقابلِ فراموش سرورق کی صورت

تراش خراش — ادارہ و قارئین — 000
اقتباسات، لطیفے، مسکراہٹیں اور قہقہے سب
کچھ آپ کی طرح جمع اور توضع کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

http://digestpk.blogspot.com

چینی نکتہ چینی

عذرا علی

عزیزان من ۔ السلام علیکم!

فروری 2011ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ آج چھبیس جنوری کی شام ہے ۔۔۔ بڑی خوشی تھی کہ چلو چہلم حضرت امام حسین علیہ السلام کے موقع پر نکلنے والے تمام جلوس اور عزاداری امن و سکون سے گزر گئے ۔۔۔ کہیں سے کوئی ناخوشگوار خبریں سماعت سے نہیں ٹکرائیں مگر یہ سطور لکھتے لکھتے سب سکون درہم برہم ہو گیا۔ لاہور اور کراچی میں ہونے والے دو دھماکے ۔۔۔ خودکش کا وجود تو ہوا میں اڑ ہی گیا مگر متعدد بے گناہوں کو بھی شہادت نصیب ہوئی ۔۔۔ پہلے کی طرح ۔۔۔ دھماکا کیا ہوا لمحہ بھر میں درجنوں گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ صف ماتم ہی نہیں بچھی، وہ جو چلے گئے، ان کے پیاروں کو اب یہ دکھ عمر بھر رلاتا ہی رہے گا۔ ایسا نہ تو پہلی بار ہوا ہے اور ۔۔۔ جو حالات ہیں، ان کو دیکھ کر نہ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آخری خودکش دھماکا تھا۔ بے گناہوں کے لہو سے زمین کی پیاس بجھانے کا سلسلہ تو اس ارض پاک میں جسے ہم "پاک سرزمین شاد باد" کہتے ہیں، برسوں سے جاری ہے ۔۔۔ اس سرزمین جس پر ہم "سایۂ خدائے ذوالجلال" کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک مدت سے بے وقت موت بانٹنے کا عمل جاری و ساری ہے۔ یہ سچ ہے تو پھر ہمارے لفظوں کا اثر کیوں نہیں ۔ کیا یہ اب صرف لفظ ہی رہ گئے ہیں اور تاثیر زائل ہو چکی ہے؟ اداسیوں کا موسم برسوں سے وطن عزیز پر اپنے پر پھیلائے ہے، مہیب اندھیروں کی چادر تانے ہوئے ہے۔ دعا کریں کہ ہماری ارض پاک پر اس روشن صبح کا چمکتا ہوا سورج جلد طلوع ہو جسے اندھیرا زوال نہ دے۔ آمین۔

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں واپس بھرے آئے سندیسوں کی محفل میں اور دیکھتے ہیں کہ کس کس نے لب کشائی کرکے کیا کیا گل ہائے افشانی کی ہے۔

ماہا ایمان کی جادوگری پنجاب سے "ایک بار پھر اس محفل میں بہت سی تمناؤں کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ ایک انتہائی مقدس فریضے سے انتہائی خوش اسلوبی سے سبکدوش کیا اس نے، اتنی کم عمری میں اتنی بڑی سعادت حاصل ہونا یقیناً خوش نصیبی کی بات ہے۔ دوستو! رشک آتا ہے مجھے خود پر ۔۔۔ اور ان پرنور و مقدس ترین مقامات کو اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود میں ابھی تک گویا حالتِ خواب میں ہوں۔ بہرحال میں اپنے تمام بہن بھائیوں اور دوستوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے مبارک باد دی حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے پر۔ اور یہ یقین کر لیجیے کہ میں نے ہر جگہ اپنی دعاؤں میں آپ سب کو یاد رکھا۔ سب سے زیادہ اپنے پیارے انکل معراج رسول صاحب کی صحت و طویل عمری کے لیے دعائیں کیں۔ (جزاک اللہ) دعا ہے تمام امت مسلمہ اور پیارے وطن کے لیے مانگی گئی ہماری دعائیں بارگاہ خداوندی میں شرف قبولیت پا گئیں (آمین)۔ ماہ جنوری کا شمارہ اپنی تازگی، رنگ و رعنائی، جلوؤں اور محبتوں سے گندھا ہوا 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق حسب روایت ابن آدم، حوا کی بیٹی اور وسیلۂ اجل پستول پر مبنی تھا۔ پستول کی نال سے نکلتی سال نو کی مبارک باد اچھا تاثر چھوڑ رہی تھی۔ البتہ مس سرورق مجھے ایسے گھور رہی ہے جیسے میں نے اس کی کوئی "چیز" چرا لی ہو یا پھر شاید "سائز" ۔ اتنے بڑے عہدے پر خاصی معمولی شکل و صورت کی محترمہ براجمان ہیں۔ آخر ذاکر انکل کب اپنے شاندار ماضی کی یاد تازہ کرتے ہوئے دوبارہ سے ایک ایسی حسینہ پیش کریں گے جسے دیکھتے ہی ہم پکار اٹھیں۔ "چاند آہیں بھرے گا، پھول دل تھام لیں گے، حسن کی بات چلی تو سب تیرا نام لیں گے۔" (یعنی اپنی ماہا ایمان کا ۔۔۔) مصنف کرخت اپنے ماضی کی روایات کو دہراتے ہوئے حسب توقع بکواس ترین پوز میں ہیں۔ سرورق کی ایسی کی تیسی کرنے کے بعد فہرست کو کھنگالا اور آخرکار محفل کو اپنی چشم بے تاب سے فیض یاب کیا۔ گو کہ اپنی غیر موجودگی کا یقین تھا پھر بھی ایک بے قراری تھی کرسی پر بیٹھیں، تمام احباب خوب چہچہا رہے تھے۔ وننگ سیٹ اس دفعہ اقبال اینڈ صبا کے قبضے میں تھی۔ چلیے جناب آپ کی بھی بالآخر لاٹری لگ گئی۔ مبارک ہو ایک، دو کے لیے صدر محفل بننا۔ ماہ تاب گل آپ نے پکارا تو ہم چلے آئے محفل میں جان ڈالنے۔ سندس جبیں بہت غلط بات ہے یار، آج کا کاسکل پر تمہیں چھوڑنا چاہیے۔ حضور بخش بھائی آپ کنول سے اتنا متاثر کیوں ہو؟ ہمایوں سعید آپ کے تبصرے کے بارے میں تو تم نے میرے منہ کی بات چھین لی لیکن کچھ تو بے چاری کے جذبات کا خیال کرتے۔ محی الدین اشفاق چالیس کے ہوتے ہوئے بچپن کا نظر آنا بھی ایک فن ہے۔ جس کے آپ پرستار ہیں وہ اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ سو یہ طعنہ کچھ بجا نہیں۔ قمر تقی کا تبصرہ پڑھتے ہی "آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" والا محاورہ یاد آ گیا۔ "قمر صاحب یاد رکھیے کہ دوستوں کو وضاحتوں کی ضرورت نہیں ہوتی اور دشمن وضاحتوں پر یقین نہیں کرتے۔ کبیر عباسی صاحب آپ کی داڑھی میں تنکا لگتا ہے، ویسے آپ کے خیال سے میں بھی متفق ہوں۔ فضل محمد آف پشاور پلیز فلم اسٹار ندیم بننے کی کوشش مت کیجیے۔ تصویر اچھی آپ کی صورت کی تعریف پڑھ کے تو اب ہمیں بھی آپ کے تین پاروں کو دیکھنے کا شوق ہو چلا ہے۔ ایم احمد ہاشمی آپ خاصے زود رنج انسان ہیں، آپ کے تمام شکوے بے محل تھے۔ آپ جیسی حضرت اکثر و بیشتر محفل میں پائے جاتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب کی چیخ و پکار کرتے ہیں۔ بابر کی موت کا مجھے انتہائی افسوس ہوا۔ (آپ کی تعزیت پہنچا دی جائے گی) کشور اور آفتاب نے ایک اچھا کام چونکہ غلط طریقے سے انجام دیا ہے، سو ہم کم بھاگ تو اب گئی رہے گی۔ وجہ چاہے جو بھی رہی ہو، میں تو کبھی بھی ایسے کسی فعل کی حمایت نہیں کروں گی۔ اور وہ ساجی، خدارا شہریار اور ماہ پارہ تو میں تھوڑا رومانس کو آگے بڑھائیں۔ کہانی کا ٹیمپو خاصا سلو اور بے رنگ سا چل رہا ہے۔ (ہاں بھئی ۔۔۔) انگارے میں ابھی تک تابش کنفیوژ کا قاری ہی ثابت ہو رہا ہے۔ سلطانہ کا کردار بھی مجھے کوئی خاص پسند نہیں آ رہا اور اس ماہ کا زبردست سرپرائز عمران کی واپسی ہے۔ واؤ ۔۔۔ اب مزہ آئے گا۔ مثل صاحب تابش کو خوامخواہ سر پر چڑھا رہے ہیں۔ عمران کو ہائی لائٹ کیجیے پلیز۔ ہیرو کو تو صرف عمران جیسا ہی ہونا چاہیے۔ کاشف صاحب، سفینۂ حیات لائے۔ اس طرز کی کہانیاں کاشف صاحب بہت عمدگی سے نبھاتے ہیں۔ عرفان اور روبینہ کا ملاپ مجھے اچھا لگا۔ چھوٹی کہانیوں نے بھی خوب چھریاں چلائیں اور ذہن کو شارپ کر ڈالا۔ سب سے زیادہ لطف مجھے گوگے کی گواہی پڑھ کے آیا اور ثمر و چودھری نے تو رونگٹے کھڑے کر ڈالے۔ پہلی کہانی ڈائجسٹ بہت دیر سے ملنے کی وجہ سے ابھی پڑھنی باقی ہے۔ سو یہیں پر ختم کرتی ہوں۔" (شکریہ۔ باقی کسر اگلے ماہ پوری کر دیجیے گا۔)

http://digestpk.blogspot.com/

تنویر احمد کی نوشہرہ سے شمولیت ”جنوری کے سرورق پر حسینہ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں اور... پستول سے شاید ڈر رہی ہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ میری ملاقات جاسوسی ڈائجسٹ سے 2008ء میں ہوئی تھی اور اب تک پڑھ رہا ہوں۔ کہانیوں میں نمبر ون للکار اور گرداب ہیں۔ اگلی قسط میں عمران کا پتا چل جائے گا تو مزہ دوبالا ہو جائے گا۔ گرداب میں ماہ بانو ایک بار پھر پھنس گئی۔ خواب زر بھی بہت اچھی تھی۔ سود و زیاں اور سفینۂ حیات نے بھی دل جیت لیا۔“

آمنہ پٹھانی فتح پور ملیے سے لکھتی ہیں۔ ”نئے سال کا خوبصورت شمارہ بروقت ملنے پر جہاں انتہائی مسرت ہوئی وہیں اپنا خط نہ پاکر قدرے مایوسی بھی ہوئی۔ اب معلوم نہیں خط نہ ملنے کی وجہ ڈاک کا ناقص انتظام ہے یا پھر شاید قینچی نے اس کا حجم کم کرتے کرتے صفحۂ ہستی سے ہی معدوم کر دیا ہو۔ (ہم مختصر کرتے ہیں، معدوم نہیں) ذہن میں ایک موہوم سا خیال یہ بھی آیا ہے کہ میں نے چونکہ اپنے سابقہ خط میں ”گرداب“ سے متعلق کچھ کھری کھری تلخ باتیں کی تھیں جو کہ میرے نزدیک تو وہ ایک مثبت، معیاری اور تعمیری تنقید تھی۔ ممکن ہے وہ باتیں آپ کو گراں گزری ہوں۔ یہی حال للکار کا ہے۔ طاہر جاوید صاحب پچھلے کئی ماہ سے ایک ہی ٹریک پر کہانی چلا رہے ہیں جس سے کہانی یکسانیت کا شکار ہو کر بوریت کی طرف رواں دواں ہے۔ البتہ کچھ حد تک ابتدائی صفحات پر شائع ہونے والی کہانیاں اور ناول کی کہانیوں نے اپنا بھرم رکھا ہوا ہے۔“ (مجھے آپ کا خط شامل اشاعت ہے، ہم ایک بات تمام قارئین سے کہنا چاہتے ہیں کہ ہم صرف تعریفی خطوط کو جگہ نہیں دیتے بلکہ تنقیدی خطوط کو بھی اسی تناسب سے شامل کرتے ہیں۔ اگر کسی قاری کا خط شائع ہونے سے رہ جاتا ہے تو اس کی قسمت۔ اس میں ہماری کوئی کوتاہی یا اقربا پروری کا دخل نہیں ہوتا۔)

بہاولپور سے سعید عباسی کی سرخوشی ”جنوری کا تازہ شمارہ 10 تاریخ کو ملا۔ ناول ہاتھ میں آتے ہی ہم نے سب سے پہلے لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی کی ہیر اور ڈائمنڈ تھی مگر ہمیں اس کی آنکھیں بہت پسند آئیں۔ لڑکی سے تھوڑا آگے عینک والے دوست پستول ایسے تھامے ہوئے تھے جیسے ابھی کسی کا نشانہ لینے والے ہوں۔ لڑکی کی دوسری سائڈ پر جو دوست تھے، بگڑے ہوئے بالوں اور لباس کے ساتھ ہمیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کتنا قصائی کو دیکھے۔ اس دفعہ محفل میں ہم نے اپنا نام دیکھا تو ہم سمجھے شاید خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ہم نہر کے ٹھنڈے پانی سے نہائے (آئندہ ایسی سنگین غلطی مت کیجیے گا سر!) تو ہمیں یقین آیا کہ سچ اس بار ہمارا خط شائع ہوا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس بار کی قسط کچھ غمگین کر دینے والی تھی۔ گرداب کی اس بار کی قسط کافی خون خرابے سے بھرپور تھی۔ پہلا رنگ کچھ خاص نہیں تھا۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر کے قلم سے لکھی گئی داستان بہت اچھی رہی۔ کہانی میں عرفان اور دوبینہ کا کردار بہت پسند آیا۔ باقی کہانیاں ابھی زیر غور ہیں۔“

علی آتش کی بزم گرفتری الہ آباد ضلع قصور سے ”میں پچھلے 8 سال سے جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ میں نے سوچا کہ اس بار میں بھی محفل کے دوستوں میں اپنا نام لکھوانے کی ہمت کروں۔ (یہ تو آپ نے بہت اچھا سوچا) شاید کامیابی ہو جائے۔ (لیجیے کامیاب بھی ہو گئے، مبارکباد) محترمہ اقبال مرزا اور صبا مرزا کو کرسیٔ صدارت مبارک۔ تصویر الحسن، قمر تقی، ماہ تاب گل، ہمایوں سعید راج اور ایم عزیز اسعد کے تبصرے بہترین تھے۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس دفعہ انکل طاہر نے سب قارئین کی مان کر ہیرو بھائی کو واپس کر دیا۔ قسط زبردست رہی۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ اس کی قسط ایکشن سے بھرپور رہی۔ پھر پہنچے کاشف زبیر کے پاس سفینۂ حیات ان کی تمام کہانیوں کی طرح بہترین کہانی تھی۔ کاشف زبیر ہیرو کے لیے کوئی نہ کوئی ہیروئن ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ سود و زیاں بھی اچھی تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر خواب زر کوئی تاثر چھوڑنے میں ناکام رہی۔ چھوٹی کہانیوں میں فتنہ پرداز محترم منظر امام کی بہت اچھی تحریر تھی۔ رازوں کا صندوق، مُردہ چہرہ، گو کہ تھے کی گواہی بھی اچھی کہانیاں تھیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

فتح پور سے سید محی الدین اشفاق کی توصیف ”جاسوسی ہمیں 6 کو ملا۔ اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ماڈل گرل ترچھی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ (سیدھی سے دیکھنے پر پابندی ہے کیا...) اشتہارات کو پھلانگ کر کوہ قاف کی محفل میں پہنچے۔ مرزا سسٹرز کو مبارکباد۔ دونوں کو ہمیز اسٹائل پسند آیا۔ ہم نے تو پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی کہ ہمیز اسٹائل لڑکیوں کی پسند کا ہے۔ (کیا بات ہے) اعجاز احمد! آپ کے دل کی کیفیت عجیب سی کیوں ہے؟ تصویر الحسن صاحب! اکثر ہے آپ نے ماڈل گرل کو صرف خوبصورت کہا ہے، یہ نہیں کہا کہ آپ جیسی لگ رہی ہے۔ سندس جبیں بہت اچھے۔ آپ ایم اے انگلش کر رہی ہیں۔ ہمایوں سعید! آپ کو کترینہ بہت پسند ہے؟ نوی صاحب! لگتا ہے سب لوگ ماڈل گرل کے ہمیز اسٹائل پر مرتے ہیں (اور آپ ترچھی نگاہوں سے گھائل ہیں)۔ قمر تقی صاحب! میں آپ کی بات سے متفق ہوں کہ ماڈل پر خوبصورت نوجوان کی تصویر ہونی چاہیے۔ ہم بھی اس قسم کا مشورہ انکل کو دے چکے ہیں۔ کبیر عباسی عرف شہزادہ کو سہارا صاحب! آپ نے غلط بات کی ہے۔ آپ انڈیا میں رہنے والے مسلمانوں اور کشمیری مسلمانوں کا حال جانتے ہیں پھر بھی آپ نے اس کہانی پر تنقید کی؟ (پسند ناپسند پر ہر شخص کو اختیار ہے) کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ رنجیت کا کردار اگر چلتا تو اچھا تھا۔ بہرحال تابش اب ایکشن میں آ چکا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ گرداب میں اسما قادری کافی بولڈ انداز میں لکھ رہی ہیں۔ انہوں نے ایکشن بھی بڑھا دیا ہے۔ پے در پے اموات کا ہونا عجیب ہے۔ شہریار اور ماہ بانو کا مشترکہ کامیاب مشن ہمیں پسند آیا۔ دوسرا رنگ، سفینۂ حیات پڑھ کر بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ایکشن اور تھرل والی مووی دیکھ رہے ہیں۔ ویل ڈن کاشف زبیر صاحب۔ سود و زیاں سوچنے پر مجبور کرنے والی کہانی تھی۔“

اقبال مرزا اینڈ صبا مرزا کی رائے ”2 تاریخ رات کے وقت جاسوسی کے ساتھ ہمارا ملاپ ہوا۔ جیسے ہی ہمارے ہاتھوں میں آیا، ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی کیونکہ لائٹ جو آ گئی تھی۔ گڑیا کی ٹوکری پر ہمیں نیا سال مبارک کہا جا رہا تھا۔ ماڈل کی حسینہ ٹھیک ہی تھی۔ شاہی دربار میں پہنچے تو اچانک ہماری آنکھیں سو واٹ کے بلب کی طرح روشن ہو گئیں۔ فیصل محمد، وہ ہماری بہن ہے۔ کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لے گی۔ آپ اپنی بات کریں۔ محمد عزیز اسعد! ہمارے خیال میں آپ پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ اگر آپ پابندی سے آتے رہیں تو ہمیں اچھا لگے گا۔ نوی برادر کس بے وقت نے یکا ریکارڈ سر انجام دیا اور کیا؟ آپ ہماری باتیں سمجھنے، سمجھانے میں لگ گئے۔ قمر تقی اللہ کے بجائے ہمیں تمہارا نام عجیب لگا ہے، ویسے تمہاری ان دیکھی شکل... اللہ نے اشرف المخلوقات کے سروں پر سینگ نہیں بنائے۔ کبیر عباسی بڑا ہی غلط خیال ہے آپ کا۔ محسن آفریدی صاحب! ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی، مدیر اعلیٰ کا جواب ہی کافی ہے۔ اس دفعہ ہم

اپنی عادت کو بدل کر رنگوں میں ڈھلنے جا رہے ہیں۔ کاشف زبیر نے نئے سال کی مناسبت سے اچھی اینڈ کیا، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سود و زیاں پڑھ کر ایک ہی بات ذہن میں آئی اگر اپنے نفس پر قابو پا لیا جائے تو زندگی میں پچھتاوا نام کی کوئی چیز نہیں آئے گی۔ طاہر انکل! آپ نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ تحریر کے پاس لاکر بھی ہمیں پیاسا رکھا۔ اگر واقعی ہیرو بھائی واپس آ گئے ہیں تو سب کو مبارک، اسماجی! آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ شہریار جی کو اس دفعہ بھی اظہار محبت سے دور رکھا۔ اب آتے ہیں مختصر کہانیوں کی طرف۔ لاحاصل میں لالانے کی حقیقت ہمارے پلے نہیں پڑی۔ عقل آزاد نے دلچسپ تحریر پڑھنے کو دی لیکن فتنہ پرداز سب سے اچھی کہانی تھی جسے پڑھ کر ہم مسکراتے ہی رہے۔ گونگے کی گواہی اور حسن کارکردگی کسی گنتی میں شمار نہیں تھی۔“

مانسہرہ سے ایم اے انجم کی پہلی کوشش ”یہ میرا پہلا خط ہے جاسوسی میں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جاسوسی سے ناتا بھی نیا ہوگا۔ ہرگز نہیں... بلکہ ہمارا اور جاسوسی کا رشتہ تو تقریباً ڈیڑھ سال پرانا ہے۔ کئی بار سوچا کہ خط لکھیں لیکن کبھی اپنی کم ہمتی اور کبھی مصروفیات کی وجہ سے اپنی اس سوچ پر عمل نہ کر سکا۔ خیر... اس دفعہ جاسوسی حسب معمول 4 تاریخ کو ہی ملا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ شمارہ ہاتھ میں لیا لیکن ہوا وہی جس کا ہمیں ڈر تھا۔ سرورق دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ گہری نیلی جھیل سی جادوئی آنکھیں، لمبی زلفیں، ستواں ناک، سرخ انار جیسے خونی ہونٹ، سفید اور چمکدار موتیوں جیسے دانت، ہماری طرف دیکھتی مغرور بے نیاز حسینہ۔ ویلڈن ڈاکٹر انکل! لیکن دائیں بائیں اصحاب وجاہت جن میں سے ایک تو لمبے اور بکھرے بالوں والا حسد سے ہمیں یوں گھور رہا ہے جیسے کوئی رقیب۔ اور دوسرا کالا چشمہ پہنے ہاتھ میں پستول پکڑے شاید سالی تو کا استقبال کر رہا تھا، گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ۔ اشتہارات سے بچتے بچاتے آگے بڑھتے کتنی میں پہنچے اور کرسیٔ صدارت پر مسز اقبال مرزا اینڈ صبا مرزا کو پایا۔ بہت مبارک ہو۔ باقی خطوط پر تبصرہ اور نوک جھونک آئندہ ان شاء اللہ... کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب اور للکار پڑھیں جن پر تبصرہ، من آنم کہ من دانم۔ کیا تبدیلی کی ہے ٹی کا شور یا۔ ویلڈن اسما قادری اینڈ انکل طاہر جاوید مغل صاحب۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا اسما قادری صاحبہ اور مغل صاحب سے کہ... اسما صاحبہ پلیز... شہریار اور مہرین (ماہ بانو) کا کردار زیادہ سے زیادہ لائیے اور انکل آپ عمران کو واپس لائیے۔ لگتا تو ہے کہ شاید آئندہ قسط میں عمران واپس آ ہی جائے لیکن ڈر ہے کہ وہ خوش آواز اول بائی والوں میں سے تو نہ ہو۔ سرورق کے رنگوں میں بنیادی موضوع دوستی ہی تھی۔ ہم مجموعی طور پر دونوں رنگ ہی زبردست رہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

عاصم بلوچ کی آمد ڈیرہ اسماعیل خان سے ”جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ ایک کمسن سی حسینہ بال کھولے معلوم نہیں کس کو سنجیدگی سے گھور رہی ہے (غیر سنجیدگی سے گھورتی تو یقیناً سامنے آپ ہوتے) اور ساتھ دو صاحبان غصے سے بھرے پڑے ہیں اور یہ کہ ایک تو پستول سے شاید قتل کرنے کے در پے ہے۔ سرورق کافی اچھا تھا۔ اشتہارات پھلانگتے ہوئے محفل میں پہنچے۔ اقبال مرزا اور صبا مرزا کو کرسیٔ صدارت حاصل کرنے پر مبارکباد۔ اور دعا ہے کہ اللہ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ ایم اے خان! شاید آپ غصے میں ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ سندس جبیں کسی کی ٹانگ کھینچنا اچھی بات نہیں ہے۔ مگر مجھے لگ رہا ہے کہ کہیں آپ میری ٹانگ نہ کھینچ لیں۔ تصویر الحسن! آپ کے نام کی طرح آپ کا تبصرہ بھی کافی اچھا تھا۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ تابش کافی ماہر لڑاکا بن چکا ہے جو پانڈے جیسے کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ کہانی کافی اچھی جا رہی ہے۔ عمران کی دوبارہ آمد کافی پسند آئی۔ گرداب کافی اچھی جا رہی ہے۔ ماہ بانو کے لیے مشکلوں کے پہاڑ ٹوٹنے والے ہیں۔ اسے تو شہریار کافی اچھے قسم کے سیکرٹ ایجنٹ بننے کی کوشش میں ہیں۔ ویسے کوئی اچھی ہیں دونوں رنگ کافی اچھے تھے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے اور ہاں وقشین بلوچ کی کافی کمی محسوس کی۔“

ضلع خوشاب سے اعجاز احمد عاجز کی تبصرہ نگاری ”سرورق، پستول کی نال سے تکتی ہوئی سال نو کی مبارکباد میں کتنی نزاکت ہوگی، کتنا گداز ہوگا مگر اس کا کیا کیجیے کہ زمینی حقائق کچھ ایسے ہی ہیں اور مصوروں کے حق ہیں۔ للکار کی قسط ہم نے تین اقساط میں پڑھی۔ اول بجلی کی تیز روشنی میں پھر موم بتی کی دھیمی مدھم روشنی میں اور آخر میں جنوری کی خوشگوار چمکیلی دھوپ میں۔ عمران کی واپسی کی توقع ہمیں سوفی صد امید تھی بس یہ اندازہ نہیں تھا کہ مغل صاحب کن حالات میں اس کی واپسی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ جہاں اس واپسی کی خوشی ہے، وہیں یہ خدشہ بھی ہے کہ ہمارے ہیرو تابش پھر سے نمبر دو نہ بن جائیں۔ ہمارا مشورہ ان کے لیے یہی ہے کہ جیسے انہوں نے جنگلی سے آفتاب بنایا ہے، اب عمران سے بھی زندگی کے اسرار و رموز سیکھیں۔ گرداب... آفتاب اور کشور ایک بار پھر بال بال بچے اور اپنے پیچھے حسب معمول خون کی لکیر چھوڑ گئے۔ ایک اور گھر وحشت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس کہانی میں چار چار کہانیاں چل رہی ہیں۔ جیسے ایک دریا سے نکلی ہوئی شاخیں بھی مل کر اور کبھی الگ الگ بہتی ہوئی رواں دواں... یہ قسط ایک اتفاق سے شروع ہوئی اور ایک اتفاق پر اس کا اختتام ہوا۔ ایسے اتفاقات کہانیوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ اگر یہ کم ہوں تو کہانی کا لطف بڑھ جاتا ہے۔ قسط وار کہانیوں کا مزہ لینے کے بعد کسی ہلکی پھلکی کہانی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ منظر امام کا نام دیکھتے ہی فتنہ پرداز کا مطالعہ شروع کیا۔ ارے یہ کیا... اس کہانی کا اختتام بھی ڈھیر سے ڈھیر ہونے پر ہوا۔ رازوں کا صندوق، ایک شاہکار یا جاسم کی کہانی ثابت ہوئی حالانکہ اس طرز کی کہانیوں میں تو کسی تشریح کی ہی تیزی کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک مناسب وقفے کے بعد پہلی کہانی خواب زر شروع کی۔ اس کہانی نے تو آغاز ہی سے کسی ریس کے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا اور پھر ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ پڑھتے پڑھتے پھر بھوک محسوس ہوئی۔ ہاتھ بڑھایا اور ساتھ کٹورے امرود کے بیچ سے دو عدد امرود توڑ کر کھا لیے۔ مطالعہ جاری رہا۔ ویرانے ہام سے زمین پر بہت ہی یادیں دستک دینے لگیں۔ (یقیناً ہمیں بھی ویرانے ماضی میں بھٹکا دیا) کہانی نے آخر تک اپنی تیز رفتاری برقرار رکھی اور اس طرح ختم ہوئی جیسے کوئی تیز دھن اونچے سروں میں بجتے ہوئے اچانک تھم جائے۔ ناداں دوست پڑھی۔ ایک الجھی ہوئی ڈور جو شاید مکمل طور پر سلجھنے سے رہ گئی۔ سرورق کے رنگوں میں ابھی نہیں رنگے اس لیے ان پر تبصرہ ان دوستوں کے لیے جو پڑھنے میں ہم سے زیادہ تیز رفتار ہیں۔“ (اگلی دفعہ آپ کی رفتار سرپٹ ہونی چاہیے۔)

عمر دراز نوناری ملتان سے حاضر ہیں ”نئے سال کا تیار رسالہ پیارا اور دراج ہزارا جنوری کو موصول ہوا۔ سرورق بہت ہی پیارا لگ رہا تھا لیکن لڑکی بلکل سے لڑکے کو دیکھا رہی تھی شاید وہ اسی لیے خفا بیٹھا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ متاثر اقبال مرزا اینڈ صبا مرزا اور فیصل محمد نے کیا۔ تصویر الحسن صاحب! آپ نے صحیح کہا کہ آفریدی قبیلے کا نام ہے۔ کہانیاں سب اچھی تھیں لیکن ان میں سے گرداب، اسما قادری، حسن کارکردگی (بابر نعیم)، للکار (طاہر جاوید مغل) بہت اچھی لگیں۔ پہلی بار شرکت کر رہا ہوں شاید کچھ دوست ویلکم کریں۔“ (خوش آمدید)

http://digestpk.blogspot.com/

سال کو مبارک کا انداز اچھا لگا۔ ڈاکٹر انکل! ٹائٹل گرل کے ادھ کھلے ہونٹ اچھے نہیں لگتے (پھر کس طرح کے اچھے لگتے ہیں۔ یہ بھی بتا دیں) اس دو سطری
میں مرزا نبیل کو کرسیٔ صدارت پر پا کر خوشی ہوئی، مبارک ہو۔ ان کا نوک جھوک سے بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ تابش صاحب! آپ غلط سمجھے۔ میرا تعلق گلگت سے
نہیں گلگشت ملتان سے ہے۔ نعمان بھائی! اتنی بھاگ دوڑ اچھی نہیں۔ حضور بخش کنول! یہ کیسا نام ہے؟ تھوڑی وضاحت کر دیں۔ کہانیوں میں سب سے
پہلے لگار پڑھی۔ جیکی کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ کہانی کا اختتام بہت ہی سسپنس پر ہوا۔ شکی انکل اعمران کی واپسی پر بہت خوشی ہوئی۔ میرے خیال میں
تابش، عمران پر پہلے کی نسبت کم انحصار کرے گا کیونکہ جیکی اسے بہت کچھ سکھا چکا ہے۔ گرداب میں بابر کی موت کا افسوس ہوا۔ ماہا نو کا اب چودھری کے
کارندوں سے بچنا مشکل نظر آ رہا ہے۔ کاشف زبیر کی سفینۂ حیات اچھی کہانی تھی۔ معاشرے میں کچھ درندہ صفت انسان موجود ہیں جن کا خاتمہ ضروری ہے۔
(ہمارا بھی یہی خیال ہے) پہلا رنگ سوداریاں کچھ خاص رنگ نہ جما سکا۔ مجموعی طور پر ماہنامہ دلچسپ رہا۔'' (شکریہ)

احمد علی کیف کی فرمائش چنیوٹ سے ''جنوری کے شمارے نے سال کا پہلا شمارہ ہونے کا حق ادا کر دیا۔ باتصویر، تصویر امین جی! آپ کو معلوم تو
ہے کہ ہمارے ملک میں جتنی لیاقتی جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ صبح سویرے دھند میں گاؤں سے شہر تک جانے کے لیے سوا گھنٹہ دو طریقوں سے طے کرتا
ہوں۔ پیدل اور رکشے پر۔ واپس آ کر گھر کا کام بھی ہوتا ہے۔ ہمایوں سعید راج! محترم! میرے نام سے لکھنے والے کرنل نے آپ کو فون تو نہیں کیا؟ عباسی
شہزادہ! جی آپ سو فیصد ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ انکل معراج رسول اور آنٹی عذرا رسول ہی ہیں جو اس مہنگائی کے دور میں اتنی سستی اور معیاری تفریح مہیا کر
رہے ہیں۔ خواب ذرا امید کے خلاف نکل کر سمجھے کچھ تھے ہوا کچھ۔ نادان دوست پسند آئی۔ رازوں کا صندوق میں لگتا ہے کہ جتنی اپنے بہرے خاوند کو مار کے
ڈال دیتی تھی۔ سلیم انور اور بابر نعیم کی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ فتنہ پرداز میں منظر امام نے ڈرامائی موڑ ضرور دیے مگر تحریر مسکراہٹ بکھیرنے والی تھی۔ تحریر تو
کامران بن کے اب ساری زندگی گانے ہی گاتا رہے گا۔ سوداریاں، مہوش بے چاری کا سہاگ اسے گیلا کا تخفہ بنائے ہوئے تھا۔ خود اس کے قابل نہیں اور وہ
اسے چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ سفینۂ حیات لکھنے پر کاشف زبیر کا بہت شکریہ۔ روبینہ اور عزہ ان کو ملا کر ساری کہانی میں ہونے والی لڑائی کا خوف اور لگنے والی مرزی
دونوں ختم کر دیے۔ نواب صاحب کی حاضری کو بہت دن ہو گئے ہیں۔'' (لیجیے آپ نے یاد کیا۔ وہ حاضر ہو گئے)

عبدالجبار خان کی آزاد کشمیر سے اولین آمد ''جاسوسی، سرگزشت، سسپنس کا چودہ سال سے قاری ہونے کے باوجود آج خط لکھنے کی جرأت کر رہا
ہوں۔ (دیر آید درست آید) جب میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا تب سے جاسوسی کا قاری ہوں۔ جاسوسی کی سب کہانیاں زبردست ہوتی ہیں۔ اب
ملتے ہیں شمارے کی جانب۔ اس دفعہ جاسوسی خلاف توقع چار تاریخ کو ہی مل گیا ورنہ مجھ بدنصیب کو جاسوسی ہمیشہ سات تاریخ کو ملا کرتا ہے۔ سب سے پہلے
ٹائٹل کی دیوار پھلانگی اور جا کر اپنے پسندیدہ مصنف طاہر جاوید مغل کی لگار پر دم لیا۔ لگار زبردست جا رہی ہے۔ تابش اب ایکشن میں آتا جا رہا ہے لیکن جیکی
کی موت کا افسوس ہوا۔ اس وقت عبدالرب بھٹی کی آمد دیکھ کر خوشی ہوئی۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔''

لوی اے فرام مسلم ٹاؤن بہاولپور ''نئے سال کی آمد پر یکم جنوری کو سرورق ملنے سے بڑا کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔ ٹائٹل پر توکمنٹس، اقبال اینڈ صبا مرزا
ولی مبارک باد۔ ویسے آج کل خالص چیز ملتی کہاں ہے؟ ایم اے خان! آپ کی زندگی کی مشکل ساعتوں میں نوک جھوک ہونی چاہیے۔ اعجاز احمد!
یہ ماہ و سال تو بدلتے رہیں گے۔ پر دل کی بستی کا کیا کریں جو کسی طرح نہیں بدلتی۔ ماہتاب گل! تعریف کے تانے بانے خود بنتے ہیں اور بات گھما پھرا کر
برادران پر کیوں ڈال دی۔؟ اور یہ آپ کبھی کبھی غلط نیلے بھی تو ہو جاتے ہیں۔ اسنوس جبین! مبارک ہو بہت بہت۔ تابش ذرا غور فرمائیں محمد سرفراز
گلگشت ملتان سے ہیں گلگت سے نہیں۔ او ہو ایم احمد موسم سرما میں اتنا گرم مزاج۔ تصویر امین! انابی میں اختتام خم تو آ گیا ہے کہ عمران پر انحصار نہیں کرے
گا۔ سعید عباسی کی کوشش اچھی لگی۔ لگار میں جہاں جیکی کی موت کا افسوس ہوا وہاں عمران کی اچانک واپسی پر حیرت زدہ رہ گئے۔ انجام کن سنسنی خیز حالات پر
اختتام پورا ماہ تڑپائے گا۔ گرداب میں کشور اور آفتاب کافی مشکلات میں گھر گئے ہیں جبکہ لگتا ہے ماہ بانو پر پھر برا وقت آ گیا۔ پہلا رنگ زندگی کی حقیقتوں کو
اجاگر کرتا نظر آیا جس میں مہوش کا کردار پسند آیا۔ کاشف صاحب نے کافی عرصے بعد قہر لیے سسپنس اور سنسنی خیز حالات پر مشتمل سفینۂ حیات لکھی جو خط سے
موسم میں مزہ دے گئی۔ خواب ذرا ابتدائی صفحات پر دلچسپ تحریر تھی لیکن کاشون کو سب خود یہ خود پتا چل گیا اس نے جاسوسی تو کی ہی نہیں۔'' (امریکا بہادر میں
کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔)

قمر حق کھوکھر راولپنڈی کی طبع آزمائی ''جنوری نئے سال کا شمارہ یکم جنوری کو خریدا۔ مصنف نازک شکل سے کوئی سراغ رساں معلوم ہوتی تھی جو کہ
مشکوک انداز میں بابر عباس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ نیچے کالی عینکیں لگائے آدمی پستول کی نمائش کر رہا تھا اور دوسرے آدمی کے بال جان بوجھ کر خراب کیے
گئے تھے۔ ویسے انکل اس پستول کا نام ہمیں بھی بتا دیں جس سے گولی کے بجائے شربت نکلتا ہے۔ جیکی بحث چینی میں داخل ہوئے تو مرزا سسٹرز پہلے نمبر پر
موجود تھیں۔ مبارک ہو۔ ماہتاب صاحب! اگر لڑکی صرف ذہانت ہی نہیں بلکہ بے وقوفیاں بھی عالمی سطح پر مانی جا چکی ہیں۔ مسز جبین صاحبہ! ذرا دھیان سے
کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی ٹانگ ہی۔ حضور بخش کنول! اگر آپ کا دل ٹوٹ گیا ہے تو کوئی بات نہیں، کسی ویلڈنگ والے کے پاس جاؤ۔ (آپ نے دیں سے
جڑوایا تھا؟) تابش صاحب! آمد کا شکریہ۔ ہمایوں سعید بھائی! آرام سے کترینہ کیف کہاں سے آ گئیں۔ ''شیلا'' تو اس وقت جوانی میں ہے۔ سید محی الدین
اشفاق صاحب! اعجاز احمد صاحب نے واقعی غلط کہا تھا کہ آپ دانا ہیں۔ آپ سب سے بڑے بے وقوف ہیں۔ اب خوش۔ ایم اے ہاشمی صاحب! اتنا غصہ
بھی تو سرورق پر شاید آپ ہی پستول لیے کھڑے ہیں۔ اس بار میں صرف قسط وار کہانیوں اور دونوں رنگوں کے بارے میں بات کروں گا۔ سب سے پہلے
لگار پڑھی۔ جیکی کی موت افسردہ کر گئی جبکہ آخر میں پر عمران کی واپسی سے دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ لیکن اب یہ نہ ہو کہ تابش عمران کا ساتھ ملتے ہی پہلے والی
روش اختیار کر لے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ گرداب میں ماہا گرو کا قصہ ختم ہوا جبکہ آفتاب اور کشور کا ساتھ دینے والے بابر اور اس کی خالہ موت کی بھینٹ
چڑھا دیے گئے۔ سرورق کا پہلا ورق ان بڑی کوٹھیوں کا احوال تھا جو باہر سے خوب صورت اور اندر سے برائی سے بھری ہوئی ہیں۔ رشتوں کا کوئی وجود نہیں
ہوتا اور جب ایک شریف انسان اسے ختم کرنے کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو اس کو بھی برائی و بے حیائی کی دلدل میں گرا کر اس کا دامن داغدار کر دیا جاتا ہے۔
سرورق کا دوسرا رنگ یہ ایک عام سی کہانی تھی لیکن ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات نے اسے سسپنس اور جاسوسی سے مزین کر کے ایک بہترین کہانی بنا دیا۔''

میرے ہاتھوں میں خوطے نہیں تھے ورنہ کب کے اڑ چکے ہوتے۔ بے ساختہ خوشی اور محبت پاش نظروں سے سرورق کی حسینہ کی طرف دیکھا، جو کسی بھی اینگل
سے حسینہ نہیں لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر انکل نے نقشہ تو وہی بنا لیتے ہیں بس صرف مفر اسٹائل اور پوز چینج کر لیتے ہیں۔ پستول کی نال سے نکلتے سال نو مبارک میں
چھپے خاموش پیغام کو محسوس کیا اور دل عزیز کے لیے دعائیں کرتے گرما گرم محفل میں داخل ہوئے جہاں انکل امید عمری باتیں کرتے کافی خوش گوار موڈ میں نظر
آئے۔ کرسیٔ صدارت پر ایک مہینے کے لیے آزمائشی طور پر اقبال اینڈ صبا کو بٹھایا گیا۔ ایم اے خان خوب جگر پی رہے تھے۔ ایم اے بھائی! آپ شدید غلط فہمی
میں مبتلا ہیں۔ اعجاز بھائی پچھلے کچھ ماہ سے دیوداس بننے کے عمل میں ہیں۔ ماہتاب جی! آپ کا شکریہ کہ آپ نے سردیوں کی ٹھنڈی میں جھانکنے کی زحمت کی۔
لگار بہترین تھی...... سفینۂ حیات کاشف زبیر کی ایک اور خوب صورت کہانی ثابت ہوئی۔ بے جا منظر نگاری، مکالمے، سسپنس اور تیز رفتاری نے اس
کو ایک ناقابل فراموش داستان بنا دیا۔ پہلا رنگ صحیح معنوں میں رنگ نہ جما سکا۔ نہ تو پلاٹ جاندار تھا نہ ہی مکالمے۔ جاسوسی کے رنگ کے معیار پر پوری
نہیں اتری۔ منظر امام نے ہلکے پھلکے پُر مزاح انداز میں ایک بہت بڑا پیغام دیا۔ واقعی دولت اور سکون میں معکوس تناسب ہوتا ہے۔ رازوں کے صندوق نے
عورت کی نفسیات کا ایک اور پہلو آشکار کیا۔ اتنی محبت اور قربانی کے بدلے اگر وہ اپنی اور اپنی بات کی اہمیت منوانا چاہتی ہے تو کچھ برا نہیں چاہتی۔ شب صد
ہزار میں ایک شیطانی قوتوں کی حامل کا احوال تھا جو کہ ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ (پسند اپنی اپنی) کو گٹے کی گواہی میں وکٹوریا پر ہمارا شک درست ثابت ہوا۔
حسن کارکردگی اور نادان دوست تو پڑھے نہیں جبکہ خواب زرکو ابتدائی صفحات پر مس فٹ پا کر چھوڑ دیا۔''

محمد نعمان پیارے کی رائے تلمبہ سے ''نئے سال کا خوب صورت تحفہ جاسوسی یکم جنوری کو مل گیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نگاہ پڑنا فطری بات ہے۔
ٹائٹل نئے سال کی مناسبت سے سجا ہوا تھا اور اس پر موجود لڑکی نما عورت ہاتھ میں پستول پکڑے نظر آئی جس میں سے نکلتا ہوا سال نو مبارک بھلا لگ رہا تھا۔
اس مرتبہ حسینہ روایت کے خلاف تھی۔ ٹائٹل گرل کے دائیں جانب ایک چشمے والے شخص کا ادھورا چہرہ نظر آیا اور بائیں جانب نوجوان اپنے لمبے بالوں کی
نمائش کرتا نظر آیا۔ اشتہارات کو پھلانگ کر دل پسند محفل کی جانب روانہ ہوئے۔ اقبال اینڈ صبا مرزا بہت سی خوش فہمیوں کے ساتھ وارد ہوئیں۔ اعجاز احمد جی!
حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ محسن آفریدی عرف شاہد آفریدی، خوش فہمی ہے آپ کی جو مبارکباد سمیٹ رہے ہیں۔ آسیہ خان آپ نے تو
ساری محفل کو ہی گرما دیا۔ سعید عباسی ایسا ہوتا ہے مگر جاسوسی صرف آپ کا ہی نہیں ہمارا بھی بہترین دوست ہے۔ باقی تبصرے بھی پسند آئے۔ تمام خطوط گلستان
میں گلوں کی طرح مہک رہے تھے۔ کہانیوں کی ابتدا کو گٹے کی گواہی سے ہوئی جو زیادہ پسند نہیں آئی۔ کہانی میں وکٹوریا کو دکھایا گیا اس حلیے میں گیا تھا کہ وہ
قاتل ثابت ہو جائے۔ دوسرے نمبر پر نادان دوست پڑھی۔ یہ بھی ایک نارمل کہانی تھی۔ حسن کارکردگی میں سسپنس اور کلائمکس دیکھا۔ لگار پڑھی۔ آخرکار
جیکی مر گیا۔ اس مرتبہ کی قسط میں بہت سارے لوگ موت کی سرحد پار کر گئے۔ تابش نے رنجیت پانڈے کو ناکوں چنے چبوائے۔ لگتا ہے تابش نے جیکی کی نصیحتیں
پلے باندھ لی ہیں۔ کہانی ایک الگ موڑ کی طرف چل نکلی ہے۔ اب اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ تحریر پانش صاحب کی لاجواب، ایک اچھی داستان
تھی۔ سنکر مر گیا اور روزی بچ گیا۔ بتار آخر اول کی شب صد ہزار سنسنی خیز اور دلچسپ کہانی تھی۔ سینڈی اور اس کے بھائی کی موت کا جو منظر بیان کیا گیا وہ دل دہلا
دینے والا تھا۔ ولیم اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا اور راجندر نے ایک جاسوس کا کردار بہت احسن طریقے سے نبھایا۔ اس مرتبہ ڈائجسٹ میں جتنی بھی کہانیاں نظر
سے گزریں، شب صد ہزار بہترین اور پہلے نمبر پر رہی۔ جاسوسی کے آخری صفحات پر کاشف زبیر صاحب کا رنگ سفینۂ حیات پڑھا جو بہت پسند آیا۔ آخر میں
اپنے جاسوسی کے دوستوں کے ساتھ اپنے جنم دن کی خوشیاں شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ یکم فروری 2011ء کو اپنی انیسویں سالگرہ مناؤں گا، اگر زندگی نے وفا
کی۔'' (ہماری طرف سے بہت بہت مبارک باد قبول فرمائیں)۔

ایم عمران صائی اینڈ رابعہ خان، ہماوانی کی شتر گرکاؤش مردان سے ''بہت عرصے بعد محفل کی چکا چوند روشنیوں کا حصہ بننے کی سعی کر رہا ہوں۔
ٹائٹل گرل کچھ خاص نہ تھی اور اسے بالکل آف اسٹپ سے باہر جاتی ہوئی گیند ہی کی طرح وکٹ کیپر کے گلوز میں جانے دیا۔ فہرست صرف لگار اور گرداب
کے ناموں کی موجودگی کے لیے دیکھتا ہوں جو دل کو طمانیت بخشتی ہے۔ تبصروں میں فضل محمد، اعجاز احمد، ماہتاب گل رانا، تصویر امین، محی الدین اشفاق اور قمر حق
کے تبصرے پسند آئے۔ ماہتاب گل کی خود پسندی پسند نہ آئی۔ بی بی! آپ سے اچھے اور بہتر تبصرہ نگاروں کی یہاں لائن لگی ہوئی ہے۔ ایم احمد! ذرا سنت ورنی
انکل کی لاڈلی بھتیجی میرے خلوص سے بھرپور اس خط کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے اور استقبال کے لیے تیار ہے۔ میرے پیارے نعمان پیارے! مصنف
نازک وہ واحد ہستی ہے جو غصے اور مسکراہٹ دونوں میں اچھی لگتی ہے۔ (واہ! کیا بات ہے) لوی اے! عرصہ ہوا کہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہو یار اور
سنجیدہ بھی۔ کہانیاں تمام کی تمام پڑھ چکا ہوں لیکن انکل اور آپ لوگوں کی اجازت سے میں صرف لگار کے متعلق لکھوں گا۔ اس دفعہ جیکی کی موت دکھی کر گئی
اور پانڈے کے صاف بچنے سے تو یہی لگتا ہے کہ آخری معرکہ اب اسی کے ساتھ ہوگا۔ اب شاید عمران کو تابش سے بہت کچھ سیکھنا پڑے۔ وقت کی کمی کے
کارن باقی کہانیوں پر تبصرہ نہ کرنے پر ایک مرتبہ پھر معذرت۔ سرورق کو چھوڑ کر زبردست شمارے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔'' (شکریہ)۔

محمد سلیم بھٹی کی مصروفیات کا احوال ملتان سے ''ماہ جنوری کا شمارہ یکم کو ہی موصول ہو گیا۔ ٹائٹل پر اب کی بار تبصرہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ بہت جلدی
ہے۔ اقبال اینڈ صبا مرزا! آپ کو بہت بہت مبارک۔ مٹھائی کو ماریں گولی، ہم آپ کو اول آنے پر ملتان کی خالص سوغات سوہن حلوہ کھلواتے ہیں۔ آپ
بتائیں کب آ رہی ہیں ملتان؟ پھر نہ کہنا بھائی نے کنجوسی دکھائی۔ (آپ کب بھجوا رہے ہیں؟) تصویر امین! آپ کے ابو کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ لگار
میں عمران کی واپسی نے سیروں خون بڑھا دیا۔ عمران کا ذکر پڑھ کر خون کی گردش تیز ہو گئی۔ امید ہے سلطانہ کو نکال کر لے جائیں گے جبکہ گرداب میں خون
خرابا اور بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ ماسٹر آفتاب کو پناہ دینے والے سارے ایک ایک کر کے دنیا سے جا رہے ہیں۔ ماہ بانو ابھی تک گرداب میں ہی پھنسی ہوئی ہے۔
ابھی یہ دو کہانیاں ہی پڑھی ہیں جبکہ مصروفیات ہی کچھ ایسی ہیں کہ تفصیلی تبصرہ نہیں بھیج سکیں گے۔''

ثنا کنول، مہرین کنول کرک سے لکھتی ہیں ''ہم بھی بھول گئے بھی کھتی ہیں'' ہماری طرف سے جاسوسی کے تمام اسٹاف اور تمام دوستوں کو محبت بھرا
سلام۔ ہم جاسوسی پسند کرتا ہے (کرتی ہوں) اور پچھلے 5 سال سے مسلسل پڑھ رہا ہے۔ پہلے ہمارا ابو اور ای بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ خط لکھنے کے لیے ہمیں

http://digestpk.blogspot.com

کلاسیکی میں مرزا اسکول لڑکی پر بیٹھے تھے... ان کا خط بالکل مزے کا نہیں تھا۔ تصویر آ گئیں ہم اور ہمارا خط بھی بہت پیارا لگتا ہے۔ جہاں تک تعلق ہم سب سے پہلے گرداب پڑھتا ہے۔ یہ کہانی ہمیں بہت پسند ہے۔ تمام کرداروں سے عامر اور کشور اور ماہ بانو سے خاص محبت ہے۔ انگارے بھی ہم شوق سے پڑھتا ہے کیونکہ یہ مقبول ناول کا ہے۔ انگریزی کہانیوں میں لاحاصل اور معاہدہ بڑی اچھی لگیں، رنگ تو ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ اس بار پہلا رنگ تو کچھ خاص نہیں آیا۔ البتہ دوسرا رنگ کافی اچھا تھا۔ ہم نے دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھا۔ شاہین کا کردار برا لگا۔ اگر ہمارا خط شامل ہوا تو ہم دوبارہ آئے گا۔" (ایک بات ضرور بتائیے گا... آپ کے علاقے میں عورتیں مردوں کی طرح بات کرتی ہیں)۔

ایم احمد ہاشمی ڈسٹرکٹ بونیر سے اپنی پسند ناپسند کا اظہار کرتے ہیں "نئے سال سے آپ کی کارکردگی کافی اچھی ہو گئی ہے یعنی رسالہ مناسب وقت پر مارکیٹ میں آ گیا تھا۔ کار اور کردگی دو لفظوں کا مرکب ہے، جب یہ دو الفاظ مل جائیں تو رسالہ جلدی ملتا ہے اور الگ ہو جائے تو تاخیر ہے۔ شمارہ یکم جنوری کو ملا۔ ٹائٹل پر ایک پہاڑی یا صحرائی دوشیزہ رونق افروز تھی۔ ورق پلٹ کر دیکھا تو اشتہارات جوں کے توں اپنی جگہ موجود تھے۔ (کیا آپ کوئی اور توقع کر رہے تھے...) اداریہ پڑھا۔ خیر مبارک۔ انعامی بانڈ انعام مرزا اینڈ صابر مرزا کا نکل آیا تھا، مبارک باد قبول ہو۔ پشاور والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔ شاید آسیہ خان کا سوگ منانے آئے ہیں۔ ماہ بانو اب گل رانا باجی اتفاق سے گرتی ذہانت کے مظاہرے بھی دیکھے ہیں مگر کم۔ زخم یہاں بیان کرنا جاسوسی کے اصولوں کے منافی نہیں۔ قمر حق ہو اور آپ کے لیے عرض ہے کہ پنجابی تو مجھے سمجھ میں بھی نہیں آتی تو پنجابی فلمیں دیکھنے میں کیا خاک مزہ آئے گا۔ اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کو پرکھنے کے لیے باقاعدہ چشمہ لگانے کی ضرورت نہیں میرے چھوٹے موٹے پیارے بھائی۔ بہرحال، ابھی آپ کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں، بلاوجہ ان بکھیڑوں میں مت الجھیے گا۔ سمجھے؟ خطوط میں اعجاز احمد، تصویر نعمن اور کبیر عباسی کے خطوط پسند آئے۔ جی ہاں! حسب عادت گرداب سے شروع کیا۔ بابر کی موت نے ازحد دل افسردہ کر دیا۔ کیا سچ مچ خوشیاں اسی طرح داؤ پر لگ جاتی ہیں جیسے بابر کی خوشیاں چکنا چور ہو گئیں؟ (جی ہاں... زندگی ایسے ہی غیر متوقع حادثات کا نام ہے) کشور اور آفتاب ایک بار پھر موت کے منہ میں جاتے جاتے بال بال بچ گئے ورنہ معلوم نہیں دونوں کا کیا حشر ہوتا۔ یہ محبت تو آزمائشوں کا ایک سلسلہ در سلسلہ ہے۔ خواب زرہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی ایک جاندار تحریر تھی۔ پلیز انگارے میں کچھ تبدیلی لائیں۔"

عائشہ رانی کی گفتار ملتان سے "میں جاسوسی کی خاموش قاری ہوں۔ تقریباً تب سے جب میں ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ جب بھی گھر میں بڑی بہن، بھائی ڈائجسٹ منگواتے تو مجھ سے چھپا کر رکھتے مگر میں جاسوسی کر کے تلاش کر ہی لیتی۔ (جاسوسی سے خاصا پرانا رشتہ ہے) لو یہ تو ہو گئی انٹری۔ آتے ہیں ٹائٹل گرل کی طرف۔ بڑی خوب صورت تھی۔ ارے یہ کیا؟ یہ میرا کزن کہاں سے آ گیا ٹائٹل میں...؟ فون کیا تو معلوم ہوا یہ بندہ نامعلوم میرا کزن نہیں مگر دکھتا ویسا ہی ہے غالبوں جیسا۔ افوہ لڑکی تو ہمیشہ خوب صورت ہوتی ہے مگر وہ لڑکوں کو بھی خوب صورت، ہر گریوئے جیسا بنا دیا کریں۔ آتے ہیں انگارے کی طرف۔ شکریہ انکل جی کہ عمران صاحب بھی نظر آئے۔ اب جان "آگ" کی کہانی میں ہمارے ہیرو کے آنے سے۔ انگارے کے بعد گرداب میں جا پہنچے۔ لو پھر بگڑی گئی ماہ بانو (مہرین) بے چاری۔ ویسے محبت کی وجہ سے کئی اموات ہو گئیں۔ دونوں رنگ پڑھے۔ پہلا جاسوسی کے مطلب کا تو تھیں مگر تیخ تھر یلی کہانی تھی۔ دوسرا رنگ بس ٹھیک ہی تھا۔ عبدالرب کی کہانی... واہ مزہ آ گیا مگر ہر اسٹوری کے اینڈ میں ہیرو، ہیروئن کی شادی لازمی ہوتا ہوتی ہے۔ (آپ کا کیا کہنا ہے؟) باقی کہانیاں تو بیر بھائی جان ہیں کیونکہ اب رسالہ ان کے ہاتھوں میں ہے، جب ملے گا تب نظر ثانی ضرور کریں گے۔"

ڈاکٹر آصل بازآفریدی کے مشورے کراچی سے "جنوری 2011ء کا جاسوسی میرے ہاتھوں میں آ چکا ہے۔ (مبارک ہو... کچھ تو ہاتھوں میں ہے) سرورق پر ایک فکر مند لڑکی نظر آ رہی ہے اور اس کی فکر مندی کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کے پیچھے دو حضرات ہیں۔ میرا پیارا صدارتی فرمان تمام قارئین سے یہ ہے کہ کہانیوں پر حسب توفیق تنقید کر لیا کریں۔ اب سارے قلم کاغذ سنبھال کر بیٹھ جاؤ اور مجھ سے تنقید کرنے کا طریقہ سیکھو۔ محمد عثمان آزاد یہ آزاد کیوں ہے؟ کیا ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی؟ (جی ہاں، ابھی شادی نہیں ہوئی... ویسے آزاد شخص بھی ہو سکتا ہے) ان کی کہانی گونگے کی گواہی پڑھی مگر کچھ بھی نہیں تھا سوائے ایک سین کے۔ اس میں بھی کوئی کمال نہیں۔ ویسے سوال ہے کہ اگر میاں بیوی دونوں گونگے ہوں تو محبت اور غصے کا اظہار کس طرح کریں گے؟ ذرا یہ تو بتائیں۔ (کسی کی قدرتی خامی یا کمزوری کے بارے میں اس طرح کہنا اچھی بات نہیں ہے۔ اگر آپ ان افراد سے کبھی ملیں تو معلوم ہو گا کہ یہ اپنے جذبے کا اظہار مکمل طور پر کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی جذبات کے اظہار کے لیے الفاظ سے زیادہ چہرے کے تاثرات اہم ہوتے ہیں) آصف ملک کی نادان دوست، ہاں بس کچھ کچھ سسپنس تھا۔ یہ بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ بابر نعیم کی حسن کارکردگی، میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ کارنامے مرد حضرات نے انجام دیے اور رہیں فائدے میں خواتین۔ شاباش... خواتین۔ معاہدہ میں یہ پیغام تھا کہ دوست بنانے میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ میں اب کیا کروں دوست بنانے کے لیے تو میں تین روپے بھی خرچ کر سکتا ہوں، شاید یہ میری کمزوری ہے۔ ... آزاد کی شب صد ہزار پر اسرار کہانی تھی۔ میں نے تو مزہ لے لیا، آپ کا مجھے معلوم نہیں۔ (چلیے شکر ہے کوئی کہانی سمجھ میں تو آئی... تبھی تو مزے لیے... کیوں؟) تنویر ریاض کی لاحاصل اچھی کہانی کہی جا سکتی ہے۔ میر یا ساحل کی تیروں کا چوہ یہ بھی اچھی تھی۔ اس میں مرد حضرات کی خصلت دکھائی گئی تھی یعنی اردو تو اور اب مردوں کو بھی نہ بخشا اور چوریاں کرتے لوگوں کو ذرا بھی نہیں آتا؟ سلیم انور کا رازوں کا صندوق لاجواب کہانی تھی۔ یعنی کوزے میں سمندر۔ دو صفحوں میں اتنی بڑی کہانی شاباش سلیم! ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب عورتوں کے پرس سے خوف آنے لگا۔ کیا پتا پرس میں سرخی کے علاوہ ٹی ٹی بھی ہو۔ ہاں، ابھی معاملات خراب ہیں کسی لڑکی کا کیا بھروسا؟ کاشف زبیر کی سفینۂ حیات کا ٹمپو بہت ہی تیز تھا۔ کردار بھی زیادہ تھے اور کئی قسم کے اتفاقات بھی... انوار صدیقی کی کہانی کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ کیا بات ہے... عورت کی وفا، گھر بچانے کے جتن، بچی کے بے فکر مندی، مرد کا مکروہ چہرہ، مرد کی خود سری اپنی اوقات بھولنا..."

ان قارئین کے نام جن کے نامے شامل بزم نہ ہو سکے۔

تکبیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ احسن بشیر ممتاز آباد، ملتان۔ عصمت علی قرام شیخ، سوات۔ علی رجب بن صادق، ضلع شیخوپورہ۔ نیازی خان...
شاہین تبسم، کراچی۔ جنید احمد، حیدرآباد۔ فضیل احمد، سکھر۔ ثمرین خان، لانڈھی کراچی۔ ثنا صادق، اوکاڑہ۔

http://digestpk.blogspot.com

http://digestpk.blogspot.com/

اولین صفحات پر آپ کے ذوقِ طبع کی نذر... پسندیدہ مصنف کی خاص تحریر

ستم زادہ

محی الدین نواب

کیا دکھوں کو کسی طرح جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے... دکھ کا حاصل کیا ہے... اور دکھ انسان کی زندگی میں کہاں کہاں معاون ثابت ہوتے ہیں... انہی سوالوں کا احاطہ کرتی ایک نوجوان کی زندگی کے نشیب و فراز... دنیا اسے لاوارث سمجھتی تھی... یہ حسن لوگوں کی نشتر زنی نے اسے رنجیدہ و دل گرفتہ بنا دیا... وہ اپنی بکھری بکھری سوالیہ زندگی کا جواب چاہتا تھا... بالآخر اس کے زخمی وجود کے لیے... دکھ ہی معاون ثابت ہوئے... اور اس کی زندگی کو یقینی طور پر منزل کے قریب لے گئے۔

ایک واہمہ... ایک خواب... گمان و یقین کے درمیان معلق تعبیر و جستجو کا فسانۂ عجب

اُس کا نام کامران تھا۔ کامران اسے کہتے ہیں جو منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے لیکن وہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی بھٹک رہا تھا۔ لہٰذا موجودہ حالات میں وہ کامران نہیں تھا۔

والدین خوش فہمی میں مبتلا ہو کر بچے کا نام شیر علی رکھ دیتے ہیں لیکن وہ آگے چل کر گیدڑ نکلتا ہے۔ بہت کم لوگ اسم بامسمّٰی ہوتے ہیں۔ فی الحال وہ اپنے نام کے مطابق کامیاب و کامران تھا۔

کامران... نام اس کی ماں یا باپ نے نہیں رکھا تھا۔ اگر انہوں نے رکھا ہوتا تو نام کے ساتھ باپ کا نام ہوتا لیکن وہ ولدیت سے محروم تھا۔ اس کا باپ نہیں تھا۔

ماں باپ کے بغیر کوئی دنیا میں نہیں آتا۔ اس کے بھی ماں باپ ہوں گے یا اپنا نام و نشان چھوڑے بغیر کہیں مر کھپ گئے ہوں گے۔ اگر زندہ ہوں گے تو اسے دایا نانی کی دہلیز پر پھینک کر کہیں عیش و عشرت کی دنیا میں مگن ہوں گے۔

جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اس نے نانی سے پوچھا کہ میرے امّی ابّو کہاں ہیں؟

اس نے جواب دیا۔ ”وہ مر چکے ہیں۔ میں ہی تمہاری ماں ہوں، میں ہی تمہارا باپ ہوں۔“

نانی نے اسکول میں اس کے باپ کا نام محمد ہاشم لکھوایا تھا۔ جیسے جیسے وہ جوان اور باشعور ہوتا گیا، اسے حقیقت معلوم ہوتی گئی کہ نانی نے فرضی باپ کا نام لکھوایا ہے۔ اس کے باپ کا کوئی پتا ہوتا تو صحیح نام بھی معلوم ہوتا۔

اس کی نانی نے ہمیشہ اسے سمجھایا تھا۔ ”تم میری بیٹی کے بیٹے ہو۔ وہ تمہیں پیدا کرنے کے بعد مر گئی تھی اور باپ تو پہلے ہی دنیا سے چلا گیا تھا۔“

اس محلے میں ایسے لوگ تھے جو برسوں سے وہاں آباد تھے۔ ایک بوڑھی خاتون نے بتایا تھا کہ اس کی نانی زیتون کی کوئی بیٹی یا بیٹا نہیں تھا۔ وہ بانجھ تھی۔ شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ پھر اس نے کبھی شادی نہیں کی۔

زیتون آس پاس کے علاقے میں دور تک دائی ماں

کہلاتی تھی۔ جب کامران دنیا والوں کی ہیرا پھیری کو کسی حد تک سمجھنے لگا تو نانی کی ہیرا پھیری بھی سمجھ میں آ گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ زیتون بڑی رازداری سے ناجائز بچے پیدا کرنے والوں کی مشکلیں آسان کرتی ہے اور ہزاروں روپے کماتی ہے۔

یہ دنیا ایک معلم کے مانند ہے۔ یہاں جو حاضر دماغی اور ہوشیاری سے دنیا کو دیکھتے ہیں اور بہت کچھ سیکھتے رہتے ہیں، وہ ایسے ماہر ہو جاتے ہیں کہ کسی کے فریب میں نہیں آتے اور منہ سے نکلتے ہی جھوٹ کو پکڑ لیتے ہیں۔

اس نے مشتعل ہو کر پوچھا۔ ”دایا نانی! تم نے جھوٹ کیوں کہا تھا؟ تمہاری کوئی بیٹی نہیں تھی۔ تم میری سگی نانی نہیں ہو۔ اب تک مجھے دھوکا دیتی آ رہی ہو۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”میں جانتی تھی، ایک دن جھوٹ کھلے گا۔ محلے میں درجنوں لوگ ہیں جو میری زندگی سے اب تک کی بہت ساری باتیں جانتے ہیں۔ ان کے پیٹ میں بات رہنے والی نہیں تھی۔ آخر انہوں نے تمہارے سامنے اُگل ہی دی۔“

”تم ناجائز کام کرتی ہو۔ گناہ گار لڑکیوں سے رقم لے کر ان کا حمل ضائع کر دیتی ہو پھر مجھے ضائع کیوں نہیں کیا؟“

زیتون نے کہا۔ ”جب تین چار ماہ گزر جاتے ہیں، تب بچے کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ ایسا کیا جائے تو ماں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔“

”اچھا تو کسی عورت نے گناہ کیا اور پھر پارسا بننے کے لیے تمہیں رازدار بنا لیا تاکہ تم مجھے پیدا ہونے سے پہلے ہی مار ڈالو۔“

وہ بڑی نفرت سے بول رہا تھا۔ ”پھر معلوم ہوا کہ ایسا کرنے سے وہ خود مر سکتی ہے تو اس نے مجبوراً مجھے پیدا کیا... یہی بات ہے ناں؟“

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے مزید بولا۔ ”میں غیر ضروری تھا۔ اس کے وجود سے نکلا ہوا کچرا تھا اس لیے پیدا کرتے ہی مجھے پھینک دیا۔ پھر تم مجھے اٹھا کر کیوں لے آئیں؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟ کیا اس نے گناہ نہیں کیا؟ کیا اس نے مجھے پھینک نہیں دیا؟“

”پھینکنا ہی ہوتا تو تمہیں پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے میں ذرا دیر نہ لگتی مگر وہ چاہتی تھی، تم زندہ رہو۔“

دایا نانی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اس کی عزت کرو۔ وہ ایک محترم ماں ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے لیکن اس نے یہ بات گھر والوں سے چھپائی۔ مگر اس کو چھپایا نہیں جا سکتا... جب گھر والوں کے سامنے یہ بات آئی تو وہ پریشان ہو گئے۔ مجھے دس ہزار روپے دے کر کہا کہ میں اس قصے کو رازداری سے ختم کر دوں۔

لیکن وقت بہت گزر چکا تھا۔ اگر بچے کو ضائع کیا جاتا تو ماں زندہ نہ رہتی۔ اسپتال والے بھی اسے بچا نہ پاتے۔ تب ان لوگوں نے کہا کہ ان کے ایک فارم ہاؤس میں رازداری سے ولادت ہو گی۔ پھر بچے کو مار کر وہیں ایک گڑھے میں دبا دیا جائے گا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”انہوں نے اس کام کے لیے پورے بیس ہزار روپے کی پیشکش کی تھی۔ آج سے بائیس برس پہلے بیس ہزار بہت ہوتے تھے۔ میں اس کیس کو نمٹا کر مالدار ہو رہی تھی اس لیے فوراً ہی راضی ہو گئی۔

”مجھے ایک کار میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک فارم ہاؤس ... پہنچایا گیا۔ وہاں میں نے تمہاری ماں کا معائنہ کیا اور اس کے بزرگوں سے کہا کہ کل تک ولادت ہو سکے گی۔

وہ بزرگ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تنہائی میں تمہاری ماں نے میرے ہاتھ تھام لیے اور گڑگڑا کر کہا۔ ”میں اپنے بچے کی زندگی چاہتی ہوں۔“

میں نے اسے تسلی دی۔ ”اطمینان رکھو۔ میں نے معائنہ کیا ہے۔ تم بھی صحت مند ہو، بچہ بھی صحت مند ہے۔ تمہارا بچہ سلامتی سے دنیا میں آئے گا۔“

وہ بولی۔ ”وہ سلامتی سے پیدا ہوگا لیکن میرے ابو اور دادا جان اسے مار ڈالیں گے۔ بدنامی کو اسی فارم ہاؤس میں دفن کر کے جائیں گے۔“ وہ رونے لگی۔

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”میں کیا کر سکتی ہوں؟ تمہارے بزرگ جو چاہتے ہیں، وہ ہونے دو اور کوئی چارہ نہیں ہے۔“

”تم کوشش کرو گی۔ میرے بچے کو یہاں سے زندہ سلامت لے جاؤ گی تو میں تمہیں ایک لاکھ روپے دوں گی۔“

”ایک لاکھ...؟“ میری اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ ”ایک لاکھ روپے...“

میں دم بخود رہ گئی۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچ کر پوچھا۔ ”تم سچ کہہ رہی ہو؟ کیا تم آج ہی مجھے ایک لاکھ روپے دے سکو گی؟“

”آج تمہیں پچاس ہزار ملیں گے۔ اس کے بعد تم بچے کو کہیں حفاظت سے رکھنے کا انتظام کرو گی تو پچاس ہزار

دوں گی اور جو عورت میرے بچے کی پرورش کرے گی، اسے ہر مہینے دس ہزار روپے دیا کروں گی۔“

میں تو ہل کر رہ گئی۔ گھر بیٹھے ماہانہ دس ہزار روپے مل سکتے تھے۔ پھر الگ سے ایک لاکھ روپے مل رہے تھے۔ میں نے تمہاری ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”میں تو جان دے دوں گی مگر بچے پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ، پچاس ہزار کی رقم مجھے آج کیسے ملے گی؟ کیا رقم ابھی تمہارے پاس ہے؟“

”میرے پاس نہیں ہے لیکن رات ہوتے ہی وہ یہاں چھپ کر آئیں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کون؟“

”وہ جو اس ہونے والے بچے کے باپ ہیں۔ ہم نے تہیہ کیا ہے، اپنے بچے کو ہر حال میں بچائیں گے۔ بزرگوں نے پہلے ہماری شادی نہیں ہونے دی اب بچے کو مار ڈالنا چاہتے ہیں اور ہم اس کی سلامتی کے لیے کچھ بھی کر گزریں گے۔“

وہ بوڑھی دایا بول رہی تھی اور کامران اپنے ماں باپ کی روداد سن رہا تھا۔ پہلے وہ بدظن تھا کہ ماں باپ نے اسے کچرا سمجھ کر پھینک دیا ہے۔ اب ان کی محبت اور قدر و منزلت دل میں گھر کر رہی تھی۔

اس نے کامران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رات کا اندھیرا پھیلتے ہی تمہارا باپ وہاں چھپ کر آیا۔ تمہاری ماں کے ابو اور دادا دوسرے کمرے میں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ چونکہ بڑی رازداری سے یہ معاملہ نمٹایا جا رہا تھا اس لیے وہاں اور کوئی رشتے دار یا نوکر نہیں تھا۔

تمہارا باپ پچھلے دروازے سے چھپ کر آیا تھا۔ میں نے کہا، میں اس ہونے والے بچے کی پرورش کروں گی۔ وہ جب چاہیں گے، چوری چھپے میرے گھر آ کر بچے کی خیر خیریت معلوم کر سکیں گے۔

تمہارا باپ بھی بہت نام والا تھا۔ تمہیں اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ میں نے تمہاری پرورش کی ذمے داری لے کر ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔

رات کے دس بجے وہ دردِ زہ میں مبتلا ہوئی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسے وقت مجھے کیا کرنا چاہیے؟

میں نے تمہاری ماں کے باپ سے کہا۔ ”یہ ناقابلِ برداشت تکلیف میں ہے۔ میں ایک انجکشن لکھ رہی ہوں۔ آپ فوراً شہر جا کر لے آئیں۔“

میں نے ایک پرچی لکھ کر دی۔ وہ اپنی کار میں وہاں سے چلے گئے۔ ایک گھنٹے سے پہلے واپس آنے والے نہیں تھے اور میرے تجربے کے مطابق آدھے گھنٹے میں ہی ولادت ہو گی۔ تم صحیح سلامت اس دنیا میں آ گئے۔

اسی وقت دوسرے کمرے سے دادا جان وہاں آئے۔ وہ تمہیں ختم کرنا چاہتے تھے لیکن تمہارا باپ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بڑے میاں کو ریوالور کے نشانے پر رکھ کر کہا۔ ”خاموشی سے اپنی پوتی کے پاس بیٹھو۔ یہ پوتی تمہاری ہے، تمہیں مبارک ہو۔ یہ بیٹا میرا ہے۔ میں اسے لے جا رہا ہوں۔“

پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”تم بھی میرے ساتھ چلو میرے گھر تک۔ میرے بیٹے کی دیکھ بھال تم کرو گی۔ ورنہ میں تمہیں بھی گولی مار دوں گا۔“

میں بڑے میاں کے سامنے خوفزدہ ہو کر اس کمرے سے باہر نکل گئی۔ تمہارے باپ نے دروازے پر آ کر تمہاری ماں سے کہا۔ ”ان بزرگوں نے ہماری شادی کی مخالفت کی۔ ہمیں ازدواجی رشتے میں منسلک نہیں ہونے دیا۔ کوئی بات نہیں، ہم ایک دن ضرور ملیں گے۔ یہ بیٹا ہمیشہ ہم دونوں کو جوڑ کر رکھے گا۔ تم میری دلہن ضرور بنو گی۔“

بیچاری ماں تم سے جدا ہو کر رو رہی تھی۔ مگر اندر سے خوش تھی کیونکہ تمہیں ہلاک کرنے والے ناکام رہے تھے۔ تم زندہ سلامت اپنے باپ کے ساتھ جا رہے تھے۔“

کامران نے مسرتوں سے سرشار ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں اپنی امی اور ابو پر تمام عمر فخر کرتا رہوں گا۔ پہلے لاوارث ہونے کے غم میں گھل رہا تھا۔ اپنے پیدا کرنے والوں سے بدظن تھا۔ اب میں ان کی عظمت کے سامنے سر جھکا رہا ہوں، چشمِ تصور سے انہیں دیکھ رہا ہوں۔“

پھر اس نے چونک کر پوچھا۔ ”ان کے نام کیا تھے؟ تم اتنی ساری اہم باتیں بتا رہی ہو، ان کے نام نہیں لے رہی ہو؟“

”اس لیے کہ میں ان کے نام نہیں جانتی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ میں آم کھاؤں پیڑ نہ گنوں۔ ان کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں۔ تمہارے باپ نے مجھے ایک لاکھ روپے دیے تھے اور ہر ماہ دس ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر میں تمہیں اپنے گھر لے آئی تھی۔“

”وہ تمہیں ماہانہ رقم دینے کے لیے یہاں آتے ہوں گے؟“

وہ بڑے دکھ سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”میرے نصیب میں ایک لاکھ تو کیا، ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ تمہارے

http://digestpk.blogspot.com

تھی لیکن میرا خاوند ایک لاکھ روپے لے کر فرار ہو گیا۔ میں خالی ہاتھ رہ گئی۔ تمہاری ماں ایک بار چھپ کر میرے گھر آئی تھی۔ تمہیں دودھ پلا پایا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ تمہارے ابو یہاں آئے تھے۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے، بچہ کہاں ہے؟

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”پھر تم نے کیا کہا؟“

”میں نے تسلی دی کہ بچے کو چھپا دیا تھا۔ تمہارے ابو مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے پھر گلی میں رک کر دو چار لوگوں سے باتیں کیں۔ اور انہوں نے معلوم کر لیا کہ میں کسی بچے کو لے کر یہاں آئی تھی۔“

تمہاری ماں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”پھر تو ڈیڈی کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میرا بیٹا یہاں تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں۔ لیکن وہ میرے پاس آ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ میں بچے کو ان کے گھر سے لے کر آئی ہوں اور اسے ان کی بیٹی نے جنم دیا ہے۔“

”ڈیڈی بدنامی سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ تمہارے پاس میرے بیٹے کو لینے نہیں آئے لیکن اسے مار ڈالنے کی کوئی چال ضرور چلیں گے۔ تم اس محلے میں اس شہر میں نہ رہو۔ لاہور چلی جاؤ۔“

”پھر تمہاری ماں چلی گئی۔ اسی شام تمہارے ابو آئے۔ انہوں نے کہا۔ ”میرے بیٹے کو لے کر ابھی لاری اڈے جاؤ اور لاہور جانے والی کسی بھی پہلی بس میں سوار ہو جاؤ۔ میں اس بس کے پیچھے اپنی کار میں آؤں گا۔ تم وہاں کسی علاقے میں مکان کرائے پر لو گی۔ میں وہاں آتا جاتا رہوں گا۔ تمہیں ہر ماہ رقم ملتی رہے گی۔“

”میں نے انہیں بتایا کہ میرا شوہر ایک لاکھ روپے لے کر فرار ہو گیا ہے۔ میں خالی ہاتھ رہ گئی ہوں۔“

انہوں نے مجھے پچاس ہزار روپے دیے اور میں لاہور آ گئی۔ وہ اپنی کار میں میری بس کے ساتھ ہی آ رہے تھے لیکن لاہور نہیں پہنچے۔ میں صبح تک انتظار کرتی رہی۔ تمہیں گود میں لیے سوچتی رہی کہ آخر تمہارے ابو کہاں رہ گئے؟

بہر حال میں نے یہاں یہ مکان کرائے پر لیا اور پورے بائیس برسوں سے اسی محلے میں ہوں۔ انہیں تلاش کر رہی ہوں۔ یقیناً وہ بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“

وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”خدا جانتا ہے، ان سے کبھی ملاقات ہو سکے گی یا نہیں؟ اور تم خود دیکھ رہے ہو، میں نے ان کی امانت کس طرح سنبھال کر رکھی ہے۔“

کامران نے دایا نانی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ نے ایک ماں کی طرح میری پرورش کی ہے۔ اب تو میں ہر نماز میں دعا مانگتا رہوں گا۔ یا اللہ! ایک بار مجھے امی ابو کی صورت دکھا دے۔“

زیتون سے تمام واقعات جان لینے کے بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ لاوارث نہیں ہے لیکن دنیا والے تو یہی کہتے تھے۔

لاوارث کیا ہوتا ہے؟

وہ ”بیچارہ“ ہوتا ہے۔ جس کا کوئی اپنا تو کیا، کوئی دور پار کا رشتے دار بھی نہیں ہوتا۔ نہ کوئی آگے ہوتا ہے نہ کوئی پیچھے رونے دھونے والا رہ جاتا ہے۔ وہ پوری دنیا میں سوکھے پتے کی طرح ہوا کے رحم و کرم پر ادھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے۔

لاوارث کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ گناہ کی پیداوار ہے۔ وہ محلے میں جہاں سے گزرتا تھا، لوگ اسے گری ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کوئی بزرگ اس کے سر پر دستِ شفقت نہیں رکھتا تھا۔ کسی گھر کا دروازہ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے نہیں کھلتا تھا۔

وہ بے چین تھا۔ اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ کسی بھی طرح یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا وجود ناجائز نہیں ہے۔ اس کے والدین زندہ ہیں۔

لیکن کہاں ہیں؟ وہ کیسے یقین دلائے کہ وہ بھی دنیا والوں جیسا ہے۔ ان سے الگ، اچھوت اور قابلِ نفرت نہیں ہے۔

اس نے اسکول میں صرف دس جماعتیں پڑھی تھیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں موٹر گیراج میں کام کرتا تھا۔ وہاں سے ہفتے میں تین سو روپے ملتے تھے۔ ان میں سے کچھ دایا نانی کو دیتا تھا۔ کچھ اسکول کی فیس اور کتابوں میں خرچ ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد کسی کالج میں قدم رکھنے کی اوقات نہیں تھی۔

اس کے باوجود اس نے اس سوتی جاگتی، دوڑتی بھاگتی اور بھاگتی ہوئی دنیا کی یونیورسٹی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔

اس دنیا میں لوگوں کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے کے لیے شعوری طور پر جس علم اور ہنر کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب کچھ حاصل کرتا رہا تھا۔

یہ سچ ہے، انسان کے اچھے دن نہیں رہتے تو برے دن بھی نہیں رہتے۔ وہ بچپن سے جوانی تک فرہاد کی طرح پہاڑ کھودتا رہا تھا اور اب دودھ کی نہر نکلنے والی تھی۔ وہ مایوس ہونا نہیں جانتا تھا۔ ایک فقیر نے پیش گوئی کی تھی کہ اس کے دن بدلنے والے ہیں۔

سچے فقیر وہ ہوتے ہیں جو اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے نام کر دیتے ہیں۔ صرف اللہ سے مانگتے ہیں۔ دنیا کی ہر ضرورت کو مار ڈالتے ہیں۔ ایسے ہی ایک قناعت میں مست رہنے والے فقیر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

وہ رحمان پورہ موڑ سے متصل ایک آبادی میں اپنی دایا نانی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ مسجد تھی۔ اس کے دو بڑے گیٹ تھے۔ ایک گیٹ سڑک کی طرف جبکہ دوسرا نہر کی طرف کھلتا تھا۔ وہ اکثر وہاں نماز پڑھا کرتا تھا۔

وہ مسجد اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کے فرش پر نماز پڑھتے وقت اس کے اندر عجیب سا روحانی سُرور پیدا ہوتا تھا۔ جی کرتا اس مسجد سے باہر نہ جائے لیکن دنیاوی معاملات اور اپنے حالات سے نمٹنے کے لیے عملی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔

وہ گیراج جانے سے پہلے فجر کی نماز جامعہ اشرفیہ میں ادا کرتا۔ فیروز پور والے گیٹ سے اندر داخل ہوتا اور نہر کی جانب کھلنے والے گیٹ سے باہر نکل جاتا۔ صبح سویرے نہر کے کنارے تازہ ٹھنڈی فضا میں فرحت و تازگی محسوس کرتا۔

وہیں پر اس کی ملاقات فقیر بابا سے ہوئی۔ پتا نہیں، وہ کیوں صبح سویرے گیٹ کے سامنے پہنچ جاتا اور میلا سا کپڑا بچھا کر چند پرانی سی کتابیں اس پر سجا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ بھی کسی کو آواز نہیں دیتا تھا کہ آؤ اور اپنی قسمت کا حال معلوم کرو....

ساری دنیا آنے والے کل کے متعلق جاننے کے لیے بے کل رہتی ہے۔ چند ایسے ہی لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ کچھ معلومات حاصل کرتے پھر اس کے سامنے چند سکے پھینک کر چلے جاتے۔

عجیب بات تھی، لوگ اپنی زندگی....اور مستقبل کے متعلق قیمتی معلومات حاصل کرتے اور اس کے عوض صرف چند سکے دیتے۔ وہ بھی خیرات کی طرح پھینک کر چلے جاتے تھے۔

کامران نے ایک بار دیکھا کہ ایک بیمار بوڑھا وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس فقیر بابا نے اپنے تمام سکے اٹھا کر اس بیمار کو دے دیے۔ سخی وہ ہے جو دُکھی انسان کے لیے اپنی آخری پونجی بھی لٹا دیتا ہے اور ایسا اللہ والے ہی کیا کرتے ہیں۔

کامران کی جیب میں چند سکے ہوتے تھے۔ جو اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناکافی ہوتے تھے۔ ایسے میں بھلا وہ اس فقیر بابا کو کیا دیتا؟ اس لیے سر جھکا کر اس کے سامنے سے گزر جاتا۔

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات یا احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وہ حسبِ معمول ایک روز اس کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی ہتھیلی مانگنے کے انداز میں پھیل گئی۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے پہلی بار اسے ہاتھ پھیلاتے دیکھا تھا۔ وہ بھی اُس جیسے کنگال کے آگے... اس کا حلیہ ہی بتا دیتا تھا کہ وہ بھکاری نہ سہی، مفلس اور کنگال ضرور ہے۔

فقیر بابا نے اپنی ہتھیلی پھیلا کر کہا۔ ”ایک روپیہ دے گا تو ایک بات بتاؤں گا۔ جتنے روپے دے گا، اتنی باتیں بتاؤں گا۔“

فی زمانہ ایک روپے کی قدر بالکل ہی گھٹ گئی ہے۔ ایک روپیہ تو ایک تنے پیسے کے برابر ہو گیا ہے اور پیسے، آنے پائی کا حساب لوگ بھول چکے ہیں لیکن ایک فقیر منش کو مہنگائی سے کیا لینا....؟

اس نے ایک روپیہ طلب کیا تھا۔ کامران نے اس کے روبرو بیٹھ کر ایک روپیہ اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا پھر پوچھا۔ ”کیا بتاؤ گے؟“

بابا نے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔ لکیروں کی جانچ میں الجھ گیا۔ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تو لاوارث نہیں ہے۔“

یہ تو اسے معلوم ہو چکا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ اتنی بڑی دنیا میں وہ پہلا شخص تھا جو اسے بڑے یقین سے لاوارث نہیں کہہ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ”یہ تو میں جانتا ہوں۔ جب اس دنیا میں آیا ہوں تو کوئی میری ماں ہوگی، کوئی میرا باپ ہوگا۔ اپنے علم سے تم یہ بتاؤ کہ میرے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟“

”میرا علم یہ نہیں بتا سکتا۔ ہاں۔ یہ بتا رہا ہے کہ تُو جلد ہی ان سے ملے گا۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔“

بابا نے اس کی دلچسپی... دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دوسرا روپیہ دے۔ دوسری بات بتاؤں گا۔“

اس کا تجسس بڑھ گیا۔ فقیر بابا نے اس کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ [illegible] بڑی گالی

http://digestpk.blogspot.com

تھی۔ یہ بات اسے اندر ہی اندر کچوکے لگاتی رہتی کہ اتنی بڑی دنیا میں اس کا وجود حرام ہے... والدین کے ملتے ہی سارے داغ دھبے دھل جانے والے تھے۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بابا مسکرانے لگا۔ کامران نے پوچھا۔ ''مسکرا کیوں رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''جو کہوں گا، وہ تیرے لیے ناقابلِ یقین ہوگا لیکن سچ تو پھر سچ ہی ہے۔ تو کروڑوں کی جائداد کا مالک ہے۔''

اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ اس کی حالت قبر کے اس مُردے جیسی تھی، جو اپنا حال خود ہی جانتا ہے۔ اس کی جیب میں صرف چند سکے تھے اور وہ اُسے کروڑپتی ہونے کی نوید سنا رہا تھا۔

اب تک اس کی دونوں باتیں ہوائی تھیں۔ کامران کے نام کے ساتھ ایک فرضی ولدیت تھی۔ کیونکہ اس کے باپ کا پتا نہیں تھا۔ ماں بھی کہیں تاریکی میں گم تھی۔

اور وہ اسے کروڑپتی بننے کے سبز باغ دکھا رہا تھا۔ جو سڑک چھاپ نجومی ہوتے ہیں، وہ لوگوں کی ایسی ہی ضروریات اور خواہشات سے کھیلتے ہیں۔

اس نے کامران کے قہقہے کی پروا نہیں کی۔ اپنا ہاتھ پھیلا کر سوال کیا۔ ''لا تیرا سکہ... ایک اور اہم بات بتاؤں گا۔''

کسی حد تک سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ اسے بڑے حربے سے لوٹ رہا ہے۔ اس نے مزید کچھ دینے سے معذرت چاہی۔ اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''بس بابا! اور پیسے نہیں ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''تیری زبان سے جھوٹ اچھا نہیں لگتا۔ اگر تیری جیب میں ایک پیسہ بھی ہو تو خدا کا شکر ادا کر اور سچ بول دے۔ نہ دینا ہو نہ دے مگر جھوٹ کبھی نہ بول۔ آج کے بعد تیری جیب خالی نہیں رہے گی۔''

یہ بھی انسان کی کمزوری ہے۔ سب ہی چاہتے ہیں کہ ان کی جیب کبھی خالی نہ ہو۔ وہ فقیر بابا ایسی ہی کمزوریوں سے کھیل رہا تھا۔

وہ درست کہہ رہا تھا۔ کامران کی جیب خالی نہیں تھی۔ اسے دو روپے دینے کے بعد جیب میں آٹھ روپے رہ گئے تھے۔ وہ ابھی اور ایک روپیہ نکال سکتا تھا۔

اس نے ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بابا بولا۔ ''تیری زندگی میں ایک ہی چاہنے والی ہے۔ وہ تجھ سے بچھڑ گئی ہے۔''

اس نے گہری سانس لی۔ اس چاہنے والی کو اپنے اندر سویا۔ ''ہائے میری جانِ فروا! کہاں ہو تم...؟''

وہ ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد گئی تھی اور ایک مہینہ گزر چکا تھا، واپس نہیں آئی تھی۔ اس کے گھر والوں نے چال چلی تھی۔ اسے کامران سے دور کرنے کے لیے کہا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہے، مری اور ایبٹ آباد کی سیر کر کے واپس آجائے گی۔

مگر اب ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی نہیں آئی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ اسے جبراً وہاں روکا گیا ہے۔ اسی لیے وہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ''مجھے وہ کب ملے گی؟''

''ملے گی... بہت جلد ملے گی لیکن...''

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''لیکن کیا...؟ کیا پھر [illegible] پیدا ہوں گی؟''

''ہاں... ملتے رہو گے، بچھڑتے رہو گے لیکن شادی...''

اس نے بے قرار ہو کر جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن شادی کیا...؟ کیا شادی نہیں ہوگی؟''

''ہوگی مگر بہت ہی عجیب و غریب طریقے سے ہوگی۔ شاید ہماری دنیا میں ایسی شادی آج تک کسی کی نہیں ہوئی ہوگی۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''وہ شادی آخر کیسے ہوگی؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میری معلومات کے آگے اندھیرا ہے۔ نہ میں جانتا ہوں، نہ اس سلسلے میں کچھ بتا سکوں گا۔''

''تم نے اب تک جتنی باتیں بتائی ہیں، وہ سب ناقابلِ یقین ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ تمہارے کہہ دینے سے کوئی معجزہ نہیں ہوگا۔ میرے ماں باپ اچانک ہی کہیں سے پیدا نہیں ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ میں کروڑپتی بننے کا خواب دیکھتا ہوں، نہ مجھے تمہاری پیش گوئی سن کر خوشی ہو رہی ہے۔

اور تیسری بات... ایسا کون سا طریقہ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے میری شادی عجیب و غریب کہلائے گی؟ تمہاری ساری باتیں قصے کہانیوں جیسی ہیں۔''

بابا نے کہا۔ ''ہتھیلی آگے بڑھا...''

کامران نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے تین

روپے پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھے پھر اس کی مٹھی کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میری پہلی پیش گوئی درست ہو رہی ہے۔''

کامران نے وہ روپے اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں دی ہوئی رقم واپس نہیں لوں گا۔ ابھی میری جیب میں سات روپے ہیں۔ یہ خالی نہیں ہے۔''

اس نے روپے اپنی جیب میں رکھ کر پرانی کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تو جب بھی آئے گا، میں یہیں ملوں گا۔ میری پیش گوئی درست نہ ہوئی تو اپنے تین روپے واپس لے جانا۔''

اس نے اٹھ کر زمین پر بچھے ہوئے کپڑے کو تہ کیا اور اپنی کتابیں اٹھالیں۔ کامران نے کہا۔ ''میں نے تمہیں جھوٹا نہیں کہا ہے۔ تمہاری پیش گوئی کو قصے کہانیوں والی بات کہی ہے۔ تم شاید ناراض ہو گئے ہو؟''

وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ تھا۔ وہ بولا۔ ''میں ناراض نہیں ہوں۔ تیری بہتری چاہتا ہوں۔ آج کا دن تجھ پر بھاری ہے۔ بہتر ہے، ظہر کی نماز گھر میں پڑھ۔ مسجد نہ جا، باہر نہ نکل...''

''کیا مجھے کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے؟ ویسے میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔''

''دشمن اندھیروں سے نکلتے ہیں۔ جب تک روشنی میں نہیں آتے، پہچانے نہیں جاتے۔''

اس نے چونک کر کہا۔ ''ہاں۔ یاد آیا فروا... میری فروا کے باپ نے ایک بار غصے سے کہا تھا، اپنی اوقات میں رہو، میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ حرام موت مرو گے۔''

''آخر ایک دشمن نکل آیا نا؟ ابھی کہہ رہا تھا، کوئی عداوت کرنے والا نہیں ہے۔''

''اس کے باپ نے غصے سے دھمکی دی تھی۔ ورنہ وہ بہت سیدھا سادہ شریف آدمی ہے۔''

اچانک ہی ایک کار تیز رفتاری سے آئی اور ان کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ پھر وہ ہوا جس کی وہ توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اس کار سے تڑاتڑ دو فائر ہوئے۔ فقیر بابا کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ ایک سکے کی طرح اچھلا... سکہ اچھلنے کے بعد زندہ ہاتھوں میں آتا ہے مگر وہ موت کی مٹھی میں چلا گیا۔

اس کے ہاتھوں سے کپڑا اور کتابیں چھوٹ کر اُدھر اُدھر بکھر گئیں۔ وہ زمین پر گر رہا تھا۔ کامران نے اسے تھام کر آرام سے لٹایا۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ وہ کلمہ پڑھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی دم نکل گیا۔

دور و نزدیک سے کتنے ہی لوگ دوڑتے چلے آئے۔ ایک شخص فون کے ذریعے قریبی تھانے والوں کو واردات کے متعلق بتا رہا تھا۔ ایک آدمی کہہ رہا تھا۔ ''اس گاڑی والے نے نمبر پلیٹ پر کپڑا باندھ رکھا تھا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''میں گاڑیوں کو دور سے پہچان لیتا ہوں۔ وہ ٹویوٹا کرولا تھی۔''

تھوڑی دیر بعد پولیس آگئی۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔ کامران اور کئی چشم دید گواہوں نے تھانے جا کر اپنے اپنے بیانات لکھوائے۔

کامران کی آنکھوں کے سامنے اچانک ہی ایک قتل ہوا تھا۔ اس نے پہلے کسی کو گولی کھا کر اس طرح مرتے نہیں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو بالکل ہی گم صم سا ہو گیا۔

اسے یاد آرہا تھا کہ موت سے چند لمحے پہلے فقیر بابا نے کہا تھا، آج کا دن تجھ پر بھاری ہے۔ گھر سے باہر نہ نکل...

اس نے سوچا۔ ''تعجب ہے، اس نے میرے متعلق پیش گوئی کی تھی اور اپنے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ آج کا دن اس پر بھاری ہے۔''

اس نے افسوس کے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ نجومی بس کھانے کمانے والے ہوتے ہیں۔ دوسروں کو زندگی اور موت کا حال بتاتے ہیں۔ مگر... ان کی بے خبری میں موت انہیں پکڑ لیتی ہے۔''

اور اس بابا کی موت کیسے ہوئی تھی؟ وہ ایک فقیر تھا۔ کوئی اس کے لہو کا حساب کرنے والا نہیں تھا۔ کوئی یہ معلوم نہیں کرے گا کہ ایک قیمتی کار والے کو ایک بھکاری سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ وہ کیوں اسے گولی مارتا ہوا کہیں گم ہو گیا تھا؟

شاید وہ کبھی پکڑا نہیں جائے گا لیکن امیر کی بندوق سے غریب کا قتل اپنے پیچھے کئی چیختے ہوئے سوالات چھوڑ گیا تھا۔ کامران ان سوالات کے جواب معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا۔

کوئی بات تھی جو اسے بے چین کر رہی تھی۔ کیا یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ اس قتل کے پیچھے کیا راز ہے؟

ایک کنگال فقیر کے قتل کے پیچھے کوئی گہرا راز ضرور ہوگا۔ قانون کے محافظ بھی حیران ہوں گے۔ چشم دید گواہوں نے کہا تھا کہ گولیاں چلانے والا ٹویوٹا کرولا میں تھا اور اس فقیر کے پاؤں میں پھٹی ہوئی چپل بھی نہیں تھی۔

اچانک ہی کامران کی [illegible]

http://digestpk.blogspot.com/

کر کہا۔ ''وہ گولیاں فقیر بابا پر تھیں، اس پر چلائی گئی تھیں۔ نشانہ وہ تھا مگر گولیاں اس بے چارے کو لگ گئیں۔''

وہ چلتے چلتے ایک دیوار کے سائے میں رک گیا۔ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ ''ایک فقیر سے کوئی دشمنی کیوں کرے گا؟''

دوسرا سوال پیدا ہوا۔ ''اور ایک مہنگی کار والا مجھے کیوں قتل کرنا چاہے گا؟''

فوراً ہی جواب ملا۔ اس کی محبوبہ فردا کا پورا خاندان قیمتی کاروں اور عالیشان کوٹھیوں والا ہے۔

کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو...

اور اسی گھر سے دیوانے کو پتھر مارے گئے تھے۔ تقدیر اچھی تھی کہ نشانہ چوک گیا۔ پتھر کسی اور کو جا لگا۔

وہ دیوار کے سائے سے پھر دھوپ میں آ گیا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''کیا فردا کے باپ نے بخش دھمکی نہیں دی تھی؟ آج سچ مچ دھما کا کر دیا تھا؟''

''ہائے فردا! اگر یہ سچ ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے، میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اب ہمارا عشق آگ اور بارود سے کھیلنے والا ہے۔''

☆☆☆

وہ حسین بھی تھی اور دلنشین بھی۔ بلور جیسی جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ نام اس کا فردا جمال تھا۔ فردا کے معنی ہیں۔ ''آئندہ، پھر کبھی...'' یعنی طلب گاروں کو آج مل ہی نہیں سکتی۔ وہ وعدۂ فردا تھی۔ پھر کبھی ہاتھ آئے گی۔

وہ ماں باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ ضدی ایسی تھی کہ کسی جائز بات پر اڑ جاتی تو اسے منوا کر ہی رہتی۔ اس کے اور بھی بہن بھائی تھے۔ لیکن اس کے حسن اور ذہانت کے آگے سب ہی احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے تھے۔

چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد اس سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔

اس کی ممی نے کہا۔ ''ہمارے خاندان میں سب ہی خوبرو اسمارٹ لڑکے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کسی کو تو پسند کر لو۔''

وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ''یہ سب گھر کے مرغے دال برابر ہیں۔''

''تمہارا تو مزاج ہی نہیں ملتا۔ چلو گھر کے نہ سہی، باہر کے کسی خاندانی لڑکے کو پسند کرو۔ تمہاری شادی ہوگی تو دوسری بہنوں کی باری آئے گی۔''

''پلیز۔ میرا انتظار نہ کریں۔ میں اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہوں۔''

''لڑکیاں جیسا سوچتی ہیں، ویسا بر نہیں ملتا پھر جیسا بھی ملتا ہے، اس کے ساتھ گزارا کر لیتی ہیں۔''

''ممی! آپ جانتی ہیں، حالات مجھے مجبور کرتے ہیں اور نہ میں مجبور ہو کر حالات سے سمجھوتا کرتی ہوں۔''

''آئیڈیل مل چکا ہے یا ابھی تلاش کر رہی ہو؟''

''وہ ایک بار گورنمنٹ ہائی اسکول کے گیٹ پر دکھائی دیا تھا۔ میں قریبی جنرل اسٹور کے سامنے کار میں بیٹھی آئسکریم کے مزے لے رہی تھی۔ کسی نے اسے پکارا کامران...!''

وہ چپ ہو گئی۔ خیالوں میں کھو گئی۔ ماں نے پوچھا۔ ''وہ کون تھا؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا؟ تم نے اس سے بات کی تھی؟''

''اس روز تو میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ سوچ میں پڑ گئی کہ وہ سب سے الگ، سب سے اچھا کیوں لگ رہا ہے؟ وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح خوبرو اور اسمارٹ نہیں تھا۔ پھر بھی اچھا لگ رہا تھا۔''

اس نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ''میں گھر آ کر بھی اس کے خیالوں میں کھوئی رہی۔ پہلے کبھی دماغ میں کوئی اس طرح نہیں سمایا تھا۔ نیند آنے سے پہلے وہ کروٹ کروٹ میرے پاس آتا رہا۔ تب میں نے مان لیا کہ وہی میرا آئیڈیل ہے اور وہ صرف میرے لیے پیدا ہوا ہے۔''

ماں چپ چاپ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ ''دوسرے دن میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی کافی تگ و دو کے بعد پتا چلا کہ وہ یہاں مارک شیٹ لینے آیا تھا۔

''ہر ایک سے اس کا پتا پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ دوسرے دن میں یہاں سے بوڑھے ملازم کو ساتھ لے گئی۔ اسے سمجھایا کہ اسکول کے آفس میں جا کر اسے کیا کہنا ہے؟

اس نے اسکول کے آفس میں جا کر ہیڈ ماسٹر سے کہا کہ وہ کامران کا چچا ہے۔ بہت عرصے بعد گاؤں سے ملنے آیا ہے۔ اسے اپنے بھتیجے کا پتا چاہیے۔

یوں اس نے پتا معلوم کیا۔ میں اس ملازم کے ساتھ اس کے گھر تک آئی۔ پھر ملازم سے کہا کہ وہ جائے اور کامران کو بلا کر لائے۔''

اس کی ماں نے کہا۔ ''اس نے ابھی میٹرک کیا ہے اور تم کالج میں پڑھ رہی ہو۔ یقیناً وہ عمر میں تم سے کم ہوگا۔ کیا یہ فرق تمہیں اس کے بارے میں سوچنے سے روک نہیں رہا؟''

''نہیں ممی! مجھے وہ کم عمر نہیں لگا۔ پہاڑ جیسا تھا۔ اگرچہ جی بھر کر دیکھا نہیں ہے پھر بھی میرے حواسوں پر چھا گیا ہے۔''

ماں نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، بہت ہی غریب ہے۔ پھر وہ جس علاقے میں رہتا ہے وہاں مڈل کلاس لوگ رہتے ہیں۔ تم اس کے لیے اتنی باؤلی ہو گئیں کہ اس کے گھر تک پہنچ گئیں؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''دماغ ہی تو ٹھیک نہیں ہے ممی! آپ نے ایک بار اپنے عشق کی داستان سنائی تھی کہ کس طرح میرے پاپا کے لیے دیوانی ہو گئی تھیں۔ جبکہ پاپا خاندانی رئیس ہیں اور آپ بھگوان پورہ کے ایک کچے مکان میں رہتی تھیں۔''

ماں اسے گھور کر رہ گئی اور بولی۔ ''آنکھیں نہ دکھائیں۔ عشق پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ جو آپ نے کیا، وہ آپ کی بیٹی کر رہی ہے۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔ اب ہمارا اسٹیٹس ہمارا مان مرتبہ بڑھ گیا ہے۔''

''آپ میرا ساتھ دیں گی تو ہم کامران کو اپنی سطح پر لے آئیں گے۔''

''ہرگز نہیں۔ تم نچلی سطح کے ایک لڑکے کو شریکِ حیات بناؤ گی تو میری دو بیٹیوں کا کیا ہوگا؟ سب تھو تھو کریں گے۔''

''جو ایسا کرے گا، میں اس پر تھوک دوں گی۔''

ماں نے غصے سے کہا۔ ''میں آج تمہارے پاپا سے بات کروں گی۔ کہاں ہے وہ لڑکا...؟''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ''وہ اپنے گھر میں نہیں تھا۔ اس کی نانی نے بتایا، وہ ملازمت کی تلاش میں کراچی گیا ہے۔ پتا نہیں کب تک واپس آئے گا؟''

وہ آہ بھرنے کے انداز میں سانس لے کر بولی۔ ''چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اگر ایک اور مہینے وہ نہ آیا تو میں کراچی چلی جاؤں گی۔''

''کیا تمہارا دماغ خراب ہے؟ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔''

''وہاں آپ کی بڑی آپا، میری خالہ جان رہتی ہیں۔ وہ بھی مجھے بہو بنانا چاہتی ہیں۔ ابھی ایک کال کروں گی تو لینے آ جائیں گی۔''

ماں اسے باتیں سنانے لگی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس خاندان کے تمام لڑکے اور لڑکیاں آزاد خیال تھے۔ بزرگوں کی موجودگی میں بوائے فرینڈز اور گرل فرینڈز کے ساتھ ہنستے بولتے تھے۔

اس کے پاپا جمال جمشید نے سمجھایا۔ ''پاپا کی جان! وہ لڑکا اچھا لگتا ہے تو صرف دوستی کرو۔ اسے شریکِ زندگی بنانے کی غلطی نہ کرو۔''

فردا نے پوچھا۔ ''آپ نے ممی کو لائف پارٹنر بنانے کی غلطی کیوں کی ہے؟ آپ کی دولت عزت اور شہرت کے سامنے ممی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔''

''بیٹی! عورت پانی کی طرح ہوتی ہے۔ اسے جس برتن میں ڈالو اسی میں ڈھل جاتی ہے۔ لیکن وہ لڑکا ہے، ہمارے ماحول میں ڈھلنے کے باوجود مخمل میں ٹاٹ کا پیوند دکھائی دے گا۔''

''میں مخمل نہیں پہنوں گی۔ ٹاٹ پہن کر رہوں گی تو پیوند دکھائی نہیں دے گا۔''

''تم بچپن سے ایسی ہی ضدی ہو۔''

''اور آپ بچپن سے میری ضدیں پوری کرتے آئے ہیں۔''

وہ مسکرانے لگا۔ فردا آگے بڑھ کر باپ کے گلے لگ گئی۔ ماں نے کمرے میں آ کر دیکھا تو جل بھن کر رہ گئی۔ جمال سے بولی۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ نے بیٹی کی بات مان لی ہے؟''

وہ بولا۔ ''فریدہ! تم بھی مان جاؤ۔ میں اس لڑکے کو بہت بڑا بزنس سیٹ اپ دوں گا تو وہ ہمارے برابر کا ہو جائے گا۔''

''میں نے آپ کو سمجھایا تھا، اسے جواد کے لیے راضی کریں۔ میرے بھائی کا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔''

فردا نے کہا۔ ''اور میں جسے چاہتی ہوں، وہ ساری دنیا میں ایک ہے۔''

جمشید نے کہا۔ ''ویسے فردا! یہ عجیب سی بات ہے۔ تم کہہ رہی ہو، وہ لڑکا تمہیں جانتا نہیں ہے۔ اس بے چارے کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ تم اسے چاہنے لگی ہو اور اس کا انتظار کر رہی ہو۔''

فریدہ نے کہا۔ ''وہ کام دھندے کے لیے کراچی گیا ہے۔ اللہ کرے اسے نوکری مل جائے۔ پھر کبھی ادھر نہ آئے۔ کسی سے شادی کر کے وہیں رہ جائے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''فردا کے نقطۂ نظر سے یہ ایک بددعا ہے۔ لیکن ایک بے روزگار نوجوان کے لیے دعا ہے۔ فردا! تم جاؤ۔ میں تمہاری ممی کو سمجھا لوں گا۔''

وہ ماں کو دیکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں مسکرا

http://digestpk.blogspot.com/

ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

جمشید نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فریدہ کے پاس آکر دھیمی آواز میں بولا۔ ”میں نے بیٹی سے کہا ہے، جب وہ لڑکا آئے تو اسے میرے آفس بھیج دے۔ میں تنہائی میں اس سے بات کروں گا۔“

”آپ کیا بات کریں گے؟“

”اسے دھمکی دوں گا کہ وہ میری بیٹی سے دور چلا جائے۔ نہیں مانے گا تو اس کی زندگی مختصر ہو جائے گی۔“

فریدہ خوش ہوگئی۔ جمشید نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ ہم بڑی خاموشی اور رازداری سے اس لڑکے کو دودھ کی مکھی طرح نکال پھینکیں گے۔ فردا کو یہی تاثر دیں گے کہ اس کی پسند، ہماری پسند ہے اور ہم اسے داماد بنانے والے ہیں۔“

فردا کے بہت سے کزنز تھے۔ سب ہی اسے شریک حیات بنانا چاہتے تھے۔ ان میں ماموں زاد جواد اور پھوپھی زاد شمشاد اسے حاصل کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی جنونی ہو رہے تھے۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ کامران ان کے راستے سے نہیں ہٹے گا تو موت اسے ہٹا کر راستہ صاف کر دے گی۔

شمشاد نے کہا۔ ”اس کے بعد بھی ایک مسئلہ رہے گا۔“

جواد نے پوچھا۔ ”وہ کیا...؟“

وہ بولا۔ ”تم بھی فردا کو چاہتے ہو، میں بھی اس کی طلب سے باز نہیں آؤں گا۔ یوں ہم دونوں آج بھی ایک دوسرے کے رقیب ہیں، کل بھی رہیں گے۔“

”ہاں۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ ابھی ہم بھائی ہیں، دوست ہیں۔ کل دشمن بن سکتے ہیں۔“

شمشاد نے کہا۔ ”بہتر ہے، ہم دشمنی سے پہلے ہی دوست بن کر آپس میں سمجھوتا کر لیں۔“

”سمجھوتا تو یہی ہوگا کہ ہم میں سے کوئی ایک اس کی طلب سے باز آ جائے۔“

وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے ہوئے سوچنے لگے۔ پھر جواد نے کہا۔ ”سچ پوچھو تو مجھے فردا پر حیرت ہے۔ اس نے ایک کمتر جوان کو ہم پر ترجیح دی ہے۔ ہماری توہین کی ہے۔“

شمشاد نے کہا۔ ”یہی بات میرے دل میں بھی ہے۔ وہ ہمیں ٹھکرا کر باہر والے کو لفٹ دے رہی ہے۔ میں بھی اسے ٹھکرانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک بار حاصل کرنے کے بعد...“

”میں بھی انتقام لینا چاہتا ہوں مگر پہلے حاصل کروں گا۔ اس کی خوب صورتی ہر وقت بے کل رکھتی ہے۔“

”وہ ہماری کزن ہے۔ اپنے خاندان کی لڑکی کو اغوا نہیں کر سکتے۔ کبھی بات کھلے گی تو پورا خاندان ہمارا مخالف ہو جائے گا۔ اسے بڑی ہیرا پھیری سے حاصل کرنا ہوگا۔“

”جب کامران اس دنیا میں نہیں رہے گا تو وہ ہم میں سے کسی ایک سے شادی کے لیے راضی ہو جائے گی۔“

شمشاد نے کہا۔ ”فرض کرو، وہ مجھ سے شادی کر لیتی ہے تو کیا تم مجھ سے دشمنی کرو گے؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں۔ تم تو اسے اتقا[illegible] حاصل کر کے چھوڑ دو گے۔ طلاق دو گے تو میں اسے محبت سے ٹریپ کروں گا۔ اس سے شادی کروں گا۔ سہاگ رات مناؤں گا۔ پھر کسی اور کزن کے لیے طلاق دے دوں گا۔“ وہ انتہائی عیاری سے اپنے عزائم بتانے لگا۔

”اس مغرور لڑکی کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ جب وہ بازاری عورت کی طرح استعمال ہوتی رہے گی تو اس کا تمام غرور خاک میں مل جائے گا۔“

ایک انار سو بیمار... اور وہ تمام بیمار سازشی تھے۔ فردا بے خبر تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ اس کے کزنز رقابت کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ ناکامی کی صورت میں اغوا اور قتل جیسی واردات سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

وہ کم ظرف رشتے داروں سے بے خبر بڑے صبر و تحمل سے کامران کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ طے کر چکی تھی کہ وہ ایک ماہ کے اندر کراچی سے واپس نہیں آئے گا تو خود وہاں جائے گی۔ اپنی خالہ کے پاس رہے گی اور اسے تلاش کرے گی۔

ایک روز وہ کالج سے واپس آ رہی تھی کہ راستے میں کار خراب ہوگئی۔ اتفاق سے قریب ہی ایک گیراج تھا۔ وہ وہاں آئی تو دو چار پرانی گاڑیوں کے درمیان ایک شخص کی جھلک نظر آئی۔ وہ ایک گاڑی کے نیچے لیٹا اس کی مرمت کر رہا تھا۔

وہ گاڑی کے... قریب آ کے جھکتے ہوئے بولی۔ ”اے سنو! میری کار میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔ وہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ پلیز۔ چل کر دیکھ لو۔“

وہ بولا۔ ”دو کاریگر نماز پڑھنے گئے ہیں۔ کام زیادہ ہے۔ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔“

وہ بولی۔ ”کوئی بڑی خرابی نہیں ہے۔ پانچ دس منٹ میں ٹھیک کر دو گے۔“

”سوری۔ یہ کام چھوڑ نہیں سکتا۔ میں نے کہا نا، انتظار کریں۔“

وہ گاڑی کو لات مارتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم لیڈیز فرسٹ کا اصول نہیں جانتے؟ کیا عورتوں کی طرح منہ چھپا رہے ہو؟ باہر نکلو۔“

اس نے زمین پر کھسکتے ہوئے کار کے نیچے سے ایک ذرا سا سر نکال کر اسے دیکھا۔ پہلی نظر میں یوں لگا آسمان کی حور ہے، ابھی ابھی زمین پر آئی ہے۔

فردا اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ اگرچہ اس کے کپڑوں پر اور منہ پر کالک لگی ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے پہچان لیا۔ حیرانی سے کہا۔ ”ہائے کامران! یہ تم ہو؟“

وہ بڑے تعجب سے بولا۔ ”ہاں۔ میں ہی کامران ہوں۔“

وہ بہت خوش تھی۔ ہنس ہنس کر بتانے لگی۔ ”میں نے سفید بادلوں کے درمیان لوحِ مقدر پر تمہیں [illegible] دیکھا تھا۔ تم نے اپنا نام بتایا تھا اور کہا تھا، زمین پر آکر ڈھونڈو۔ پھر یہ پہچان بتائی تھی کہ تمہارے منہ پر کالک لگی ہوگی۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“

وہ گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ بولی۔ ”لڑکی کو دیکھ کر صورت نکھارو گے۔ حلیہ درست کرو گے۔ ابھی کہہ رہے تھے، کام بہت ہے۔ گاڑی کے نیچے سے نکل نہیں رہے تھے؟“

”تم نے مجھے کام چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تمہاری طرح میں نے بھی سفید بادلوں کے درمیان لوحِ مقدر پر تمہیں دیکھا تھا۔ تم نے اپنا نام بتایا تھا اور کہا تھا، گاڑی کے نیچے سے نکلو میں آ رہی ہوں۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”کیا تم نے مقدر کی تختی پر مجھے دیکھا تھا؟“

”ہاں، دیکھا تھا۔“

”کیا میں نے اپنا نام بتایا تھا؟“

”ہاں، بتایا تھا۔ تمہارا نام فردا جمال ہے۔“

یہ کہہ کر وہ گیراج کے ایک کمرے کی طرف جانے لگا۔ وہ حیرانی سے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ ”لوحِ مقدر والی بات مذاق تھی۔ اب مذاق ختم کرو۔ سچ بتاؤ، میرا نام کیسے جانتے ہو؟“

وہ واش بیسن پر جھک کر منہ ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔ ”پہلے تم بتاؤ، تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

وہ بتانے لگی کہ اسکول کے گیٹ پر اسے پہلی بار دیکھا تھا اور اس کا نام [illegible] سنا تھا۔ وہ اسے اچھا لگا۔ اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ اسے تلاش کرتی ہوئی اس کے گھر تک پہنچ گئی تھی۔

اس نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا میں ایسا ہوں کہ مجھ سے دوستی کرنے میرے دروازے تک آ گئیں؟“

”دوستی نہیں، محبت... مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا، نوکری کی تلاش میں تم کراچی گئے ہو۔“

”ہاں۔ مجھے ایک اچھی نوکری مل گئی تھی مگر وہاں دل نہیں لگا۔“

”یہاں میں دل لگا رہی تھی اس لیے وہاں دل نہیں لگا۔ دیکھو میں صاف اور سیدھی بات کرنے والی لڑکی ہوں۔ جو میرے دل میں ہوتا ہے، وہ زبان پر آ جاتا ہے۔ تم بہت اچھے ہو۔ میرے خیالی آئیڈیل سے لاکھ درجے بہتر ہو۔“

وہ منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس کی بے باکی اور صاف گوئی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اگرچہ یہ پہلی ملاقات ہے۔ مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ اب تم بتاؤ میں تمہیں کیسی لگی؟“

وہ تولیے سے منہ ہاتھ پونچھتے پونچھتے رک گیا۔ اسے بڑی محویت سے دیکھنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اچھی طرح دیکھ لو بعد میں کوئی عیب نکالو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں جو کام کرتی ہوں ڈنکے کی چوٹ پر کرتی ہوں۔ میرا خاندان دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اور میں اعلان کر چکی ہوں کہ تم میرے آئیڈیل ہو اور تم سے شادی کرنے والی ہوں۔“

وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لڑکی ہو یا طوفان میل؟ تمہیں یہاں آئے ہوئے پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ اتنی سی دیر میں تم نے مجھ سے محبت بھی کر لی اور شادی بھی کرنا چاہتی ہو۔“

”پندرہ منٹ...؟ نہیں کامران! میں تو جیسے صدیوں سے تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ چھ ماہ پہلے ایک بار تمہیں دیکھا تھا، تب سے بار بار دیکھنے کی تمنا دل میں مچلتی رہی۔ تم اس دنیا کی بھیڑ میں کہیں کھو گئے تھے۔“

وہ بڑے جذب سے بول رہی تھی اور وہ سحر زدہ سا ہو کر سن رہا تھا۔ فردا نے ذرا رک کر کہا۔ ”مگر اب میں تمہیں کہیں گم ہونے نہیں دوں گی۔ محبت کی ہے شادی بھی تم سے کروں گی۔ تم اسے میری ضد کہہ سکتے ہو مگر یہ میرے پیار کی شدت ہے۔“

”تمہیں یہ تو معلوم کرنا چاہیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا نہیں؟ میں تم سے شادی کروں گا یا نہیں؟“

”[illegible]“

http://digestpk.blogspot.com

قسمت کا نام کروں گی۔ تمہاری ہی لے چہرہ تکتے ہوئے زندگی گزار دوں گی لیکن تمہارے سوا کسی کا نام زبان پر نہیں لاؤں گی۔"

"نام...؟"

وہ چونک کر بولی۔ "ارے ہاں۔ تم نے بتایا نہیں، میرا نام کیسے جانتے ہو؟"

اس نے اپنی جیب سے اس کا شناختی کارڈ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "اس طرح تمہارا نام جانتا ہوں۔"

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "میرا آئی ڈی کارڈ تمہارے پاس کیسے آ گیا؟"

"تمہارے پرس کی زپ کھلی ہوئی ہے۔ وہاں گاڑی کے پاس یہ گرا ہوا تھا۔ پتا نہیں، راستے میں اور کیا کچھ گرا آئی ہو؟ اپنا پرس چیک کرلو۔"

اس نے پرس دیکھا۔ اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا پھر کہا۔ "یہ کارڈ اوپر ہی رکھا ہوا تھا اس لیے گر پڑا۔ باقی تمام چیزیں ہیں۔"

وہ پرس بند کرتے ہوئے بولی۔ "ارے ہاں۔ کارڈ سے یاد آیا۔ تم مجھ سے کچھ نہیں تو دو تین سال بڑے ہوگے۔ مگر ابھی تک اسکول میں پڑھ رہے تھے، کیا ہر کلاس میں دو دو سال گزارے ہیں؟"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم درست کہہ رہی ہو۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں لیکن میری غربت کی عمر مجھ سے بھی بڑی ہے۔ کبھی یہ پڑھنے کی اجازت دیتی تھی، کبھی تعلیم کا راستہ روک لیتی تھی اسی لیے اس عمر میں میٹرک کیا ہے۔"

"یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم نے ایسے حالات میں بھی تعلیم کو چھوڑا نہیں۔ دیر سے ہی سہی، میٹرک تو کرلیا۔"

پھر اس نے جائے نماز بچھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تمہاری گاڑی چیک کرتا ہوں۔ ذرا انتظار کرلو۔"

وہ ایک جگہ کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے ان لمحات میں ایسی خوشی اور آسودگی مل رہی تھی جو منزل کو پا لینے کے بعد ملتی ہے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ سب سے پہلے اسے اپنے پاپا سے ملائے گی۔ پھر ممی اور دوسرے رشتے داروں سے متعارف کرائے گی۔ لیکن...

وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگی۔ "آدمی اپنے لباس سے پہچانا جاتا ہے، اپنے پہناوے سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔"

اس نے ایک پرانا سا ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اپنے گھر والوں کو متاثر کرنے کے لیے اس کا حلیہ بدلنا ضروری تھا۔

وہ نماز کے بعد دعا مانگنے لگا۔ "یا خدا! میرے لیے بہتری فرما... تُو نے آسمان سے من و سلویٰ اتارا تھا۔ کیا میرے لیے یہ لڑکی اتاری ہے؟ یہ میرے دل کو لگ گئی ہے۔ لیکن میری اوقات سے بہت زیادہ ہے اور بہت زیادہ تُو ہی دیتا ہے۔ اگر یہ واقعی تیری رضا سے آئی ہے تو پھر میری زندگی میں رہے۔ واپس نہ جائے۔"

وہ اسے خوب نظر بھر کر دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ "اللہ کرے اس کا دل مجھ پر آجائے۔ نہیں آئے گا، تب بھی نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے آج تک جو چاہا ہے، وہ حاصل کیا ہے۔ اسے بھی حاصل کر کے رہوں گی۔"

وہ مصلا اٹھا کر اسے تہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نماز نہیں پڑھتی ہو؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ کامران نے پوچھا۔ "روزے رکھتی ہو؟"

وہ بولی۔ "جب کھانے کو مل رہا ہے تو بھوکے رہنا کونسی دانشمندی ہے؟"

کامران نے بڑے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کسی ڈاکٹر نے یا تمہارے گھر والوں نے یہ نہیں سمجھایا کہ کبھی پیٹ کو خالی رکھنا چاہیے، معدے کو آرام پہنچانا چاہیے؟"

"مجھے کبھی پیٹ کی کوئی بیماری نہیں ہوئی۔ ہمارے گھر میں پاپا کے سوا نہ کوئی روزہ رکھتا ہے نہ نماز پڑھتا ہے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "تعجب ہے۔"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ جو غریب محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں، انہیں مانگنے سے نہیں ملتا تو خدا سے مانگنے کے لیے روزے رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ ہماری ضرورتیں تو پلک جھپکتے ہی پوری ہو جاتی ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ تم مسلمان گھرانے میں پیدا نہیں ہوئی ہو؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میرے باپ دادا، پر دادا سب ہی مسلمان تھے اور ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں۔"

"پھر تو تمہارے مسلمان ہونے کی کوئی پہچان ہوگی؟"

وہ سوچنے لگی پھر سر جھٹک کر بولی۔ "یہ کیا بحث شروع کردی؟ تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"یہ بحث نہیں ہے۔ تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کر رہی ہو، شادی کرنا چاہتی ہو، میں تمہاری اسلامی شناخت چاہتا ہوں۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "ہمارے گھر میں قرآن مجید ہے۔ میرے دادا جب زندہ تھے، اسے پڑھا کرتے تھے۔ اب پاپا پڑھتے ہیں۔ وہ نمازی ہیں۔ پورے روزے رکھتے ہیں۔ تمام بچوں کو نماز پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ میری دو بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ وہ جمعے کی نماز پڑھتے ہیں۔"

"اور تم...؟"

"میں نہیں پڑھتی۔ اب یہ نہ پوچھنا، کیوں نہیں پڑھتی؟ میں جھوٹ نہیں بولتی۔ جو سچ ہے، وہ کہہ دیا۔"

"تم ایک اچھی مسلمان لڑکی بن سکتی ہو۔ کیونکہ جھوٹ نہیں بولتی ہو۔" پھر وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔ "چلو مجھے دکھاؤ، کار کہاں ہے؟"

وہ گیراج سے باہر آگئے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک ہنڈا کار کھڑی تھی۔ کامران اسے چیک کرنے لگا۔ وہ بولی۔ "تم ابھی میرے ساتھ چلو گے۔"

"گیراج میں بہت کام ہے۔ میں کہیں نہیں جاسکتا۔"

"یہ کام چھوڑ دو۔ پاپا تمہیں بزنس مین بنانا چاہتے ہیں۔"

"میں ان کا یہ احسان کیوں لوں؟"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ تم ان کے داماد بنو گے۔"

"یہ کس نے کہا؟"

"کیا...؟ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے؟"

اس نے محبت سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "تم بہت خوب صورت ہو۔ تمہاری طرف دل کھنچا جاتا ہے۔ لیکن..."

"جب میں خوب صورت اور پرکشش ہوں تو لیکن کیا...؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے کہا۔ "میری شریکِ حیات وہ ہوگی جو نماز پڑھتی ہو، دین کے تمام احکامات کی پابندی کرتی ہو۔"

"یہ تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ابھی کہو! میں ابھی نماز پڑھ سکتی ہوں۔"

"صرف دکھاوے کے لیے اور شادی کرنے کے لیے نہیں، دل سے نماز پڑھتی ہوگی۔"

"جب تمہیں دل دیا ہے تو دل سے پڑھوں گی۔ پوری سچائی سے عبادت کروں گی۔"

"کیا تم نے قرآن مجید پڑھا ہے؟"

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
اندھیری رات کے مسافر
325/-
ثقافت کی تلاش 150/-
قیصر و کسریٰ 380/-

اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
گمشدہ قافلے 350/-
داستان مجاہد 200/-
پردیسی درخت 325/-
یوسف بن تاشفین 325/-

معظم علی 325/-
خاک اور خون 350/-
کلیسا اور آگ 300/-
قافلہ حجاز 350/-
محمد بن قاسم 300/-
پورس کے ہاتھی 180/-

انسان اور دیوتا 280/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-
آخری چٹان 325/-
سو سال بعد 150/-
سفید جزیرہ 225/-
شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781
022-2780128
051-35539609
021-2765086
042-37220878
041-2627568

''بچپن میں نانی کے پاس رہتی تھی۔ ان سے ایک سپارہ پڑھا تھا۔ دو تین سورتیں زبانی یاد کی تھیں۔ وہ سب بھول گئی۔''

''تو پھر نماز میں کیا پڑھوگی؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''تم مجھے سورتیں یاد کرا دینا۔ میری یادداشت زبردست ہے۔ فٹافٹ یاد کرلوں گی۔''

وہ مطمئن ہوکر بولا۔ ''تمہارا یہ جذبہ دیکھ کر گیراج سے چھٹی لینی ہوگی۔ تم اپنی گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

''اسے ٹھیک کرکے تو جاؤ۔''

''معمولی سی خرابی تھی۔ دور ہوگئی۔''

وہ یوں تا ہوا چلا گیا۔ فروا اسے جاتے ہوئے یوں دیکھتی رہی، جیسے اس کی طرف کھنچی جارہی ہو۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ کار کی اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔

وہ ہنسنے بولنے اور میوزک کی دھن پر ناچنے گانے والی لڑکی تھی۔ اپنے آئیڈیل کے ساتھ لائف انجوائے کرنے والے بہت سے پروگرام بنا چکی تھی۔

اس نے سوچا تھا کامران کراچی سے آئے گا تو اسے جانے نہیں دے گی۔ اس کے ساتھ..... پیار بھری باتیں کرے گی اور بھرپور رومان پرور لمحات گزارے گی۔

لیکن وہ پہلی بار ملتے ہی نماز روزے اور دین ایمان کی باتیں کررہا تھا۔ فروا کو۔ یوں ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوش تھی۔ کیونکہ وہ بڑے انتظار کے بعد مل رہا تھا اور اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے لیے یہ بہت تھا کہ اس کی آرزو پوری ہورہی تھی۔ اس کا مطلوب، اس کا محبوب اسے مل گیا تھا۔ اب اس کے ساتھ رہنے والا تھا اور وہ طے کرچکی تھی کہ اس کے رنگ میں رنگ جائے گی۔

کامران جلد ہی واپس آگیا۔ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔ ''تم جہاں کہوگی چلوں گا لیکن عصر کی نماز کے وقت جدا ہوجاؤں گا۔''

''میں تو جدا نہیں ہوں گی۔ تم کسی بھی مسجد میں نماز پڑھ کر میرے پاس آجاؤ گے۔''

''اور تم...؟ تم نے نماز پڑھنے کا وعدہ کیا ہے۔''

''ہاں۔ مگر اتنی جلدی آیتیں یاد نہیں کرسکوں گی۔''

''ابھی آدھے گھنٹے میں دو آیتیں یاد کرلوگی۔ ایک سورۃ فاتحہ اور ایک بہت ہی مختصر سی آیت ہے سورۃ اخلاص۔''

''ٹھیک ہے یاد کرلوں گی لیکن نماز پڑھنے کے لیے گھر جانا ہوگا۔ غسل کروں گی، لباس تبدیل کروں گی پھر نماز پڑھوں گی۔''

''اچھی بات ہے۔''

اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں چلنا ہے؟''

''فی الحال انارکلی چلو۔ تمہارے لیے ایک درجن سوٹ، جوتے، جرابیں اور...''

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''تم میرے لیے کیوں خریدوگی؟''

''اس لیے کہ تم میرے ہوچکے ہو۔ مجھے حق پہنچتا ہے کہ تمہیں شہزادہ سلیم بنادوں۔''

''تم بھی میری ہوچکی ہو۔ میرا بھی فرض ہے کہ تمہیں انارکلی بنادوں۔''

''جب میرے پاپا تمہیں بزنس مین بنادیں گے، تب میں تم سے شاپنگ کے لیے لاکھوں روپے لیا کروں گی۔ ابھی مجھے اپنی خوشی پوری کرنے دو۔''

''جہاں تک تمہارے پاپا کے ذریعے بزنس مین بننے کا تعلق ہے، اس پر مجھے اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ میں کسی کا سہارا، کسی کا تعاون حاصل کرکے ہی اپنا بہتر مستقبل بہتر بنا سکتا ہوں۔ لیکن یہ مناسب ہے کہ تم مجھے شاپنگ کراؤ۔''

''میں تمہاری بات مان رہی ہوں۔ دینی احکامات پر عمل کروں گی۔ تمہیں بھی میری بات ماننی ہوگی۔''

اس نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ پہلے تم آیتیں یاد کرو۔ گھر جاکر نماز پڑھو۔ اس کے بعد شاپنگ ہوگی۔''

''اچھی بات ہے۔ مجھے پڑھاؤ۔''

وہ اسے سورۃ فاتحہ پڑھانے لگا۔ وہ پڑھتے پڑھتے بولی۔ ''یہ سورۃ تو نانی جان نے یاد کرائی تھی۔ تم ایک دو بار پڑھو، میں یاد کرلوں گی۔''

اس نے دو بار سورۃ پڑھائی۔ اس نے تیسری بار روانی سے سنا دی۔

کامران نے کہا۔ ''شاباش! تم نے مجھے خوش کیا ہے۔ خدا تم سے خوش ہوگا۔ اب اپنے گھر کا راستہ بتاؤ۔ وہاں پہنچنے تک سورۃ اخلاص بھی یاد کرلوگی۔''

اور یہی ہوا۔ اس نے اپنی کوٹھی کے قریب پہنچنے تک دو آیتیں اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ کامران نے کہا۔ ''اب تم یہاں سے ڈرائیو کرتی ہوئی گھر جاؤ۔ میں نماز پڑھنے کے بعد اس سامنے والی مسجد کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔''

وہ کار سے اتر گیا۔ فروا ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی کوٹھی کے پورچ میں آئی۔ اس کی ماں فریدہ بیگم دروازہ کھول کر باہر آرہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''اتنی دیر کہاں لگادی؟ مجھے چابی دو۔ میں ایک کام سے جارہی ہوں۔''

''سوری ممی! آپ پاپا کی گاڑی لے جائیں۔ مجھے نماز پڑھنے ہی جانا ہے۔''

ماں نے حیرانی سے چیخ کر پوچھا۔ ''نماز...؟ تم نماز پڑھوگی؟''

وہ جواب دیے بغیر تیزی سے کوٹھی کے اندر آئی۔ ماں تو حیران رہ گئی۔ اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی آئی۔ ''فروا! میں نے ٹھیک سنا ہے نا؟ تم نے نماز پڑھنے کی بات کی ہے؟''

''یس ممی! آپ کے کان بہت تیز ہیں۔ درست ہی سنا ہے۔''

فروا کا ماموں ایک کمرے سے نکل کر آرہا تھا۔ فریدہ نے کہا۔ ''بھائی جان! آج اس لڑکی کو کیا ہوا ہے؟ یہ نماز پڑھنے جارہی ہے۔''

ماموں جان نے پہلے حیرانی ظاہر کی پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں... یہ... یہ تو اچھی بات ہے۔ ہم نے نہیں پڑھی، ہماری بھانجی پڑھ رہی ہے۔ کیا ایسے وقت کوئی دستور ہے؟ میرا خیال ہے، دیگیں پکوائی جائیں۔''

فریدہ نے کہا۔ ''پتا نہیں، ایسے وقت کیا کرتے ہیں؟ آپ داتا دربار فون کریں۔ وہاں دیگیں پک جائیں گی۔''

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ وہاں جمال جمشید کسی سے فون پر بات کررہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سنتے ہیں جی!''

وہ ایک انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''چپ رہو۔ ضروری کال ہے۔''

''کیسے چپ رہوں؟ آج تو آپ کی لاڈلی نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھنے گئی ہے۔''

جمشید اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ اس نے بھی تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ ''نماز...؟ کیا فروا نماز پڑھ رہی ہے؟''

وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ فریدہ پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ باپ نے کمرے میں آکر دیکھا۔ بیٹی نہیں تھی۔ ماں نے باتھ روم کا دروازہ کھولنا چاہا، وہ بند تھا۔ اس نے کہا۔ ''غسل کررہی ہے۔ پاک صاف ہورہی ہے۔ کیا اسے وضو کرنا آتا ہے؟''

''نہیں آتا ہوگا تو میں سکھادوں گا۔ یہ باپ کی طرح نماز پڑھے گی۔''

موبائل فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ فریدہ نے اسے آن کرکے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے فروا کی پھوپھی نے کہا۔ ''بھابی جان! یہ اچانک کیسے ہوگیا؟ ابھی آپ کے بھائی جان نے فون پر بتایا ہے فروا نماز پڑھ رہی ہے؟ مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔''

''میں بھی حیران ہوں۔ ابھی اسے نماز پڑھتے دیکھوں گی، وہ کیسی لگتی ہے؟''

''بھابی جان! فوراً کیمرا نکالیں۔ اس کی تصویریں اتاریں۔ یہ ایک چونکا دینے والا موقع ہے۔ ہم رشتے داروں کو مٹھائی کے ساتھ اس کی تصویریں بھی بھیجیں گے۔''

''تم نے اچھا مشورہ دیا ہے۔ میں تصویریں اتار کر دبئی اور کینیڈا بھیجوں گی۔ ابھی بھائی جان نے داتا دربار کے لنگر خانے میں دیگیں پکوانے کا آرڈر دیا ہے۔''

''میں مغرب کے وقت آکر اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی، وہ نماز پڑھتی ہوئی کیسی لگتی ہے؟''

رابطہ ختم ہوگیا۔ جمشید نے پوچھا۔ ''کیا تم نے منت مانی تھی کہ بیٹی نمازی بن جائے؟''

''نہیں تو۔ میں نے کوئی منت نہیں مانی تھی۔''

''کیا ہمارے خاندان میں کوئی مرگیا ہے؟''

''خدا نہ کرے۔ کیوں کسی کے مرنے کی بات کررہے ہیں؟''

''اس لیے کہ تم دیگیں پکوا رہی ہو۔''

''اور کیا کرنا چاہیے؟ میری سمجھ میں جو آیا، وہی کررہی ہوں۔''

''ذرا عقل سے کام لوگی تو سمجھ میں آئے گا کہ بیٹی نماز پڑھ رہی ہے تو ماں کو بھی پڑھنا چاہیے۔''

''رہنے دیں۔ میری بات چھوڑیں اور.........

...اپنی دوسری اولادوں کو نصیحت کریں۔''

فروا غسل سے فارغ ہوکر باتھ روم سے باہر آئی تو باپ نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوچھا۔ ''کیا واقعی تم نماز شروع کررہی ہو؟''

''یس پاپا! کامران نے کہا ہے، میں نماز نہیں پڑھوں گی، دینی احکامات پر عمل نہیں کروں گی تو وہ شادی نہیں کرے گا۔ بس اب میں پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گی۔ رمضان کا مہینہ قریب ہے، پورے روزے رکھوں

http://digestpk.blogspot.com/

گی۔"

باپ نے بیٹی کی پیشانی چوم کر کہا۔ "سبحان اللہ! میں جانتا ہوں، تم ارادے کی پکی ہو۔ آئندہ دینی احکامات پر عمل کرتی رہو گی۔ کامران کو یہاں بلاؤ، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کل اس کے ساتھ آپ کے آفس آؤں گی۔ آج اس نے دو سورتیں یاد کرائی ہیں اور بتایا ہے کہ عصر کی نماز میں چار رکعت سنت اور چار رکعت فرض ادا کی جاتی ہیں مگر یہ پوچھنا بھول گئی کہ وضو کیسے کرتے ہیں؟"

"میں اپنی بیٹی کو سکھاتا ہوں... آؤ۔"

وہ دونوں واش روم میں آ گئے۔ فریدہ دروازے پر کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ باپ نے آج تک بیٹی کی ہر ضرورت پوری کی تھی۔ بہت کچھ دیا تھا اور آئندہ بھی دینے والا تھا لیکن دینی تعلیم نہیں دی تھی، وہ اب دے رہا تھا۔

اذان کے بعد باپ بیٹی نے ایک ہی کمرے میں نماز ادا کی۔ ایسے وقت فریدہ ان کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ماموں جان ڈیجیٹل کیمرے سے اس کی تصویریں اتار رہے تھے۔

فردا نے سلام پھیر کر مختصر سی دعا مانگی۔ "یا خدا! میں نادان تھی۔ کبھی تیرے سامنے سجدہ نہیں کیا۔ کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ پہلی بار مانگ رہی ہوں۔ کامران کو ہمیشہ کے لیے میری زندگی کا ساتھی بنا دے۔ آمین۔ یا خدا! ہماری شادی کرا دے۔ آمین۔"

وہ دعا مانگتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ باپ سے بولی۔ "پاپا! میں جا رہی ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں مغرب کے وقت آؤں گی۔ پھر آپ کے ساتھ نماز ادا کروں گی۔"

"مغرب کے بعد تو نہیں جاؤ گی نا؟"

"جاؤں گی۔ عشاء کے بعد نہیں جاؤں گی۔ کل صبح اس سے ملوں گی۔ پھر اسے آپ کے آفس ..... لاؤں گی۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی باہر پورچ میں آ کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کی دونوں بہنوں نے پوچھا۔ "ہائے آپی! ہم مارکیٹ گئے تھے۔ یہاں آتے ہی معلوم ہوا، آپ نماز پڑھنے لگی ہیں؟"

دوسری بہن فریال نے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"پاپا سے جا کر پوچھو۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ میں چاہوں گی، تم دونوں بھی میرے ساتھ نماز پڑھا کرو۔"

وہ کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی مسجد کے سامنے آئی۔ کامران اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گاڑی میں آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا نماز پڑھی ہے؟"

"ہاں۔ پاپا کے ساتھ پڑھی ہے۔ وہ بہت خوش ہیں۔ انہوں نے مجھے پیار کیا اور دعائیں دی ہیں۔"

وہ گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "میرے گھر میں تو تہلکہ مچ گیا ہے۔ ممی نے اور ماموں جان نے لنگر بانٹنے کے لیے دیگیں چڑھائی ہیں۔ نماز پڑھتے وقت میری تصویریں اتاری گئی ہیں۔ جو دوسرے رشتے داروں کے پاس بھیجی جائیں گی۔"

"گھر میں اور کسی نے نماز نہیں پڑھی؟"

"نہیں۔ وہ بس ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں منا رہے ہیں۔"

وہ بولا۔ "اسی طرح وہ روزے نہیں رکھتے ہوں گے مگر عید کی خوشیاں مناتے ہوں گے؟ جیسا کہ اکثر مسلمان کرتے ہیں۔"

"میں بھی یہی کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے پہلی بار نماز پڑھی ہے۔ کیا بتاؤں، کتنا اچھا لگ رہا ہے جب سجدے میں گئی تھی تو ایسا لگا، جیسے بدن کا سارا خون سجدہ کرنے کے لیے سر میں سمٹ آیا ہو۔ اگر پاپا ساتھ نہ ہوتے تو سجدے سے سر نہ اٹھاتی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔"

یہ کہتے ہی وہ رونے لگی اور گاڑی کو سائڈ میں کر کے روک دیا۔ کامران نے سرشار ہو کر پہلی بار اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "فردا! میں بہت خوش ہوں۔ ایسی روحانی خوشی آج تک کسی نے نہیں دی۔ ہمارے درمیان پوری سچائی سے محبت پنپ رہی ہے۔ ہم مسلمانوں کو ایسا ہی رومانس کرنا چاہیے۔"

وہ دوپٹے کا ایک کونا تھام کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں نے نماز قائم رکھنے کی نیت کی ہے تو تم مل رہے ہو۔ تم خدا کی طرف سے ملنے والا انعام ہو۔"

"میری ایک بات مانو، کل صبح شاپنگ کرو۔ ابھی باتیں کرتے کرتے نماز کا وقت ہو جائے گا۔"

"جو کہو گے، وہی کروں گی۔ فی الحال تمہارے پاس ایک موبائل فون ہونا چاہیے۔ عشاء کے بعد ہم بچھڑ جائیں گے تو فون پر بات کریں گے۔"

وہ دل سے مجبور ہو گیا تھا، انکار نہ کر سکا۔ اس کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ اس کی رس بھری آواز ہر وقت اس کے کانوں میں رس گھولتی رہے۔ بچھڑنے کے بعد بھی وہ اسے سنتا رہے۔

فردا نے ایک موبائل فون خرید کر اسے دیا۔ اس نے

کہا۔ "میں گھر جا کر اسے چارج کر لوں گا پھر رات گیارہ بجے کے بعد ہم باتیں کر سکیں گے۔"

"عشاء کی نماز آٹھ بجے ہوتی ہے۔ ایک گھنٹے میں بیٹری فل ہو جائے گی۔ ہم دس بجے سے پہلے بات کریں گے۔"

"تم نماز کے بعد اپنے پاپا سے مزید سورتیں پڑھو گی۔ انہیں ازبر کرو گی۔ مجھے فون پر سناؤ گی۔ پھر ہم پیار بھری باتیں کریں گے۔"

مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ کامران اسی طرح کوٹھی کے قریب بچھڑ کر مسجد چلا گیا۔ فردا گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا، اس شہر میں رہنے والے تمام رشتے دار عورتوں بچوں سمیت وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پھولوں کے ہار پہنانے لگے۔

وہ حیران ہو کر بولی۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

اس کی خالہ نے کہا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ڈرائنگ روم میں جا کر دیکھو۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو ہر سو رنگا رنگ غبارے دکھائی دیے۔ ایک بڑی سی میز پر کیک رکھا ہوا تھا۔ سب ایک ساتھ بول رہے تھے۔ "ہیپی ڈیلی نماز ٹو یو فردا، ہیپی ڈیلی نماز ٹو یو..."

وہاں جواد اور شمشاد کے علاوہ اور کئی طلب گار کزنز چپ کھڑے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ کامران کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے۔ ان کے ماں باپ بھی خوش نہیں تھے۔ اسے بہو بنانا چاہتے تھے اور وہ ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔

جمشید نے ان سب سے کہا۔ "کسی کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کامران کو ابھی داماد نہیں بنایا جا رہا ہے۔ ہم فردا کو پیار سے سمجھائیں گے۔ مجھے یقین ہے، وہ اپنی ضد سے باز آ جائے گی۔ جب مان جائے گی تو پھر کامران کا منہ بھی نہیں دیکھے گی۔"

وہ سب یہ سن کر کسی حد تک مطمئن ہو گئے کہ فریدہ اور جمشید معمولی لڑکے کو داماد بنانا نہیں چاہتے۔ مگر فردا کے طلب گار مطمئن نہیں تھے کیونکہ وہ کامران کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔

وہ تمام رقیب اپنی اپنی سوچ کے مطابق تصور کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ کامران ان کی چیز کو چھو رہا ہے، پکڑ رہا ہے، اپنی دھڑکنوں سے لگا رہا ہے اور پتا نہیں عشق و محبت کے کیسے کیسے مرحلوں سے گزر رہا ہے؟

وہ تمام رقیب چپ چاپ انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ لیکن خاموش رہنے والے نہیں تھے۔ کچھ کر گزرنے کے لیے بے چین و بے قرار تھے۔

وہ نماز سے فارغ ہوتے ہی گھر سے نکلنے لگی۔ اس کی چچی نے کہا۔ "کہاں جا رہی ہو؟ یہاں آؤ اور کیک کاٹو۔"

"ابھی واپس آتی ہوں، عشاء کی نماز کے بعد آپ لوگوں کے ساتھ انجوائے کروں گی۔"

اس نے کار اسٹارٹ کی۔ ماموں نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم اس لڑکے کی خاطر ہمیں نظر انداز کر رہی ہو۔"

اس نے جواباً خاموشی سے کار آگے بڑھا دی۔ رفتار تیز کرتی ہوئی احاطے کے گیٹ سے باہر نکل کے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ماموں اور پھوپھی جھنجلا کر رہ گئے۔

ماموں نے کہا۔ "یہ میری بہن کی بیٹی نہ ہوتی تو ایک ہی تھپڑ میں سیدھی کر دیتا۔"

پھوپھی نے کہا۔ "یہ میرے بھائی کی بیٹی نہ ہوتی تو میں اسے غنڈوں سے اٹھوا لیتی۔ ساری ناز نخرے اور غرور بھول کر قدموں میں پڑی رہتی۔"

چچی نے کہا۔ "سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ دن بھر اس لڑکے کے ساتھ رہی۔ کیا لڑکے کے گھر جاتی ہے؟ تنہائی میں وہ کیا کرتے ہوں گے؟"

"ایسی کوئی بات نہ کرو۔ سوچنے سے شرم آتی ہے۔"

چچی نے کہا۔ "اس کے ماں باپ کو بھی شرم آنی چاہیے۔ فریدہ بھابی تو روک ٹوک کرتی ہیں مگر جمشید بھائی نے اسے بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے، کیا عشاء کے بعد بھی وہ اس لڑکے سے ملنے جائے گی؟ جائے گی تو بس سمجھ لو، رات کالی کر کے آئے گی۔"

وہ اپنی اپنی فطرت اور مزاج کے مطابق رائے قائم کر رہے تھے۔ انتہائی شرمناک باتیں سوچنے کے باوجود اسے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے کیونکہ وہ کروڑوں کی جائداد جہیز میں لانے والی تھی۔

جب عشاء کے وقت وہ واپس آئی تو سب ہی اس پر تنقید کرنا بھول گئے۔ اس پر صدقے واری ہونے لگے۔ فردا نے نماز کے بعد ان کی خوشی کے لیے کیک کاٹا۔ ان کے ساتھ رات کا کھانا کھایا پھر تمام کزنز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں بہت تھک گئی ہوں۔ سونے جا رہی ہوں۔ پلیز کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔"

http://www.paksociety.com

بند کرلیا۔ دوپٹے کو اتار کر ایک طرف پھینکا۔ پھر کامران کے نمبر پنچ کرنے لگی، اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہائے فردا...!''

وہ مسکرا کے بولی۔ ''ہائے کامران...!''

اس نے کہا۔ ''الفاظ ہوں یا انسان... حالات کے مطابق بدل جاتے ہیں۔ یہ ہائے ماتم کرنے اور سینہ پیٹنے والی نہیں ہے۔ ابھی یہ ہائے ایک خوشبو ہے، جو پیار کرنے والوں کے دلوں سے نکلی ہے۔''

''اُف کامران! تم نے کتنی اچھی اور رومانٹک بات کہی ہے۔''

''عبادت کے وقت صرف عبادت، مشقت کے وقت صرف محنت اور محبت کے وقت صرف محبت ہونی چاہیے۔''

''ہاں۔ زندگی کو صرف ایسی ہی ترتیب سے گزارنا چاہیے۔ آئی لو یو کامران...!''

''آئی لو یو ٹو... تم میری زندگی کو ایک نئے موڑ پر لا رہی ہو۔ سوچ رہا ہوں، یہ تیار راستہ ہموار ہوگا یا پیچیدہ؟''

''کوئی پیچیدگی اور رکاوٹ نہیں ہوگی۔ پاپا میری خوشی میں خوش رہتے ہیں۔''

''بعض اوقات ہم جیسا سوچتے ہیں، ویسا نہیں ہوتا۔ خاص طور پر پیار کرنے والوں کے ساتھ تو ویسا کبھی نہیں ہوتا، جیسا سوچا جاتا ہے۔''

''کل پاپا سے ملاقات ہوگی تو تمہارے تمام اندیشے دور ہوجائیں گے۔''

دوسری طرف جمشید کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس نے بیٹی کو نماز کی طرف مائل ہوتے دیکھا تو مصلحتاً کامران سے ملاقات کرنے پر بیٹی کو نہیں روکا۔ یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ لڑکا نیک اور دیندار ہے، حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔

یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی موٹر گیراج میں کام کرتا ہے اور کہیں کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ یعنی کوٹھی کے ملازموں سے بھی گیا گزرا تھا۔

اگر بیٹی کہتی کہ کامران کو کاروبار کرنے کے لیے دس پندرہ لاکھ روپے دیے جائیں تو وہ دے دیتا لیکن بیٹی نہیں دے سکتا تھا۔

اگر ایک غریب آدمی جان پر کھیل کر امیر آدمی کی جان بچائے تو وہ اسے منہ مانگا انعام دیتا ہے، اسے داماد بنا کر بھی اونچی سطح پر نہیں لاتا۔

معاشرے میں رائج طبقاتی تقسیم کو مثل سمجھا جاتا ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں آتی۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ کوئی اپنی حیثیت سے اوپر نہ آئے۔ خاندانی برتری کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی کمتر کو اپنے خاندان میں شامل نہ کیا جائے۔

یہ انسانی سوسائٹی کے اصول ہیں۔ جمال جمشید ان اصولوں کے خلاف نچلے طبقے کے ایک جوان کو داماد نہیں بنا سکتا تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی دیندار اور عبادت گزار کیوں نہ ہو۔

دوسرے دن کامران فردا کے ساتھ اس کے آفس میں آیا۔ فردا نے باپ سے اس کا تعارف کرایا۔ باپ نے بظاہر مسکرا کے اس سے مصافحہ کیا۔ اسے طنزیہ انداز میں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ وہ فردا کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کرتے ہو؟''

''ایک موٹر گیراج میں کام کرتا ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''پھر تو بہت بڑا کام کرتے ہو۔''

''جی ہاں۔ جب آپ کی گاڑیاں چلنے سے انکار کردیتی ہیں تو میں ہی انہیں چلنے اور دوڑنے کے قابل بناتا ہوں۔ انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے آگے بڑھتے رہنے کے راستے ہموار کرتا رہے۔''

''باتیں اچھی کرلیتے ہو۔ تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟ کیا نام ہے ان کا...؟ میں تمہارا خاندانی شجرہ دیکھنا چاہوں گا۔''

اس نے ایک نظر فردا پر ڈالی پھر جمشید کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے والدین کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میری دایا نانی نے میری پرورش کی ہے۔''

''کیا تمہاری نانی نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارے والدین کون تھے؟''

''وہ بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتیں۔''

''اچھا۔ تمہاری تو بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چلو... یہ بتادو، تم دنیا میں کیسے آئے؟''

کامران نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں چاہوں تو ابھی جھوٹ بول سکتا ہوں کہ والدین بچپن میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میری نانی نے میری پرورش کی۔ پھر میں ایک شاندار فرضی تجرہ بنا کر پیش کروں تو آپ تسلیم کرلیں گے۔''

جمشید نے کہا۔ ''سچ بولو گے تو میں تمہاری عزت کروں گا۔''

''سچ یہ ہے کہ میں اپنے والدین کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ نانی مجھے کہیں سے لائی تھیں۔''

''کہیں کا کیا مطلب؟ کسی کچرا گھر سے یا یتیم خانے

سے...؟''

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔ وہ مجھے ایسی ہی کسی جگہ سے لائی ہوں گی۔''

فردا اس کی باتیں سن رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کامران! یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''جو سچ ہے، وہ کہہ رہا ہوں۔ تم نے نماز شروع کی ہے۔ کسی حال میں بھی جھوٹ نہ بولو۔ سچ بولو گی تو تمہاری نمازیں بھی سچی ہوں گی۔ خدا کو راضی رکھو، بندوں کی پروا نہ کرو۔''

وہ باپ سے بولی۔ ''پاپا! آپ نے کہا ہے، کامران سچ بولے گا تو آپ اس کی قدر کریں گے۔''

''بے شک۔ ایسی باتیں سب چھپاتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے ایسے کتنے لوگ ہیں جو جھوٹ بول کر معزز بن کر ہمارے درمیان رہتے ہیں۔ میں مانتا ہوں یہ سچا اور کھرا ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''آئی لو یو پاپا...!''

جمشید نے کہا۔ ''میں کاروبار کرنے کے لیے اسے ابھی دس لاکھ روپے دوں گا۔ اس سے بھی زیادہ دوں گا مگر معذرت چاہتا ہوں... اسے رشتے دار نہیں بنا سکتا۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

جمشید نے کہا۔ ''یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔''

''نو پاپا! پہلے آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔''

وہ کامران سے بولا۔ ''یہ بہت ضدی ہے۔ تم ہماری خاندانی نیک نامی کو، ہمارے اسٹیٹس کو سمجھو اور اسے سمجھاؤ۔''

اس نے کہا۔ ''اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ فردا کو اپنی محبت سے باز رکھوں تو یہ میرے لیے اتنا ہی مشکل ہے، جتنا آپ کے لیے ہے۔''

''تم مجھ سے بیس لاکھ روپے لو۔ یہ تمہاری سچائی اور شرافت سے خوش ہو کر دوں گا۔ تم اس کی زندگی سے کہیں دور چلے جاؤ۔''

''میں لاکھوں روپے تو کیا، سارے جہاں کی دولت کے بدلے بھی فردا سے بیوفائی نہیں کروں گا۔''

''میں اسے عاق کردوں گا۔ اپنی دولت اور جائداد سے ایک ٹکا بھی نہیں دوں گا۔ یہ خالی ہاتھ تمہارے پاس آئے گی تو اسے کیا کھلاؤ گے کیا پہناؤ گے؟''

''میں آج تک آپ کی دولت کے بغیر زندہ رہا۔ آئندہ، آپ کی بیٹی کو بھی زندہ رکھوں گا۔''

فردا نے کہا۔ ''سن لیا آپ نے؟ میرا انتخاب کتنا ٹھوس ...اور نا قابل شکست ہے؟ آپ کی اطلاع کے لیے کہہ دوں کہ میرے بینک اکاؤنٹ میں تقریباً بیس لاکھ روپے ہیں۔ ہم دونوں کچھ روز پیار محبت سے جی لیں گے۔''

''تم ابھی تک کھڑی ہوئی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی بات ختم نہیں ہوئی ہے۔''

وہ پھر کامران کے پاس بیٹھ گئی۔ جمشید نے کہا۔ ''فردا! تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم جانتی ہو، اپنی اولادوں میں میں تمہیں سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں پاپا...!''

''میں نے تمہیں عاق کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اسے دل پر نہ لو۔''

''کوئی بات نہیں پاپا! آپ نے غصے میں کہہ دیا تھا۔''

''میں بری طرح الجھ گیا ہوں۔ تمہاری خاطر مجھے ہوی سے، بہنوں سے، بھائیوں سے اور ان کی جوان اولادوں سے جنگ کرنی ہوگی۔''

پھر اس نے کامران سے کہا۔ ''میرے خاندان میں کچھ سر پھرے لوگ ہیں۔ جب وہ ناکام ہوں گے تو تمہاری زندگی مختصر کردیں گے۔''

''یہ زندگی تو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ وہ جب چاہے گا، جس طرح چاہے گا... لے لے گا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔''

فردا نے کہا۔ ''پاپا! میں آپ کی الجھنوں کو سمجھ رہی ہوں۔ کچھ بھی ہو آپ کو میری خاطر یہ جنگ لڑنی ہوگی۔''

''تم میری ایک بات مانو گی تو ضرور تمہارے لیے فائٹ کروں گا۔''

''میں ضرور مانوں گی۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''تم دونوں دو ہفتے تک ایک دوسرے سے نہ ملو۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟''

''تم کامران سے نہیں ملو گی تو گھر میں ٹینشن پیدا نہیں ہوگی۔ تم میرے ساتھ رہ کر اپنی بات منواؤ گی۔''

کامران نے کہا۔ ''تمہارے پاپا درست کہہ رہے ہیں۔ صرف دو ہفتے کی بات ہے۔ فون کے ذریعے ہماری آدھی ملاقات ہوتی رہے گی۔''

''مگر دو ہفتے تو بہت ہوتے ہیں۔''

''اگر ہم فون پر باتیں نہ کریں۔ ایک دوسرے سے کٹ کر رہ جائیں تو دو ہفتے پہاڑ لگیں گے لیکن ہمارے پاس فون کی سہولت ہے۔ پلیز، اپنے پاپا کی بات مان لو۔''

http://digestpk.blogspot.com

وہ جمشید کے پاس آ کر بیٹھ گئی پھر بولی۔ ”میں آپ کی بات مان رہی ہوں۔ دو ہفتوں تک گھر سے نہیں نکلوں گی۔ مگر آج مجھے آزادی دیں۔“

باپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ جاؤ مگر عشاء سے پہلے گھر آ جانا۔“

”آل رائٹ پاپا...!“

وہ باپ کے گال کو چوم کر وہاں سے اٹھ گئی اور کامران کے ساتھ آفس سے باہر آ گئی۔ اس نے کہا۔ ”میں پاپا کی مشکلات کو سمجھ رہی ہوں۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہیں کہ کس طرح میرا ساتھ دیں گے؟“

وہ اس کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ”سچ بولنا اچھا ہے۔ لیکن تم نے اپنی پیدائش کے متعلق سچ بول کر پاپا کو الجھا دیا ہے۔ یہ بات دوسروں کو معلوم ہوگی تو تمام رشتے دار کھل کر اعتراض کریں گے۔ خاندان کے تمام بزرگ پاپا کی ہر بات مانتے ہیں۔ مگر یہ کبھی نہیں مانیں گے کہ ایک لاوارث کو اپنے خاندان میں شامل کیا جائے۔“

کامران نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بعض اوقات سچ بولنے سے بنتے ہوئے کام بگڑ جاتے ہیں اسی لیے لوگ سچ بولنے سے ڈرتے ہیں۔ ہمارا ابھی کام بگڑ سکتا ہے۔ لیکن ہمیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ ہم بچھڑ جائیں گے، کبھی مل نہیں پائیں گے۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”میں مر جاؤں گی۔“

”مرنے والوں کو خدا بھی خودکشی سے نہیں روکتا۔ حوصلے سے جیتی رہوگی تو ہمارے حصے کی خوشیاں ہمیں ضرور ملیں گی۔“

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ”اصل بات ہے اللہ پر کامل اعتماد رکھنا۔ اگر وہ بگاڑتا ہے، آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو کبھی کامیابی اور کامرانی بھی عطا کرتا ہے۔“

”یہ دو ہفتے پہاڑ جیسے لگ رہے ہیں۔ میں تم سے جدا ہو کر کیسے وقت گزاروں گی؟“

”نمازیں پڑھو اور استغفار کرتی رہو اور اپنی نمازوں کو قبولیت کے مقام تک پہنچانے کے لیے سچ بولتی رہو۔ فون کے ذریعے ہماری نصف ملاقاتیں جاری رہیں گی۔ کسی بھی مصیبت کی گھڑی میں ایک کال کرو گی تو میں دوڑا چلا آؤں گا۔“

کامران نے عشاء سے پہلے اپنے گھر کے قریب آ کر کار روک دی۔ فردا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔

کار جہاں رکی تھی، وہاں ذرا دور تک تاریکی تھی۔ فردا نے کہا۔ ”میں تمہاری بات مان کر جدائی برداشت کرنے والی ہوں۔ مجھے اتنا پیار کرو، اتنا پیار کرو کہ میں دو ہفتوں تک اسی سحر میں ڈوبی رہوں۔“

”ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے ہیں۔ نکاح سے پہلے یہ بھی مناسب نہیں ہے۔ ابھی تاریکی میں تنہائی میں مجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں۔ انہوں نے ایسی ہی تنہائی میں دینی احکامات کے خلاف جذباتی غلطی کی ہوگی جس کے نتیجے میری ولادت ہوئی۔ ہمیں دوسروں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔“

وہ اس کے ہاتھ پر اپنا چہرہ رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم بہت اچھے ہو۔ تم نے اپنے والدین کی مثال دے کر اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہمیں ایسی کوئی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ میں تم پر فخر کرتی ہوں۔“

وہ تھوڑی دیر تک پیار بھری باتیں کرتے رہے پھر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ گھر واپس جاتے ہوئے رو رہی تھی۔ اندیشے رلاتے ہیں کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا ہے؟ ان لمحات میں جدائی کلیجہ نوچ رہی تھی کہ پھر نہ جانے کب ملاقات ہوگی؟

اس رات عشاء کی نماز کے بعد جمال جمشید نے خاندان کے تمام افراد کو ڈرائنگ روم میں بلایا اور ان سے کہا۔ ”آج میں نے کامران سے ملاقات کی تھی۔ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا وہ نوجوان موٹر گیراج میں کام کرتا ہے۔ اسے میری فردا لائف پارٹنر بنانا چاہتی ہے۔“

اس کے کئی کزنز نے کہا۔ ”شیم... شیم... شیم...“

بزرگوں نے کہا۔ ”یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ فردا کو اپنے خاندان کی اونچی حیثیت اور نیک نامی کا خیال رکھنا چاہیے۔“

اس کی پھوپھی نے کہا۔ ”بھائی جان! آپ بیٹی کو سمجھائیں۔“

”ابھی میں خود کو سمجھا رہا ہوں کہ مجھے بیٹی کی پسند کو پسند کرنا چاہیے یا نہیں...؟“

فریدہ نے کہا۔ ”یعنی وہ لڑکا آپ کو پسند نہیں ہے اور پسند بھی ہے۔“

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں۔ یہی بات ہے۔“

”اس میں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے کہ اسے پسند کیا جائے۔“

”درست کہتی ہو۔ اس کا کوئی خاندان نہیں ہے۔ کوئی شجرہ نہیں ہے۔ ماں باپ لاپتا ہیں۔“

پھوپھی نے کہا۔ ”توبہ توبہ۔ یعنی وہ لاوارث ہے۔ پتا نہیں کیسے پیدا ہوا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟“

رشتے داروں کی بھیڑ میں کہیں سے آواز آئی۔ ”نہ جانے کس کی اولاد ہے۔“

فردا اچھل کر کھڑی ہو گئی اور غصے سے بولی۔ ”اگر کسی نے اس کے بارے میں غلط بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

باپ نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ”میں نے تمہیں سمجھایا تھا، کچھ نہیں کہو گی۔ غصہ برداشت کرو گی۔ آرام سے بیٹھو۔ مجھے بات کرنے دو۔“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ باپ نے پھر سمجھایا۔ ”بالکل نہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کہو گی۔ چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔“

جمال جمشید نے تمام رشتے داروں پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہمیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لاوارث ہے؟ اگر وہ سچ نہ بولتا اور ایک خاندانی شجرہ بنا کر لے آتا تو ہم دھوکا کھا جاتے۔ اسے ایک اعلیٰ خاندانی لڑکا تسلیم کر لیتے۔“

وہ سب خاموش رہے۔ جمشید نے کہا۔ ”یہ سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ ہم جھوٹ پر ایمان لاتے ہیں۔ فریب کھا کر خوش رہتے ہیں۔ میرا ایمان کہتا ہے، ایک سچے نوجوان کی قدر کرنی چاہیے۔“

فریدہ نے پوچھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ قدر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسے اپنی بیٹی دے دیں۔“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ ہم ایک سچے ایماندار کی تمام ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں لیکن اسے داماد نہیں بنا سکتے۔“

پھر اس نے بیٹی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کیا کیا جائے؟ میری بیٹی اسے چاہتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے بھی متاثر کیا ہے۔“

ماموں جان اٹھ کر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ جمشید نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ ”ابھی میں کشمکش میں ہوں۔ اگر وہ واقعی لاوارث ہے تو اسے فردا کے لیے کیسے قبول کروں؟“

اس نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ”میں نے صحابہ اور اولیا کرام کے اقوال میں کہیں پڑھا ہے کہ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو سمجھ بن کر فیصلے میں جلدی نہ کرو۔ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت لو اور علمائے دین کے علم و عقل سے استفادہ کرو۔

میں نے فردا اور کامران سے دو ہفتے کی مہلت لی ہے۔ اس عرصے میں سوچوں گا، سمجھوں گا اور ایک لاوارث کے سلسلے میں علمائے دین سے فتویٰ حاصل کروں گا۔

اگر فتویٰ کامران کے خلاف ہوگا تو فردا میری بات مانے گی اور کامران کو لائف پارٹنر بنانے سے باز رہے گی۔

اگر فتویٰ کامران کے حق میں ہوگا میں کھلے دل سے اسے اپنا داماد بنا لوں گا۔“

فریدہ نے کہا۔ ”میں تو کبھی اسے داماد تسلیم نہیں کروں گی۔“

”اگر تم علمائے دین کا فتویٰ تسلیم نہیں کرو گی تو میں تمہیں اپنی زوجہ تسلیم نہیں کروں گا۔ تم میرے نکاح سے خارج ہو جاؤ گی۔“

فریدہ فوراً ہی سر پر آنچل رکھ کر توبہ توبہ کرنے لگی۔ یہ ایسی بات تھی کہ اس کے بعد کوئی کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے وہاں سے اٹھ گئے۔

اس دن کے بعد سب ہی منتظر تھے کہ دیکھیں دین کے حوالے سے کیا فیصلہ سنایا جائے گا؟ وہ تمام رشتے دار بھی اپنے اپنے طور پر علمائے دین سے رجوع کرنے لگے۔ ان سے تحریری فتویٰ حاصل کر رہے تھے۔

کئی علمائے کرام نے متفقہ طور پر کہا تھا کہ کامران اپنے والدین سے کیسے بچھڑ گیا؟ پیدائش کن حالات میں ہوئی؟ اس بات کی صحیح تحقیقات کی جائیں۔

کسی ثبوت کے بغیر اسے ناجائز کہنا مناسب نہیں ہے اور اگر وہ ناجائز ہے تو بے قصور ہے۔ گناہ گار اس کے والدین ہیں۔

جبکہ وہ دیندار ہے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے، ہر حال میں سچ بولتا ہے تو وہ قابل قدر ہے۔ ہمیں اسے عزت دینی چاہیے۔

چونکہ وہ سچا اور عبادت گزار تھا اس لیے فتویٰ اس کے حق میں تھا۔ تمام رشتے دار مایوس ہو گئے لیکن جواد اور شمشاد مایوس ہونے والے نہیں تھے۔

انہوں نے اپنے والدین سے کہا۔ ”آپ فریدہ آنٹی کو راضی کریں کہ وہ فردا کو اسلام آباد اور مری لے جائیں۔ آپ سب بھی ان کے ساتھ جائیں۔ ہم وہاں اپنا کام دکھائیں گے۔“

پھوپھی نے پوچھا۔ ”کیا ارادے ہیں تمہارے؟ اگر پکڑے گئے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟“

ماموں جان نے کہا۔ ”بھائی جان کے تعلقات اور... تک ہیں۔ وہ انہیں الٹا لٹکا دیں گے۔“

http://digestpk.blogspot.com/

شمشاد نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ نہ ہمیں کوئی پہچانے گا، نہ ہم پکڑے جائیں گے۔''

جواد نے کہا۔ ''ہم آپ سب کے ساتھ وہاں نہیں جائیں گے۔ آپ سے پہلے ہی مری پہنچ جائیں گے لیکن فریدہ آنٹی اور فردا کی نظروں میں نہیں آئیں گے۔''

شمشاد نے کہا۔ ''ہم نے خوب سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کی ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔''

پھوپھی، ماموں اور چچی نے مل کر فریدہ کو پہاڑی علاقے میں جانے کے لیے راضی کرلیا۔ فریدہ نے بیٹی سے کہا۔ ''تمہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے اپنے مجازی خدا سے اجازت ملے گی تو ضرور جاؤں گی۔''

ماں نے جل کر کہا۔ ''نکاح کے بغیر وہ تمہارا مجازی خدا کیسے ہوگیا؟''

''وہ دل کے رشتے سے میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میں ابھی ان سے اجازت لیتی ہوں۔''

اس نے فون کے ذریعے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''ہائے کامران! آپ کیسے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''میں تو ٹھیک ہوں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم مجھے تم کے بجائے آپ کہہ رہی ہو!''

''بات یہ ہے کہ ممی سامنے بیٹھی ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے، میں اپنے ہونے والے مجازی خدا کا احترام کرتی ہوں اور آپ کہہ کر مخاطب کرتی ہوں۔''

فریدہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''ہمارے گھر والے اسلام آباد اور مری کی سیر کے لیے جارہے ہیں۔ کیا میں ان کے ساتھ جاؤں؟''

''تمہیں ضرور جانا چاہیے۔ تم نے پاپا سے وعدہ کیا ہے کہ دو ہفتے تک گھر سے باہر نہیں نکلو گی۔ لیکن اپنے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ باہر کی کھلی فضا میں کچھ روز رہنا چاہیے۔''

''پاپا کاروباری مصروفیات کے باعث نہیں جاسکیں گے۔ میں صرف ایک ہفتے کے لیے جاؤں گی۔ تب تک پاپا کی دو ہفتے والی شرط بھی ختم ہوجائے گی۔ میں سیدھی آپ کے پاس آؤں گی۔''

''اور میں بے چینی سے تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔''

''ذرا حساب کریں، وہ دوسرا ہفتہ کس روز ختم ہوگا؟ میں تھوڑی دیر بعد فون کرتی ہوں۔''

وہ رابطہ ختم کرکے بولی۔ ''ٹھیک ہے ممی! میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

وہ منہ بنا کر وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ''اونہہ۔۔۔ میرے کہنے سے نہیں جارہی ہو۔ نہ رشتہ نہ ناتا، نہ جورو نہ شوہر۔ ابھی سے جورو بننے کے چوچلے کررہی ہو۔''

فردا مسکرا کر رہ گئی۔ دوسری صبح وہ سب اپنی اپنی کاروں میں وہاں سے روانہ ہونے والے تھے۔ جمشید نے عشاء کی نماز کے بعد بیٹی سے کہا۔ ''پچھلی رات میں نے خواب میں تمہیں دیکھا ہے۔۔۔ تب سے پریشان ہوں۔''

''ایسا کیا خواب دیکھا تھا؟''

''تم کہیں بھی بے جا میں ہو۔ کمرے کا دروازہ کھولنا چاہتی ہو مگر وہ باہر سے بند ہے۔''

''اگر آپ کا خیال ہے کہ مجھ پر کوئی مصیبت آسکتی ہے تو میں نہیں جاؤں گی۔''

''نہیں بیٹی! تم پچھلے ایک ہفتے سے یہاں کی چار دیواری میں قید ہو۔ تمہیں کھلی فضا میں سانس لینا چاہیے۔ پوری فیملی کے ساتھ خوب انجوائے کرنا چاہیے۔''

وہ جائے نماز سے اٹھ کر الماری کے پاس جاتے ہوئے بولا۔ ''تم ضرور جاؤ لیکن محتاط رہنا۔''

فردا نے دونوں مصلوں کو اٹھا کر تہ کیا۔ پھر انہیں ایک جگہ رکھ کر باپ کے پاس آئی تو چونک گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا۔ وہ اسے بیٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اسے چھپا کر رکھو۔ کسی کو پتا نہ چلے۔ خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہو۔ مگر اسے کسی بھی برے وقت کے لیے اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔''

اس نے کمرے میں آکر پستول کو اپنے اٹیچی میں رکھا پھر دوسری صبح جانے سے پہلے اسے لباس کے اندر چھپالیا۔

وہاں سے چھ کاروں میں وہ قافلہ روانہ ہوا۔ انہوں نے اسلام آباد پہنچ کر ایک دن اور ایک رات گزاری۔ پھر دوسرے دن مری پہنچ گئے۔

کامران سے فون پر برابر رابطہ مسلسل تھا۔ وہ بتاتی کہ کس طرح فیملی کے ساتھ انجوائے کررہی ہے اور نمازیں باقاعدگی سے ادا کررہی ہے۔

وہ تیسرے دن ایوبیہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ چھ گاڑیاں کبھی ایک دوسرے سے بہت دور ہوجاتیں، کبھی ایک دوسرے کے قریب ہوجاتی تھیں۔ پہاڑی راستے پرپیچ اور خطرناک تھے۔ [illegible] تھی، وہ ڈرائیونگ سے گریز کرتی تھی۔ ایک ڈرائیور اس کی کار چلا رہا تھا۔

http://digestpk.blogspot.com

اس کار میں فروا، اس کی ممی اور چچی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگلی سیٹ پر چچی کا ایک کمسن بیٹا تھا۔ ان کی کار پیچھے رہ گئی اور باقی گاڑیاں آگے نکل گئیں۔

ایسے ہی وقت ان کی کار اچانک رک گئی۔ سامنے سڑک پر ایک شخص منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ریوالور تھا۔ ان کی کار اس ریوالور کے نشانے پر تھی۔ وہ نہ رکتی تو وہ فائرنگ شروع کر دیتا۔

فروا آنکھیں بند کیے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے کامران کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔

جب اس اجنبی نے بالکل قریب آکر پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خواتین کو دھمکی دی تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ دیر ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنا پستول نہیں نکال سکتی تھی۔ ایسی کوئی حرکت کرنے سے پہلے ہی وہ ان سب کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیتا۔

اس نے فروا کو حکم دیا۔ "باہر آؤ۔ جلدی کرو۔ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرو گی تو کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ اپنا پرس لے کر چپ چاپ باہر آگئی۔ اس نے پرس چھین کر اس کی ممی اور چچی سے موبائل فون طلب کیے۔ ڈرائیور کے پاس بھی فون تھا، اسے بھی لے کر رکھ لیا۔ پھر ان سے کہا۔ "یہاں سے جاؤ اور اس لڑکی کو بھول جاؤ۔"

فریدہ نے تڑپ کر کہا۔ "میری بچی کو کیوں روک رہے ہو؟ تمہیں جتنی رقم کی ضرورت ہے، مجھ سے لے لو۔ میری بیٹی پر کوئی ظلم نہ کرو۔"

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "میرا وقت برباد نہ کرو۔ فوراً یہاں سے جاؤ۔ ورنہ تم سب ماری جاؤ گی۔"

فروا پریشان تھی۔ اتنا موقع مل رہا تھا کہ وہ لباس کے اندر سے پستول نکال کر اس پر فائر کر سکتی لیکن ایسے وقت اس کے ریوالور سے بھی فائرنگ ہوتی تو اس کی ممی یا چچی زد میں آسکتی تھیں۔

وہ صبر کر رہی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار موجود ہے۔ ڈرائیور نے اس کی دھمکی سے مجبور ہو کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اسے اپنی ممی کے رونے اور واویلا کرنے کی آوازیں کچھ دور تک سنائی دیں پھر وہ کار آگے جا کر ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ اس اجنبی کے ساتھ سڑک کے کنارے تنہا بے یار و مددگار رہ گئی۔ اس نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ اگر تاوان کی بھاری رقم حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں ایک گھنٹے کے اندر ادا کر سکتی ہوں۔"

اب اس شخص کے منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا نہیں تھا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک جوان لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں سے لوگ ان پر ایک نظر ڈالتے ہوں گے۔ اس لیے وہ فروا سے تقریباً لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ کوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے ریوالور کی نال اسے چبھ رہی تھی۔ فروا نے پھر بڑی رقم کی پیشکش کی۔

وہ بولا۔ "خاموش رہو۔ جب بھی یہاں سے کوئی گاڑی گزرے تو مجھ سے مسکرا کر کچھ بھی بات کر لینا۔"

اس نے پوچھا۔ "ہم یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

اسی وقت ایک گاڑی ان کے قریب آکر رک گئی۔ اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو..."

وہ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی اندر آکر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اسی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ مسلسل نشانے پر تھی۔ اس کی جگہ کوئی ماہر چالباز جنگجو ہوتا تو چشم زدن میں لباس کے اندر سے پستول نکال کر مقابلے پر ڈٹ جاتا۔

لیکن وہ ایسے حالات سے پہلی بار گزر رہی تھی۔ اس اجنبی سے مقابلہ کرنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ صبر کرنا چاہیے۔ کسی مناسب موقع پر اپنی پستول کو کام میں لانا چاہیے۔

وہ گاڑی نہ ایوبیہ کی سمت جا رہی تھی نہ مری کی طرف۔ وہ کسی تیسرے راستے پر مڑ گئی۔ معلوم نہیں کتنا لمبا سفر تھا؟ فروا نے ایک گھنٹے بعد پوچھا۔ "آخر مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "آرام سے بیٹھی رہو۔ ہم تمہیں گھر نہیں لے جا رہے۔ جہاں بھی لے جا رہے ہیں، وہاں جانا... پڑے گا۔"

گاڑی ڈرائیو کرنے والے نے کہا۔ "ویسے یہ بزدل نہیں ہے۔ بڑی جیدار ہے۔ کوئی اور ہوتی تو رونے لگتی۔"

مزید آدھے گھنٹے بعد گاڑی سڑک کے کنارے رک گئی۔ فروا بدستور نشانے پر رہ کر گاڑی سے باہر آئی۔ پھر ڈرائیور کے پیچھے چلتی ہوئی دور تک ایک ڈھلان پر اترنے لگی۔ ریوالور والا اس کے پیچھے تھا۔ گھنے درختوں کی بہتات کے باعث سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کتنی پگڈنڈیوں سے مڑتے ہوئے کس سمت جا رہے ہیں؟ پہاڑی راستے بھول بھلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ ان راستوں میں الجھ گئی تھی۔ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ وہاں سے واپس کیسے جائے گی؟

تقریباً ایک گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد وہ ایک

بڑے سے کاٹیج میں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "یہاں تم آرام سے رہو۔ جب دن ڈھل جائے گا، تب تمہارے دوست آئیں گے۔ تم انہیں خوش کرو گی۔ وہ تمہیں خوش کریں گے۔"

انہوں نے اسے ایک کمرے میں دھکا دے کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ وہاں تنہا ہوتے ہی اس نے لباس کے اندر سے اپنا پستول نکالا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی بھی نہیں تھی۔

اس نے دروازے کو پیٹتے ہوئے کہا۔ "پلیز دروازہ کھولو۔ میری ایک بات سن لو پھر مجھے یہیں بند کر دینا۔"

وہ چاہتی تھی، ایک بار وہ دروازہ کھول کر اسے تنہا سمجھ کر آئیں اور اس کا نشانہ بن جائیں۔ پھر وہ وہاں سے فرار ہو جائے گی۔

اس نے پھر آواز دی۔ "میں بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز۔ میرے پاس آؤ۔"

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک دیوار میں چھوٹا سا روشن دان بنا ہوا تھا۔ وہاں ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔ وہ صندوق پر کرسی رکھ کر روشن دان تک پہنچ گئی۔

وہاں سے جنگل کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ بہت دور چڑھائی پر وہ دونوں واپس جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ پستول کی رینج سے بہت دور تھے۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں ضائع ہو جاتیں۔

وہ جھنجلا کر فائر کرنا چاہتی تھی۔ انہیں بتا دینا چاہتی تھی کہ وہ نہتی نہیں ہے۔ پھر عقل آئی کہ رات کو کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ فی الحال انہیں یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ نہتی اور کمزور ہے۔ ایسے ہی وقت اس کا پستول کام آسکے گا۔

وہ روشن دان سے نیچے اتر آئی۔ پورا کاٹیج لکڑیوں... سے بنا ہوا تھا۔ لکڑیاں پرانی اور بوسیدہ ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا صدیوں پرانا کاٹیج ہے۔ اس نے دروازے کے پاس آکر اسے ہلایا تو ہلکی سی کھڑکھڑ کی آواز سنائی دی۔ باہر سے لوہے کی زنجیر اوپر کنڈی سے لگائی گئی تھی۔ اس نے زور زور سے دروازے کو ہلایا تو وہ بھی زوردار آواز سے بجنے لگی۔ دروازے کے ساتھ چوکھٹ بھی لرزنے لگی۔

وہ پیچھے ہٹ کر دروازے اور چوکھٹ کو بغور دیکھنے لگی۔ اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو دو چار ٹکروں میں دروازے کو توڑ ڈالتا۔ اس نے سوچا۔ "اگر میں مسلسل زور لگاؤں تو شاید دروازہ ٹوٹ جائے یا اوپر لگی ہوئی زنجیر نیچے آجائے۔ جب تک دم میں دم ہے میں کوشش کرتی رہوں گی۔"

دروازے کو اندر سے بند کرنے کے لیے لکڑی کا گٹکا لگا ہوا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر پوری قوت سے ہلانے لگی۔ باہر لوہے کی زنجیر لرز رہی تھی۔ یقین دلا رہی تھی کہ اپنی جگہ چھوڑ سکتی ہے۔

خدا ہمت کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے... وہ تھک کر ہانپنے لگی لیکن ہمت نہیں ہاری۔ سانس معمول پر آتے ہی پھر دروازے کو جھٹکے دینے لگی۔ ایسا اس نے وقفے وقفے سے تین بار کیا۔ چوتھی بار زنجیر اوپر سے نیچے آگئی اور دروازہ کھل گیا۔

اس نے خوش ہو کر ایک گہری سانس لی۔ اپنی مضبوط قوت ارادی اور محنت سے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے باہر آکر دیکھا۔ انہوں نے زنجیر کو کنڈی سے لگا کر ایک مضبوط تالا لگایا تھا۔ وہ چابی کے بغیر کھلنے والا نہیں تھا لیکن وہ کنڈی ہی جڑ سے اکھڑ کر نیچے آگئی تھی۔ بوسیدہ چوکھٹ پر کنڈی کی جگہ دو سوراخ دکھائی دے رہے تھے۔ تالا زنجیر اور کنڈی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔

اس نے پستول کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ جس سمت سے آئی تھی ادھر دور تک دیکھنے لگی۔ شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی، رات کی تاریکی میں کہاں جائے گی؟

اس نے آتے وقت دیکھا تھا، وہ دشمن اسے بڑے ہی پیچیدہ راستوں سے لے کر آئے تھے۔ اس جنگل میں کئی پگڈنڈیاں مختلف سمتوں میں گئی تھیں۔ وہ کس پگڈنڈی پر چل کر کس آبادی تک پہنچے گی؟

وہ بھٹکتی ہوئی ان دشمنوں سے بھی ٹکرا سکتی تھی، جو ادھر آنے والے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ٹارچ لائٹ یا لالٹین کی روشنی کے بغیر وہاں سے جا نہیں سکتی تھی۔

اس کاٹیج میں مزید دو کمرے تھے۔ وہاں کھانے پینے کا سامان اور شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اور آنے والوں کی نیتوں کا حال بتا رہی تھیں۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی، عیاش دشمنوں سے کس طرح چھپے گی؟ نہ اس کاٹیج سے دور جا سکتی تھی، نہ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ تھی۔

اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ پھر کاٹیج کے دائیں طرف گئی۔ وہاں ایک سیڑھی چھت پر جانے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ فی الحال وہ اوپر جا کر ان سے کچھ فاصلہ رکھ سکتی تھی۔ وہ کسی وقت بھی وہاں پہنچ سکتے تھے۔ وہ فوراً ہی چھت پر آگئی۔ لکڑی کی بوسیدہ سیڑھی کو بھی کھینچ کر اوپر لے آئی۔

http://digestpk.blogspot.com

تاکہ دشمن آسانی سے چھت پر نہ چڑھ سکیں۔

وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے دشمنوں کے شکنجے میں رہنے کے باعث عصر اور مغرب کی نماز نہ پڑھ سکی۔ رات کی تاریکی میں اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ قبلہ کس سمت ہے؟

اس نے اندازے سے ایک سمت رخ کر کے عشاء کی نماز ادا کی پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ ”اے ربِ کریم! مجھ پر کرم فرما۔ میں تنہا، بے یار و مددگار ہوں۔ مجھے میرے کامران اور پاپا سے ملا دے۔

مجھے حوصلہ دے کہ میں دشمنوں سے محفوظ رہنے کی ہمت کر سکوں۔ دشمنوں کو ان کے ناپاک ارادوں میں ناکام کر دے میرے مالک! مجھے عزت و آبرو سے میرے گھر پہنچا دے۔۔۔ آمین!“

نماز کے دوران میں چاند نکل آیا تھا۔ کسی حد تک تاریکی چھٹ گئی تھی۔ وہ نماز کے بعد پچھلی یاد کی ہوئی سورتوں کو دہرا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت دور درختوں کے درمیان ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔

وہ آرہے تھے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نہ جانے آنے والے لمحات میں کیا ہونے والا تھا؟

وہ چھت پر اوندھے منہ لیٹ کر ادھر دیکھنے لگی۔ اس نے پستول مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

وہ لوگ چڑھائی پر تھے۔ ٹارچ کی روشنی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ڈھلان سے اترتے ہوئے کاٹیج کی طرف آرہے ہیں۔ سامنے کھلی جگہ پر آتے ہی چاند کی روشنی میں تین افراد سائے کے مانند دکھائی دیے۔

پہلے تو وہ واضح نہیں تھے۔ کاٹیج کے قریب آئے تو فردا نے انہیں پہچان لیا۔ وہ جواد اور شمشاد تھے۔ ان کے ساتھ وہی ریوالور والا آدمی تھا جو اسے کمرے میں بند کر کے گیا تھا۔

وہ اپنے کم ظرف کزنز کو دیکھ کر غصے سے تلملا گئی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس قدر گر جائیں گے۔ اس کی عزت سے کھیلنے کے لیے اسے اغوا کرائیں گے اور بے دست و پا کر دینے کے لیے ایک تاریک جنگل میں پہنچا دیں گے۔

انہوں نے کاٹیج کے بالکل قریب آکر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو چونک گئے۔ ایک نے حیرانی سے کہا۔ ”ارے! یہ دروازہ تو کھلا ہوا ہے؟“

وہ تینوں دوڑتے ہوئے اس کمرے کی طرف گئے۔ فردا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن ان کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

وہ تینوں اسے کاٹیج کے تمام کمروں میں ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ”وہ نازک سی لڑکی ہے۔ کنڈی توڑ نہیں سکتی۔ یہاں ضرور کوئی اس کی مدد کے لیے آیا ہوگا۔“

شمشاد کی آواز سنائی دی۔ ”یہاں کون آیا ہوگا؟ ادھر سے تو شاید ہی کوئی گزرتا ہوگا۔ یہ دیکھو۔۔۔ یہ چوکھٹ کمزور ہے۔ بار بار دھکا دینے کی وجہ سے کنڈی اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔“

جواد کی آواز سنائی دی۔ ”وہ بہت ضدی اور طوفانی مزاج والی لڑکی ہے۔ اس نے جنون میں آکر اس مقفل دروازے کو کھولا ہے۔ اسے ڈھونڈو، وہ یہاں سے فرار ہونے کے بعد بھی راستہ نہیں پائے گی۔ جنگل میں بھٹکتی رہے گی۔“

وہ سب کاٹیج سے باہر کھلی فضا میں آگئے۔ دور دور تک ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھنے لگے۔ وہ تینوں صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے صرف اسی شخص کے پاس ریوالور تھا جو اسے کمرے میں بند کر کے گیا تھا۔

کاٹیج کے پچھلے حصے میں گہری کھائی تھی۔ انہوں نے کاٹیج کے دائیں بائیں جا کر دیکھا۔ جواد نے کہا۔ ”جب ہم پچھلی گرمیوں میں آئے تھے تو یہاں ایک سیڑھی تھی۔ وہ کہاں ہے؟“

ریوالور والے نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا۔ میں تو اسے بند کرنے کے بعد یہاں سے چلا گیا تھا۔ شمشاد نے چھت کی طرف ٹارچ روشن کی۔ فردا اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ نیچے سے نظر نہیں آسکتی تھی۔

ایک نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے، کوئی لکڑیاں جلانے کے لیے سیڑھی یہاں سے لے گیا ہو یا وہ چھت پر پڑی ہو۔“

اس نے پھر چھت کی طرف روشنی کی۔ ریوالور والے نے کہا۔ ”چھت بہت اونچی ہے۔ لڑکی سیڑھی کے بغیر اوپر جا نہیں سکتی۔ وہ دروازہ کھلتے ہی دن کی روشنی میں یہاں سے فرار ہو گئی ہے۔“

جواد نے شمشاد سے کہا۔ ”اگر وہ ہاتھ سے نکل گئی تو سمجھ لو دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گی۔ اس کی مغرور جوانی سے کھیلنے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔“

فردا ان کی باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ”لگتا ہے، یہ تینوں رات کو واپس نہیں جائیں گے۔ کاٹیج میں صبح تک رہیں گے۔ میں چھت پر کب تک ساکت پڑی رہوں

گی؟ کروٹ بدلوں گی، یا اٹھنے بیٹھنے کی غلطی کروں گی تو لکڑیوں کی چرچراہٹ نیچے سنائی دے گی۔ پھر وہ چھت پر آنے میں دیر نہیں کریں گے۔“

دانشمندی یہی تھی کہ وہ اسی وقت ان سے نمٹ لے۔ وہ تینوں کاٹیج کے سامنے کھلی جگہ پر تھے۔ چاندنی میں ریوالور والا صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ فردا نے اللہ کا نام لے کر نشانہ لیا پھر گولی چلا دی۔

جنگل کے سناٹے میں دور تک فائر کی آواز گونجتی چلی گئی۔ نشانہ ذرا چوک گیا اور گولی سینے کے بجائے شانے پر لگی۔

وہ اچھل کر زمین پر گرا۔ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف چلا گیا۔ وہ دونوں چونک گئے۔ جواد فوراً کاٹیج کے اندر گیا۔ شمشاد نے ریوالور کی طرف چھلانگ لگائی۔ فائر کی دوسری آواز موت کی طرح گونجی۔ شمشاد کے حلق سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔

جواد نے دہشت زدہ ہو کر کاٹیج میں چھپ کر دیکھا۔ شمشاد ریوالور کے پاس زمین پر تڑپ رہا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ٹھنڈا پڑ گیا اور ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

اسے اغوا کرنے والے کے شانے پر گولی لگی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ریوالور اس سے دو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ رینگتا ہوا اسے اٹھا لیتا۔ وہ شمشاد کا انجام دیکھ چکا تھا۔

جواد برآمدے میں تھا۔ فی الحال مطمئن تھا کہ چھت سے ہونے والی فائرنگ سے محفوظ رہے گا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک طرف ریوالور تھا اور دوسری طرف ٹارچ پڑی ہوئی تھی۔ دونوں چیزیں اس کے لیے ضروری تھیں اور وہ وہاں سے ایک چیز بھی اٹھا کر لانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ زخمی شخص وہاں سے فرار ہونے کے لیے زمین پر گھسٹتا ہوا شوٹنگ رینج سے دور ہونے کے بعد اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا۔ فردا نے اس کا نشانہ لیا پھر گولی چلا دی۔ وہ جہاں تھا، وہیں پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ گولی اس کی پشت میں پیوست ہو کر دل میں سوراخ کرتی ہوئی سینے سے نکل گئی تھی۔

جواد کے ہوش اڑ رہے تھے، وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ وہ تو فردا کو کمزور اور بے بس سمجھ کر عیاشی کرنے آیا تھا۔

اس نے اور شمشاد نے سوچا تھا اس ویرانے میں خوب مزے اڑائیں گے پھر اسے کرائے کے قاتل کے حوالے کر کے چلے جائیں گے۔ اب وہ کرائے کا قاتل اس کے سامنے مردہ پڑا تھا اور شمشاد بھی جہنم میں پہنچ چکا تھا۔

اسے اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چھت کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”فردا! مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم گولیاں چلا رہی ہو۔ تمہارے پاس اسلحہ کہاں سے آیا؟“

وہ بولی۔ ”آم کھانے والے پیڑ نہیں گنتے۔ تم بھی گولی کھاؤ، اسلحہ کا حساب نہ کرو۔“

پھر وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”باہر نکل کتے! کمینے! ابھی تو نے درست کہا تھا کہ میری مغرور جوانی سے کھیلنے کی حسرت رہ جائے گی۔ تو بھی یہاں سے زندہ نہیں جاسکے گا۔“

وہ دیوار سے لگ کر دبے قدموں چلتا ہوا کاٹیج کے ایک طرف آیا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ فردا کی نظریں سامنے کی طرف ہیں، وہ زمین پر پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھانے کا موقع نہیں دے گی۔ اس لیے وہ دوسری سمت آکر زمین پر گھٹنے ٹیک کر رینگتا ہوا وہاں سے دور جانے لگا۔

فردا اس کی چالاکی کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس سے بے خبر رہتی اور ساری رات انتظار کرتی رہتی کہ وہ ریوالور اٹھانے کسی بھی وقت کاٹیج سے باہر آئے گا۔ یوں ساری رات دھوکے میں رہتی۔۔۔

لیکن تقدیر اس پر مہربان تھی۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا جا رہا تھا۔ اسی وقت ایک گلہری اس کے نیچے سے چیختی ہوئی گزری تو اس کے حلق سے بھی چیخ نکل گئی۔ اس کے خوفزدہ ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی جنگلی بلا نے حملہ کر دیا ہے۔

فردا نے فوراً ہی اٹھ کر چھت پر دوڑتے ہوئے آواز کی سمت دیکھا۔ جواد سنبھلا اور اٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگا۔ فردا نے گولی چلائی، وہ گولی موت کی آواز تھی۔ گولی نہ لگنے کے باوجود وہ لڑکھڑا کر گرا مگر فوراً ہی اٹھ کر بھاگنے لگا۔

وہ شوٹنگ رینج سے باہر جا چکا تھا۔ فردا اسے دیکھتی رہی۔ وہ چاندنی میں دور تک سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ پھر درختوں کے جھنڈ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ اتنی دور جا چکا تھا کہ واپس آکر حملہ کرنے میں دیر لگتی۔ پھر وہ تنہا تھا، پلٹ کر آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً ہی سیڑھی کو کھینچ کر نیچے پہنچایا۔ چھت سے اترتے ہی دوڑتی ہوئی آکر ریوالور کو اٹھا لیا۔ اپنے پستول کو لباس کے اندر رکھا۔ شمشاد کی جیب سے موبائل فون نکال کر چیک کیا۔ [illegible]

http://digestpk.blogspot.com

اہم تھا۔ اس نے کرائے کے قاتل کی جیب سے بھی فون نکال لیا۔

وہ بہت محتاط تھی۔ دور تک دیکھتی بھی جا رہی تھی۔ پھر ٹارچ اٹھا کر کاٹیج کے اندر آئی۔ وہاں سے بستر اور کمبل کو اٹھا کر سیڑھی کے پاس آگئی۔ اس نے تھوڑی دیر میں تمام ضروری سامان چھت پر پہنچا دیا۔ پھر سیڑھی کو اوپر کھینچ لیا۔ بڑی حد تک اطمینان ہوا کہ کوئی آسانی سے وہاں تک پہنچ نہیں پائے گا۔

ایک تنہا سپاہی حوصلے سے پورا میدان مار لیتا ہے۔ وہ پورے حوصلے کے ساتھ بدترین حالات سے لڑ رہی تھی اور کامیاب تھی۔ وہ بستر بچھا کر کمبل لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے فون کے ذریعے پہلے اپنے باپ سے رابطہ کیا۔ ''ہیلو پاپا! میں فردا بول رہی ہوں۔''

جمال جمشید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''میری بیٹی! میری جان! تم کہاں ہو؟ ہم سب تمہارے لیے پریشان ہیں۔ ہوم منسٹر نے حکم دیا ہے کہ تمہیں مری اور ایبوبیہ کے درمیان تلاش کیا جائے۔ فورسٹ ڈیپارٹمنٹ کے سپاہی تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ تم گائیڈ کرو، ابھی کہاں ہو؟''

''میں صحیح جگہ کی نشاندہی نہیں کر سکتی۔ ایبوبیہ سے مری کی سمت جاتے ہوئے ایک تیسرا راستہ ہے۔ اس راستے پر آدھے گھنٹے تک گاڑی چلتی رہی تھی۔ پھر ایک جگہ رک گئی تھی۔''

وہ چاندنی میں دور تک دیکھتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔ ''مجھے اغوا کرنے والے وہاں سے پیدل ایک گھنے جنگل میں لے کر آئے تھے۔ جنگل میں اتنی پیچیدہ پگڈنڈیاں تھیں کہ یاد نہیں رہا، کن پگڈنڈیوں سے گزرتی ہوئی یہاں کاٹیج میں آئی ہوں۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا تمام رشتے دار آپ کے آس پاس ہیں؟''

''ہاں۔ میں تمہیں تلاش کرنے کے لیے مری آ گیا ہوں۔ یہاں سب ہی موجود ہیں۔''

''تو پھر انہیں یہ خوشخبری سنا دیں کہ مجھے جواد اور شمشاد نے اغوا کرایا ہے۔''

جمشید نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو فون بند کر دیں۔''

''نہیں میری جان! مجھے یقین ہے۔ میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

پھر جمال نے اپنی بہن اور سالے کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تھو ہے تم لوگوں پر... تمہارے بیٹوں نے میری بیٹی کو اغوا کرایا ہے۔''

پھر اس نے فون پر پوچھا۔ ''وہ دونوں کہاں ہیں؟''

''پاپا! آپ کا دیا ہوا پستول بہت کام آیا ہے۔ وہ دونوں میری عزت لوٹنے آئے تھے۔ میں نے شمشاد کو اور ان کے کرائے کے قاتل کو گولی مار دی ہے۔ ان کی لاشیں کاٹیج کے باہر پڑی ہیں۔ جواد جان بچا کر فرار ہو گیا ہے۔''

جمشید نے اپنے سالے سے کہا۔ ''مجھے اپنی بیٹی کی دلیری پر ناز ہے۔ اس نے تمہارے بیٹے کو گولی مار کر جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ چلو تم بھی اٹھو میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ لاہور جا کر میرے گھر میں قدم نہ رکھو ورنہ میرے ملازم تمہیں جوتے مار کر وہاں سے نکالیں گے۔''

پھر وہ بہن سے بولا۔ ''تمہارا بیٹا جان بچا کر بھاگ گیا ہے۔ لیکن بھاگ کر کہاں جائے گا؟ تمہیں بھی اس کی لاش جلد ہی ملے گی۔''

بہن دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹے کے لیے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ جمشید نے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اس کتے نے میری بیٹی کی عزت سے کھیلنے کے لیے اسے اغوا کرایا۔ نہ جانے وہ جنگل کے کس کاٹیج میں ہے؟ تنہا اور بے یار و مددگار ہے اور تم بخشتی ہو، میں تمہارے بیٹے کو معاف کر دوں گا؟''

اس نے ملازموں کو حکم دیا کہ بہن۔ اور سالے کو وہاں سے دھکے دے کر نکال دیں۔

پھر بیٹی سے کہا۔ ''میں تمہاری روداد بعد میں سنوں گا۔ ابھی ہوم منسٹر سے رابطہ کرتا ہوں۔ انشاء اللہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے تمہیں تلاش کر لیں گے۔''

وہ بولی۔ ''میں دشمنوں سے بچنے کے لیے کاٹیج کی چھت پر ہوں۔ جب ہیلی کاپٹر آئے گا، میں ٹارچ کے ذریعے سگنل دوں گی۔''

''پاپا کی جان! تم سلامت رہو ہزار برس۔ میں صبح ہونے سے پہلے تمہیں وہاں سے لے آؤں گا۔''

باپ سے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ فون دیکھ کر سوچنے لگی کہ اب کامران سے بات کرنی چاہیے لیکن اس سے کیا کہے گی؟ جب یہ معلوم ہو گا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے تو وہ تڑپ جائے گا اور جب پتا چلے گا کہ وہ ایک گھنے جنگل میں بالکل تنہا ہے تو وہ پاگلوں کی طرح مری کی طرف دوڑا چلا آئے گا۔

دانشمندی یہ تھی کہ اسے پریشان نہ کیا جائے۔ صرف

ایک رات کی بات ہے۔ کسی وقت بھی گھر پہنچتے ہی اس سے رابطہ کروں گی۔

اس نے صبر کیا۔ سیل میں اچھی طرح چھپ کر بیٹھ گئی۔ رات جیسے جیسے گزر رہی تھی، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ زیر لب آیتیں پڑھنے لگی۔ بار بار دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ اندیشہ تھا کہ دشمن پلٹ کر آ سکتا ہے۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے رات کے ایک بجے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ وہ ہاتھ میں ٹارچ لے کر کھڑی ہو گئی۔ دور ایک ہیلی کاپٹر کی ننھی سی لائٹ جلتی بجھتی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ اپنی ٹارچ کی روشنی 'آن' 'آف' کرنے لگی۔ دور چکر کاٹتے ہیلی کاپٹر کو سگنل ملا تو وہ کاٹیج کی طرف آنے لگا۔ قریب آتے ہی تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ آس پاس کے درختوں کے پتے شور مچانے لگے۔ وہ کاٹیج کے سامنے کھلے میدان میں اتر رہا تھا۔

فردا نے سیڑھی کو نیچے زمین تک پہنچایا۔ پھر ریوالور، فون اور ٹارچ لے کر نیچے آ گئی۔ ہیلی کاپٹر کی پنکھڑیاں بند ہو گئی تھیں۔ ایک پولیس افسر اور دو مسلح سپاہی باہر آئے۔

افسر نے فردا کو سر سے پاؤں تک حیرانی سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تم نے تنہا ان دونوں کو ہلاک کیا ہے؟''

اس نے ریوالور افسر کو دیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔ یہ جو لاش پڑی ہے، یہی وہ کرائے کا قاتل تھا۔ یہ ریوالور اسی کا ہے۔''

وہ اپنے لباس کے اندر سے پستول نکال کر دکھاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اس پستول سے انہیں ہلاک کیا ہے۔''

افسر نے اس پستول کو بھی اپنے پاس رکھ لیا۔ سپاہیوں سے کہا کہ دونوں لاشوں کو ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے میں ڈال دیں۔ پھر اس نے کاٹیج کے اندر جا کر شراب کی بوتلیں دیکھیں۔ فردا سے دو چار سوالات کیے۔ پھر کہا۔ ''آؤ اسلام آباد چلو۔ وہاں تمہارے پاپا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ان کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئی۔ تقریباً دو بجے اسلام آباد پہنچی۔ جمال جمشید ہیلی پیڈ پر موجود تھا۔ اس نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔ وہ دوسری صبح لاہور جانا چاہتے تھے۔

انٹیلی جنس کے ایک افسر نے کہا۔ ''آپ کی صاحبزادی نے دو قتل کیے ہیں۔ اس کیس کو مضبوط بنانا ہو گا کہ اسے جبراً اغوا کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی آبرو اور جان بچانے کی خاطر دو دشمنوں کو ہلاک کیا ہے۔ جبکہ دو دشمن آپ کے رشتے دار ہیں۔ انہیں دشمن ثابت کرنا ہو گا۔ کیس ذرا بھی کمزور ہو گا تو آپ کی صاحبزادی قانون کی گرفت میں آ جائے گی۔''

جمشید نے پوچھا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''آپ اپنی صاحبزادی کے ساتھ کم از کم دو دن تک اسلام آباد میں رہیں۔ ہماری تفتیش مکمل ہو جائے گی۔ کیس آپ کی صاحبزادی کے حق میں مضبوط ہو جائے گا، تب آپ لاہور جا سکتے ہیں۔''

فردا کامران سے ملنے کے لیے بے چین تھی لیکن قانونی کارروائی کے باعث اسے اسلام آباد میں رکنا پڑا۔ اس نے باپ کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں آ کر فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ چند لمحوں کے بعد ریکارڈنگ سنائی دی کہ اس کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔

اس نے حیرانی سے سوچا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فون ہمیشہ کامران کے پاس رہتا ہے۔ وہ بے قراری سے میری کال کا انتظار کرتا ہے۔''

اس نے دوسری پھر تیسری بار اس کے نمبر پنچ کیے۔ ہر بار یہی کہا گیا کہ وہ نمبر بند ہے۔ اب وہ کیا کر سکتی تھی؟ مزید دو دن تک صبر کرنا تھا۔ بیچاری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

دو ہفتوں کی جدائی میں کامران کے حالات بدل گئے۔ اس نے فردا کی بات مان کر گیراج کا کام چھوڑ دیا تھا۔ دو ہفتے کی بیروزگاری نے اسے کنگال بنا دیا تھا۔ اس نے عارضی طور پر کسی دکان میں کام کرنا چاہا تو کہیں کام نہ ملا۔

ایک روز وہ بس میں سفر کر رہا تھا۔ اسے اپنے حالات پریشان کر رہے تھے۔ پھر فردا کی فکر تھی۔ فون کے ذریعے اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے اور اس سے فون چھین لیا گیا ہے۔

اسی فکر و پریشانی میں بس سے اترتے وقت وہ اپنا بیگ وہاں سے اٹھانا بھول گیا۔ جب وہ بس دور نکل گئی تو خیال آیا کہ بیگ ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس نے بس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ اور آگے نکل گئی اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

جب وہ سورج کی تپش سے جھلستا ہوا بس اڈے پر پہنچا تو وہ خالی ہو چکی تھی۔ مسافر جا چکے تھے اور کوئی فون سمیت اس کا بیگ لے جا چکا تھا۔ یہ وہی وقت تھا، جب وہ مسجد جامعہ اشرفیہ میں جا کر نماز پڑھا کرتا تھا اور نہر کنارے ایک فقیر بابا سے ملاقات ہوئی تھی۔

http://digestpk.blogspot.com/

بابا نے اسے تین باتیں بتائی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ لاوارث نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ کروڑوں کی جائداد کا مالک ہے اور تیسری حقیقت یہ کہ اس کی محبوبہ بچھڑ گئی ہے لیکن جلد ہی ملے گی۔

آخر میں اس نے کہا تھا کہ آج کا دن اس پر بھاری ہے۔ اسے گھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی تڑاتڑ دو فائر ہوئے تھے۔ کار میں بیٹھا ہوا کوئی دشمن کامران کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر اس کی موت بابا کے حصے میں آئی تھی۔ اس کے نصیب میں زندگی تھی۔ وہ ابھی سانسیں لے رہا تھا۔

وہ بابا کی ہلاکت کے سلسلے میں تھانے جا کر اپنا بیان لکھوانے کے بعد گھر واپس جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”فردا کے کزنز میرے رقیب ہیں۔ ان ہی میں سے کسی نے مجھ پر گولیاں چلائی ہوں گی نتیجے میں بیچارہ بابا مارا گیا۔“

جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو ایک بہت ہی مہنگی سفید ٹویوٹا کرولا کو دیکھا۔ وہ دھوپ میں چمچما رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ دھڑکتے ہوئے دل نے کہا۔ ”فردا ایک نئی کار میں آئی ہے۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا گھر کا دروازہ کھول کر اندر آیا تو اس کی محبوبہ نہیں تھی۔ ایک خاتون اور ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے جوان بیٹے کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی خاتون اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

نانی نے کہا۔ ”یہ تمہاری امی ہیں اور یہ تمہارے ابو ہیں۔ بڑی مشکل سے مجھے تلاش کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔“

باپ چارپائی سے اٹھ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”بیٹے! میرے سینے سے لگ جاؤ۔ آج کے بعد تم لاوارث نہیں کہلاؤ گے۔“

وہ باپ کے گلے لگ گیا۔ اس نے دیکھا، ماں اسے دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ جیسے چھونے کے لیے تڑپ رہی ہو۔ وہ باپ سے الگ ہو کر ماں کے پاس آ کر بولا۔ ”امی...!“

وہ خوشی سے لبریز اس سے لپٹ گئی۔ وہ بڑے ہی جذباتی لمحات تھے۔ کامران شکایت کرنا بھول گیا کہ اسے پیدا کرنے کے بعد کیوں ایک لاوارث کی طرح چھوڑ دیا گیا تھا؟

وہ زندگی میں پہلی بار باپ اور ماں کے گلے لگ رہا تھا۔ ان کے وجود سے نکل کر ان کی بے قرار دھڑکنوں کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہا تھا۔

باپ نے کہا۔ ”بیٹے! ہم نے حالات سے مجبور ہو کر تم سے ناانصافی کی ہے۔ اب ہمارے سامنے کوئی رکاوٹ، کوئی مجبوری نہیں ہے۔ ہم اعلان کریں گے کہ تم ہمارے بیٹے ہو۔ بچپن میں ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ اب تمہارے تمام جائز حقوق تمہیں ملیں گے۔“

ماں نے کہا۔ ”تم ابھی ہمارے ساتھ چلو اور ہمارے ساتھ رہو۔ یہ تمہارا چھوٹا بھائی عدنان ہے۔ اکثر تمہارے بارے میں پوچھتا رہتا ہے۔ بہت محبت کرنے والا بھائی ہے۔ یہ تمہیں لینے آیا ہے۔“

کامران نے عدنان کو گلے لگا کر پیار کیا۔ وہ قد میں اس کے برابر تھا۔ عمر میں اس سے دو برس چھوٹا ہوگا۔ اس نے کہا۔ ”بھائی! گھر چلیں۔ میں نے آپ کے کمرے کو اپنے ہاتھوں سے سجایا ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔“

”بیٹے! میرا نام صادق حسین ہے۔ آج سے تم کامران ولد صادق حسین ہو۔“

ماں نے کہا۔ ”میرا نام آمنہ حسین ہے۔ قیامت کے دن تمہیں میرے نام سے پکارا جائے گا۔ میں بہت مجبور ہو کر تمہارے ابو سے بچھڑ گئی تھی۔ خاندان کے ایک جوان سے زبردستی میری شادی کر دی گئی۔ دو برس بعد عدنان پیدا ہوا۔ اس کے بعد میں نے قسم کھائی کہ جب تک تمہارے تمام حقوق ادا نہیں کروں گی مزید کوئی اولاد پیدا نہیں ہوگی۔“

اس نے عدنان کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا۔ وہ شرابی اور عیاش تھا۔ اسے بھی باپ کا پیار نہیں ملا۔ وہ شرابی عیاش دو برس پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میں بیوہ ہو گئی۔ آزاد ہو گئی۔ میرے خاندان میں جو بزرگ ہمارے مخالف تھے۔ وہ سب اپنی مخالفتوں کے ساتھ مٹی میں مل گئے۔ اس کے بعد مجھے صادق کی منکوحہ بننے سے کوئی نہیں روک سکا۔“

صادق نے کہا۔ ”میں لندن میں اپنا کاروبار سنبھال رہا تھا۔ تمہاری امی سے فون پر رابطہ تھا۔ یہ بیوہ ہونے کے تین ماہ بعد لندن آ گئیں۔ وہاں ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ فوراً ہی پاکستان جا کر تمہیں گلے لگا لیں گے اور اعلانیہ تمہیں اپنی اولاد تسلیم کریں گے۔“

ماں نے کہا۔ ”لیکن ہم فوراً ہی نہ آ سکے۔ تم نے اخبارات میں پڑھا ہوگا، لندن میں جو بم دھماکا ہوا تھا۔ اس کے الزام میں مسلمانوں کو دہشت گرد کہہ کر گرفتار کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے میرے عدنان کو بھی دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔“

صادق حسین نے کہا۔ ”ہم کافی عرصے..... تک مقدمہ لڑتے رہے۔ خدا کا شکر ہے عدنان کو الزام سے بری کر دیا گیا ہے۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے یہاں کا پتا معلوم کیا اور آج تم سے مل رہے ہیں۔“

ماں نے کامران کے سینے سے لگ کر کہا۔ ”ہم خدا کا جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے۔ ہماری پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ تمہیں اپنا نام دیں۔ یہ خواہش بھی پوری ہو چکی ہے۔ ہم پورے خاندان میں یہ اعلان کر چکے ہیں کہ اپنے بڑے بیٹے کو لینے جا رہے ہیں۔“

باپ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”چلو بیٹے! وہاں ہمارا پورا خاندان تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

کامران نے نانی کو گلے لگا کر کہا۔ ”میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں اور اسپتال کی ملازمت چھوڑ دیں۔“

وہ بولی۔ ”نہیں بیٹے! مجھے یہیں رہنے دو۔ تمہارے ابو نے وعدہ کیا ہے، آئندہ مجھے دس ہزار روپے ماہانہ دیا کریں گے۔ یہ میرے لیے بہت ہیں۔ تم جاؤ اپنے والدین کے ساتھ نیک نامی کی زندگی گزارو۔“

وہ ان کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ ان لمحات میں یہ سوچ کر دل مسرتوں سے بھر گیا کہ اب فردا کے والدین اسے لاوارث نہیں کہیں گے۔ وہ بڑے فخر سے ایک اونچے گھرانے کا شجرہ پیش کر سکے گا۔

وہ گلبرگ کی ایک عالی شان کوٹھی میں پہنچا تو وہاں رشتے داروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ سب اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ہر ایک سے تعارف کرایا جا رہا تھا کہ کون رشتے میں اس کا کیا لگتا ہے؟ وہ اتنی تعداد میں تھے کہ کامران ان کے نام یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔

آخر میں ایک شخص سے تعارف کرایا گیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ماں نے کہا۔ ”بیٹے! ان سے ملو! یہ جبار بھائی ہیں اور یہ ان کی بیٹی ماہم ہے۔ ہم نے عدنان کے لیے اسے مانگا ہے۔ بس تمہارا انتظار تھا۔ اب دھوم دھام سے منگنی کریں گے۔“

بیٹی جتنی خوبصورت تھی، باپ صورت سے اتنا ہی جابر اور سنگدل دکھائی دیتا تھا۔ کامران سے مصافحہ کرتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

یوں نہ مسکرانے کے پیچھے ایک خطرناک معاملہ تھا۔ جبار نے جب اپنی بیٹی کے لیے عدنان کا رشتہ قبول کیا تو یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں سے لندن تک پھیلی ہوئی دولت اور جائداد میں عدنان کا ایک حصے دار بھائی بھی ہے۔

یہ بات جبار ہمدانی کو گوارا نہیں تھی۔ اس نے کئی برس پہلے اپنے کاروبار میں سے دو بھائیوں کی حصے داری ختم کرنے کے لیے بڑی رازداری سے انہیں مروا دیا تھا۔ اب اس کاروبار کا بلاشرکت غیرے مالک بن گیا تھا۔

پولیس کو اس پر شبہ تھا لیکن وہ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اسے گرفتار نہ کر سکے۔

اب اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی بیٹی عدنان کے ذریعے جس دولت اور جائداد کی مالک بننے والی ہے، اس کا حصے دار کامران بن جائے۔

جس دن کامران اپنے والدین کے ساتھ اپنی عالی شان کوٹھی میں آنے والا تھا اور تمام رشتے دار اسے خوش آمدید کہنے والے تھے۔ اس سے دو روز پہلے جبار نے معلوم کیا تھا کہ کامران فجر کی نماز ادا کرنے مسجد اشرفیہ..... جاتا ہے اور نہر والے گیٹ سے باہر آ کر چہل قدمی کرتا ہے۔

وہ مناسب جگہ تھی۔ صبح کے وقت ادھر لوگوں کی آمد و رفت کم سے کم ہوتی تھی۔ زبیر نامی ایک شخص اس کا دستِ راست تھا۔ خفیہ معاملات میں اس کا رازدار بھی تھا۔ اس نے کرائے پر ایک مہنگی کار حاصل کی تھی اور اسے ڈرائیو کرتا رہا تھا۔ جبار ہمدانی گن لیے فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے دور سے دیکھ کہ کامران ایک فقیر بابا کے روبرو کھڑا ہے۔ اس نے اپنی دانست میں اچھی طرح جم کر کامران کا نشانہ لیا لیکن تیز رفتار گاڑی میں بیٹھ کر مہارت رکھنے والے ہی صحیح نشانے پر گولی چلاتے ہیں اور وہ ماہر نہیں تھا۔ وہ فائر کرتا ہوا گزرا۔ ان میں سے ایک گولی ضائع ہو گئی اور دوسری فقیر بابا کو لگی۔

کامران کے نصیب میں زندگی تھی۔ اب جبار ہمدانی اسے زندہ سلامت دیکھ رہا تھا اور ان لمحات میں کامران سوچ رہا تھا۔ ”بابا کی باتیں کتنی سچی تھیں؟ اس نے کہا تھا، میں لاوارث نہیں رہوں گا اور کہا تھا، کروڑوں کی جائداد کا مالک ہوں۔ یہ دونوں پیش گوئیاں درست ثابت ہوئی ہیں۔“

پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ ”میری فردا جلد ہی مجھے ملے گی، یہ بابا کی تیسری پیش گوئی تھی۔ ابھی خدا جانے کہاں ہوگی؟ میں نے کئی بار فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ پتا نہیں، اس کا فون کیوں بند تھا؟ اب میرا فون گم ہو گیا ہے۔ وہ رابطہ کرے گی تو میری طرح مایوس ہوتی رہے گی۔“

http://digestpk.blogspot.com/

شام تک رشتے داروں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ جبار نے

آمنہ اور صادق حسین سے کہا۔ ''جتنی جلدی ہو سکے، عدنان اور ماہم کی منگنی کی رسم ادا کی جائے۔ میں چاہوں گا، اسی سال ان کی شادی ہو جائے۔''

کامران نے کہا۔ ''ابو! میں نے اپنے لیے ایک شریکِ حیات پسند کی ہے۔ میں چاہتا ہوں، آپ اور امی اسے دیکھ لیں۔ اس کے والدین سے ملاقات کریں۔ پھر ایک ہی دن ہم دونوں بھائیوں کی منگنی کر دی جائے۔''

انہوں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''لڑکی کا نام کیا ہے؟ اس کے والد کے متعلق بتاؤ؟''

''اس کا نام فروا جمال ہے اور اس کے والد جمال جمشید بہت بڑے بزنس مین ہیں۔''

صادق حسین نے کہا۔ ''وہ تو میرے شناسا ہیں۔ جب بھی لندن آتے ہیں، مجھ سے ملاقات ضرور کرتے ہیں۔ ہم کل ہی ان سے ملنے جائیں گے۔''

جبار نے کہا۔ ''آپ ان سے ملیں، رشتہ طے کریں پھر منگنی کی رسومات کے لیے تاریخ مقرر کی جائے گی۔''

ماہم باہر لان میں عدنان سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ دونوں اسکول کے زمانے سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ان کی محبت کالج میں پروان چڑھتی ہوئی رشتۂ ازدواج تک پہنچنے والی تھی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔

جبار ہدائی نے پورچ میں کار کے پاس آ کر آواز دی۔ ''کم آن ماہم! ہم گھر جا رہے ہیں۔''

عدنان نے ماہم سے کہا۔ ''جاؤ۔ میں رات کو کال کروں گا۔''

وہ باپ کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے احاطے سے باہر آیا۔ پھر بولا۔ ''یہ جو تمہارے عدنان کا گمشدہ بھائی آیا ہے۔ یہ جمال جمشید کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اس گھر میں تمہارے مقابلے پر ایک بڑی بہو ہوگی۔ میں نے تو یہ سوچ کر تمہارا رشتہ کیا تھا کہ وہاں تم اکیلی راج کرو گی۔''

''کوئی بات نہیں ڈیڈ! عدنان مجھے بہت چاہتا ہے۔ بس مجھے اس کی محبت چاہیے۔''

''محبت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ کتنی ہی خواہشیں بھوکی رہ جاتی ہیں۔ تمہاری ایک الگ حیثیت نہیں ہوگی۔ تم اپنی ہر ضرورت، ہر خواہش پوری نہیں کرو گی۔ وہاں بڑی بہو سے کتر ہو گی تو یہ میرے مزاج کے خلاف ہوگا۔ مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا۔''

پھر اس نے دل میں سوچا۔ ''کیا تو تھا، کم بخت قسمت کا دھنی ہے، بچ گیا۔''

ماہم نے پوچھا۔ ''ڈیڈ! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''کچھ نہیں یہ میرا معاملہ ہے۔ میں نمٹ لوں گا۔''

''یہ آپ کا نہیں، میرا معاملہ ہے۔ مجھے ساری زندگی عدنان کے ساتھ گزارنی ہے۔''

''تم نادان ہو۔ یہ نہیں جانتیں کہ خود کو برتر بنائے رکھنے کے لیے اپنے کسی معاملے میں کسی کو حصے دار نہیں بنانا چاہیے۔''

''جس طرح آپ نے اپنے بھائیوں کو کاروبار میں اور میرے دادا کی جائداد میں حصے دار نہیں بنایا، انہیں گولی ماردی؟''

باپ کے لیے یہ چونکا دینے والی بات تھی کہ اتنا اہم راز بیٹی کیسے جانتی ہے؟

اس نے فوراً ہی کار کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے اسے سڑک کے کنارے روکا۔ پھر بیٹی کو گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تم کیا بکواس کر رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''ڈیڈ! ہم تنہا ہیں، یہاں کوئی تیسرا نہیں ہے اور میں دشمن نہیں ہوں، آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کی کوئی بات عدنان کے سامنے بھی میری زبان پر نہیں آئے گی۔''

وہ خوشی سے جھوم کر بیٹی کی پیشانی کو چوم کر بولا۔ ''تم سو فیصد میرا لہو ہو۔ مجھ پر گئی ہو۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں۔ اب تم دیکھو گی، میں تمہارے عدنان کے کسی حصے دار کو اس خاندان میں رہنے نہیں دوں گا۔''

''آپ کیا کرنا چاہتے ہیں...؟''

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے یہ بتاؤ، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے اپنے بھائیوں کو راستے سے ہٹایا ہے؟''

''یہ دو روز پہلے کی بات ہے۔ آدھی رات کے بعد میرے سر میں درد ہو رہا تھا، طبیعت گھبرا رہی تھی۔ ایسے وقت میں آپ کے پاس آ جاتی ہوں۔ آپ ڈاکٹر کو کال کرتے ہیں۔ میرا دل بہلاتے ہیں۔

اس رات میں آپ کی کھڑکی کے پاس آ کر رک گئی۔ آپ فون پر زبیر انکل سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں اپنے کمرے میں سو رہی ہوں۔ اب آپ خود سمجھیں کہ اس وقت کیا باتیں کر رہے تھے؟''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ عدنان کا ایک اور بھائی کامران ہے اور وہ آبائی جائداد کا حصے دار بننے کے لیے آ رہا ہے تو میرا سکون برباد ہو گیا۔ میں

تمہیں اس گھرانے کی واحد مالکن بنانا چاہتا ہوں اور وہ کباب میں ہڈی بن رہا ہے۔''

وہ کار کو ایک راستے پر موڑتے ہوئے بولا۔ ''میں فون پر زبیر سے کہہ رہا تھا، جس طرح میں نے حصے دار بننے والے بھائیوں کو اپنے راستے سے ہٹایا ہے۔ اسی طرح میں اپنے داماد کے کسی حصے دار کو برداشت نہیں کروں گا۔''

''آپ میری بہتری کے لیے بول رہے تھے اور صرف زبیر انکل کو رازدار بنا رہے تھے۔ میں نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی۔ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔''

وہ اسٹیئرنگ پر باپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''اتنا تو سمجھتی ہوں کہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے اپنے مال کی اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ایسے معاملات میں شوہر کے سوا کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔''

''شاباش بیٹی! تم باپ کے نقشِ قدم پر چلتی رہو گی تو سسرال میں صرف تمہاری حکمرانی رہے گی۔ عدنان اپنے والدین کا تنہا وارث ہوگا۔ اس طرح صرف تم اور تمہارے بچے کروڑوں کی دولت اور جائداد سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔''

''میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ ہی کی طرح زندگی گزاروں گی۔ بس میرے عدنان کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''اسے کبھی کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ میرا ہونے والا داماد ہے۔ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔''

یہ انسانی فطرت ہے، اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے ناجائز راستہ آسان ہو تو اسے جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور جو ایسا سمجھ لیتا ہے، اسے آسمانی ہدایات بھی سمجھا نہیں پاتیں۔ جرائم کی راہیں اسی طرح ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں۔

دوسرے دن کامران اپنے والدین کے ساتھ جمال جمشید کی کوٹھی پہنچا تو گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ نے کہا۔ ''یہاں کوئی نہیں ہے۔ سب ہی اسلام آباد میں ہیں۔ کل یا پرسوں تک آئیں گے۔''

صادق حسین نے کہا۔ ''جمال جمشید کا فون نمبر بتاؤ۔ ہم ان سے بات کریں گے۔''

گارڈ نے کہا۔ ''ہمیں اپنا نمبر دیں۔ ہم صاحب تک آپ کا نمبر اور پیغام پہنچا دیں گے۔ پھر وہ چاہیں گے تو خود ہی آپ سے رابطہ کریں گے۔''

صادق نے اپنا نمبر بتایا اور کہا۔ ''ان سے کہو، لندن سے ان کا ایک شناسا صادق حسین آیا ہے۔ ان سے ابھی بات کرنا چاہتا ہے۔''

اُدھر فروا اپنے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ اسلام آباد میں تھی۔ اس کے ساتھ جو واردات ہوئی تھی، اس سلسلے میں انہیں دو دن کے لیے وہاں روک لیا گیا تھا۔

لیکن دو دن کے بجائے چار دن لگ گئے۔ ہوا یہ کہ جواد پشاور کے راستے سرحد پار کر کے افغانستان جاتے ہوئے پکڑا گیا۔ اسے اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔ اس نے فروا کے سامنے اپنا جرم قبول کر لیا۔

فروا کا کیس مضبوط ہو گیا۔ اگرچہ اس نے دو قتل کیے تھے مگر اپنی حفاظت کی خاطر کیے تھے۔ انہیں لاہور جانے کی اجازت دے دی گئی۔

ایسے ہی وقت ان کے سیکورٹی گارڈ نے صادق حسین کا نمبر اور پیغام پہنچایا۔ جمال جمشید نے اس نمبر پر رابطہ کیا پھر پوچھا۔ ''ہیلو حسین صاحب! کیا آپ لاہور آئے ہوئے ہیں؟''

صادق نے کہا۔ ''میں آپ کے دروازے سے واپس جا رہا ہوں۔''

''میں آج شام تک آ رہا ہوں۔ آپ کا قیام جہاں بھی ہے، وہاں آ کر ملاقات کروں گا۔''

''آپ نہ آئیں۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ آپ کے گھر آؤں گا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ کامران میرا بیٹا ہے، جسے آپ لاوارث سمجھ رہے ہیں۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''کیا واقعی آپ کامران کے والد ہیں؟''

''جی ہاں۔ میں اس کی والدہ کے ساتھ آپ کے گھر رشتہ مانگنے آؤں گا اور خاندانی تجرہ بھی پیش کروں گا۔''

''شرمندہ نہ کریں۔ بھلا آپ کے خاندان کو کون نہیں جانتا؟ میں لاہور پہنچتے ہی آپ کو فون کروں گا۔''

پھر فروا کی آواز سنائی دی۔ ''انکل! السلام علیکم۔ میں آپ کے دوست کی بیٹی فروا بات کر رہی ہوں۔''

صادق نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''میرا بیٹا تمہارے گم ہونے پر بہت پریشان ہے۔ لو اس سے بات کرو۔''

فروا نے چند لمحوں میں دھڑکتے ہوئے دل سے کامران کی آواز سنی۔ ''ہیلو فروا! کیسی ہو؟ کہاں گم ہو گئی تھیں؟ میں نے کئی بار رابطہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ پھر میرا اپنا فون گم ہو گیا۔''

http://digestpk.blogspot.com/

وہ بولی۔ ''تقدیر میں جو پریشانیاں لکھی ہوتی ہیں، انھیں جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ کیا تم نے نیا فون لیا ہے؟''

''ہاں۔ تم اپنا نیا نمبر بتاؤ۔ میں ابھی کال کروں گا۔''

اس نے اپنا نمبر بتا کر رابطہ ختم کردیا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنے ذاتی فون پر آدھی ملاقات کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے طویل مدت کے بعد ایک دوسرے کی آوازیں سن رہے ہوں۔

فردا نے اسے اپنی روداد سنائی تو وہ حیرت اور مسرت سے بولا۔ ''تم نے واقعی غیر معمولی دلیری دکھائی ہے۔ یہ سن کر بھی یقین نہیں ہو رہا ہے کہ تم نے تنہا تین دشمنوں کو زیر کیا۔ دو کو موت کے گھاٹ اتارا اور ایک کو قانون کی گرفت میں پہنچا دیا۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں۔''

پھر کامران نے اپنی روداد سنائی کہ اس پر بھی کسی انجانے دشمن نے گولیاں چلائی تھیں لیکن وہ فردا کو خوشیاں دینے کے لیے زندہ سلامت ہے۔

پھر اس نے بتایا کہ اس کے بچھڑے ہوئے ماں باپ کس طرح اچانک مل گئے ہیں؟ اس کے لیے سب سے خوش آئند بات یہ ہے کہ اب کوئی اسے لاوارث نہیں کہے گا۔

وہ گھنٹوں فون پر باتیں کرتے رہے۔ پھر شام کو روبرو ملاقات ہوئی۔ کامران پہلی بار اپنے والدین کے ساتھ ان کی کوٹھی میں آیا۔ اس کوٹھی میں فردا کی پھوپھی اور ماموں کا داخلہ ممنوع ہو چکا تھا۔ باقی جو رشتے دار تھے، وہ کامران کا موجودہ اسٹیٹس دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

جمال جمشید نے صادق حسین سے کہا۔ ''میری بیٹی نے مجھے بتایا ہے کہ کامران آپ سے کیسے بچھڑ گیا تھا؟ آپ کے ساتھ اور کامران کی والدہ کے ساتھ کیسے کیسے حالات پیش آتے رہے، یہ روداد میں نے سن لی ہے۔ میں کامران کو دل سے قبول کرتا ہوں۔''

فی الحال کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ اگر کوئی تھی تو ابھی در پردہ تھی۔ ابھی تو چنے بولنے اور ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت گانے کے دن آ گئے تھے۔

تمام بزرگوں نے یہ طے کیا کہ منگنی نہ کی جائے۔ اپنے بچوں کی شادی کردی جائے۔ بچے کہلانے والے جوان خوش ہوگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی اُن کے من کی مرادیں پوری ہو رہی تھیں۔

آمنہ اور صادق حسین ایک دن کامران کی برات لے کر گئے اور فردا کو بہو بنا کر لے آ گئے۔ دوسرے دن عدنان کی برات جبار کے دروازے پر گئی۔ دوسری بہو ماہم بھی آ گئی۔

فردا اور کامران نے بڑے حوصلے سے عداوتیں کرنے والوں کو زیر کیا تھا۔ ایک تھکا دینے والے انتظار کے بعد سہاگ کی پھولوں بھری سیج تک پہنچے تھے۔ وہ بڑے ارمانوں سے گھونگھٹ میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔

کامران نے اس ماڈرن لڑکی کو روزے نماز کے علاوہ حجاب میں رہنا سکھایا تھا۔ وہ سچ مچ گھونگھٹ کے پیچھے شرما رہی تھی۔ کامران نے اس کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''فردا! ہم اتنے دنوں تک پاس رہ کر بھی دور دور رہے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے تھے۔ اب صبر نہیں ہوگا۔ میں کوئی رسمی گفتگو نہیں کروں گا۔''

اس نے یہ کہتے ہی گھونگھٹ کو الٹ دیا۔ اسے کھینچ کر اپنی دھڑکنوں سے لگا لیا۔ وہ بھی بے قرار تھی۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ اس کی آغوش میں کھلتی چلی گئی۔ وہ محض دو چار منٹ کی قربت تھی۔ اس کے بعد اچانک ہی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ باہر سے کوئی عداوت کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ خود ہی اس سے الگ ہوگئی۔

کامران نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ شرماتے اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''پلیز آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جائیں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیوں...؟''

وہ بولی۔ ''پلیز۔ کوئی سوال نہ کریں۔''

وہ بیڈ سے اترتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ دلہن اپنے دولہا کو حجلۂ عروسی سے بھگا دیتی ہے۔''

وہ دروازے کے باہر جاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔''

وہ بیڈ روم سے نکل کر باہر آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ وہ کمرے میں کیا کر رہی ہے؟ ویسے کچھ بھی کر رہی ہے، مجھ سے کیوں چھپا رہی ہے؟''

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ یہ سچ ہے، عورت ایک پہیلی ہے۔ اسے بوجھتے بوجھتے زندگی گزر جاتی ہے۔

آدھے گھنٹے کے بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اندر آیا۔ فردا لباس بدل چکی تھی۔ سر جھکا کر اس کے سینے سے لگ گئی، وہ اس کے چہرے پر جھک کر بولا۔ ''ایک لباس بدلنے کے لیے مجھے باہر کر دیا تھا؟''

اس نے دھیمی سی سرگوشی کی۔ سرگوشی ایسی تھی کہ وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ ساحل پر تھا اور بہتی ہوئی ندیا کہہ رہی تھی۔ ''پیاسے رہو۔''

ماہم اور عدنان کے نصیب میں ازدواجی مسرتیں تھیں۔ ماہم پر سحر طاری ہو گیا۔ اس نے سہیلیوں سے سنا تھا، کتابوں میں پڑھا تھا کہ سہاگ کی پہلی رات ایسی ہوتی ہے، جسے عورت کبھی بھول نہیں پاتی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ ''عدنان کی قربت میں یہ کیسی جادوگری ہے؟''

وہ اب تک باپ سے زیادہ متاثر تھی۔ عدنان کی حیثیت ثانوی تھی۔ اس رات عدنان اہم ہو گیا، باپ پس پشت چلا گیا۔

جبار ہمدانی فی الحال خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ کامران کی خوش نصیبی تھی کہ اس کے ہتھے نہیں چڑھ رہا تھا۔

ماہم باپ کے ارادوں کو سمجھ رہی تھی۔ ازراہِ انسانیت کسی طرح کا اعتراض نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ باپ جو کچھ کر رہا تھا، اس کی بہتری کے لیے ہی کر رہا تھا۔

شادی کے پانچویں دن فردا میکے گئی۔ وہ اور کامران کنوارے بیاہتا تھے۔ وہ اس سے پوچھتا رہتا۔ ''اور کتنا انتظار کراؤ گی؟''

وہ ذرا شرماتے ہوئے بولی۔ ''تھوڑا سا انتظار اور بس...''

وہ بولا۔ ''کل کبھی نہیں آتا۔ تم کہہ رہی ہو تو شاید آجائے۔''

وہ میکے میں تھی۔ فون پر باتیں ہو رہی تھیں۔ عدنان نے آ کر کہا۔ ''بھائی! میں اور ماہم ابو کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''اور امی...؟''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم دو چار گھنٹوں میں واپس آجائیں گے۔ کھانا اور فنگر فش وغیرہ لے کر آئیں گے۔ امی بڑے شوق سے فنگر فش کھاتی ہیں۔''

وہ شاپنگ کے لیے چلے گئے۔ آمنہ ان کے ساتھ نہ جا سکی۔ اپنے بیڈ روم میں آرام سے لیٹی رہی۔ کوٹھی میں اور کوئی نہیں تھا۔ ایسے وقت جبار ہمدانی وہاں پہنچ گیا۔

آمنہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ حیرانی سے بولی۔ ''آپ...؟ آپ دستک دیے بغیر میرے کمرے میں آگئے۔ کیا بات ہے؟''

وہ بولا۔ ''بات یہ ہے کہ عدنان میرا داماد ہے۔ عدنان کے باپ کے مرتے ہی تم نے دوسری شادی کرلی۔ ایک شوہر کے ساتھ پلا پلایا بیٹا بھی لے آئیں۔''

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ آمنہ کے پاس رکھے ہوئے فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ جبار نے فوراً ہی ریوالور نکال کر اس کا نشانہ لیتے ہوئے دھمکی دی۔ ''فون اٹینڈ کرو۔ مگر خبردار! کسی سے نہ کہنا، میں یہاں تمہارے کمرے میں ہوں۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''جبار بھائی! یہ آپ کیسی حرکتیں کر رہے ہیں؟''

''زیادہ نہ بولو۔ فون سنو۔ کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی بات، کوئی حرکت میرے خلاف ہوگی تو میں گولی مار کر چلا جاؤں گا۔''

آمنہ نے ریوالور کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ''ہیلو کون...؟''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''میں فردا بول رہی ہوں۔ کامران اپنا فون اٹینڈ نہیں کر رہے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

''بیٹی! وہ اپنے ابو کے ساتھ شاپنگ کے لیے گیا ہے۔ لگتا ہے فون یہاں بھول گیا ہے۔ واپس آئے گا تو تمہیں کال کرے گا۔''

وہ فون بند کر کے بولی۔ ''جبار بھائی! ریوالور کو سامنے سے ہٹائیں۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''کیا اب تک یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟ عدنان کے باپ نے جو دولت اور جائداد چھوڑی ہے، میں اس میں کامران کی حصے داری نہیں چاہتا۔''

''آپ جانتے ہیں، عدنان کا باپ عیاش تھا۔ اپنی دولت پانی کی طرح بہا کر گیا ہے۔ یہ جو کروڑوں کی جائداد ہے، وہ میں اپنے میکے سے لائی ہوں۔ پھر یہ کہ میرے شوہر صادق حسین اب بہت ہیں۔ عدنان کو ان کی جائداد میں سے بھی حصہ ملے گا۔''

جبار نے کہا۔ ''جب کامران اس دنیا میں نہیں رہے گا تو میرا داماد اب بیٹی بن جائے گا۔ یہاں صرف میری بیٹی کی حکمرانی رہے گی۔''

''یہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں؟ میرا کامران اس دنیا میں کیوں نہیں رہے گا؟ خدا اسے میری بھی عمر دے۔ آپ کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں؟''

''ابھی یہ صرف باتیں ہیں۔ مگر افسوس! تم اس کا انجام دیکھنے کے لیے...

http://digestpk.blogspot.com

تمہاری موت ضروری ہے۔ کیونکہ تم زندہ رہوگی تو آئندہ دوسرا تیسرا کامران پیدا کرتی رہوگی۔ تمہاری موت کے بعد میرے داماد کا کوئی حصے دار پیدا نہیں ہوگا۔"

یہ کہہ کر اس نے آمنہ کا نشانہ لیا اور... ٹریگر دبا دیا۔ دھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی لیکن وہ دوسری طرف چلی گئی۔ عین وقت پر کامران نے اس پر چھلانگ لگادی تھی۔

وہ فردا سے پرسل گفتگو کرنے کی خاطر اپنا فون لینے کے لیے واپس آیا تھا۔ عین وقت پر اس نے ماں کی جان بچائی تھی۔ چھلانگ لگانے کے نتیجے میں وہ دونوں فرش پر گرے۔ کامران نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑلیا تھا۔ اس سے ریوالور چھیننے کی کوشش کررہا تھا۔

وہ نیچے تھا اور کامران اوپر۔ دونوں زور آزمارہے تھے۔ ریوالور کی نال کبھی کامران کی طرف آرہی تھی، کبھی جبار کی طرف جارہی تھی۔ آمنہ بیٹے کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ فون پر نمبر پنچ کررہی تھی۔ رابطہ ہونے پر صادق کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو...!"

وہ چیخ کر بولی۔ "جلدی آئیں۔ ہمارے بیٹے کی جان خطرے میں ہے۔ یہ جبار ہمدانی پاگل ہوگیا ہے۔ مجھے گولی مارنے آیا تھا۔ عین وقت پر کامران نے آکر مجھے بچالیا مگر اب اس کی جان خطرے میں..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فائر کی زوردار آواز گونجی اور آمنہ کے ہاتھوں سے فون چھوٹ گیا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔

بیٹا دشمن پر سوار تھا اور ساکت ہوگیا۔ وہ دونوں ہی بےحس وحرکت تھے۔ جیسے موت نے دونوں کو آدبوچا ہو۔

یہ چند لمحوں کا تجسس تھا۔ پھر کامران کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ریوالور ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ آمنہ دوڑتی ہوئی بیٹے سے لپٹ گئی۔ سامنے جبار کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے سے ابلنے والا لہو فرش پر پھیل رہا تھا۔

بیڈ پر رکھا ہوا فون چیخنے لگا۔ کامران نے اسے اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے صادق حسین کہہ رہا تھا۔ "ہیلو آمنہ! ہیلو... ابھی میں نے گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔ ہمارا بیٹا خیریت سے ہے نا؟"

وہ بولا۔ "جی ابو! یہ جبار ہمدانی امی کو قتل کرنے آیا تھا۔ خدا کا شکر ہے، امی محفوظ ہیں۔ گولی جبار کو لگی ہے۔ یہ مر چکا ہے۔ آپ جلدی آئیں۔"

"میں راستے میں ہوں، بس پہنچنے والا ہوں۔"

صادق حسین کار ڈرائیو کررہا تھا۔ اس نے فون بند کرتے ہوئے عقب نما آئینے میں ماہم کو دیکھا۔ وہ عدنان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "ماہم! کیا تمہارا باپ بہت زیادہ نشہ کرنے لگا...؟ وہ ابھی عدنان کی امی کو گولی مارنے آیا تھا۔"

وہ گھبرا گئی، سمجھ گئی کہ باپ واردات کرتے ہوئے اس کے سسرال والوں کی نظروں آگیا ہے۔ وہ انجان بن کر بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

عدنان نے کہا۔ "جبار انکل خوامخواہ امی سے کیوں دشمنی کریں گے؟"

"کیا تمہاری امی جھوٹ کہہ رہی ہیں؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں۔ جب امی کہہ رہی ہیں تو بات درست ہوگی۔"

"اگر کامران عین وقت پر نہ پہنچتا تو وہ تمہاری ماں کو گولی ماردیتا۔ اب خود ہی جہنم میں پہنچ گیا ہے۔"

ماہم چیخ پڑی۔ "نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

صادق نے کہا۔ "سوری۔ میں اس کی موت پر افسوس نہیں کروں گا۔ وہ موت کا جو گڑھا کھودنے آیا تھا، اس میں خود گرچکا ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں ڈیڈی کے پاس جاؤں گی۔"

صادق نے کہا۔ "ہم وہیں جارہے ہیں۔"

وہ روتے ہوئے عدنان کے بازو سے لگ گئی۔ عدنان نے بڑی آہستگی سے اسے ہٹایا پھر ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ "مجھ سے دور رہو۔ پہلے میں اپنی ماں کی زبان سے سچ سنوں گا۔ اس کے بعد تم اپنے باپ کی لاش کے ساتھ میکے جاؤ گی۔ پھر واپسی کا راستہ بھول جاؤ گی۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "ایسے وقت تمہیں تسلی دینی چاہیے اور تم دل توڑنے والی بات کررہے ہو؟"

"تم میری ماں کے دشمن کی بیٹی ہو۔ یہی بہت ہے کہ ابھی تمہیں اپنے قریب برداشت کررہا ہوں۔"

اسی اثنا میں وہ کوٹھی پہنچ گئے۔ ماہم دوڑتی ہوئی اسی کمرے میں آئی۔ پھر باپ کی لاش کے پاس گر کر رونے لگی۔ آمنہ نے عدنان کو بتایا کہ جبار اس ارادے سے قتل کرنے آیا تھا کہ آئندہ وہ کوئی اولاد پیدا نہ کرے۔ وہ کروڑوں اربوں کی جائداد میں عدنان کا حصے دار نہیں چاہتا تھا۔ کامران کو بھی قتل کرنے کا ارادہ کرچکا تھا۔

صادق حسین نے فون کے ذریعے پولیس کو اس سانحے

کی اطلاع دی۔ کامران فردا کو فون پر بتاچکا تھا کہ وہاں کیسی واردات ہوچکی ہے؟ فردا نے اپنے باپ کو بتایا کہ کامران مشکل میں پڑنے والا ہے۔

وہ باپ بیٹی ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہاں پہنچے تو پولیس ان سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ اپنے طور پر کارروائی کررہی تھی۔ انہوں نے کامران کو حراست میں لے لیا تھا۔

جمال جمشید نے ہوم منسٹر سے رابطہ کیا۔ اسے بتایا کہ اس کا داماد کس قدر نیک سیرت اور عبادت گزار ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس دیندار نوجوان کی سفارش کی جائے۔

ہوم منسٹر نے پولیس افسر سے فون پر بات کی۔ افسر نے کہا۔ "سر! یہ ثابت ہونا چاہیے کہ مقتول ریوالور لے کر قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ جبکہ وہ اس گھر میں اپنی بیٹی کو دلہن بناچکا ہے۔ وہ اس گھر میں واردات کرنے کیوں آئے گا؟ اس واردات کے اور بھی بہت سے پہلو جواب طلب تھا۔ ہمیں مجبوراً کامران کو حراست میں رکھنا ہوگا۔ آپ چاہیں تو کل عدالت سے ضمانت نامہ حاصل کرکے اسے عارضی رہائی دلاسکتے ہیں۔"

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔ اونچی سفارش کے باعث کامران کو ہتھکڑی نہیں پہنائی گئی لیکن اسے حوالات پہنچادیا گیا۔

فردا رونے لگی۔ باپ نے تسلی دی کہ اسے ضمانت پر رہا کرالیا جائے گا۔ لیکن قتل کی واردات تھی۔ جب تک پولیس کی تفتیشی رپورٹ عدالت میں نہ پہنچتی اور کیس کامران کے حق میں کمزور نہ ہوتا، تب تک عدالت سے ضمانت نامہ حاصل نہ ہوتا۔

اور توقع کے خلاف یہ کیس کامران کے خلاف ہوگیا۔ پولیس نے معلوم کیا کہ وہ ریوالور لائسنس یافتہ نہیں تھا۔ غیر قانونی تھا۔ یہ ثابت نہیں ہوسکتا تھا کہ جبار ہمدانی وہ ریوالور لے کر قتل کی نیت سے آیا تھا۔

اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ آمنہ کو کیوں قتل کرے گا؟ جبکہ اس کا سمدھی بن چکا تھا۔ پہلے کبھی آمنہ سے دشمنی نہیں تھی۔ دونوں گھرانوں میں بہترین تعلقات تھے۔ وہ اچانک دشمن کیوں بن گیا؟

آمنہ کا یہ بیان قابل قبول نہیں تھا کہ جبار اپنے داماد عدنان کو تمام دولت اور جائداد کا تنہا وارث بنتے دیکھنا چاہتا تھا اور اسی مقصد کے لیے کامران اور آمنہ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

آمنہ کو اس لیے ہلاک کرنا چاہتا تھا کہ اس کی موت کے بعد پھر کوئی وارث پیدا نہیں ہوگا۔ یہ کہا جارہا تھا کہ آمنہ اپنے بیٹے کامران کو بچانے کے لیے باتیں بنارہی ہے۔

سرکاری وکیل کہہ رہا تھا، کامران اور جبار کے درمیان پہلے سے دشمنی چلی آرہی تھی۔ جو کسی کے علم میں نہیں تھی۔ کامران اپنے پاس غیر قانونی اسلحہ رکھتا تھا۔ جبار ریوالور لے کر اس کے گھر نہیں گیا تھا۔

جبکہ کامران کا بیان تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے ریوالور چھیننا چاہتے تھے۔ کامران نے اپنی اور اپنی ماں کی سلامتی کے لیے گولی چلائی تھی۔

ریوالور کے لیے چھینا جھپٹی ہوئی تھی یا نہیں؟ اسے کامران کا من گھڑت بیان سمجھا جارہا تھا۔ اہم نقطہ یہ تھا کہ اس نے گولی چلائی تھی۔ وہ اقبالِ جرم کرچکا تھا۔

آمنہ اور صادق حسین نے بائیس برس کے بعد بیٹے کو حاصل کیا تھا۔ اسے اپنا نام دیا تھا لیکن عدالت میں کہا جارہا تھا کہ اس کی ماں آمنہ تو ہے مگر صادق حسین اس کا باپ نہیں ہے۔ وہ آمنہ کے گناہ کو چھپانے کے لیے کامران کو باپ کا نام دے رہا ہے۔

بائیس برسوں تک لاوارث رہنے کے نتیجے میں اس کی پیدائش کئی پہلوؤں سے مشکوک ہوگئی تھی۔

اور یہی قتل کی وجہ تھی کہ جبار نے اسے ناجائز کہا تھا۔ ناقابلِ برداشت گالی دی تھی اور کامران نے طیش میں آکر اسے گولی ماردی تھی۔

یہ ثابت ہورہا تھا کہ وہ قاتل ہے اور جبار بےگناہ ثابت ہورہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے اس کے سسرال آیا تھا اور کامران نے اسے دشمنی کی بنا پر ہلاک کردیا۔

اس قتل کی ایک اور ٹھوس وجہ بیان کی گئی کہ جبار ہمدانی کامران کو لاوارث ہی کہتا آرہا تھا اور یہ کہ وہ گناہ کی پیداوار ہے۔ اسے مصلحتاً جائز قرار دیا جارہا تھا اور جبار اسے جائز تسلیم نہیں کررہا تھا۔ یہی ان کے درمیان دشمنی کی بنیادی وجہ تھی۔

فردا چپ تھی۔ بظاہر آنکھیں خشک تھیں مگر اندر آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ عجب سہاگن تھی، ازدواجی مسرتوں کی ایک رات بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

وہ جیل میں کامران سے ملنے گئی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ "پتا نہیں، خدا کو کیا منظور ہے؟ وہی جانتا ہے کہ ان سلاخوں سے باہر آسکوں گا یا نہیں؟ ہمیں زندگی کی مسرتیں حاصل ہوسکیں گی یا نہیں؟"

وہ دونوں ہی دن رات عبادت کرتے تھے اور عدالت

http://digestpk.blogspot.com/

تھے۔ مقدمہ رخ بدلتا جارہا تھا۔ اس کے خلاف ہوتا جارہا

تھا۔

وہ ازل سے بدنصیبی لکھوا کر لایا تھا۔ ماں اور باپ کے ساتھ رہنا نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ اب فردا کی محبت اور قربت ملتے ملتے چھن گئی تھی۔

کچھ یہی حال ماہم کا تھا۔ اس نے عدنان کے ساتھ ازدواجی مسرتوں کے پانچ دن گزارے تھے۔ پھر عدنان نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ آمنہ اپنی زندگی سے بھی نکل لنے والا تھا۔

وہ کہنے لگی۔ ''میں موت سے پہلے تمہاری زندگی سے نہیں نکلوں گی۔ میری محبت، میری وفاؤں کو سمجھو۔ تم ہی میری زندگی میں پہلے ہو اور آخری ہو۔ تمہارے سوا کسی کا منہ نہیں دیکھوں گی۔''

پھر ایک ماہ بعد ہی وہ امید سے ہو گئی۔ عدنان اور زیادہ اس کے حواس پر چھا گیا۔ اگرچہ دور ہو گیا تھا لیکن جان سے زیادہ قریب آچکا تھا۔ اس کی کوکھ کے اندر دستک دے رہا تھا کہ دروازہ کھولو میں آگیا ہوں...

اس نے دوسرے مہینے فون پر کہا۔ ''عدنان! آجاؤ۔ الٹرا ساؤنڈ سے معلوم ہوا ہے، بیٹا ہوگا اور وہ ضرور تمہارے جیسا ہوگا۔''

عدنان نے کہا۔ ''یقیناً میں اسے چومنا اور سینے سے لگائے رکھنا چاہوں گا لیکن پہلے وہ کرو، جو میں کہتا ہوں۔ میرے بھائی کے خلاف بیان بدل دو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ تمہارے باپ نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیکی نہیں کمائی۔ میری امی سے اور بھائی سے دشمنی کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو اس کی کمزوریاں بیان کرو۔''

''تم چاہتے ہو میں اپنے مظلوم اور مقتول ڈیڈی کے کیس کو کمزور بنا دوں۔ میرے ڈیڈی کی روح مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں ایک بیٹی ہوں۔ اپنے باپ کے لیے انصاف ضرور چاہوں گی۔''

چھ ماہ تک فون کے ذریعے بحث و تکرار ہوتی رہی۔ آخر عدالت نے کامران کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس روز جج کی آواز فردا کے کانوں میں صورِ اسرافیل کی طرح گونجی۔ وہ ایسے لرز گئی کہ کھڑے کھڑے گر پڑی۔

ایک موہوم سی امید تھی۔ عدالت عالیہ میں اپیل کرنے سے شاید روٹھی ہوئی تقدیر مان جاتی۔ رہائی تو نہ ملتی، شاید سزائے موت عمر قید میں بدل جاتی۔ ایسا کچھ ہو سکتا تھا۔ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا رہ گیا تھا۔

فردا جب اس سے بچھڑی تھی تو یہ اصرار رہتا تھا کہ فون کے ذریعے نصف ملاقات ہوتی رہے گی۔ پھانسی پانے والے قیدی سے یہ رعایت چھین لی گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی آواز بھی نہیں سن سکتے تھے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سزائے موت پر عمل نہیں ہو رہا تھا۔ کامران سے پہلے بھی سزائے موت پانے والے دو قیدی اپنے آخری دنوں کا انتظار کر رہے تھے۔ موت ابھی ٹل رہی تھی۔ اس کے باوجود اٹل تھی۔ کسی دن کامران کو تختہ دار پر اپنی سانسوں سے رخصت ہونا تھا۔

آمنہ روتی رہتی۔ عبادت کرتی رہتی کہ جو بیٹا پیدا ہوتے ہی بچھڑ گیا تھا، وہ ملتے ہی پھر بچھڑ جانے والا تھا۔

وہ صادق سے رو رو کر کہتی۔ ''میرا بیٹا میری جان بچا کر اپنی جان پر کھیل رہا ہے۔ اسے بچا لیں۔ سیدھے راستے سے رہائی نہیں مل رہی ہے تو کسی چور دروازے سے نکال لائیں۔ ہم اسے کسی دوسرے ملک لے جائیں گے۔''

صادق حسین کچھ زیادہ بولتا نہیں تھا مگر بیٹے کے لیے اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ اس ملک میں اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھنے والے اور قانون بنانے اور بگاڑنے والے سب ہی بک جاتے ہیں۔ وہ درپردہ عدالت کا فیصلہ بدلنے کے لیے متعلقہ عہدیداروں کو بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے انہیں خریدنا چاہتا تھا۔ بیٹے کو بچانے کے لیے طرح طرح کی تدابیر پر عمل کر رہا تھا۔

ان ہی دنوں ماہم نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بچہ باپ کی طرح خوبرو اور صحت مند تھا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی عدنان کے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف کال بیل پہنچی لیکن اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ فون بند کر دیا۔

اس سے پہلے بھی اس نے یہی کیا تھا۔ یہ کہہ چکا تھا کہ فون پر بھی اس سے بات نہیں کرے گا۔ ماہم نے کئی بار اسے خوشخبری سنانے کی کوشش کی پھر تھک ہار کر رونے لگی۔

اس نے اپنے محبوب شوہر کے بچے کو جنم دیا تھا۔ اسے یہ خوشخبری سنائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے سم بدل کر فون کیا تو اپنی ساس آمنہ کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو کون...؟''

اس نے کہا۔ ''آپ دادی بن گئی ہیں۔ اگر پوتے کی ایک جھلک دیکھ لیں گی تو خوشی سے جشن منائیں گی۔''

آمنہ نے کہا۔ ''بے شک۔ یہ بہت بڑی خوشخبری ہے لیکن تمہارے شیطان باپ نے ہماری آنکھوں میں آنسو بھر دیے ہیں۔ ہم ہنسنا مسکرانا بھول گئے ہیں۔''

''پلیز، اپنے بیٹے سے بات کرائیں۔''

''وہ جیل میں ہے۔''

''میں عدنان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''جب تک اپنے باپ کے خلاف سچ نہیں بولو گی، تب تک عدنان کی آواز بھی سن نہیں سکو گی۔ میں اسے یہ نہیں بتاؤں گی کہ تم نے ہمارے خاندانی لہو سے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔''

آمنہ نے فون بند کر دیا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ اتنی بڑی خبر اس کے عدنان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ بری طرح تڑپنے لگی...

اس نے پھر ایک سم بدل کر اسے فون کیا۔ اس بار عدنان کی آواز سنائی دی۔ ہائے وہ تنہائیوں میں بولنے والا جادو جگانے والا کئی مہینوں کے بعد پھر بول رہا تھا۔ اس کی آواز وصال کے گزشتہ لمحات کو بیدار کر رہی تھی۔

اس نے پھر پوچھا۔ ''ہیلو کون...؟''

وہ بڑے جذب سے بولی۔ ''میں تمہارے بچے کی ماں بن گئی ہوں۔ تمہیں اس نومولود بیٹے کی قسم دیتی ہوں، مجھ سے بات کرو۔''

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ''تم نے بہت ہی اہم خبر سنائی ہے۔ لیکن تم...... میری ایک بات کا جواب دو، ابھی کوئی وہاں آئے اور ہمارے بیٹے کو سولی پر لٹکا دے تو کیا لگے گا؟''

وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی، چیخ کر بولی۔ ''نہیں۔ یہ معصوم ابھی دنیا میں آیا ہے۔ ایسی باتیں نہ کرو۔''

''میری امی سے پوچھو، ان کا کامران بھی دنیا میں آنے کے بائیس برس بعد انہیں ملا ہے۔ میرے بھائی ہمارے بیٹے کی طرح معصوم ہیں۔ تم ماں بن چکی ہو۔ میری ماں کے درد کو سمجھو۔ ابھی عدالت میں جاؤ اور بیان بدل دو۔ سچ بولو۔ میں وہاں آکر اپنے بیٹے کو سینے سے لگاؤں گا۔ تمہیں بڑی عزت سے اپنے گھر لاؤں گا۔''

وہ دوراہے پر کھڑی تھی۔ اپنے بچے کی خاطر پٹڑی بدل سکتی تھی۔ بیان بدل سکتی تھی۔ مکمل ثبوت کے ساتھ اپنے باپ کی کمزوریاں پیش کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اسی رات باپ نے خواب میں آکر کہا۔ ''بیٹی! ہرگز کمزور نہ پڑنا۔ عدنان کی نفرت عارضی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی خاطر تمہارے آگے ضرور جھکے گا۔ کامران کو سزا پانے دو۔ اس کے بعد عدنان کے تمام راستے تمہاری ہی طرف آئیں گے۔''

وہ ایسا حوصلہ افزا خواب تھا کہ وہ پہلے کی طرح اپنے

جہل خرد

دہشت گرد کا مشہور باکسر کاروس ماسٹرن امریکہ گیا۔ ایک سنسنی خیز صبح ٹیلیفون کی گھنٹی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دوسری طرف ایک اخباری نمائندہ پوچھ رہا تھا۔

''مسٹر ماسٹرن! آپ انگریزی بول سکتے ہیں؟''

باکسر نے انگریزی میں جواب دیا۔ ''صبح کے چھ بجے، ہرگز نہیں!!''

اور ریسیور رکھ دیا۔

موقف پر ڈٹ گئی۔ زمین پر زلزلہ آجائے، آسمان ہل جائے مگر وہ جھکنے والی اور بیان بدلنے والی نہیں تھی۔

ایک روز کامران کال کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس وقت آہنی سلاخوں والا دروازہ کھلا۔ عدالت کا ایک اہل کار، جیل سپرنٹنڈنٹ اور دو افسران وہاں آئے۔ اہل کار نے کہا۔ ''کامران ولد صادق حسین عدالتی حکم کے مطابق تمہاری موت کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔''

کامران نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''آج سے ٹھیک دسویں روز دس نومبر تک تمہارا دم نکلنے تک تمہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔''

وہ اجل نامہ پڑھ رہا تھا اور کامران خاموشی سے سن رہا تھا۔ اہل کار کہہ رہا تھا۔ ''عدالت نے قانون کے مطابق حکم دیا ہے کہ تمہاری آخری خواہش پوری کی جائے۔''

کامران انہیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ''میں ایک سہاگن کی پہلی خواہش پوری نہ کر سکا۔ اب آخری دنوں میں آخری خواہش بھلا کیا ہوں؟''

جیل... سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''اپنا کوئی مناسب اور قابل قبول مطالبہ پیش کرو۔ اسے تسلیم کیا جائے گا۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اپنی زندگی کی آخری چند راتیں اپنی شریکِ حیات فردا کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

ان سب نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک افسر نے کہا۔ ''کسی بھی اپنے یا پرائے کو سزائے موت پانے والے کے قریب آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ تمہاری یہ خواہش قابل قبول نہیں ہے۔''

http://digestpk.blogspot.com/

کامران نے کہا۔ ''وہ میری زندگی کی ساتھی ہے۔

اسے میری آخری سانسوں تک ساتھ رہنا چاہیے۔ میری یہ خواہش نامناسب نہیں ہے۔"

دوسرے افسر نے کہا۔ "مناسب ہے۔ لیکن ہم قانون سے مجبور ہیں۔"

"اگر بات مناسب ہے تو از راہِ ہمدردی قانون میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے۔"

"ہم تمہاری یہ اپیل عدالت تک پہنچا دیں گے۔"

"اگر میری اپیل کو رد کیا جائے گا تو پھر آخری خواہش یہ ہوگی کہ میری رد کردہ خواہش کو تمام پریس اور میڈیا تک پہنچایا جائے۔"

انہوں نے وعدہ کیا کہ اس کی کسی ایک خواہش کو پورا کیا جائے گا۔

دوسرے دن عدالت میں اس کی اپیل نامنظور ہوگئی۔ تیسرے دن یہ خبر پریس ریلیز کے طور پر جاری کی گئی کہ ٹھیک ایک ہفتے بعد کامران کو پھانسی دے دی جائے گی۔ اس کی آخری خواہش یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی بقیہ راتیں اپنی شریکِ حیات کے ساتھ جیل کی کال کوٹھری میں گزارنا چاہتا ہے۔

یہ چونکا دینے والی خبر تھی۔ تمام اخبارات نے اسے پہلے صفحے پر شائع کیا۔ ٹی وی چینلز بھی دن رات یہ خبر نشر کرنے لگے کہ آخری سانس لینے والا قیدی اپنی بیوی سے ازدواجی رشتہ نبھانا چاہتا ہے۔

فروا اپنے کامران کی آخری خواہش سنتے ہی تڑپ گئی۔ اس نے اپنے والدین اور وکیل سے کہا۔ "عدالت میں اپیل کی جائے۔ میرے کامران کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو میں عدالت کی دہلیز پر اپنی جان دے دوں گی۔"

جمال جمشید اور اس کے وکیل نے تگ و دو شروع کر دی۔ پریس اور مختلف میڈیا زکی طرف سے ان کی حمایت کی جارہی تھی۔ بڑے بڑے قانون داں اور علمائے دین سے اس سلسلے میں ان کے خیالات و افکار معلوم کیے جارہے تھے۔

تمام علما اور قانون داں فروا اور کامران کے حق میں بیان دے رہے تھے۔ فروا اپنا مسئلہ حل کرانے کے لیے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے التجا کر رہی تھی۔

اگر کامران کو سزا دی گئی ہے تو اس کی بیوی کو کیوں سزا دی جارہی ہے؟ ایک بیوی کے حق کو سلب کرنا سراسر زیادتی ہے۔

خدا خدا کرکے سات نومبر کو اجازت مل گئی۔ عدالتی حکم کے مطابق وہ صرف آٹھ نومبر کی رات خاوند کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ نو نومبر کامران کی زندگی کی آخری رات تھی۔ دوسری صبح پھانسی دی جانے والی تھی۔ لہٰذا آخری رات فروا کو اس کے پاس رہنے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ آٹھ نومبر کی شام کو آکر نو نومبر کی صبح کامران سے بچھڑنے والی تھی۔ وہ روتی ہوئی جیل کی چار دیواری میں آئی۔ اپنے ساتھ ایک جائے نماز لائی تھی۔ ان کے یے کال کوٹھری کے قریب ہی ایک کشادہ کمرا مخصوص کیا گیا تھا۔ کامران سے سامنا ہوتے ہی وہ چیخیں مارتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

کامران اسے آغوش میں لیے گم صم کھڑا تھا۔ اس کے اندرونی کرب کو سمجھ رہا تھا۔ وہ آخری بار ملنے آئی تھی۔ اس کے بعد وہ قیامت کی نیند سو جاتا۔ تمام دُکھ درد سے نجات پالیتا لیکن وہ ساری عمر اس کے نام کا خنجر کلیجے میں پیوست کیے رہتی۔ اوپر سے شانت رہتی، اندر سے ماتم کرتی رہتی۔

اس نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ "چپ ہوجاؤ۔ آنسو پونچھ لو۔ بس یہی ایک رات ہے۔ اسے ہنس کر گزارو یا رو کر گزار دو۔ قدرتی معاملات اٹل ہیں۔ مجھے جانا ہے، چلا جاؤں گا۔ تمہارے آنسو تقدیر نہیں بدل سکیں گے۔"

وہ اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ جیل خانے کی مسجد سے عشاء کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ دونوں نے وضو کیا۔ قیدیوں کو نماز پڑھنے کے لیے مصلا دیا جاتا ہے۔ وہ دونوں نماز ادا کرنے کے لیے اپنے اپنے مصلے پر کھڑے ہوگئے۔

کامران کے دل سے آواز نکل رہی تھی۔ "یا اللہ! ہم تو ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر یہ بیٹھے بٹھائے کیسی آزمائش میں مبتلا ہوگئے ہیں؟ کیا یہ آزمائش میری موت پر ہی ختم ہوگی؟

اے میرے معبود! تیری رضا پر راضی رہتا ہے اور راضی نہیں رہیں گے تو کیا کرلیں گے؟ زندگی کو پھر سے کیسے پالیں گے؟"

دونوں نماز ادا کرنے کے بعد ایک جگہ فرش پر بیٹھ گئے۔ ان کے لیے رات کا کھانا آیا۔ انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بھوک اڑ گئی تھی۔ رت جگا بھی تھا۔ نیند آنے والی نہیں تھی۔ کوئی ضرورت، کوئی خواہش کوئی ہوس نہیں رہی تھی۔

فروا کا سر اس کے شانے پر تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، چھو رہے تھے۔ اس سے زیادہ کی طلب نہیں رہی تھی۔

وہ دلہن پھولوں کی سیج پر آئی تھی اور نامراد رہی تھی۔ اب بھی کنواری دلہن تھی۔ جیل کے ننگے فرش پر آئی تھی۔ لیکن وہ دونوں جسمانی حصول کی ہوس سے خالی تھے، کیا موت کی دہلیز پر کوئی سہاگ رات منا سکتا ہے؟

ایسے وقت تو صرف خدا ہی یاد آتا ہے۔ انہیں عبادت کرنی تھی۔ تمام رات پاک و صاف رہ کر فجر کی نماز ادا کرنی تھی۔ عبادت کے لیے دعاؤں کی قبولیت کے لیے پاکیزگی لازمی ہوتی ہے۔

کامران نے پوچھا۔ "میری ایک بات مانوگی؟"

"تمہاری ہر بات مانوں گی۔"

"دینی احکامات پر عمل کرتی رہو۔ ہمارے دین میں عورت کو تنہا رہنے سے منع کیا گیا ہے۔ میرے بعد تم شادی کروگی۔ ازدواجی زندگی گزاروگی۔"

"بے شک، دینِ اسلام میں عورت کو تنہا رہنے سے منع کیا گیا ہے لیکن میں لڑکی ہوں۔ نہ شجرِ ممنوعہ کی طرف گئی ہوں، نہ ہی میں نے بہکنے اور بہکانے والا پھل چکھا ہے۔"

"بحث نہ کرو فروا...!"

"تم بحث نہ کرو۔ جو سچ ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ ابھی تنہائی میں، میں ہوں، میرا محبوب ہے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ پھر بھی بہک نہیں رہی ہوں اور نہ تمہیں ترغیب دے رہی ہوں۔"

وہ اس حقیقت کے سامنے چپ رہا۔ وہ بولی۔ "بعض لڑکیاں بڑی مستقل مزاج ہوتی ہیں۔ ساری زندگی پل صراط سے تلوار کی دھار پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ کبھی خود پر کسی مرد کا سایہ نہیں پڑنے دیتیں۔ تم یہ بحث نہ کرو۔ ہم دوسری باتیں کریں گے۔"

"دوسری کوئی بات نہیں ہے۔ کل میری زندگی کی شام ہے۔ دوسری صبح آخری نماز پڑھوں گا پھر میری آخری نماز دوسرے پڑھیں گے۔"

وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ پھر جائے نماز پر آگئے۔ نفل پڑھنے لگے۔

"اے خدا! یہ میرا مجازی خدا ہے۔ تو زندگی کے بدلے زندگی نہیں دیتا۔ اگر دیتا ہے تو ابھی میری جان کھینچ لے۔ میرے شوہر کو نئی زندگی دے دے۔"

اس نے کامران سے کہا۔ "جب سے تمہیں قیدی بنایا گیا ہے، تب سے میں اللہ تعالیٰ کے نام کا وظیفہ پڑھتی رہتی ہوں۔ یا دکیل، یا کفیل..."

کامران نے کہا۔ "میں بھی وظیفہ پڑھتا رہتا ہوں۔ یا مجیب یا حق... سنا ہے، پڑھنے والے کو شکنجے سے نجات اور قید سے رہائی ملتی ہے۔"

وہ اپنی دائیں ہتھیلی دکھاتے ہوئے بولا۔ "اگر ہتھیلی پر یا حق لکھ کر اسے دعائیہ انداز میں آسمان کی سمت اٹھائے اور یا حق پڑھتا رہے تو مقدمے میں کامیابی ہوتی ہے۔"

وہ ذرا رک کر بولا۔ "ہمیں یہاں ایک قلم تو کیا ایک ننھی سی تیلی بھی نہیں دی جاسکتی۔ میں ہتھیلی پر لکھ نہیں سکتا اس لیے چشمِ تصور سے دیکھتا ہوں۔ مجھے اپنی ہتھیلی پر یا حق لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

وہ اپنی ہتھیلی کو دعا مانگنے کے انداز میں آسمان کی سمت اٹھا کر پڑھنے لگا۔ "یا مجیب، یا حق..."

وہ بھی پڑھ رہی تھی۔ "یا دکیل، یا کفیل..."

اس کمرے کی چار دیواری میں وظیفے کی دھیمی دھیمی سی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ خوشبو کی طرح پھیل رہی تھیں اور یقیناً آسمان کی طرف جارہی تھیں۔

رات گزرتی جارہی تھی۔ وہ اسمائے حسنیٰ میں غرق تھے۔ آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود وہ کمرا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ انہوں نے خود کو اسمائے حسنیٰ میں جذب کر دیا تھا۔ یہ

http://digestpk.blogspot.com/

نہیں جانتے تھے کہ کس عالم نامعلوم میں پہنچ گئے ہیں۔

یوں جانے چلا رات کیسے گزر گئی؟ پھر فجر کی اذان انہیں اس کمرے میں واپس لے آئی۔ انہوں نے مصلے پر کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ دعا مانگی۔ پھر فریاد بے اختیار اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ جیلر نے لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ آ کر کہا۔ ”بی بی! باہر آجاؤ۔ ملاقات کی مدت ختم ہو چکی ہے۔“

کامران اسے تھپکتا ہوا صبر کی تلقین کرتا ہوا آہنی سلاخوں کے پاس آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس سے دور نہیں ہونا چاہتی تھی۔ دو لیڈی کانسٹیبل نے اسے پکڑ لیا۔ اسے باہر لے آئیں۔

ہمیشہ کے لیے بچھڑنا تھا لیکن کوئی خوشی سے نہیں بچھڑتا۔ وہ دو عورتیں اسے جبراً وہاں سے لے گئیں۔ کامران اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب نہ وہ اسے بھی دیکھ سکتی تھی نہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

☆☆☆

جس دن کامران کو موت کی اٹل تاریخ سنائی گئی، اس روز ماں کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ وہ روتے ہوئے صادق حسین سے لپٹ کر بولی۔ ”کسی بھی طرح میرے بیٹے کو بچالیں۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ کوئی تدبیر کریں، کچھ بھی کریں۔ میرے کامران کو واپس لے آئیں۔“

صادق نے اپنے وکیل سے کہا۔ ”آپ نے وکالت کے پیشے میں بڑے بڑے تجربات کیے ہیں۔ بڑے ہی پیچیدہ مقدمات میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ پلیز۔ پھر سے قانون کی کتابیں پڑھیں۔ کوئی ایسا نکتہ ڈھونڈ کر نکالیں کہ کامران کی سزا معاف ہو جائے یا سزائے موت عمر قید میں بدل جائے۔“

وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ طرح طرح کی تدابیر سوچنے لگے۔ وقت بہت کم تھا۔ بہت زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔ جو کرنا تھا جلد ہی کر گزرنا تھا۔ پھر ایک دن آمنہ نے ماہم کو فون پر مخاطب کیا۔ اس نے بڑی امیدوں سے پوچھا۔ ”کیا عدنان مجھ سے راضی ہو رہا ہے؟“

آمنہ نے کہا۔ ”میں اس کی ماں ہوں اگر چاہوں تو وہ تم سے راضی ہو سکتا ہے۔ ابھی اس لیے فون کیا ہے کہ میں نے خواب میں اپنے پوتے کو دیکھا تھا۔ وہ میری گود میں کھیل رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی ہوں۔“

”میں بچے کو لے کر آپ کے گھر آسکتی ہوں؟“

”عدنان تمہیں یہاں قدم رکھنے نہیں دے گا۔ مجھ سے بارہ دری یا قلعے میں آ کر ملو۔ ہم دونوں مل کر عدنان کو راضی کرنے کی کوئی تدبیر کریں گے۔“

”میں عدنان کو منانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

”ایک گھنٹے بعد قلعے کے عجائب گھر کے سامنے پہنچو۔ میں آرہی ہوں۔ اپنے پوتے کی تصویریں بھی اتاروں گی۔“

وہ دوپہر دو بجے اپنے بچے کو سینے سے لگائے وہاں آگئی۔ آمنہ پہلے سے اس کی منتظر تھی۔ بچے کو اس سے لے کر سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔

دوپہر کے وقت وہاں لوگوں کی آمد و رفت کم ہوتی ہے۔ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی نسبتاً سنسان جگہ آگئیں۔

آمنہ نے کہا۔ ”تم ماں کی ممتا کو خوب سمجھ رہی ہو۔ میرا بیٹا پھانسی پانے والا ہے۔ ذرا سوچو! میرے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟“

وہ بے نیازی سے بولی۔ ”میں کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“

”مجھ سے ہمدردی نہ کرو۔ تم بھی ماں ہو۔ یہ سوچو ابھی تمہارے بچے کی جان پر بن آئے تو تم کیا کرو گی؟“

”خدا نہ کرے میرے بچے کو کچھ ہو۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔“

”میں نے ایسی ہی باتیں کرنے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔“

آمنہ نے پرس کی جیب سے ایک چاقو نکالتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے شور مچانے سے پہلے ہی یہ ننھی سی جان اپنی جان سے چلی جائے گی۔ پھر دن رات واویلا کرتی رہو گی‘ تب بھی یہ بچہ میرے کامران کی طرح واپس نہیں آئے گا۔“

ماہم کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ بچہ چاقو کی نوک پر تھا۔ وہ چند لمحوں تک سانس لینا بھول گئی پھر تڑپ کر بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ یہ آپ کا پوتا ہے۔“

”نہیں۔ یہ صرف تمہارا بیٹا ہے، تم اس کی ماں ہو اور میں اپنے بیٹے کامران کی ماں ہوں۔ وہ آج سے پانچویں دن پھانسی پائے گا۔ تم نے میری بات نہ مانی تو تمہارا بیٹا ابھی جان سے جائے گا۔“

ماہم نے دیکھا، اس کا بیٹا جس کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، آمنہ نے چاقو کو اس کپڑے میں چھپا لیا تھا۔ ادھر سے گزرنے والوں کو وہ چاقو نظر نہیں آسکتا تھا۔

اس کی ممتا لرز رہی تھی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے شور مچاتے ہی ساس اس کے بچے کو مار ڈالے گی، وہ تڑپ کر بولی۔ ”چاقو ہٹائیں۔ مجھے بتائیں، آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”وہی جو عدنان تم سے کہہ چکا ہے۔ اپنا بیان بدل دو۔“

ایسے وقت صادق حسین اپنے وکیل کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”بات کہاں تک پہنچی؟“

آمنہ نے کہا۔ ”میں اس سے کہہ رہی ہوں، یہ بیان نہیں بدلے گی تو ابھی اپنے بچے کو لہو میں نہاتے ہوئے دیکھے گی۔“

وہ رو رہی تھی۔ بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں، اس کا دل اور اس کا سارا وجود اپنے بچے کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”آپ زبردستی کیسے کریں گی؟ اگر میں ابھی بیان بدلنے پر راضی ہو جاؤں، بچے کو سلامتی سے اپنے سینے سے لگا کر لے جاؤں اور بعد میں مکر جاؤں تو آپ کیا کر لیں گی؟“

”یہ بچہ ابھی تمہیں نہیں ملے گا۔ جب تک عدالت میں بیان نہیں بدلو گی۔ اپنے باپ کا لکھا چھپا بیان نہیں کرو گی۔ تب تک یہ ننھی سی جان میرے پاس رہے گی۔“

صادق نے کہا۔ ”تم کسی سے یہ نہیں کہہ سکو گی کہ بچے کو اغوا کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے باپ عدنان کے پاس رہے گا۔“

آمنہ نے کہا۔ ”جب تک ہماری بن کر رہو گی۔ کامران کے حق میں بیان دے کر اس پر قائم رہو گی‘ تب تک یہ بچہ زندہ سلامت رہے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے فون نمبر ملایا۔ پھر رابطہ ہونے پر فون ماہم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو عدنان سے بات کرو۔“

اس نے فون کو لپک لیا۔ فوراً ہی کان سے لگا کر کہا۔ ”عدنان! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

وہ بولا۔ ”وہی جو میری ماں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اگر تم ہماری ہو تو یہ بچہ بھی ہمارا ہے۔ ہم اس ننھی سی جان کے محافظ ہیں۔ اگر دشمن ہو تو یہ بچہ تمہارا ہے۔ میری ماں کا بیٹا جائے گا تو تمہارا بیٹا بھی ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے گا۔“

”عدنان! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔“

”میرے پاس عزت سے، محبت سے اور شرافت سے آؤ۔ یہاں تمہیں ساری عمر سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا۔ جیسے ہی کیس میرے بھائی کے حق میں ہوگا، میں تمہیں لینے کے لیے تمہارے دروازے پر آؤں گا۔ اس سے پہلے سوری۔“

سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، کا بے مثال مجموعہ
تازہ شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے
ماہنامہ
سرگزشت
فروری 2011ء کی ایک جھلک
لیلیٰ مجنوں
تاریخی شواہد کی روشنی میں دلچسپ روداد
فتنہ ساز
وکی لیکس کے بانی کی سوانح حیات
خوش قلم
اردو خطاطی کی پرلطف تاریخ
اس کے علاوہ
لہو کی گردش تیز کر دینے والی روداد
”سراب“ فلم و ادب کی دنیا کے چونکا
دینے والے واقعات ”فلمی الف لیلہ“۔
دلچسپ سفر کہانی ”سورج کا دیس“۔
پاکستان کا انوکھا شہر ”نمک کا شہر“۔
اور بہت سی دلچسپ، سبق آموز
آپ بیتیاں جگ بیتیاں
بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں
آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے
آج ہی اپنی کاپی قریبی بک اسٹال سے طلب کریں
http://digestpk.blogspot.com/

اس نے فون بند کر دیا۔ ماہم نے فون کو دیکھا۔ وہ عدنان کا پیار بھرا فیصلہ سنا کر چپ ہو گیا تھا۔ اس کی یہ بات سحر زدہ کر رہی تھی کہ وہ اسے لینے کے لیے اس کے دروازے پر آئے گا۔

وہ آمنہ اور صادق حسین کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں بیان بدل دوں گی۔ سب سے پہلے میرے ڈیڈ کے دست راست اور ہمراز زبیر کو گرفتار کرائیں۔ اس سے سچ اگلوائیں۔ پھر آپ کے بیٹے کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔''

آمنہ نے کہا۔ ''شاباش بیٹی! اب یہ میرا پوتا ہے۔ مقدمہ جیسے ہی ری اوپن ہوگا، عدنان تمہیں عزت سے گھر لائے گا۔ وہاں تم اپنے بیٹے کو کلیجے سے لگا سکو گی۔''

ماہم نے اپنے بیٹے کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اسے ساس کے حوالے کیا۔ پھر صادق حسین اور وکیل کے ساتھ اپنا بیان بدلنے کے لیے چلی گئی۔

صادق تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ اس نے پولیس کے اعلیٰ افسران کو لاکھوں روپے پیش کیے۔ انہوں نے زبیر کو گرفتار کر کے ٹارچر سیل میں پہنچا دیا۔ وہ لاتوں کا بھوت تھا، باتوں سے ماننے والا نہیں تھا۔ ٹارچر سیل میں اسے ایسی اذیتیں پہنچائی گئیں کہ اس کے ہوش اڑ گئے۔

وہ سچ اگلنے لگا۔ اس نے تحریری بیان دیا کہ جبار ہمدانی نے نہر کے کنارے کامران کو قتل کرنے کی ناکام کوششیں کی تھیں۔ اس نے جو گولیاں چلائیں، وہ ایک فقیر بابا کو لگیں۔

اس بیان کی روشنی میں علاقے کے تھانے میں انکوائری کرائی گئی۔ اس بات کی تصدیق ہوئی کہ اس روز صبح کے وقت چلتی ہوئی کار سے فائرنگ کی گئی تھی۔ وہاں کامران چشم دید گواہ کے طور پر اپنا بیان قلم بند کرا چکا تھا۔

زبیر نے ایک رینٹ اے کار والوں کا پتا بتایا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جبار نے ایک رات پہلے وہاں سے ایک کار کرائے پر حاصل کی تھی اور اسی کار میں بیٹھ کر فائرنگ کی تھی۔

زبیر نے قتل کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''جبار اپنے داماد عدنان کو اس کے والدین کا تنہا وارث بنانا چاہتا تھا۔ کروڑوں اربوں کی دولت اور جائداد میں کسی حصے دار کو برداشت نہیں کر رہا تھا اسی لیے اس نے کامران پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔''

زبیر نے کہا۔ ''جبار نے دس برس پہلے اپنے دو سگے بھائیوں کو بھی بڑی رازداری سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کاروبار میں حصے دار بھائیوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔''

پولیس والے ان دنوں قتل کی واردات کے سلسلے میں جبار پر شبہ کر رہے تھے۔ زبیر کے بیان سے ان کا شبہ درست ثابت ہوا۔ یوں جبار ہمدانی تین قتل کی واردات کا مجرم ثابت ہو رہا تھا۔

پھر اس کی بیٹی ماہم کے بیان سے زبیر کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ چار دنوں کے اندر ہی جیسے کایا پلٹ گئی۔ اس قدر ٹھوس ثبوت اور گواہوں کو عدالت میں تسلیم کرتے ہوئے کامران کی سزائے موت کو روک دیا گیا اور اس مقدمے کو دوبارہ شروع کرنے کی ہدایت کی گئی۔

یہ وہ وقت تھا، جب فرواد اپنے کامران سے آخری ملاقات کرنے کے لیے جیل کی چار دیواری میں گئی تھی۔ وہ دونوں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دوسری صبح کیا معجزہ ہونے والا ہے؟ جب وہ کامران سے بچھڑنے کے بعد جیلر کے روم میں آئی تو وہاں جمال جمشید ایک عدالتی اہل کار کے ساتھ موجود تھا۔ وہ روتی ہوئی آ کر باپ سے لپٹ گئی۔ وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ ''آنسوؤں کو پونچھ لو بیٹی! خدا نے ہماری فریاد سن لی ہے۔ کسی نے درست ہی کہا ہے، اوپر والے کے ہاں دیر ضرور ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے باپ کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''عدالت کی طرف سے اسٹے آرڈر آ گیا ہے۔ ہمارا کامران انشاء اللہ جلدی رہا ہو جائے گا۔''

یہ ایسی کامیابی تھی کہ فرواد وہیں چکرا کر سجدے میں گر پڑی۔ مقدمہ پھر سے شروع ہوا تو دو پیشیوں کے بعد ہی تیسری پیشی میں کامران کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔

بے شک۔ وہی رب کریم عزت دیتا ہے لیکن آزمائشوں میں بھی مبتلا کرتا ہے۔

اب کامران دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تھا تو اس کی ہتھیلی پر لکھا ہوتا تھا۔ ''یا مجیب، یا حق...''

بے شک اللہ تعالیٰ مشکلوں سے نکالتا ہے۔

فرواد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تھی تو اس کی ہتھیلی پر لکھا ہوتا تھا۔ ''یا وکیل، یا کفیل...''

بے شک اللہ تعالیٰ ناحق الزامات سے بری کرتا ہے۔

اور کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا رب آزمائشوں سے گزارنے کے بعد ہی انعام دیتا ہے...

دوسرا پاگل

فوزیہ ظہیر

اپنی شخصیت کو یکسر بدل دینے کا عزم کر لینے والے شخص کا پرلرزہ المیہ۔ وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز اپنے دشمنوں کے خاتمے سے کرنا چاہتا تھا۔

ایک کج فہم شخص کے ذہنی تغیرات... جو دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث تھے

موسم سرما کی ایک خنک صبح جب جمی فیلڈن سو کر اٹھا تو وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا کیونکہ وہ اپنی شخصیت کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ دراصل رات کو سونے سے پہلے اس نے ٹی وی پر ایک فلم دیکھی تھی جس میں ہیرو اپنی ابتدائی زندگی میں بہت بزدل، ڈرپوک اور بے وقوف آدمی تھا لیکن اس نے اپنی قوت ارادی کے ذریعے خود کو تبدیل کیا اور ایک نڈر اور بے باک انسان بن گیا۔ پھر اس نے ہر اس شخص سے بدلہ لیا جس نے اسے اس کی بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے اب تک نقصان پہنچایا تھا۔

جمی کافی دیر تک پچھلی رات والی فلم کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔ کبھی وہ زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسنے لگتا اور کبھی رونے لگتا۔۔۔ ایسی کیفیت اس پر زندگی میں پہلی بار طاری ہوئی

http://digestpk.blogspot.com/

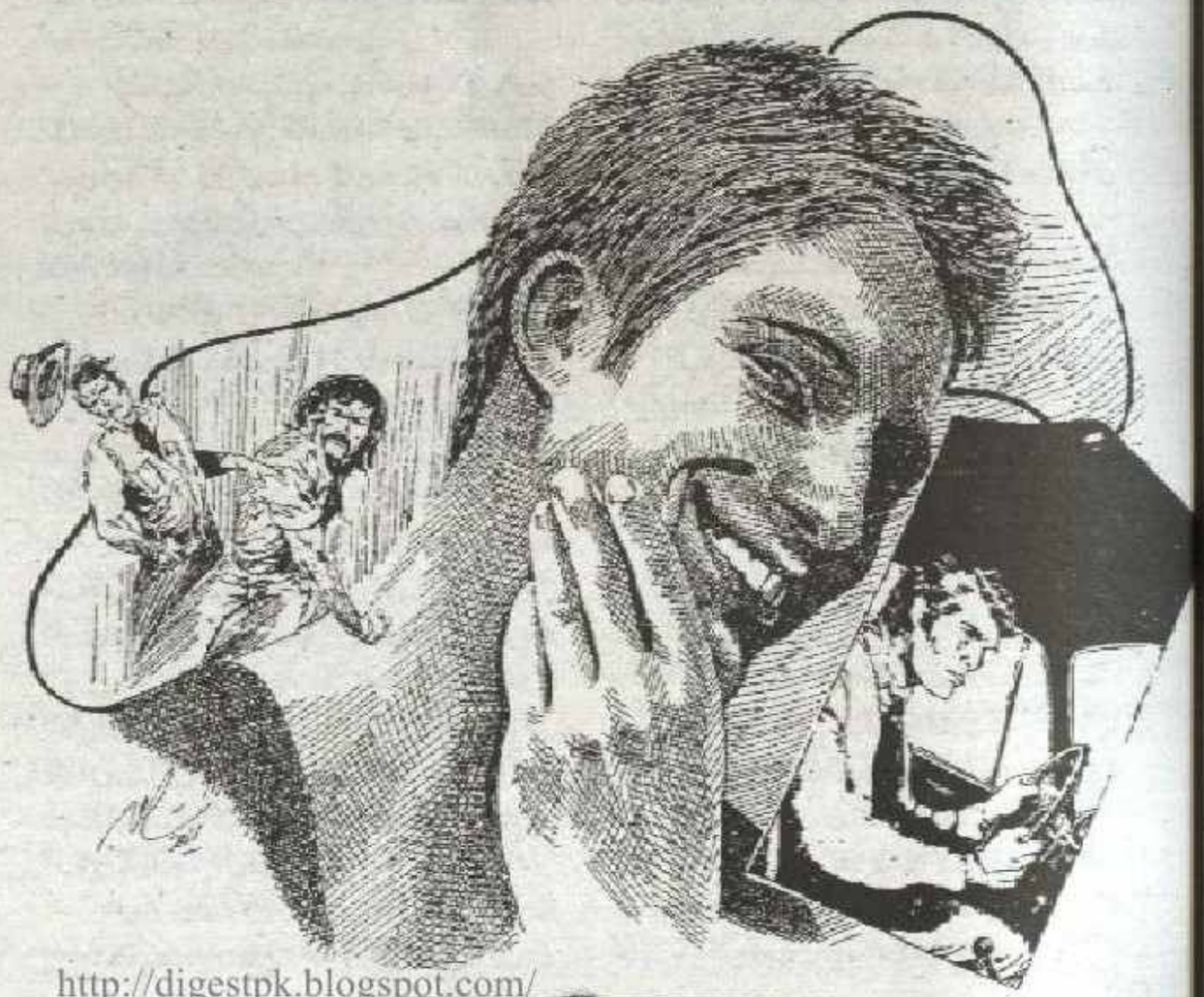

تھی۔ فلم کے ہیرو کا کردار اس کو اپنی زندگی سے بہت قریب تر لگا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس فلم کے بارے میں سوچتا رہا اور ہیرو کی طرح اپنی زندگی میں تبدیلیاں لانے کے منصوبے بناتا رہا۔

اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ پچاس سالہ جیمی کاؤچ سے اٹھا، اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ کافی ٹیبل پر بوربن کی آدھی بوتل رکھی تھی۔ ایش ٹرے بجھے ہوئے سگریٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک پاپ کارن کا لفافہ مائیکروویو میں پڑا تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس نے اپنے قدم زمین پر جمائے اور کھڑا ہو گیا۔ ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں اٹھایا جو اس کے نیچے دبا ہوا تھا اور ٹی وی کو بند کیا جو اب تک کھلا ہوا تھا لیکن خاموش تھا۔۔۔ کیونکہ اس نے سونے سے پہلے MUTE کا بٹن دبا دیا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پسینے کی بے تحاشا بو آرہی تھی کیونکہ اس نے کئی دن سے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے۔ کراہت سے اس نے اپنی ناک سکیڑی۔ پھر اس کی نظر دروازے کے پاس پڑی ہوئی ڈاک پر پڑی جو ڈھیر کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اس خط کو دیکھا جو اوپر ہی پڑا تھا۔ یہ فیملی کورٹ کا خط تھا۔

'اوہ اب کیا ہوگا؟' اس نے دکھ سے سوچا۔

پچھلے مہینے بھی وہ اپنے بیٹے کو لینے نہیں جا سکا تھا۔ اس کی سابقہ بیوی نے بہت شور مچایا تھا اور وہ ملاقات کے اوقات میں تبدیلی کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ پریشان ہو رہا تھا کہ اگر کورٹ میں جانے سے تھوڑی دیر بھی دیر ہو گئی تو وہ عورت کورٹ میں کافی شور و ہنگامہ کرے گی۔

'اوہ خدا! مجھے اس کم بخت عورت کو اپنی تنخواہ کا پچاس فیصد حصہ دینا پڑتا ہے۔ میرے پاس کوئی سونے کی کان ہے؟ میں ایک انشورنس کمپنی کا معمولی ایجنٹ ہی تو ہوں۔' سوچتے سوچتے اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ اپنے دو کمروں کے گندے سے اپارٹمنٹ میں بیٹھا تھا۔ سفید دیواریں دھبوں سے اٹی پڑی تھیں۔ وہ پچھلی رات والی فلم کے ہیرو کے متعلق سوچنے لگا جس نے اپنے ماضی میں دکھ پہنچانے والوں سے چن چن کر بدلہ لیا تھا۔ وہ بھی ان لوگوں کا حساب لگانے لگا جنہوں نے اسے زندگی میں نقصان پہنچایا تھا۔ مثلاً اس کے آفس کے ساتھی، اس کا سگا بھائی، سابق افسران، دوست، کالج کے ساتھی، اس کی مطلقہ بیوی۔۔۔ اس کی ماں حتیٰ کہ بچپن میں گریڈ اسکول کے بچے۔

اس کو ہمیشہ توہین، احساسِ کمتری اور ذلت کے احساسات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ پھر اس کا تو دل لوگوں کے سامنے گڑگڑانا، معافی مانگنا اور اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہوتا تھا۔ 'لیکن اب ایسا کبھی نہیں ہوگا۔' اس نے مٹھیاں بھینچ کر غصے سے کہا۔

جیمی تیزی سے اٹھا، شراب کی بوتل اٹھائی اور اسے کچن کے سنک میں انڈیل دیا۔ وہ لیونگ روم میں آیا، بجھے ہوئے سگریٹوں پر نظر ڈالی اور سوچا۔۔۔ 'ٹھیک ہے میں انہیں چھوڑ تو نہیں سکتا لیکن کم تو کر سکتا ہوں۔ ایک دن میں دس۔۔۔ نہیں، پانچ مناسب ہے۔'

وہ باتھ روم میں گیا۔ شاور لے کر باہر نکلا، صاف ستھرے کپڑے پہنے پھر کچن میں آ گیا۔ ایک مزے دار برگر بنایا اور بلیک کافی بنا کر ناشتا کیا۔ اس کے بعد اپنی پرانی ٹویوٹا نکالی اور اپنے آفس روانہ ہو گیا۔ اپنی میز پر بیٹھ کر پہلی دفعہ اس نے محسوس کیا کہ فلم کے ہیرو نے تقریباً آدھے گھنٹے میں ان لوگوں کے ناموں کی لسٹ بنالی تھی جن سے اسے بدلہ لینا تھا لیکن وہ تو فکشن پر مبنی کہانی تھی۔ حقیقی زندگی میں ایسے لوگوں کے نام تلاش کرنا، ان کی لسٹ بنانا اور پھر ان سے بدلہ لینا۔۔۔ اس کے لیے تو کافی وقت درکار تھا۔ چنانچہ وہ اپنے باس کے کمرے میں گیا اور اس سے ایک ہفتے کی چھٹی مانگی۔ باس نے اپنی گھومنے والی کرسی پر آگے پیچھے جھولتے ہوئے چھٹی دینے سے انکار کر دیا لیکن جیمی اپنی بات پر جما رہا اور کہا۔

''ٹھیک ہے مسٹر لوگن! آپ مجھے بغیر تنخواہ کے چھٹی دے دیں۔''

''بغیر تنخواہ کے۔۔۔؟'' باس نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی ہاں! بغیر تنخواہ کے۔'' جیمی نے سکون سے کہا۔

اس کا باس لوگن اب بھی اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم بیمار ہو؟''

''نہیں۔۔۔ لیکن کچھ لوگ ہیں جنہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''اچھا تو آج کل نیکی کے کام شروع کر دیے ہیں۔'' لوگن نے ہنس کر کہا۔

''کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔'' جیمی بھی مسکرایا۔

''پھر تو میں انکار نہیں کر سکتا۔۔۔ اور تنخواہ کی فکر نہ کرنا۔''

''شکریہ مسٹر لوگن۔۔۔ آپ کی عنایت کا۔''

جب جیمی فیلڈن، لوگن کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو باس کے چہرے پر حیران کن مسکراہٹ تھی۔

دوسرے دن جیمی صبح سویرے اٹھ گیا۔ شاور لیا، صاف کپڑے پہن کر تیار ہوا۔ دودھ کے ساتھ ایک پیالہ سیریل کھایا۔ کچن ٹیبل کو صاف کیا۔ سنک میں پڑے برتنوں کو ڈش

واشر میں لگایا۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ کام شروع کیا جس کے لیے چھٹی لی تھی۔ پیلے کاغذ والا پیڈ اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے سوچ سوچ کر لسٹ بنانی شروع کی۔ لسٹ بنانے میں اسے دو دن لگ گئے۔ اس طرح تینتالیس افراد کے نام اس کی لسٹ میں تھے۔ ایک دن ان کے موجودہ پتے معلوم کرنے میں لگ گیا۔ کچھ کو وہ جانتا تھا، کچھ کے لیے جاسوسی کرنی پڑی۔ اس کے لیے فون بک، ڈائریکٹری اور کمپیوٹر سے مدد لی اور سب کی معلومات حاصل کر لیں۔ کام مکمل ہونے کے بعد اس نے آئس ٹی کا بڑا گلاس اور سگریٹ پی کر جشن منایا۔

سونے سے پہلے اس نے سوچا کہ ابتدا پرانے دشمن سے کرنی چاہیے یا نئے دشمن سے؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد جیمی نے فیصلہ کیا کہ اس کو نئے اور تازہ تازہ نقصان پہنچانے والے دشمن سے شروعات کرنی چاہیے چنانچہ پہلا شکار کون ہے؟ اس نے لسٹ میں دیکھا، وہاں ''چارلس'' کا نام سب سے اوپر لکھا ہوا تھا۔ 'تقریباً ڈیڑھ مہینہ پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا جو مجھے بھلائے نہیں بھولتا۔ اس کے متعلق سوچ کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور ہتھیلیوں میں پسینا آجاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ہر غم ہلکا ہو جاتا ہے لیکن یہ دکھ تو فلو کی طرح تھا جو آ جائے تو جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔۔۔'

☆☆☆

چارلس ویگن ایک پرسکون اور خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ایک بڑی سافٹ ویئر کمپنی کا سیلز منیجر تھا۔ اس نے نیویارک یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال تھی۔ اس بزنس مین کا ایک خوب صورت گھر تھا۔ ایک حسین بیوی اور دو بچے تھے جو اچھے کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ وہ صحت مند بھی تھا اور ایک آئیڈیل زندگی گزار رہا تھا لیکن چند دن پہلے ایک منحوس واقعے نے اس کی زندگی عذاب کر دی تھی۔ وہ واقعہ ہر وقت اس کے ذہن پر سوار رہتا تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ چارلس، اس کی بیوی اور بیٹی نے اتفاق سے اس سال سینٹ پیٹرک ڈے، بوسٹن میں اسٹور اور ریستوران فینیل ہال میں منانے کا فیصلہ کیا جسے سیاحوں کی جنت کہا جاتا ہے۔ وہاں سیکڑوں کے حساب سے اور بھی بہت لوگ تھے۔ وہ لوگ وہاں ایک خوشگوار وقت گزارنے کے بعد واپس گھر آرہے تھے کہ اچانک اس کی بیٹی کو یاد آیا کہ اسے اپنی دوست کے لیے گفٹ لینا تھا۔

''بیٹا! ہمیں گھر پہنچنے میں بہت دیر ہو جائے گی۔'' چارلس نے کہا۔

''ڈیڈی! صرف پندرہ منٹ لگیں گے۔''

وہ لوگ تقریباً دو گھنٹے شاپنگ کرتے رہے تھے لیکن اس کو اب تحفے کی یاد آئی تھی۔ چارلس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ ''ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ۔۔۔ میں کار میں ہی انتظار کروں گا۔''

''ہم یوں گئے اور یوں آئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی بیٹی اور بیوی شاپنگ سینٹر میں غائب ہو گئیں۔ چارلس نے گاڑی کا ہیٹر چلایا اور سردی کی شدت سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ اپنے بزنس کے مسائل کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس میدان میں اس کے بہت سے حریف بھی تھے۔ وہ سوچ رہا تھا ان سے کیسے نمٹا جائے کہ اچانک اس نے گاڑی کے ہارن کی آواز سنی۔ اس نے سڑک پر نظر ڈالی۔ ایک گاڑی اس کی گاڑی کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس میں ایک لمبوترے چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا آدمی جو لگ بھگ اسی کی عمر کا تھا، اس نے کچھ کہا تو چارلس نے سر ہلا کر کھڑکی کھولی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا تم نکل رہے ہو؟'' اس نے پارکنگ کی جگہ پر نظر ڈال کر کہا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔ میں اپنی بیوی اور بیٹی کا انتظار کر رہا ہوں۔'' چارلس نے مسکرا کر کہا اور دل میں سوچنے لگا کہ ان عورتوں کی شاپنگ میں پانچ منٹ بھی لگ سکتے ہیں اور ایک گھنٹا بھی۔

پرانی سی کار میں بیٹھے ہوئے آدمی نے جواباً مسکرانے کی زحمت نہیں کی بلکہ تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''تم اپنی کار یہاں سے نکالو اور وہاں ڈبل پارک میں ان کا انتظار کرو۔''

چارلس کو اس کا تحکمانہ لہجہ بہت برا لگا۔ اس نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میری بیوی اور بیٹی مجھے اسی جگہ تلاش کریں گی۔''

''میں نے تم سے یہ تو نہیں کہا کہ پہاڑ پر چڑھ جاؤ۔ میں نے صرف یہاں سے گاڑی نکالنے کو کہا ہے اور گاڑی تو تمہیں ہر حال میں نکالنی پڑے گی۔''

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں ہے کہ وہ لوگ کتنی دیر میں آئیں گی۔'' چارلس نے جھنجلا کر کہا۔

''وہ زیادہ ٹائم نہیں لیں گی اسی لیے تمہاری گاڑی کا انجن بھی چل رہا ہے۔۔۔ ہے نا؟''

چارلس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ اپنے اندر بے چینی محسوس کرنے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے یہیں انتظار کرنا چاہیے۔'' پھر اس نے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔

http://digestpk.blogspot.com/

'اوہ! اچھا طریقہ ہے۔' آدمی نے دانت بھینچ کر کہا۔ وہ

نشے میں لگتا تھا۔ "سینٹ پیٹرک ڈے۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ کمزور بہانہ۔۔۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر۔" وہ بڑبڑاتا رہا۔

چارلس نے گاڑی کی کھڑکی بند کرلی اور دوسری طرف منہ پھیرلیا۔ وہ دکانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس امید پر کہ شاید اس کی بیوی اور بیٹی آتی ہوئی نظر آجائیں۔ وہ آدمی ابھی تک چیخ رہا تھا لیکن کھڑکی بند ہونے کی وجہ سے چارلس کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ اسے نظرانداز کرتا رہا کہ شاید وہ تھک کر واپس چلا جائے۔ وہ اپنی فیملی کے بارے میں سوچتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ وہ جلدی آجائیں تاکہ اس ناگہانی بلا سے نجات ملے۔ اسے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا جن کی وجہ سے وہ اس مصیبت میں گرفتار ہوا تھا۔ اچانک وہ آدمی اپنی پرانی کار سے اترا اور اس سے پہلے کہ چارلس دروازے کو لاک کرتا، اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور جھک کر چارلس کے چہرے کو غصے سے گھورنے لگا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ وہ غصے میں بل کھاتے ہوئے بولا۔ "باہر نکل الو کے پٹھے! میں کسی کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ تم کس بات کو درست سمجھتے ہو اور کس کو نہیں، میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔" اس کے منہ سے مغلظات کا فوارہ ابل پڑا۔ ساتھ ہی اس نے چارلس کا گریبان پکڑ کر اسے باہر کھینچنا چاہا۔ چارلس نے اپنی آنکھیں اس غلیظ آدمی کے چہرے پر گاڑ کر غصے سے کہا۔

"میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک میری فیملی نہیں آجاتی۔۔۔ سمجھے تم۔"

"میں تمہیں ابھی سمجھاتا ہوں۔" اس نے اپنی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ دور پھینکا اور اپنی گاڑی کی چابی رگڑ کر اس کی بیش قیمت گاڑی پر اسکریچ ڈال دیا جس سے اس کا پینٹ اکھڑ گیا۔

چارلس نے جلدی سے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور نائن ون ون کے نمبر پنچ کیے۔ فوراً ہی ایک پولیس آفیسر کی آواز آئی۔ "یہ نائن ون ون ہے۔۔۔ تمہارا کیا مسئلہ ہے؟"

"مجھ پر حملہ کیا گیا ہے۔۔۔ پلیز! کسی کو جلد بھیجیں۔"

"آپ کا نام اور پتا کیا ہے؟"

"میرا نام چارلس ہے۔ میں لنکولن میں رہتا ہوں لیکن اس وقت میں اپنی کار میں ہوں۔۔۔ فیمل ہال کے سامنے۔ ولیم ہولوسر کے قریب۔۔۔ وہ نشے میں ہے اور مجھ پر حملہ کررہا ہے۔ میں۔۔۔"

اس آدمی نے چارلس کو گریبان سے پکڑا پھر سیل فون چھین کر فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ شور ہنگامے سے ایک مجمع لگ گیا۔ کچھ تو ڈر کے پیچھے ہو گئے کچھ وہیں کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ کچھ لفنگے لڑکے مزے لے رہے تھے اور ہنس رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔

"فائٹ۔۔۔ فائٹ۔۔۔ فائٹ!"

اس آدمی نے چارلس کی جیکٹ پکڑ کر کھینچی تاکہ اسے گاڑی سے باہر نکال سکے۔

"چھوڑو مجھے۔۔۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" چارلس نے اسٹیئرنگ وہیل کو زور سے پکڑ لیا۔ دونوں میں کھینچا تانی ہونے لگی، یہاں تک کہ قریب سے پولیس سائرن کی آواز گونجنے لگی۔

"شکر خدا کا۔۔۔"

حملہ آور کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اب چارلس کے ساتھ کیا سلوک کرے لیکن پھر پولیس کے ڈر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی گاڑی کو ریورس کیا اور کونے میں جاکر غائب ہوگیا۔ چارلس نے گردن گھما کر اس کی گاڑی کی نمبر پلیٹ دیکھنا چاہی لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ اس شخص کے ساتھ پکڑ دھکڑ میں چارلس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سانس پھول رہا تھا۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے وہ بالکل نڈھال ہوگیا تھا۔

پولیس آئی۔۔۔ اس نے چارلس کا بیان لیا۔ اس حادثے اور گاڑی کے نقصان کی رپورٹ لکھی۔ چارلس سوچ سوچ کر تمام واقعہ بیان کرتا رہا۔ ایک دم اسے کچھ یاد آیا اور اس کی آواز خوف سے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

"کیا بات ہے سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟" ایک پولیس آفیسر نے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر پوچھا۔

"جب میں نائن ون ون کو اپنا نام اور پتا بتا رہا تھا تو اس نے بھی سن لیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بدلہ لینے کے لیے مجھے تلاش کرے اور میرے گھر تک پہنچ جائے؟"

پولیس والے اس واقعے کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے۔ انہوں نے بے پروائی سے کہا۔ "سڑک پر جھگڑا، پارکنگ کی وجہ سے لڑائی۔۔۔ یہ سب باتیں اتنی اہم نہیں ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ تم خطرے میں ہو؟"

دوسرے پولیس والے نے کہا۔ "اس نے تمہاری گاڑی کے پینٹ کو نقصان پہنچا کر بدلہ تو لے لیا ہے۔" اسی اثنا میں پولیس کے وائرلیس سیٹ پر کسی دوسرے جھگڑے کی کال آگئی۔ پولیس آفیسر نے سر جھٹک کر منہ بنایا اور کہا۔ "اف! سینٹ پیٹرک ڈے کی وجہ سے اتنا رش ہے کہ لوگوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔" وہ فوراً وہاں سے روانہ ہوگئے۔ پاس کھڑے ہوئے

ایک آدمی نے چارلس سے خیریت دریافت کی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔۔۔ شکریہ۔" چارلس نے جواب دیا لیکن وہ بالکل ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے گاڑی کے اکھڑے ہوئے پینٹ کے لیے اسکریچ پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا۔۔۔ کیا اس معاملے میں میری غلطی تھی؟ کیا مجھے اس آدمی کو جگہ دے دینی چاہیے تھی؟ ہرگز نہیں۔ لیکن اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ کیا میں نے اسے بے عزت کیا تھا؟ نہیں۔ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ اتنے میں اس کی بیوی اور بیٹی ہاتھوں میں شاپنگ بیگ اٹھائے واپس آگئیں۔ انہوں نے گاڑی پر اسکریچ دیکھا پھر پچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے سیل فون کے ٹکڑے دیکھے تو اس کی بیوی نے حیران ہوکر پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے ہنی؟"

اس نے پورا واقعہ بیان کیا تو بیٹی نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"او ڈیڈ! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔ اب جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔"

ان کے بیٹھنے کے بعد اس نے گاڑی کے دروازے لاک کیے اور تیزی سے وہاں سے روانہ ہوگیا۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھا اور بار بار بیک ویو مرر میں دیکھتا جارہا تھا کہ کہیں حملہ آور کی گاڑی اس کا پیچھا تو نہیں کررہی لیکن اس کی گاڑی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی اس طرح باتیں کررہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چارلس خاموش تھا اور مستقل اس واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے خود پر اور اس منحوس شخص پر غصہ آرہا تھا۔

جب وہ گھر سے چند میل دور تھے تو اس کی بیوی نے کہا۔ "کیا بات ہے ہنی! تم اس پاگل آدمی کی وجہ سے ابھی تک پریشان لگ رہے ہو؟"

"نہیں، میں کچھ تھک گیا ہوں۔"

"تم پریشان نہ ہو۔ گاڑی کا تھوڑا سا پینٹ ہی تو اترا ہے۔ مستری اسے بالکل ٹھیک کردے گا۔"

عورتیں بھی معاملے کی گہرائی کو سمجھ نہیں پاتیں۔ اس نے سوچا۔ وہ رات کو بھی ٹھیک سے سو نہیں پایا۔ وہ بار بار کھڑکی سے گلی میں جھانکتا رہا کہ کہیں حملہ آور تو نہیں آگیا۔ اسے افسوس ہورہا تھا کہ اس نے جھگڑا کیوں کیا؟ اسے دھکا دے کر زمین پر کیوں گرایا؟ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا ہوجاتا اگر میں اپنی گاڑی نکال کر اسے جگہ دے دیتا اور اپنی گاڑی ڈبل پارک کرلیتا۔ پھر اس نے سوچا۔۔۔ شاید میں بزدل ہوں، کمزور یا پھر بوڑھا ہورہا ہوں۔

چھ ہفتے گزر گئے لیکن اس کا خوف دور نہیں ہوا۔ جب بھی وہ باہر نکلتا تو یہی سوچتا کہ حملہ آور کی گاڑی پیچھے آرہی ہے اور فرار ہونے کے لیے گاڑی کی رفتار تیز کردیتا۔ ایک دفعہ تو گھبراہٹ میں وہ ایک عورت کی گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ایک دن وہ ایک بار سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف جارہا تھا کہ اس کی نظر سڑک پار ایک آدمی پر پڑی جو سیاہ شیشوں والی عینک لگائے اسے گھور رہا تھا۔ وہ حملہ آور جیسا ہی لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چارلس کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ دیوانوں کی طرح بھاگا اور واپس بار میں گھس گیا۔ بدحواسی میں کتنے ہی لوگوں کو دھکے دیے، کسی کی ڈرنک گرائی اور بار کے پچھلے دروازے کی طرف بھاگا اور کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا وہاں سے فرار ہوگیا۔ حالانکہ ان سارے واقعات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سب اس کی نظر کا دھوکا تھا۔ نہ ہی کوئی اس کا پیچھا کررہا تھا اور نہ ہی سیاہ عینک والا شخص حملہ آور تھا۔ بس خوف کسی طرح اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔۔۔ وہ اس خوف سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ایک فیصلہ کیا۔ ایک صبح اس نے دفتر میں ایک میٹنگ کینسل کی۔ وہ ایک اسلحے کی دکان پر پہنچا اور ایک آٹومیٹک پستول خرید لیا جو اس کی حفاظت کرسکتا تھا۔ اب وہ کچھ مطمئن تھا۔

☆☆☆

جیمی فیلڈن صبح نو بجے سو کر اٹھا۔ خوب آرام کرنے کے بعد وہ تازہ دم تھا اور نئی زندگی کی شروعات کرنا چاہتا تھا۔ گزشتہ شب اس نے اپنے بستر پر صاف چادر بچھائی تھی، دھلا ہوا سلیپنگ سوٹ پہنا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد بیئر پینے کی عیاشی بھی کی۔ سگریٹ پیے، سونے سے پہلے ایک منٹ تک دانت بھی صاف کیے اور اب ہلکا سا ناشتا کررہا تھا۔ اس نے ان نوٹس پر ایک نظر ڈالی جو چارلس وگن کے متعلق جمع کیے تھے۔

وہ ایک بزنس مین ہے۔ لنکولن میں رہتا ہے لیکن جیمی اس سے اس کی فیملی کی غیر موجودگی میں ملنا چاہتا تھا۔ اس نے گوگل میں اس کا نام ڈالا تو پتا چلا کہ وہ کسی کمپیوٹر انڈسٹری میں کام کرتا ہے جو اس کے گھر سے دس میل دور تھی۔ اس لیے جیمی نے وہیں جانے کا فیصلہ کیا۔ جیمی اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لے جانا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کر شیمپین کی بوتل ساتھ لینا مناسب سمجھا۔ ٹھیک پانچ بجے جیمی فیلڈن، چارلس وگن کے دفتر کے باہر تھا۔ وہ اپنی ٹویوٹا کار میں بیٹھا ریڈیو پر گانے سن رہا تھا اور لوگوں کو دفتر سے نکلتے ہوئے دیکھ رہا تھا [illegible] تھا۔

http://[illegible].blogspot.com

میکڈونلڈ کے چکن سینڈوچ۔ اور کولڈ کافی بڑا مزہ دے رہی تھی۔

وہ چارلس کے آفس سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں چارلس ویگن آفس کے سامنے والے دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے چاروں طرف ایک محتاط نظر ڈالی اور پارکنگ کی طرف چل دیا۔ جیمی نے ایک گہری سانس لی۔ اس نے شیمپین کی بوتل کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھاما۔ کار سے نکلا اور پارکنگ کے ساتھ بنے ہوئے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا اوپر جانے لگا۔

☆☆☆

چارلس ویگن اپنی کار کے پاس پہنچا اور پینٹ کا کام دیکھنے لگا جو اس نے تازہ تازہ کروایا تھا۔ نفسیاتی مجرم نے گاڑی کے پینٹ کو اپنی چابی سے جو نقصان پہنچایا تھا، وہ اب مکمل طور پر غائب ہوگیا تھا۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے کمر میں لگے ریوالور نے نفسیاتی حملہ آور کا خوف دل سے دور کر دیا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔۔۔ 'اب میں تمہارے حملے کا جواب دے سکتا ہوں۔' یہی وقت تھا جب اس نے کوئی آواز سنی جو زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ اس کے قدم زمین پر جم گئے۔ اس نے گردن گھما کر چاروں اطراف میں دیکھا۔ گیراج میں کوئی نہیں تھا۔ اس کو پارکنگ پانچویں فلور پر ملی تھی اور وہاں صرف اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے اپنا بریف کیس سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ میں شفٹ کیا۔ اب پستول اس کے دائیں ہاتھ سے چند انچ کی دوری پر تھا لیکن پھر اس نے سوچا اس منحوس آدمی کو یہ کیسے پتا لگ سکتا ہے کہ میں یہاں کام کرتا ہوں؟ وہ لنکولن میں میرے گھر کے باہر انتظار کر سکتا ہے لیکن یہاں؟ ناممکن۔۔۔ لیکن پھر بھی اس نے ایک محتاط نظر اپنے پیچھے ڈالی۔ سیڑھیوں کی دیوار پر ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ اس کی زبان گنگ ہوگئی اور دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ وہ اس آدمی کا چہرہ پہچانتا تھا۔ اس کو اس کی غصہ اگلتی آنکھیں بھی یاد آگئیں۔ شراب کے جھٹکے اور بے قابو ہاتھ جن سے اس نے اس کی جیکٹ کو کھینچا تھا۔ پورا منظر اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی سے ایک سرد لہر اٹھی مگر یہ خوف نہیں تھا، یہ اس کے اندر کا جوش تھا۔ چارلس ویگن نے اپنا بریف کیس زمین پر رکھا اور جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالنے لگا۔ ساتھ ہی وہ گیراج کا جائزہ لیتا جا رہا تھا جہاں سے قدموں کی آواز آئی تھی۔ وہ آواز دوبارہ آئی تو اس نے جلدی سے چابی گھما کر گاڑی کا دروازہ کھولا لیکن اندر بیٹھا نہیں بلکہ اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے پستول کو تھپتھپایا۔ اچانک اس نے ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سنی تو اس کے اعصاب تن گئے۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا تو اس کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا، جب اس نے ایک پک اپ ٹرک کو باہر کی طرف جاتے دیکھا۔

یہی وقت تھا جب اس نے اپنے پیچھے سے ایک مردانہ آواز سنی۔ "ایکسکیوزمی مسٹر چارلس! تم شاید مجھے نہیں جانتے لیکن۔۔۔؟"

چارلس کی سانس رک گئی۔ گاڑی کی چابیاں ہاتھ سے گر گئیں۔ اس نے دہشت سے اس شخص کو گھور کر دیکھا جو پشت کی طرف سے اب سامنے آ گیا تھا جس کے دائیں ہاتھ میں چھری کی طرح کوئی لمبی چیز تھی۔

'اوہ خدا! یہ تو وہی حملہ آور ہے۔' اس نے سوچا اور غیر محسوس طریقے سے تیزی سے پستول نکالا۔ شوٹنگ پوز بنا کر آدمی کے سینے کا نشانہ لیا۔۔۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں نے ٹریگر کو دبانا شروع کیا۔

جیمی فیلڈن سانس روکے سکتے کی سی حالت میں کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پستول کی طرف پھیلا ہوا تھا جیسے آنے والی گولی کو ہاتھ سے روک لے گا۔

"نہیں پلیز!" وہ گڑگڑایا۔

جیمی اور چارلس دونوں اپنی جگہ ساکت تھے۔ وقت جیسے تھم گیا تھا۔ مہیب سناٹا طاری تھا۔ اتنی خاموشی تھی کہ جیمی کو ایسا لگا کہ گولی نے اس کا کام تمام کر دیا ہے اور وہ مر چکا ہے۔ اچانک فاصلے سے کسی ٹرک کے ہارن کی آواز آئی تو اس کو ہوش آیا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

"پلیز! ایسا نہ کرنا۔۔۔ پلیز! پستول کو ہٹا لو۔" وہ پھر گھگھیایا۔

چارلس بہت غور سے جیمی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم۔۔۔ مجھے معاف کرنا۔۔۔ کیا تم ادھر روشنی میں آسکتے ہو؟ یہاں اندھیرا ہے۔"

جیمی روشنی کی طرف کھسکنے لگا۔ چارلس نے روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چھری نہیں، شیمپین کی بوتل تھی اور وہ چہرہ حملہ آور کا بھی نہیں تھا۔

"اوہ میرے خدا۔۔۔!" اس کا پستول والا ہاتھ نیچے چلا گیا اور وہ اپنی کار سے سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

"میں سمجھا۔۔۔ مجھے معاف کرنا۔۔۔ میں تمہیں کوئی اور سمجھا۔"

جیمی نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ اس نے پوچھا۔ "کون؟"

چارلس نے بتایا۔ "بوسٹن میں ایک شخص سے کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس دن سینٹ پیٹرک ڈے تھا۔ رش بہت زیادہ تھا۔

پارکنگ نہیں مل رہی تھی۔ بس اسی بات پر کچھ تو تو میں میں ہو گئی۔۔۔ مجھے افسوس ہے۔۔۔ میں تمہیں روشنی کم ہونے کی وجہ سے ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا، شاید میری نظر کمزور ہو گئی ہے۔" پھر اس نے پستول پر نظر ڈالی اور اسے جلدی سے ہولسٹر میں رکھ لیا۔ پھر دوبارہ شرمندگی سے بولا۔ "تم۔۔۔ میرا مطلب۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟"

جیمی نے ہنس کر کہا۔ "تمہارے پستول کے ہولسٹر میں جانے کے بعد میں کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں ورنہ صرف ایک منٹ پہلے خوف سے میرا برا حال تھا۔"

"تم کون ہو؟"

"میرا نام جیمی فیلڈن ہے۔"

"کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟"

"حقیقت میں تو ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے لیکن ملے ضرور ہیں۔"

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

جیمی نے اچانک گرج کر کہا۔ "میں تم سے انتقام لینے آیا ہوں۔" پھر اس نے شیمپین کی بوتل کو فضا میں لہرایا۔

چارلس نے بھویں سکیڑ کر حیرت سے پوچھا۔ "لیکن میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟" جیمی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بوتل کو گھمایا اور آگے بڑھ کر چارلس کے سر پر دے مارا۔

چارلس کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد جب چارلس کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ جیمی پستول ہاتھ میں لیے اس کے سینے کا نشانہ لے رہا ہے۔ پستول کے دستے پر اس نے ایک رومال لپیٹا ہوا تھا۔

"یہ کیا چکر ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"انتقام۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا تھا۔"

"لیکن میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔۔۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"پکی بات ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔۔۔ ہے نا؟"

"ہاں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"

"ذرا دماغ پر زور ڈالو۔۔۔ سوچو۔"

"یقین مانو مجھے کچھ نہیں یاد۔ تم یہ پستول تو نیچے کر لو۔ ہم آپس میں بات چیت کر کے بھی معاملے کو حل کر سکتے ہیں۔"

"ذرا اپنے ماضی میں جھانکو۔ گزشتہ مارچ کے مہینے میں تم لنکولن بار کلب گئے تھے۔"

"ہاں، میں وہاں اکثر جاتا ہوں۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں لیکن میں اس خاص دن کی بات

پاکیزہ
فروری 2011ء
کی ایک جھلک

عالیہ بخاری کا ناول خوشبو کا سفر
ایک نئی مہک کے ساتھ رفیقہ بلگرامی کا ناول اگر ملنا نہیں ہمدم سوچ کی نئی راہوں پر گامزن

فرحانہ ناز ملک کا زرد رواج زمانے کے
کچے جذبوں سے مزین ایک پرتاثر مکمل ناول

سائرہ عارف، رتیزا رشی اور
مدیحہ عدنان کے زندگی سے قریب ترین تلخ و شیریں ناولٹ

افسانوں میں شیریں حیدر، سیمابت عاصم، نورالعین ساحرہ، رابعہ فیاض قادری، ارجمند عقیل، مدیحہ شاہ کی خوب صورت دھنک

مقبول معروف اداکار شکیل اور ان کی بیگم کی گفتگو جسے تحریر میں ڈھالا ہے رضوانہ پرنس نے

بہنوں کی محفل پاکیزہ کی فیس بک جس میں آپ بھی اپنے کھٹے میٹھے اور تیکھے خطوط کے ساتھ شرکت کر سکتی ہیں

دین کی باتیں، روحانی مشورے، طبی مشورے، میں اکثر گنگناتی ہوں، میرا انتخاب، بزم پاکیزہ، جلترنگ، ہومیو کلینک اور وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتی ہیں

اگر آپ پاکیزہ میں اپنی تحریر اور تصویر دیکھنا چاہتی ہیں تو جنوری کا پاکیزہ پڑھنا نہ بھولیں

http://digestpk.blogspot.com

کر رہا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا جب تم کلب کے دروازے سے باہر نکلے لیکن فوراً ہی دوڑتے ہوئے واپس آئے۔۔۔۔ جیسے باہر تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ بدحواسی میں تم مجھ سے ٹکرائے۔ میرے ہاتھ میں جو شراب سے بھرا جام تھا، وہ میرے کپڑوں پر گر گیا۔ میرے سارے کپڑے گندے ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہاری اس حرکت پر تمہاری خبر لیتا، تم بار کے پچھلے دروازے سے نکل کر بھاگ گئے۔"

"ٹھہرو۔" چارلس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "مجھے یاد آگیا۔۔۔ لیکن تم نے مجھے تلاش کیسے کیا؟"

"لنکولن کے پب کے بارٹینڈر سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ اس کے بعد گوگل پر جاکر تمہارے گھر کا پتا اور یہ کہ تم کہاں کام کرتے ہو، سب معلوم ہوگیا۔ میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ تمہیں اکیلے ہی چھاپ لوں۔ میں تمہاری فیملی کو درمیان میں نہیں لانا چاہتا تھا۔"

"تمہیں میرے مسئلے کو سمجھنا چاہیے۔ اس دن جب میں بار سے باہر نکلا تھا تو مجھے شک ہوا کہ وہاں وہی حملہ آور ہے جس کے متعلق ابھی میں نے تمہیں بتایا تھا۔ میں خوف زدہ ہوکر واپس بھاگا اور گھبراہٹ میں تم سے ٹکرا گیا۔ یہ غیر اختیاری فعل تھا۔ میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔"

جمی نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور بولا۔ "اس دن مجھے کورٹ کے حکم کے مطابق اپنے بیٹے سے ملنے جانا تھا لیکن ڈرنک سے کپڑے گندے ہو جانے کی وجہ سے مجھے کپڑے تبدیل کرنے گھر جانا پڑا جس کی وجہ سے مجھے کورٹ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔۔۔ چنانچہ میری سابقہ بیوی میرے پہنچنے سے پہلے میرے بیٹے کو لے کر غائب ہوگئی اور مجھے کورٹ کو بھی ایک بڑی رقم جرمانے کے طور پر بھرنی پڑی۔"

"مجھے بہت افسوس ہے لیکن۔۔۔"

"افسوس ہے پھر بھی لیکن۔۔۔" جمی نے مضحکہ اڑایا۔ "سنو، میں ایک شکست خوردہ شخص ہوں۔ ساری زندگی لوگ میری توہین کرتے رہے، مجھے دھوکا دیتے رہے۔۔۔ میرا مذاق اڑاتے رہے۔ بچپن سے لے کر اب تک مجھے ٹھوکریں مارتے رہے اور مجھ میں ان سے ٹکرانے، ان سے لڑنے اور ان سے بدلہ لینے کی ہمت نہیں تھی اس لیے میں سب کچھ برداشت کرتا رہا۔۔۔ لیکن ایک ہفتہ پہلے میری زندگی میں ایک موڑ آیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں کسی کی زیادتی برداشت نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے مجھے اب تک نقصان پہنچایا ہے، ان سب سے انتقام لوں گا اور میری لسٹ میں تمہارا نام سب سے اوپر ہے۔"

"مجھ سے انتقام لوگے؟" چارلس نے سوالیہ انداز میں حیرت سے پوچھا۔ "میں نے کیا ہی کیا ہے؟ صرف اتنی سی بات کہ ڈرنک غلطی سے تمہارے کپڑوں پر گر گئی۔۔۔ تم چاہتے کیا ہو؟ تمہیں رقم چاہیے؟"

"نہیں! مجھے تمہاری جان چاہیے۔" جمی نے غرا کر کہا اور پستول چارلس کے سر سے لگا دیا۔ پھر ٹریگر پر انگلی کا زور ڈالنا شروع کیا۔ جوں جوں ٹریگر دب رہا تھا، چارلس کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اس نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور گولی کے سر میں پیوست ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دھماکا ہوا اور تیز چیخ کی آواز سنائی دی۔

لیکن یہ چیخ میری تو نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کوئی تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ چارلس نے حیرت سے سوچا اور جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے دوسرا ہی منظر تھا۔ جمی کے ہاتھ سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ وہ اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے دبائے کراہ رہا تھا۔ پستول دور زمین پر پڑا تھا اور نائن ون ون کا وہی پولیس آفیسر جس سے پہلے بھی اس کا واسطہ پڑ چکا تھا، ہاتھ میں گن لیے کھڑا تھا جس کا رخ جمی کے ہاتھ کی طرف تھا۔

چارلس زمین سے اٹھا۔ اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ کہیں کوئی ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی لیکن شکر خدا کا سب سلامت تھا۔ چارلس حیران تھا، یہ معجزہ کیسے ہوگیا؟ چارلس نے سوالیہ نظروں سے پولیس آفیسر کی طرف دیکھا۔ اس نے بتایا کہ گارڈ نے جمی کو کسی پر پستول تانے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً نائن ون ون کو فون کر دیا۔ اتفاق سے وہ اسی علاقے میں گشت کر رہا تھا اسی لیے فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گیا اور عین اس وقت جب وہ فائر کرنے والا تھا آفیسر نے اس کے ہاتھ پر گولی چلا کر اس کے حملے کو ناکام کر دیا۔

"نئی زندگی مبارک ہو۔" آفیسر نے ہنس کر کہا۔

"یہ تمہاری مہربانی کا نتیجہ ہے آفیسر! اگر تم بروقت یہاں نہ پہنچتے تو اس نے تو مجھے اوپر روانہ کر دیا تھا۔" چارلس نے جمی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"کیا یہ وہی پاگل ہے جس نے سینٹ پیٹرک ڈے پر تمہیں زدوکوب کیا تھا؟"

"نہیں آفیسر! یہ دوسرا پاگل ہے۔ آج کل پاگلوں نے میرا گھیراؤ کر رکھا ہے۔"

آفیسر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جمی کو ہتھکڑی ڈال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ چارلس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنا پستول اٹھا کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب میں پہلے سے زیادہ محتاط ہوگیا ہوں۔

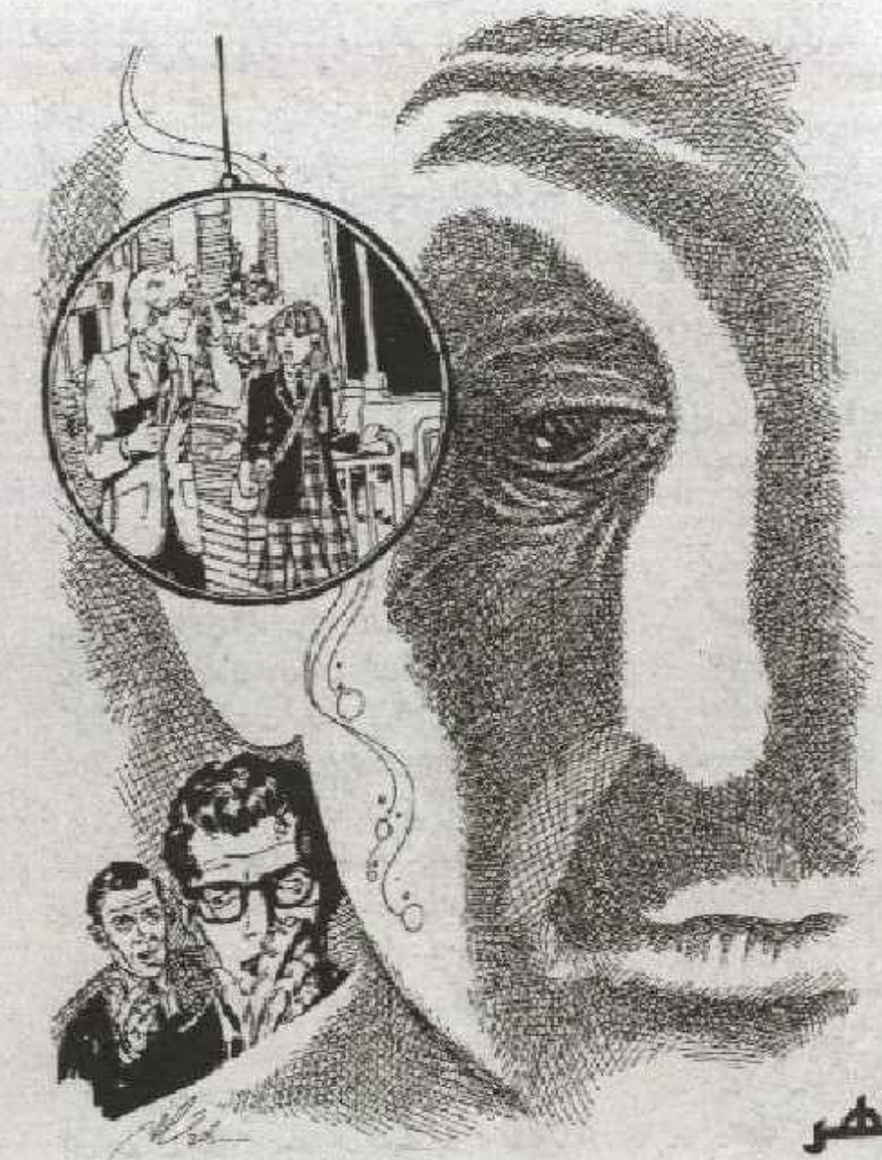

گڑیا گھر

رضوان منظر

معمولاتِ زندگی سے قطع نظر ہر شخص کوئی نہ کوئی شوق ضرور رکھتا ہے اکثر اوقات وہی شوق ذریعۂ معاش کی صورت اس کی زندگی کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔۔۔ مگر بسا اوقات یہ شوق آہستہ آہستہ ایسے جنوں میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

وہ اپنی ہر تخلیق کو لازوال فن پارے کی صورت دینے کا شدید خواہش مند تھا۔

اس چھوٹے سے لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بلڈنگ کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی عمر بمشکل بارہ سال ہوگی۔ آنکھوں پر چشمہ، پیروں میں سلیپر، براؤن اور گوٹ اور گہرے نیلے رنگ کے پاجامے میں ملبوس وہ اس سرد رات میں نہ جانے کس مشن پر نکلا تھا، حالانکہ اس وقت اسے اپنے بستر میں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اپنی بلڈنگ سے بارہ بلاک دور ہر قسم کے خوف سے بے نیاز اپارٹمنٹ بلڈنگ کے مرکزی دروازے پر کھڑا تھا۔ عمارت کے اندرونی حصے میں باہر کی نسبت سردی قدرے کم تھی۔ استقبالیہ پر موجود عمر رسیدہ نائٹ کلرک اونگھتے اونگھتے سو گیا تھا اور پیالی میں بچی ہوئی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ لڑکا اس کے پاس سے گزرا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا پانچویں منزل پر پہنچ گیا۔ اسے مطلوبہ

http://digestpk.blogspot.com/

شخص کا پتا اچھی طرح یاد تھا۔ اپارٹمنٹ نمبر 26، پانچویں منزل، ڈرگ اسٹور کے برابر میں پرانی گرے کلر کی عمارت۔

راہداری میں ہلکی سی روشنی تھی۔ ایک دروازے کے پیچھے سے کسی مرد اور عورت کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کسی بات پر بحث کررہے تھے جبکہ دوسرے اپارٹمنٹ میں ٹی وی چل رہا تھا۔ لڑکا دروازوں پر لگے ہوئے نمبر پڑھتا گیا۔ اس نے اپنا چشمہ سیدھا کیا کیونکہ نمبر پڑھنے میں دشواری محسوس ہورہی تھی۔ راہداری کے آخری سرے پر اپارٹمنٹ نمبر 26 تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد دوسری بار دستک دی۔ اس آواز پر ہنری چونک گیا۔ وہ اس وقت اپنے پرانے پیانو پر بیٹھا ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا جو پیانو کے اوپری حصے پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کسی لڑکی کی تھی۔ وقت کی گرد نے اس تصویر کو دھندلا دیا تھا لیکن لڑکی کی خوب صورتی پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

دوسری تصویر ہنری کی تھی جس میں اس نے پرانے زمانے کے فیشن کے مطابق باریک مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ بدن پر نفاست سے سلا ہوا سوٹ زیب تن تھا اور وہ کوئی فلم اسٹار لگ رہا تھا۔ اسی تصویر میں ہنری کے ساتھ ایک پانچ سالہ بچی بھی تھی۔ ہنری کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ تصویر کھینچی گئی تھی۔

تیسری دستک پر ہنری اپنے خیالوں سے باہر آگیا۔ اس نے جلتی ہوئی سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی اور اپنا ریوالور اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”کون ہے؟“

دروازے کے دوسری جانب سے ایک بچے کی آواز سنائی دی جو ہنری کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ ہنری نے دروازہ ذرا سا کھولا اور باہر جھانکا۔ لڑکا اسی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایک سراغ رساں کی ضرورت ہے۔“

لڑکے کا قد زیادہ سے زیادہ چار فٹ ہوگا۔ چھوٹے سے چہرے پر خوب صورتی سے سنوارے ہوئے بال اس کی معصومیت میں اضافہ کررہے تھے۔ اس کا لباس بھی اس علاقے کے دوسرے لڑکوں کی نسبت خاصا صاف ستھرا تھا۔

”چلے جاؤ۔“ ہنری نے ناگواری سے کہہ کر دروازہ بند کردیا اور اپنی جگہ واپس آکر نئی سگریٹ سلگالی۔ لڑکے نے دوبارہ دستک دی لیکن ہنری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ایک ہاتھ ریوالور پر تھا جبکہ دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اس نے پیانو پر اپنی پسندیدہ دھن چھیڑ دی۔ اس نے حال ہی میں پیانو کی مرمت کروائی تھی۔

☆☆☆

دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ لڑکا ایک بار پھر اپنے گھر سے باہر نکلا اور گلیوں گلیوں ہوتا ہوا مطلوبہ عمارت تک پہنچ گیا۔ گزشتہ رات کی طرح ایک بار پھر اس نے اپارٹمنٹ نمبر 26 کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا لیکن لڑکے نے ہمت نہ ہاری اور وہ بیس منٹ تک وقفے وقفے سے دستک دیتا رہا۔ تنگ آکر ہنری نے دروازہ کھولا اور غصے سے پوچھا۔

”تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”بارہ سال۔“ لڑکے نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“

”گھر پر بیٹھی ریڈیو سن رہی ہوگی۔“

”اور باپ؟“

”وہ بھی لاؤنج میں صوفے پر پڑا سو رہا ہوگا۔“

اس سے پہلے کہ ہنری کچھ اور پوچھتا، لڑکے نے سوال داغ دیا۔ ”تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”اکہتر سال۔“

لڑکا متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ ”اوہ... تم تو خاصے بڑے ہو۔“

”جبکہ تم بہت چھوٹے ہو۔ یہ بتاؤ کہ بارہ سال کی عمر میں تمہیں سراغ رساں کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

”کیونکہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میری اسپنسر کہاں ہے؟“

”یہ میری اسپنسر کون ہے؟“

”وہ میری ایک دوست ہے اور صرف میں ہی یہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔“

”کیا تم مجھے بتانا پسند کروگے کہ وہ کہاں ہے؟“ ہنری نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ایک آنکھ والے آدمی نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔“

ہنری نے غور سے اس لڑکے کو دیکھا۔ وہ جیتا جاگتا انسان تھا یا کوئی بھٹکی روح۔ اسے یوں لگا کہ اگر وہ مزید چند لمحے اس سے باتیں کرتا رہا تو ضرور پاگل ہوجائے گا۔ اس نے لڑکے کو دھتکارتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ یہاں سے... میرا وقت خراب کرنے آجاتے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کردیا۔

دوسرے روز ہنری نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنا شروع کردیں۔ اس نے اپنے ایک پرانے ساتھی دوست

کیا جو کافی عرصے سے پولیس میں تھا لیکن ابھی تک کوئی کارنامہ انجام نہیں دے پایا تھا لیکن اس کی باتیں سن کر ایسا لگتا تھا جیسے سارا پولیس ڈپارٹمنٹ اسی پر چل رہا ہے۔ اس نے تصدیق کی کہ میری اسپنسر اسکول سے گھر واپس آتے ہوئے دس روز پہلے غائب ہوگئی تھی اور ابھی تک اس کی گمشدگی کے بارے میں کوئی ثبوت یا شہادت نہیں مل سکی ہے۔ پولیس کو شک تھا کہ لڑکی کے باپ نے اسے اغوا کیا ہے۔ وہ مشرقی بندرگاہ پر رہتا تھا اور ایک سال پہلے بیوی سے اس کی علیحدگی ہوگئی تھی۔

اس رات وہ لڑکا آیا تو ہنری نے پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا اور بولا۔ ”لڑکے! تمہارا نام کیا ہے؟“

”ٹاس۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”اندر آجاؤ۔“

اس روز ٹاس نے پاجامے کے بجائے براؤن کلر کی پتلون پہن رکھی تھی۔ سفید قمیص اور چمکتے ہوئے سیاہ جوتوں نے اس کی شخصیت کو مزید نکھار دیا تھا۔ ہنری کے کمرے میں پیانو کے علاوہ تقریباً تمام چیزیں کباڑ خانے کا منظر پیش کررہی تھیں۔ ٹاس دلچسپی سے ان سب کو دیکھتا ہوا پیانو کے پاس آیا اور اسٹول پر بیٹھ کر کسی ماہر پیانو نواز کی طرح انگلیاں چلانے لگا۔ ہنری دو منٹ تک اسے پیانو سے کھیلتے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بس کرو... میں نے تمہیں یہاں اس لیے نہیں بلایا۔“

ٹاس کا ہاتھ چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے ہنری سے کہا۔ ”میں نے کل رات تمہیں پیانو بجاتے ہوئے سنا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں مزید سیکھنے کی ضرورت ہے۔“

ہنری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”میرے ہاتھ کی ننھی انگلیاں نہیں ہیں۔ اس لیے مجھ سے سیکھنے کی بات مت کرو۔“

”میرے باپ نے اس پیانو کی مرمت کی تھی۔“ ٹاس نے انکشاف کیا۔ ”وہ دو ہفتے پہلے یہاں آیا تھا۔“

ہنری کی آنکھوں کے سامنے پیانو ٹھیک کرنے والے کی صورت گھوم گئی۔ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

”میرے باپ کا کہنا تھا کہ اس نے تمہارے پیانو کے نچلے خانے میں ریوالور رکھا دیکھا تھا... جس سے وہ یہی سمجھا کہ تم ماضی میں پولیس سراغ رساں رہ چکے ہو۔“

ہنری کو ہنسی آگئی۔ ضروری تو نہیں کہ جس کے پاس ریوالور ہو وہ پولیس میں بھی رہ چکا ہو لیکن اس نے سر ہلاتے ہوئے گفتگو کا رخ اصل موضوع کی جانب موڑ دیا۔ ”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میری اسپنسر، ایک آنکھ والے آدمی کے پاس ہے؟“

ٹاس پیانو کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں اور میری ایک ساتھ ہی اسکول سے گھر واپس آتے ہیں۔ ہمارا راستہ ایلورنا ہائٹس کے سامنے سے گزرتا ہے اور یہ وہی جگہ ہے جہاں ایک آنکھ والے آدمی کی رہائش ہے۔“

”کیا واقعی اس کی ایک ہی آنکھ ہے؟“ ہنری نے تعجب سے پوچھا۔

ٹاس نے سر ہلایا اور بولا۔ ”اکثر و بیشتر جب ہم اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے تو وہ باہر آجاتا اور ہم سے باتیں کرنے لگتا۔“

ہنری کرسی پر بیٹھ گیا اور نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”وہ کس بارے میں باتیں کیا کرتا تھا؟“

”ہر طرح کے موضوعات پر... موسم، کتابیں اور اپنی بلی کے بارے میں وہ زیادہ باتیں کرتا تھا۔“

”اس کی عمر کیا ہوگی؟“

”تقریباً تمہارے جتنی... شاید کچھ زیادہ ہو۔“

”مجھے تو وہ کوئی تنہائی کا مارا بوڑھا شخص لگتا ہے۔ تم اس پر شبہ کیوں کررہے ہو؟“ ہنری نے اسے کریدا۔

”وہ میری سے باتیں کرتے وقت جس انداز میں اسے دیکھتا تھا، اس سے اس کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت سی باتیں کرتا تھا۔“

”مثلاً؟“

”وہ کہا کرتا تھا کہ میری کا چہرہ اور بال بہت خوب صورت ہیں۔ اس نے میری سے اس کے گھر کا پتا اور اسکول کا نام بھی پوچھا تھا۔ اس نے میری سے یہ بھی کہا کہ کیا اسے گڑیاں پسند ہیں۔ سب سے زیادہ قابل اعتراض اس کا دیکھنے کا انداز تھا۔“

”کیا تم نے کسی کو اس بارے میں کچھ بتایا؟“

”ہاں... لیکن کوئی بھی سننا نہیں چاہتا۔“ ٹاس نے مایوسی سے کہا۔

”تم نے کس سے بات کی تھی؟“

”میں نے اپنی ماں کو بتایا تھا۔ اس نے یہی بات ڈیڈ سے کہی اور اس نے ایک پولیس مین کو جا کر سارا قصہ سنا دیا۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”تقریباً دس دن گزر چکے ہیں۔“

[illegible]

http://digestpk.blogspot.com

"نہیں۔"

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" ہنری نے جرح کے انداز میں پوچھا۔

"کیونکہ ایک آنکھ والا آدمی اب بھی آزادانہ گھوم رہا ہے جبکہ میری کا کچھ پتا نہیں۔" ٹاس نے تلخی سے کہا۔

ہنری نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اتنا ہی مخلص نظر آرہا تھا جتنا کہ ایک بارہ سالہ لڑکا اپنی دوست کے معاملے میں ہوسکتا ہے۔ اس نے ٹاس سے پوچھا۔

"آخری بار تم نے میری کو کب دیکھا تھا؟"

"جس دن وہ غائب ہوئی۔ ہم ایک ساتھ واپس گھر نہیں آئے تھے۔ میری ماں اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد مجھے نئے جوتے دلانے کے لیے مارکیٹ لے گئی تھی۔"

ہنری کی نگاہ اس کے پیروں پر گئی۔ اس نے واقعی نئے جوتے پہن رکھے تھے۔ ہنری نے پیانو کے اوپر رکھے ہوئے رسالوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان میں سے ایک میگزین اٹھادو۔"

ٹاس نے وہاں سے ایک میگزین اٹھایا۔ معاً اس کی نگاہ پیانو پر رکھی ہوئی تصویروں پر گئی۔ اس نے ہنری کو میگزین دیتے ہوئے کہا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

ہنری ڈائننگ ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "میری بیٹی!"

"کیا وہ بھی تمہارے ساتھ ہی رہتی ہے؟" ٹاس نے پوچھا۔

"نہیں، وہ مرچکی ہے۔"

ٹاس نے ایک بار پھر ہنری کو دیکھا پھر وہ اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ وہ قینچی سے میگزین کے سرورق کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ تم کیا کررہے ہو؟"

"یہ مجھے ایک بوڑھے پولیس والے نے بتایا تھا۔" ہنری نے تصویر کے ٹکڑوں کو میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح وہ کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کررہا تھا۔"

ٹاس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ہنری کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟" ہنری نے اس سے پوچھا۔

"ایک تصویر کے ٹکڑے۔"

"یہ تصویر کس کی ہے؟" ہنری نے دوسرا سوال پوچھا۔

ٹاس نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے اپنے کندھے اچکا دیے۔

"ان میں سے ایک ٹکڑا اٹھاؤ۔" ہنری نے کہا۔

ٹاس نے ان میں سے ایک ٹکڑا اٹھایا اور بولا۔ "یہ تو کسی کی آنکھ ہے۔"

"یہ پہلا اشارہ ہے۔ اب دوسرا ٹکڑا اٹھاؤ۔"

ٹاس نے دوسرے ٹکڑے کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "یہ کسی کا منہ ہے۔"

"یہ دوسرا اشارہ ہے۔ اسی طرح تم ایک ایک ٹکڑا اٹھاتے جاؤ گے تو یہ تصویر مکمل ہو جائے گی۔ اس وقت تمہارے پاس صرف دو اشارے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہاری دوست گم ہوگئی ہے اور دوسرا۔۔۔ یہ کہ ایلورنا ہائٹس میں ایک آنکھ والا شخص رہتا ہے۔ گویا تمہارے پاس مکمل تصویر نہیں، اس کے صرف دو ٹکڑے ہیں۔"

ٹاس نے بیزاری سے سر ہلایا اور بولا۔ "میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔"

☆☆☆

"تمہاری انگلیاں کیسے ضائع ہوگئیں؟" ٹاس نے ایلورنا ہائٹس کی طرف جاتے ہوئے ہنری سے پوچھا۔

"یوں سمجھ لو کہ یہ کچھ بُرے آدمیوں کی کارستانی ہے۔"

اس وقت سڑکیں سنسان پڑی تھیں اور دوپہر میں ہونے والی بارش کی وجہ سے گیلی تھیں۔ ہنری نے اپنا پرانا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اسے رات گئے سڑکوں پر گھومنے کی عادت تھی۔ اس نے ٹاس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تم مجھے میری کے بارے میں کیا بتا سکتے ہو؟"

ٹاس نے پانچ منٹ میں اس لڑکی کے متعلق سب کچھ بتا دیا جس کے ساتھ وہ روزانہ اسکول سے واپس آتا تھا۔ اس کے بال سرخ اور قد ٹاس جتنا ہی تھا۔ وہ ایک ہی گلی میں رہتے تھے اور کلاس روم میں بھی ان کے ڈیسک برابر برابر تھے۔ اس کا پسندیدہ رنگ بنفشی اور کی نمبر تین تھا۔ اسے شور شرابا، جنگ اور مار دھاڑ والی فلمیں بالکل پسند نہیں تھیں۔ وہ وائلن بجانا سیکھ رہی تھی اور اس کی پسندیدہ کتاب لعل دیمن تھی۔

"تم واقعی اس لڑکی کے لیے پریشان ہو؟" ہنری نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ٹاس اس بے تکے سوال پر بوکھلا گیا۔

"دو تین سالوں بعد تم سب کچھ جان جاؤ گے۔" ہنری نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ایلورنا ہائٹس پہنچ کر ٹاس ان سیڑھیوں کی جانب بڑھا جہاں سے ایک آنکھ والا آدمی اتر کر ان کے راستے میں آیا

کرتا تھا۔ وہ مکان دو منزلہ تھا اور رات کی تاریکی میں لگ رہا تھا جیسے اس کی بیرونی دیواروں پر سیاہ رنگ کردیا گیا ہو۔ صرف دوسری منزل کے کسی کمرے میں روشنی نظر آرہی تھی۔ ایک سفید رنگ کی لمبی سیڑھیوں کے دروازے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سیڑھیوں سے نیچے ہنری اور ٹاس کو دیکھا تو اس کی آنکھیں کچھ اور تنگ ہوگئیں پھر وہ اپنے پنجے زمین پر مارتے ہوئے واپس چلی گئی۔

ایلورنا ہائٹس ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور وہاں روشنی کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ایک جانب مکانات بنے ہوئے تھے اور دوسری طرف پارک تھا۔ اس وقت وہاں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور قرب و جوار میں کوئی فرد نظر نہیں آرہا تھا۔ ہنری سڑک پار کرکے ٹاس کو پارک میں لے گیا اور وہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے اس طرح کھڑے ہوگئے کہ تاریکی میں کسی کو نظر نہ آسکیں۔

"تین دن پہلے میں نے اس مکان کا تالا کھولنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تالا کس طرح کھولا جاتا ہے۔" ٹاس نے ایک آنکھ والے آدمی کے مکان پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اس طرح کی کوشش تمہیں کسی بڑی مشکل میں مبتلا کرسکتی ہے۔" ہنری نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ٹاس نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ وہ اسی مکان میں ہے۔"

ہنری اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے حقائق سے آگاہی بھی ضروری تھی، چنانچہ اس نے محتاط لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "کثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ میری کے باپ نے اسے چھین لیا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہاری دوست والدین کے جھگڑے میں پھنس گئی ہے۔"

ٹاس نے بھی یہ سب باتیں سن رکھی تھیں۔ وہ بولا۔ "مجھے تصویر کے مزید ٹکڑوں کی ضرورت ہے۔"

"تمہاری ہر بات کا رخ گھوم پھر کر اسی بوڑھے کی طرف چلا جاتا ہے۔ تمہارے پاس اپنی دعویٰ کے حق میں کوئی ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے۔"

ٹاس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ "اب مجھے چلنا چاہیے۔ میں اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہ سکتا۔"

"چلو، میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔"

وہ دونوں دوسری سمت میں چل دیے۔ گھر کے قریب پہنچ کر ٹاس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میری بات سننے کا شکریہ۔"

ہنری کی بھویں چڑھ گئیں اور وہ تنک کر بولا۔ "تمہیں یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

☆☆☆

دوسرے دن سہ پہر کے وقت ایلورنا ہائٹس کے مکان سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس نے سیاہ رنگ کا اوورکوٹ اور سر پر ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے مرکزی دروازے کو تالا لگایا۔ کچھ دیر سیڑھیوں پر کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ پر چل دیا۔ ہنری نے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کردیا۔ صبح سے ہی وہ ٹاس کی باتوں پر غور کررہا تھا پھر یونہی سن گن لینے کے ارادے سے ایلورنا ہائٹس کی طرف چلا آیا۔ ہنری نے دور سے ہی اس شخص کا جائزہ لیا۔ اس نے قیمتی جوتے پہن رکھے تھے اور کوٹ پتلون بھی نفاست سے سلا ہوا تھا۔ وہ ہنری کے مقابلے میں لمبا اور موٹا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا لیکن گردن کی پشت پر پڑی جھریوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ لگ بھگ ہنری ہی کی عمر کا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی تختی سے لگتا تھا کہ وہ جسمانی مشقت والا کوئی کام کرتا ہے۔

وہ شخص چلتا ہوا ایک کھلونوں کی دکان میں داخل ہوا۔ ہنری نے باہر ہی ایک کونے پر کھڑے ہوکر اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ چند منٹوں بعد اس شخص کی واپسی ہوئی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر سڑک پر چلتی گاڑیوں کا مشاہدہ کیا اور پھر احتیاط سے سڑک پار کی۔ ہنری بدستور اس کے تعاقب میں تھا۔ دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ شخص ایک بارڈ ویئر کی دکان میں داخل ہوگیا۔ تین چار منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک براؤن رنگ کا لفافہ تھا۔ دو دکانیں چھوڑنے کے بعد وہ ایک تمباکو فروش کی دکان میں داخل ہوگیا۔ ہنری نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور بارڈ ویئر کی دکان میں داخل ہوگیا۔

"ابھی ابھی جو شخص یہاں سے گیا ہے، اس نے کیا خریداری کی ہے؟"

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہوا سیلز مین اس عجیب و غریب سوال کو سن کر حیران رہ گیا اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا۔ "تم مسٹر وائٹ کی بات کررہے ہو؟"

"ہاں، ہاں۔۔۔ وہی جو ابھی ابھی اس دکان سے نکلا ہے۔"

"انہوں نے ایک ایکس ایچ کی آری اور کچھ اضافی بلیڈز لیے ہیں۔"

http://digestpk.blogspot.com/

"جی ہاں، وہ ہمارے مستقل گاہک ہیں۔"

اس دکان میں آنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہنری کو اس ایک آنکھ والے کا نام معلوم ہو گیا۔ وائٹ نامی وہ شخص ...... دکان سے نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا جسے ڈوری سے باندھا گیا تھا۔ ایک بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ شخص ایک اخبار فروش کے پاس رک گیا اور جیب سے ایک سکہ نکال کر دوپہر کا ایڈیشن خرید لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے پہلے صفحے کی سرخیوں پر نظر دوڑانا شروع کی۔ ہنری ایک عام راہ گیر کی طرح اس کے عقب میں جا کھڑا ہوا اور ایک سگریٹ سلگائی۔ اس نے اخبار والے کے ہاتھ میں پکڑے اخبار پر نظر دوڑائی تو ایک سرخی نے اس کی توجہ اپنی جانب کر لی۔ "گمشدہ بچی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔"

وائٹ کے حلق سے ایک غراہٹ نکلی۔ اس نے اخبار کو موڑ کر بغل میں دبا لیا پھر وہ ایڑی کے بل گھوما تو اس کا چہرہ ہنری کے سامنے آ گیا۔ ہنری پہلی بار اسے سامنے سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے کرختگی جھلک رہی تھی۔ چوڑے چہرے پر چپٹی ناک اور سب سے بڑھ کر یہ کہ واقعی اس کی ایک آنکھ تھی۔ اس کی دوسری آنکھ بند تھی جیسے کسی نے اسے سی دیا ہو۔ جونہی اس کی نظر ہنری پر گئی وہ غراتے ہوئے بولا۔

"میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

ہنری نے اسے خاموشی سے راستہ دے دیا۔ دو بلاک چلنے کے بعد اس نے اخبار پھینک دیا اور ایک بار میں داخل ہو گیا۔ ہنری نے اخبار اٹھایا اور اس کے پیچھے پیچھے بار میں چلا گیا۔ وائٹ نے اپنے لیے وہسکی کا آرڈر دیا اور ایک الگ میز پر بیٹھ کر وہ پارسل کھولنے لگا جو اس نے تمباکو کی دکان سے لیا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا تھا جس پر جمہوریہ کیوبا کی مہر لگی ہوئی تھی۔

ہنری نے اخبار کے پہلے صفحے پر نظر دوڑانا شروع کی۔ اس میں میری کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ لڑکی کے باپ نے اسے اغوا نہیں کیا۔ بچی بہت پیاری تھی اور اس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ہنری نے وائٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اتنے انہماک سے سگار کے ڈبے کا معائنہ کر رہا تھا جیسے وہ کوئی مذہبی سوغات ہو۔ ہنری نے محسوس کیا کہ وہ کافی دیر تک بار میں بیٹھنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کی واپسی سورج غروب ہونے کے بعد ہی ہوگی۔

☆☆☆

ہنری کو ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ وائٹ کے دروازے پر کھڑا تھا اور اس کے گھر کا تالا کھولنے کی نیت سے آیا تھا۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور سوچا کہ وہ کس کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ سراغ رساں نہیں تھا۔ اسے تو اپنے کام سے غرض ہونی چاہیے تھی۔ جرائم کی دنیا سے دو عرصہ ہوا دور ہو چکا تھا۔ جس روز پہلی بار اس نے ناس کے لیے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو وہ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ کسی مشکل میں پڑنے والا ہے۔ وہ سکون اور خاموشی سے اپنی ریٹائرمنٹ کے دن گزار رہا تھا اور اس نے اپنے آپ کو دوسروں کے معاملات سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ناس کی باتوں میں آ گیا۔

ہنری ایک جانب بڑھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مکان کے عقب میں جا کر کوڑے دان کا جائزہ لے۔ اس سے بھی گھر کے مکینوں کے طرز رہائش اور گھر میں استعمال ہونے والی اشیا کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے اور قانوناً کوڑے دان میں جھانکنے پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ ہنری دو کھڑکیوں کے پاس سے گزرا۔ دونوں بند تھیں اور ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ تیسری کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ ہنری نے اندر کا جائزہ لینے کے لیے اپنی ناک کھڑکی کے شیشے پر لگا دی۔

اندر کا منظر ایک پرانے فیشن کے ڈرائنگ روم جیسا تھا۔ کھڑکی پرانی تھی اور اس کا شیشہ بھی دھندلا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک صوفہ، ایک لکھنے کی میز اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہنری سانس لینا بھول گیا۔

آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ ہنری نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک چھوٹی بچی تھی۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا جبکہ اس کا سر ایک سیاہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہنری کو وہاں کھڑے چند سیکنڈ ہی ہوئے ہوں گے کہ اس نے کسی کے کھانسنے اور تالا کھلنے کی آواز سنی۔ وائٹ واپس آ گیا تھا۔ اچانک ہی سفید رنگ کی بلی کھڑکی کے سامنے آ گئی۔ اس نے شاید ہنری کی موجودگی محسوس کر لی تھی۔ وہ اپنے پنجوں سے کھڑکی کے کھلے ہوئے حصے پر زور لگا رہی تھی۔ ہنری کی نبض تیز ہو گئی۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور دبے پاؤں واپس چلا آیا۔

☆☆☆

ہنری نے جو منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ میری اسی گھر میں موجود ہے۔ اس نے ایک بلاک کے فاصلے پر واقع ایک پبلک فون سے پولیس کو

فون کیا اور تجویز پیش کی کہ ایلوریٹا ہائٹس میں واقع مسٹر وائٹ کی رہائش گاہ کا معائنہ کیا جائے کیونکہ اسے یقین ہے کہ میری کو وہاں رکھا گیا ہے۔ ڈیوٹی پر موجود سارجنٹ نے اس سے پوچھا کہ وہ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہا ہے لیکن ہنری نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وقت کم ہے۔ اگر پولیس نے بروقت کارروائی نہ کی تو میری کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

دس منٹ بعد دو سراغ رساں اور دو وردی میں ملبوس پولیس والے ایک پٹرول کار میں سوار ہو کر وائٹ کے گھر پہنچے۔ سیڑھیاں چڑھ کر انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ وائٹ نے دروازہ کھولا لیکن وہ ان پولیس والوں کو دیکھ کر بالکل بھی مرعوب نہیں ہوا۔ تھوڑی سی بحث کے بعد اس نے انہیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ ہنری سڑک کے پار پارک میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کی واپسی تک تین سگریٹ پھونک ڈالے۔ سب سے پہلے باوردی پولیس والے باہر آئے اور یوں مسکراتے ہوئے کار کی جانب بڑھ گئے جیسے وہ کوئی لطیفہ سن کر آ رہے ہوں۔ ان کے پیچھے پیچھے دونوں سراغ رساں بھی آ گئے۔ وہ بھی مسکرا رہے تھے اور ایک آنکھ والا اس نیک کام میں ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

اسی وقت ہنری کی نظر ناس پر پڑی۔ وہ وائٹ کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس کے کندھے پر اسکول بیگ لٹکا ہوا تھا۔ پھر اس کی نگاہ اوپر گئی۔ دونوں سراغ رساں وائٹ سے باتیں کر رہے تھے جبکہ پٹرول کار میں بیٹھے پولیس والے ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ناس وہاں رکا نہیں۔ اس دوران دونوں سراغ رساں بھی نیچے آ چکے تھے۔ وہ کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ دس گز دور جانے کے بعد ناس نے مڑ کر ہنری کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

"اگر تم نے اسے دیکھا تھا تو پھر اندر جا کر اسے ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے؟" ناس نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔ وہ ہنری کے گھر میں اس کی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہنری نے مشروب کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔"

ناس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ "تم نے کہا تھا کہ ہمیں ثبوت چاہئیں۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا؟"

"میں بوڑھا آدمی ہوں اور میری نظر بھی کمزور ہے۔ ممکن ہے کہ مجھ سے دیکھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ بہر حال، پولیس والے دس منٹ تک اندر رہے لیکن انہیں بھی میری نہیں ملی۔"

ناس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور وہ آہستہ سے بولا۔ "تم سڑک کے پار کھڑے کیا کر رہے تھے؟ کیا تمہیں امید نہیں تھی کہ وہ میری کو بازیاب کر لیں گے؟"

ہنری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میرا خیال تھا کہ تم ماضی میں سراغ رساں رہ چکے ہو۔"

"میں نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا۔ تمہارے باپ نے پیانو میں رکھا ریوالور دیکھ کر یہ فرض کر لیا کہ میں سراغ رساں ہوں۔"

ناس یہ سن کر حیران رہ گیا۔

ہنری آگے کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اسے اپنے تک ہی رکھو۔ اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ثبوت ملنے پر آگے چلتے ہیں اور کچھ لوگ انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میرا تعلق دوسری قسم سے ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" ناس نے پوچھا۔

"میں کبھی بھی سراغ رساں نہیں رہا۔"

ناس کے چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم برے آدمی ہو؟"

"کبھی تھا۔ اب نہیں ہوں۔" ہنری نے اعتراف کیا۔

"کیا تم لوگوں کو نقصان پہنچاتے تھے؟"

ہنری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کبھی کسی شریف آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔"

ناس اس جملے پر غور کرنے لگا۔ نہ جانے اس کے ذہن میں شریف آدمی کا تصور کیا تھا۔

"اب تمہیں گھر جانا چاہیے۔" ہنری گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔"

ناس نے پانی کا ایک اور گھونٹ لیا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"تم جو کچھ کر سکتے تھے، وہ تم نے کر لیا۔ اب تمہیں یقین ہو جانا چاہیے کہ وہ لڑکی وہاں نہیں ہے۔"

☆☆☆

اگلے دن دوپہر کے وقت ایک آنکھ والا شخص اپنے گھر سے باہر آیا۔ اس نے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ایک سگار سلگایا اور چاروں طرف دیکھتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اس نے اپنا اوورکوٹ درست کیا اور رفتہ رفتہ ...... اس کا تعاقب نہیں کیا بلکہ جونہی وہ آدمی نظروں سے اوجھل ہوا، وہ

http://digestpk.blogspot.com

تیزی سے اس کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ اس نے سڑک پر ایک نگاہ ڈالی کہ کہیں کسی نے اسے دیکھا تو نہیں۔ پھر اپنی جیب سے ایک درمیانے سائز کی کیل نکالی اور تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ کافی دیر تک وہ کیل کو چابی کے سوراخ میں گھماتا رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ چھ منٹ بعد اسے کٹ کٹ کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔

”تمہیں تو اس وقت اسکول میں ہونا چاہیے تھا۔“

ٹاس اچھل پڑا۔ ہنری نہ جانے کب اور کیسے وہاں آ گیا تھا۔

”کبھی یہ فرض مت کرنا کہ تمہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔“

”میں اندر جانا چاہتا ہوں۔“ ٹاس نے بے جھجک سے کہا۔

”ہم واقعی کسی مشکل میں گرفتار ہونے والے ہیں۔“ ہنری نے بے بسی سے کہا۔

گھر کے اندر بہت کم روشنی تھی۔ اسے پرانے انداز میں سجایا گیا تھا۔ ہنری نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”خاموش رہو اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔“

ٹاس نے سر ہلایا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”میری!“ کوئی جواب نہیں ملا۔ اس دوران ہنری اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔

ڈرائنگ روم ہال کے سرے پر واقع تھا۔ یہ کم و بیش ایسا ہی تھا جیسا کہ ہنری نے کھڑکی سے دیکھا تھا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہیں آتش دان کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر کوئی بچی بیٹھی نظر نہ آئی۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر وہ ڈائننگ ہال میں آئے جہاں ایک بڑی سی لکڑی کی میز کے گرد بارہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دروازے کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر ایک بچی کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ یہ سفید کاٹن کا لباس تھا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ میز کے گرد رکھی تمام کرسیوں پر اسی طرح کا لباس موجود تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہر کرسی کے نیچے لباس سے ہم رنگ بچی کے سائز کے جوتے بھی رکھے ہوئے تھے۔

”کیا یہ کپڑے اور جوتے میری کے ناپ کے ہیں؟“ ہنری نے پوچھا۔

ٹاس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”یہ سب ایک جیسے کیوں ہیں؟“

ہنری خود بھی اس سوال کا جواب نہیں جانتا تھا۔

ہال کے دوسرے کنارے پر لائبریری تھی۔ اس میں دیواروں کے ساتھ کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف رکھے تھے جن کی اونچائی چھت تک تھی۔ وہاں ہر قسم کے موضوعات پر کتابیں موجود تھیں جنہیں دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ ایک آنکھ والے آدمی نے انہیں کبھی ہاتھ لگایا ہو۔ اچانک ہی ٹاس چلایا۔ ”نقل و میمن!“

وہ ایک کرسی کے پاس کھڑا تھا اور اس سے ایک ہاتھ کی بلندی پر وہ کتاب رکھی ہوئی تھی۔ ہنری نے وہ کتاب اٹھائی اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس پر کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔

ٹاس پُرجوش آواز میں بولا۔ ”یہ میری کی پسندیدہ کتاب ہے۔“

ہنری نے سر ہلایا اور کہا۔ ”اس کتاب سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کسی کی ملکیت ہے۔“ اس نے اسے واپس اپنی جگہ پر رکھا۔ ”یہ محض لائبریری میں رکھی ایک کتاب ہے۔“

دوسری منزل پر جانے والا زینہ گول اور چوڑا تھا۔ اس کی دیواروں پر خاندانی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ ٹاس نے عجیب سی بو محسوس کی جیسے فضا میں لکڑی کے برادے کی آمیزش ہو گئی ہو۔ ہنری کو بھی ایسا ہی لگا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے۔ ٹاس نے ایک بار پھر آہستہ سے پکارا۔ ”میری!“

کوئی جواب نہ ملنے پر وہ ایک کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ یہ ایک بیڈ روم تھا جس میں بڑے سے بستر کے علاوہ قیمتی کپڑوں سے بھری ہوئی وارڈ روب بھی تھی۔ قریب ہی ایک گراموفون رکھا تھا اور دیوار پر ایک آنکھ والے شخص کی پینٹنگ آویزاں تھی۔ یہ تصویر اس وقت بنائی گئی تھی جب اس کی دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔ اس کمرے سے نکل کر وہ دوسرے کمرے کی جانب بڑھے۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ ٹاس نے چابی کے سوراخ سے جھانکا لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ مجبوراً اسے دروازے کا تالا توڑنا پڑا۔

ہنری نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں بالکل تاریکی تھی اور دن میں بھی رات کا گمان ہو رہا تھا۔ ہنری نے آگے بڑھ کر لائٹ جلائی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر ٹاس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

یہ بھی ایک بیڈ روم ہی تھا لیکن بیڈ کے کنارے ایک قطار میں بیٹھی چار لڑکیاں انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان سب نے سفید رنگ کا لباس اور ہم رنگ جوتے پہن رکھے تھے اور ان کے سر پر سیاہ نقاب چڑھا ہوا تھا جس سے ان کے چہرے چھپ گئے تھے۔

ٹاس نے اپنا منہ سختی سے بند کر لیا۔

”میری!“ ہنری نے آہستہ سے آواز دی لیکن ان میں سے کسی لڑکی نے جواب نہیں دیا۔ ہنری بستر کی جانب بڑھا۔ اس نے غور سے دیکھا کہ صرف ان لڑکیوں کا لباس ہی ایک جیسا نہیں تھا بلکہ وہ قد کاٹھ میں بھی ایک جیسی تھیں۔ یہاں تک کہ ہاتھوں اور انگلیوں میں بھی کوئی فرق نہ تھا۔ وہ آگے جھکا اور ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ برف کی طرح سرد تھا۔

ہنری نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ”یہ لکڑی کی بنی ہوئی گڑیاں ہیں۔“

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کھڑکی سے جس لڑکی کو کرسی پر بیٹھا دیکھا تھا، وہ میری نہیں بلکہ ایسی ہی کوئی گڑیا تھی۔ ٹاس بھی ہنری کے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”ان کے سر پر نقاب کیوں چڑھا ہوا ہے؟“

ہنری نے ایک نقاب ہٹایا تو اسے وہاں چہرے کے بجائے لکڑی کا گول ٹکڑا نظر آیا جس پر آنکھیں، ناک، منہ یہاں تک کہ بال بھی نہیں تھے۔ ٹاس نے دوسری گڑیا پر سے نقاب ہٹایا تو اس کا سر بھی ویسا ہی تھا۔ پھر اس نے بقیہ دو گڑیوں کے بھی نقاب اتار دیے۔ سبھی کے سر ایک جیسے تھے۔ محض لکڑی کے گول ٹکڑے جن میں ابھی کام ہونا باقی تھا۔ ٹاس نے دوبارہ ان پر نقاب چڑھا دیا۔

”اس کمرے کا تالا کھولو۔“ ہنری نے ہال میں واقع دوسرے کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھماتے ہوئے کہا۔

ٹاس تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنے نتھنے سکیڑے اور بولا۔ ”یہ بو کیسی ہے؟“

”لکڑی کی۔“ ہنری نے جواب دیا۔

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ وہ ایک ورک شاپ تھی۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں کام کرنے والی میز تھی جس پر آریاں، ہتھوڑے، پیچ کش اور دوسرے اوزار رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف لکڑی کے لمبائی میں کٹے ہوئے ٹکڑے، تار کے لچھے اور رنگ کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر جگہ جگہ لکڑی کا برادہ بکھرا ہوا تھا۔

”کیا ایک آنکھ والا آدمی گڑیاں بناتا ہے؟“ ٹاس نے پوچھا۔

”اس ورک شاپ کو دیکھ کر تو ایسا ہی لگتا ہے۔“ ہنری نے جواب دیا۔

”میری!“ اس بار ٹاس نے سرگوشی کے بجائے اسے بلند آواز میں پکارا۔

ہنری اسے منع کرنے ہی والا تھا کہ ٹاس نے پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں میری کو پکارا۔ اس کے ساتھ ہی مکان میں چھائی خاموشی دم توڑ گئی۔ انہیں ایک آواز سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بلی کے پنجوں کی آواز تھی۔

ہنری نے ٹاس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئے جیسے انہوں نے اولمپک میڈل جیت لیا ہو۔ جیسے ہی وہ نیچے پہنچے، انہیں مرکزی دروازے میں چابی گھمانے کی آواز آئی۔ ایک آنکھ والا شخص دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس نے غور سے دروازے کے تالے کو دیکھا جیسے کچھ شبہ ہو رہا ہو پھر اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔

ہنری اور ٹاس مکان کے عقب میں واقع کچن میں چھپے ہوئے تھے۔ ٹاس اس کا تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا اور وہ مکان سے باہر آ گئے۔

☆☆☆

ہنری نے بلیک کافی اور ایک گلاس دودھ کا آرڈر دیا۔ ٹاس اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ویٹرس کے جانے کے بعد اس نے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک بوڑھے شخص کو نقل و میمن میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“

ہنری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ وہ کتاب میری کی ہے۔“

ٹاس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”لیکن وہ تو لڑکیوں کے پڑھنے کی کتاب ہے۔“

”میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو سیمنٹ کی طرح سخت تھا لیکن میں نے اس کی کار کے گلوز کمپارٹمنٹ میں پریوں کی کہانیوں والی کتاب دیکھی تھی۔“

ٹاس کچھ نہ بولا۔ اس نے گردن گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اس وقت کافی ہاؤس میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

”ہم نے مکان میں جا کر دیکھ لیا۔“ ہنری بولا۔ ”میری کہیں نظر نہیں آئی اور نہ ہی ہم نے اس کی آواز سنی۔ اس کے بعد بھی کسی شک کی گنجائش باقی رہتی ہے؟“

”ہم نے اوپری منزل کے صرف تین کمرے دیکھے تھے۔ ایک چوتھا دروازہ بھی تھا جسے ہم نے نہیں کھولا۔“

”تم نے اسے آواز بھی دی تھی۔ اگر وہ وہاں ہوتی تو ضرور جواب دیتی۔“

http://digestpk.blogspot.com

ویٹرس کافی اور دودھ کا [illegible] لے

دودھ کا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ایک گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ ”تم اتنی جلدی ریٹائر کیوں ہوگئے؟“

”بیٹی کے انتقال کے بعد میرا دل اس دنیا سے اچاٹ ہوگیا۔ تب سے ہی میں ایسی زندگی گزار رہا ہوں۔“

ٹاس ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟“

”وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ فلم دیکھنے جارہی تھی کہ ایک تیز رفتار کار اسے کچلتی ہوئی چلی گئی۔“

”کیا وہ بہت خوب صورت تھی؟“ ٹاس نے معصومیت سے پوچھا۔

ہنری مسکرایا لیکن اس کا چہرہ اندرونی دکھ کی غمازی کررہا تھا۔ ”میرے لیے وہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔“

☆☆☆

ہنری رات کے کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ہنری نے دروازہ کھولا۔ وہاں ٹاس کھڑا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ والدین بھی تھے۔ ٹاس کچھ بے چین نظر آرہا تھا۔ اس کی ماں نے اندر داخل ہوتے ہی ہنری پر برسنا شروع کردیا۔ دراصل ٹاس کی ٹیچر نے ٹیلی فون پر شکایت کی تھی کہ وہ پڑھائی میں دلچسپی نہیں لے رہا اور آج پورا دن وہ اسکول سے غائب رہا تھا۔ جب ٹاس سے پوچھا گیا تو اس نے اعتراف کرلیا کہ وہ سراغ رساں کے ساتھ مل کر میری کو تلاش کررہا تھا۔

ہنری جانتا تھا کہ اگر اس نے بھی جواب میں سخت رویہ اختیار کیا تو بات بڑھ جائے گی۔ چنانچہ اس نے اصل موضوع کو نظر انداز کرکے ٹاس کے باپ کی تعریف کرنا شروع کردی کہ جب سے اس نے پیانو کی مرمت کی ہے، تب سے اس کی کارکردگی بہتر ہوگئی ہے۔ اس نے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ٹاس بہت اچھا لڑکا ہے اور وہ صرف اس کی گمشدہ دوست کی تلاش میں اس کی مدد کررہا ہے۔ ٹاس کی ماں نے کہا کہ اس نے آدھ گھنٹا پہلے پولیس ہیڈکوارٹر فون کیا تھا۔ انہوں نے ہنری نامی کسی پولیس سراغ رساں کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس نام کا کوئی شخص اس کیس کی تحقیقات نہیں کررہا۔ ٹاس کی ماں بہت غصے میں تھی۔ اس نے ہنری کو دھمکی دی کہ آئندہ وہ ٹاس سے دور رہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے شوہر اور بیٹے کو گھسیٹتی ہوئی وہاں سے لے گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن ان کی ملاقات اسکول کے گیٹ پر ہوئی۔

ٹاس نے ہنری سے اپنے والدین کے رویے پر معذرت کی تو وہ بولا۔ ”تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری بھلائی کے لیے ہی سوچتے ہیں۔“

”لیکن اب میں بڑا ہوگیا ہوں۔ اپنا برا بھلا سمجھ سکتا ہوں۔“

ہنری نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”کل تم نے ایک آنکھ والے آدمی کے کچن میں کتنی دھلی ہوئی پلیٹیں دیکھی تھیں؟“

ٹاس سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔“

”میں نے دیکھا تھا۔“ ہنری بولا۔ ”وہاں دو پلیٹیں، دو چھریاں، دو کانٹے اور دو پیالیاں دھلی ہوئی رکھی تھیں۔“

”کیا اس سے کوئی اشارہ ملتا ہے؟“ ٹاس نے پوچھا۔

”اس کا مطلب تو یہی ہے کہ کل کسی نے اس کے ساتھ لنچ کیا تھا۔ کم از کم بلی تو کانٹے چھری کا استعمال نہیں کرسکتی۔“

”یقیناً وہ میری ہی ہوگی۔“ ٹاس پرجوش لہجے میں بولا۔

”ممکن ہے۔“

”اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“ ٹاس نے پوچھا۔

”فی الحال تم کلاس میں جاؤ۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ مجھ پر بھروسا کرو۔“

کلاس شروع ہونے کی گھنٹی بجی۔ ٹاس جانے لگا تو ہنری نے کہا۔ ”اب میرے گھر مت آنا، ورنہ مشکل میں پڑ سکتے ہو۔ ویسے بھی میں یہ شہر چھوڑ کر جارہا ہوں۔“

”کیا میں تمہیں دوبارہ مل سکوں گا؟“ ٹاس نے اداس لہجے میں کہا۔

”کون جانے اب ہم کبھی مل سکیں گے یا نہیں۔“

ٹاس نے اپنا بیگ اٹھایا اور اسکول میں چلا گیا۔

☆☆☆

اسی شب ہنری نے وائٹ کے دروازے پر دستک دی۔ وہ باہر آیا تو اس نے ایک ایپرن پہن رکھا تھا۔ اس نے ہنری کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”مجھے ایک گڑیا خریدنی ہے۔“ ہنری نے اپنا بیج اتارتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کس نے یہاں کا پتا دیا؟“

”ایک دوست نے۔“ ہنری نے جواب دیا۔

وائٹ نے نفی میں اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ”میں گڑیاں بناتا ہوں... کوئی اسٹور نہیں چلاتا۔“

”یہ تو بہت بڑی بات ہے۔“ ہنری نے اسے ....

چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری گڑیاں مہنگے داموں بکتی ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ تم نے بنائی ہیں۔ میں نے ماضی میں اپنی بیٹی کے لیے کئی گڑیاں خریدیں لیکن کبھی تمہارا نام نہیں سنا۔“

ہنری کی تعریف سن کر وہ کچھ نرم پڑگیا اور بولا۔ ”میرا خاندان دو سو سال سے گڑیاں بنارہا ہے۔ ہمارا نام جانا پہچانا ہے۔“

”پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟“

”اندر آجاؤ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مہارت کیا ہوتی ہے۔“

ہنری نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور بولا۔ ”چلو، میں چند منٹ تو دے سکتا ہوں۔“

وہ شخص ہنری کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا اور ایک منٹ بعد ہی ایک گڑیا لے کر آگیا۔ ہنری کا خون رگوں میں جمنے لگا۔ وہ گڑیا بالکل ویسی ہی تھی جو اس نے اوپر کے کمرے میں دیکھی تھی۔ وہی سفید لباس اور ہم رنگ جوتے۔ البتہ اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھا۔ اب گڑیا کے گول ٹکڑے پر جو چہرہ نظر آرہا تھا، وہ ہو بہو میری سے ملتا جلتا تھا۔

”کیا تم نے کبھی اتنی خوب صورت لڑکی دیکھی ہے؟“ وائٹ نے پوچھا۔

ہنری بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ اس سے برداشت نہ ہوسکا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے اپنا ریوالور نکالا اور بولا۔

”بتاؤ، یہ لڑکی کہاں ہے؟“

وائٹ کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

”بتاؤ، میری کہاں ہے؟“ ہنری زور سے بولا۔

وائٹ نے الجھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”میں تمہاری اکلوتی آنکھ میں سوراخ کرسکتا ہوں اور اگر وہ نہ ملی تو اس گھر کو بھی تہس نہس کردوں گا۔“

”میں سمجھا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟“

ہنری نے اس کے سر کے قریب جاکر نشانہ لیا اور گولی چلادی جو اس کے سر پر سے ہوتی ہوئی دیوار میں جالگی۔

”بتاؤ، وہ کہاں ہے؟“ ہنری نے ایک دفعہ پھر پوچھا۔

وائٹ خوف زدہ ہوچکا تھا۔ اس نے ہنری سے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ اسے اوپر کی منزل پر واقع دوسرے بیڈروم میں لے گیا اور چابی نکال کر اس کا تالا کھول دیا۔ کمرے میں پہلے سے ہی روشنی ہورہی تھی۔ ہنری نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اب وہاں بیڈ کے کنارے صرف تین گڑیاں نظر آرہی تھیں جن

یہ کک باکسنگ ہے برخوردار! میں نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ مقابلہ جیتنا چاہتے ہو تو حریف کی لاتوں سے بچتے رہنا

لودھراں سے نفیسہ بی بی کی تلاش

میں سے دو کے چہروں پر سیاہ نقاب پڑا ہوا تھا اور تیسری گڑیا بالکل ویسی تھی جیسی وہ ڈرائنگ روم میں چھوڑ آئے تھے... میری کی ہم شکل۔

وائٹ فخریہ انداز میں بولا۔ ”یہ میری بنائی ہوئی نئی گڑیاں ہیں۔ میں انہیں فائنل ٹچ دے رہا تھا۔“

ہنری نے اپنا پستول اس کی آنکھ پر رکھ دیا اور بولا۔ ”میری کہاں ہے؟“

”اسی گڑیا کا نام میری ہے۔“ ایک آنکھ والا ڈھٹائی سے بولا۔

ہنری نے ایک اور فائر داغ دیا لیکن اس بار وائٹ خوف زدہ نہیں ہوا اور احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ”اپنا ریوالور جیب میں رکھ لو۔ میں گڑیاں بناتا ہوں۔ تم نے میری کا پوچھا تھا، اسی گڑیا کا نام میری ہے۔“

ہنری نے چوتھے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں کیا ہے؟“

”اس کمرے میں بھی گڑیاں ہی ہیں۔“

”اسے بھی کھولو۔“

وہ بیڈروم نہیں تھا۔ ہنری کو ایسا لگا جیسے وہ کسی گودام میں آگیا ہو۔ وہاں کھلونوں کی قطار لگی ہوئی تھی...

http://digestpk.blogspot.com/

"میں ایک سراغ رساں ہوں۔"

گڑیا گھر کے اندر ایک چھوٹا سا بستر بھی تھا جس پر ایک سہمی ہوئی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہنری نے فوراً پہچان لیا۔ یہی میری تھی۔ اس نے سفید رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور پیروں میں بھی سفید جوتے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ بستر کے پائے کے ساتھ زنجیر سے بندھی ہوئی تھی۔ ہنری نے دیکھا کہ وہی لڑکی اس کے زانو پر بیٹھی ہوئی تھی اور میری اس کی پشت سہلا رہی تھی۔

"تم نے اس لڑکی کو کیوں قید کر رکھا ہے؟" ہنری نے غصے سے پوچھا۔

"یہ میری ماڈل ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں نے سیکڑوں گڑیاں بنائی ہیں لیکن مجھے ہمیشہ تشنگی کا احساس رہا جبکہ میں فن میں پختگی کا قائل ہوں۔ میں خود نامکمل ہوں تو کیا ہوا لیکن میرے فن میں کمی نہیں رہنی چاہیے۔ میں گڑیاں بناتا تھا اور انہیں ایک نام دے دیتا۔ اسے تم میرا احساسِ محرومی سمجھ لو۔ میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ میں انہی گڑیوں کو اپنی اولاد سمجھتا ہوں۔ اسی لیے چاہتا تھا کہ جو کمی مجھ میں ہے، وہ میری اولاد میں نہ ہو۔ میں سڑکوں پر، بازاروں اور پارکوں میں چھوٹی چھوٹی بچیوں کو دیکھتا اور پھر ان کی تصویر ذہن میں نقش کر کے گڑیا بنانے بیٹھ جاتا لیکن مجھے ہمیشہ کوئی کمی محسوس ہوئی۔ پھر میں نے میری کو دیکھا تو یوں لگا جیسے مجھے میرا ماڈل مل گیا ہو۔ جب بھی اس کے اسکول سے آنے کا وقت ہوتا تو میں گھر سے باہر آجاتا اور اس سے باتیں کرنے لگتا۔ لیکن میری تشنگی بڑھتی جارہی تھی پھر ایک دن میں نے اسے تنہا آتے دیکھا تو بہانے سے گھر میں لے آیا۔ اسے سامنے بٹھا کر گڑیا بنائی تو یوں لگا جیسے میرا فن مکمل ہو گیا ہو۔"

ہنری کو اس وقت بڑی شدت سے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی لیکن اس سے پہلے پولیس کو فون کرنا ضروری تھا۔

☆☆☆

ناس اور میری نے اسکول سے واپسی کا راستہ بدل لیا ہے۔ ناس کو ہنری بہت یاد آتا ہے جو اسی روز شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ناس کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی سراغ رساں نہیں تھا۔ البتہ اسے اس دن کا انتظار ہے جب وہ ہنری کی کہی ہوئی بات کا مطلب سمجھنے کے قابل ہو سکے گا جو اس نے میری اور اس کے تعلق کے بارے میں کہی تھی۔

لڑکی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ہر طرف گڑیاں ہی گڑیاں تھیں۔ کسی کے سنہری بال تھے تو کوئی سیاہ بال سجائے ہوئے تھی۔ کوئی موٹی، کوئی دبلی، کوئی چھوٹے اور کوئی لمبے قد کی تھی۔ ہر چہرہ مختلف تھا۔

"یہ میری لڑکیاں ہیں۔" وائٹ کا لہجہ پھر فخریہ ہو گیا۔

ہنری کو اچانک ہی کچھ خیال آیا۔ وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا اوپر بھی کوئی کمرا ہے... کوئی دو چھتی وغیرہ؟"

"نہیں۔"

"میں فنِ تعمیر کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا مگر میرا خیال ہے کہ اس مکان میں ایسا کمرا ضرور ہو گا۔"

"تم غلطی پر ہو۔"

ہنری نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ وائٹ کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ گولی اس کی پتلون کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس نے سختی سے پوچھا۔ "اوپر جانے کا راستہ کس طرف سے ہے؟"

وائٹ کے حواس قدرے بحال ہوئے تو وہ بولا۔ "تم کل بھی یہاں آ چکے ہو؟"

ہنری نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کون ہو تم اور میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"مجھے میری کے ایک دوست نے اس کا سراغ لگانے پر مامور کیا ہے۔" یہ کہہ کر ہنری نے اس کی دوسری ٹانگ کا نشانہ لیا۔

"ٹھہرو، گولی مت چلانا۔" وائٹ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اس کا راستہ میرے بیڈروم سے ہے۔"

بیڈروم میں جس میز پر گراموفون رکھا تھا، اس کے برابر میں ہی ایک دروازہ تھا۔ اس کے دوسری جانب اوپر جانے کے لیے لکڑی کا زینہ بنا ہوا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے۔ چھت کے دوسرے سرے پر ایک کمرا بنا ہوا تھا جس کی دیواروں پر سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ البتہ دروازہ سرخ رنگ کا تھا جس کی اونچائی تقریباً تین فٹ تھی۔ اس گڑیا گھر کی چھت بھی سرخ رنگ کی تھی اور کمرے کے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں۔

ہنری نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وائٹ کی تاریک اور گرد آلود دو چھتی پر ایسا خوب صورت کمرا بھی ہو گا۔

"تمہیں اس لڑکی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" وائٹ نے پوچھا۔

یہ گھر مرا گلشن ہے

شہزاد خان

کچھ لوگ بظاہر بہت معمولی... بے وقوف اور غیر اہم دکھائی دیتے ہیں... ان کے اندر کی گہرائی کا کسی کو کوئی اندازہ نہیں ہوتا... آپ ہی کے اردگرد سانس لیتی ایک ایسی ہی ہستی کا پُرفسوں قصہ۔

پُرمزاح انداز میں شعور و آگہی کے در وا کر دینے والی انوکھے انداز کی تحریر

زبیدہ نام کی اس لڑکی نے ہمیں گگی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ وہ ایک درزی کی بیٹی تھی اور اس کا باپ کمانے سے زیادہ اودھم اور سلائی کم کرتا تھا۔ محلے کی عورتوں کا کہنا تھا کہ اس کی بیوی یعنی زبیدہ کی ماں نے مار مار کر اس کا یہ حال کر دیا ہے۔

شاید کسی نے اس سے یہ کہہ دیا تھا کہ شوہر کو مارنا کارِ ثواب ہے۔ اس لیے وہ دن... رات اس ثواب کے حصول کی کوششیں کرتی رہتی اور جس دن اس کا شوقِ ثواب کچھ زیادہ ہو جاتا تو اس دن اس کا شوہر چارپائی پکڑ لیتا۔

ان دونوں کی جوڑی ایسی تھی جیسے الف نون۔ بیوی دیوقامت اور شوہر دبلا پتلا مریض۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ شادی سے پہلے اچھا خاصا صحت مند تھا بلکہ اکھاڑے میں ورزش کے لیے بھی جایا کرتا... بہرحال ان دونوں کی اکلوتی نشانی

http://digestpk.blogspot.com/

زبیدہ تھی۔

اس کے نقوش غضب کے تھے اور اس کی بے باکی اور بھی غضب کی تھی۔ اسے پروا نہیں تھی کہ کون اسے دیکھ رہا ہے کون اسے برا سمجھ رہا ہے۔ بس وہ لڑکوں سے لڑ جایا کرتی اور دھڑلے سے اظہارِ عشق کر دیا کرتی۔

اس نے تقریباً بارہ تیرہ لڑکوں سے محبت کر رکھی تھی اور محلے کا ہر لڑکا دوسرے کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ بھی زبیدہ کے عشق میں گرفتار ہے لیکن ان رقیبوں کے درمیان جنگجو صورتِ حال کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

اس کی وجہ وہ کارنر میٹنگ ہے جس کا میں ابھی ذکر کرنے والا ہوں۔ یہ کارنر میٹنگ خود زبیدہ نے طلب کی تھی اور میٹنگ کے لیے اس نے مجھ ناچیز کے گھر کا انتخاب کیا تھا۔

"پروفیسر صاحب مجھے آپ کے گھر میٹنگ رکھنی ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں کوئی پروفیسر ..... نہیں ہوں بلکہ مجھے پروفیسر اس لیے کہتے کہ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔ میرے پاس بہت سی کتب تھیں اس لیے محلے والوں نے میرا نام پروفیسر رکھ دیا۔

چونکہ گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا... اس لیے زبیدہ نے میرے گھر کا انتخاب کیا تھا۔

"کس بات کی میٹنگ۔؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اپنے عاشقوں کی۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "کم بختوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ محلے میں خون خرابا ہو جائے۔"

"تو تم ایسی حرکتیں ہی کیوں کرتی ہو؟"

"پروفیسر صاحب میں اس کے علاوہ اور کیا کرتی ہوں کہ کسی کو دیکھ کر سلام کر لیا کسی کی طرف دیکھ کر انگڑائی لے لی اور کسی کو آنکھ مار دی بس اب اتنی سی بات پر یہ لوگ میرے عاشق ہو جاتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔"

"یہ معمولی حرکتیں ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم اس طرح پورے محلے میں بدنام ہو رہی ہو۔"

"لوگ بھی پاگل ہیں جو اتنی سی بات پر بدنام کر دیتے ہیں۔ اب خود سوچیں میرے گھر میں سوائے اماں ابا کے لڑائی جھگڑے کے اور ہے کیا۔ نہ کوئی تفریح، نہ کہیں آنا جانا آخر میں بھی تو انسان ہی ہوں... میں اس طرح اپنا دل بہلا لوں تو اس میں کیا برائی ہے؟"

میں جانتا تھا کہ اس کو سمجھانا فضول ہے۔ "اچھا یہ بتاؤ یہ میٹنگ کس خوشی میں ہو رہی ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ میں اس محلے کو ایک بڑے فساد سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں اگر آپ ہاں کر دیں تو سب لوگ آپ کے یہاں جمع ہو جائیں۔"

کچھ عجیب ہی منصوبہ تھا اس کا۔ اگر میرے گھر میں ان کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو پھر میں کیا کرتا لیکن میں یہ انوکھا تماشا دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اجازت دے دی۔ "ٹھیک ہے جمع کر لینا سب کو۔"

"اور ہاں پروفیسر صاحب، سب کے لیے چائے پانی کا بندوبست بھی کر دینا۔"

"وہ کس خوشی میں، عشق تم کر رہی ہو اور خرچہ میں کروں۔"

"مہمان نوازی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

وہ واقعی شگوفہ تھی۔ محلے والوں نے بالکل صحیح نام دیا تھا اسے۔ اب نہ جانے وہ کون سا گل کھلانے جا رہی تھی اور کن کن لوگوں کو اس نے مدعو کر رکھا تھا۔ میں نے اس انوکھی میٹنگ کے انتظام سے پہلے اپنا فرض مجھانے کے طور پر یہ مناسب سمجھا کہ اس کی ماں کو بتا دوں۔ جو اس وقت میونسپلٹی کے نلکے سے پانی بھر رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ "تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

"پروفیسر پہلے یہ بالٹی میرے گھر پہنچا دے پھر میں تیری بات سنوں گی۔"

"میں تو تمہاری بھلائی کے لیے آیا ہوں اور تم مجھ سے کام کرواری ہو۔" میں جھلا کر بولا۔

"یہ بھی میری بھلائی کا کام ہے۔" اس نے کہا۔ "گھر میں پانی نہ ہو تو زندگی بے کار ہو سکتی ہے، چلو اٹھاؤ بالٹی۔" اور بالٹی اٹھا کر میں اس کے پیچھے چل پڑا..... اس عورت نے بھی دو دو بالٹیاں اٹھا رکھی تھیں بہر حال جیسے تیسے میں نے بالٹی اس کے دروازے تک پہنچا ہی دی تھی۔

"ہاں، اب بتاؤ کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے زبیدہ کی مطلوبہ میٹنگ کے بارے میں بتا دیا۔ میری بات سن کر وہ زبیدہ کو گالیاں دینے لگی۔ "اسی قسم کی حرکتیں کرتی ہے۔ اب بھلا تمہیں پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی کیا میٹنگ کے لیے اپنا گھر نہیں تھا۔"

"کیا مطلب.....؟" میں بوکھلا کر بولا۔ "کیا تمہیں اس بات پر اعتراض نہیں ہے کہ اس نے اتنے عاشق پال رکھے ہیں؟"

"یہ لو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے۔ جوان لڑکی ہے..... ایسی حرکتیں ابھی نہیں کرے گی تو کیا بڑھاپے میں کرے گی۔"

"حد ہو گئی، کیا تمہیں یہ بھی خیال نہیں ہے کہ وہ بدنام ہو رہی ہے۔"

"بدنام کرنے والوں کی تو میں ٹانگیں توڑ دوں گی جو ایک شریف اور معصوم لڑکی کو بدنام کر رہے ہیں۔"

اب اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہتی تھی یعنی زبیدہ ایسی حرکتوں کے باوجود اپنی ماں کی نگاہوں میں شریف اور معصوم تھی۔

"اب یہ بتاؤ تمہیں میٹنگ کے لیے اپنا گھر دینا ہے یا نہیں۔" اس نے پوچھا۔ "یا میں اس کے لیے کوئی اور بندوبست کر لوں؟"

"چلو ٹھیک ہے، ہو جائے گی میٹنگ بھی۔"

اس شام میں نے آنگن میں سب کے بیٹھنے کا بندوبست کر دیا تھا..... دریاں، چاندنیاں بچھوا دی تھیں۔ چائے کے لیے ہوٹل والے سے بات کر لی تھی۔ ان سب کاموں سے فارغ ہو کر میں زبیدہ کے عاشقوں کا انتظار کرنے لگا۔

سب سے پہلے کالے خان آیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ محلے میں پرچون کی دکان تھی اور بات بات پر گالیاں دیتا تھا۔

"خان صاحب۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم یہاں کیسے؟"

"بھائی پروفیسر، وہ میٹنگ میں آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ تم بھی زبیدہ کے چکر میں ہو؟"

"اس میں چکر کی کیا بات ہے میاں۔ یہ تو خدائی جذبہ ہے یہ کہاں دیکھتا ہے کہ کون کس عمر کا ہے۔"

"حد ہو گئی لیکن تمہاری تو ..... بیوی اور جوان بیٹا بھی ہے؟"

"وہ بیٹا بھی آ ہی رہا ہو گا۔" وہ ہنس پڑا۔ "زبیدہ نے اس کو بھی بلایا ہے۔"

میں سر تھام کر رہ گیا، وہ کیسی لڑکی تھی۔ اس نے ایک ہی وقت میں باپ اور بیٹے دونوں کو پھانس رکھا تھا۔ بہر حال اس کے بعد دوسرے لوگ آنے شروع ہو گئے۔ یہ سب محلے ہی کے تھے۔ ادھیڑ عمر، جوان، لونڈے، دکاندار، دھوبی، نائی، طالب علم بھی تھے بلکہ انتہا تو یہ تھی کہ ایک مولوی صاحب بھی اس میٹنگ میں شریک ہونے چلے آئے تھے۔ زبیدہ نے سب کو لائن پر لگا رکھا تھا اور وہ بھی اتنے دھڑلے کے ساتھ۔ واقعی کوئی جواب نہیں تھا اس کا۔

ان سب کے آنے کے بعد خود زبیدہ بھی چلی آئی۔ اس کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی اور کیا سنگار کر رکھا تھا اس نے۔ مجھے یہ ڈر لگنے لگا کہ اس کے لیے کہیں مار پیٹ ہی نہ شروع ہو جائے۔

لیکن حیرت یہ تھی کہ وہ سارے غیر مہذب لوگ اس وقت انتہائی مہذب انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زبیدہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پروفیسر تمہاری اجازت ہے نا۔"

"کس بات کی؟"

"میٹنگ شروع کرنے کی۔"

"ہاں، ہاں اجازت ہے۔" زبیدہ نے ایک طرف کھڑے ہو کر بولنا شروع کیا۔

"دیکھو میرے عاشقو! تم سب میرے چکر میں ہو اور یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں سب کو مبارکباد دیتی ہوں لیکن ٹرافی تو اس کو ملتی ہے جو اس دوڑ میں پہلے نمبر پر آتا ہے۔ کیوں غلط تو نہیں کہا نا؟"

"نہیں، نہیں کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔" دھوبی نے کہا۔

"ٹرافی تو ایک ہی کو ملے گی۔"

"اور فرسٹ آنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم سب اس محلے کو اور اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش کرو۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" کسی نے پوچھا۔

"بہت سیدھا سا مطلب ہے۔" اس نے کہا۔ "اب جیسے کالے خان ہے۔ یہ سودا بہت مہنگا بیچتا ہے حالانکہ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اب اگر یہ مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی دوڑ یہ ہے کہ یہ بے ایمانی نہ کرے۔ میں اس کو کئی مہینوں تک آزماؤں گی۔ اگر یہ اپنے قول پر پورا اترا تو پھر میرے پیار کی ٹرافی اس کے نام ہو جائے گی۔"

ایک عجیب بات یہ تھی کہ سب لوگ یہ سن کر تالیاں بجانے لگے تھے اور خود کالے خان نے گردن جھکا رکھی تھی۔

"اب بانکے حلوائی کو دیکھ لو۔ اس کی دکان میں کتنی گندگی ہوتی ہے۔ مکھیاں ہی بھنکتی رہتی ہیں اور لوگ خریدنے پر مجبور ہیں۔ اب اگر یہ تھوڑا صفائی کی طرف دھیان دے دے تو اس کا کیا نقصان ہے۔"

میں حیرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جس نے کیسی کہانی شروع کر دی تھی۔ پیار محبت کی باتوں کے بجائے وہ اپنے عاشقوں سے کس قسم کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اسے تحفے لا کر دیں۔ مہینے میں پیسے دیا کریں، اس کے اخراجات پورے کریں یا اسے سیریں کرایا کریں۔

اس کے بجائے وہ کسی سے یہ کہہ رہی تھی کہ اس کے مکان کے آگے گندگی بہت ہوتی ہے پیار کی دوڑ میں حصہ لینا ہے تو یہ گندگی صاف ہونی چاہیے تو کسی سے کہہ رہی تھی کہ وہ سودا تولنے میں بے ایمانی نہ کیا کرے۔

میرے خدا وہ کیسی لڑکی تھی۔ ہزار پڑھے لکھے، مہذب اور سیاست داں قسم کے لوگ اس پر قربان کیے جا سکتے تھے۔ حالانکہ اس کی تقریر میں روانی نہیں تھی اور نہ ہی الفاظ کا صحیح استعمال کر رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کی باتیں براہ راست دل میں اتر رہی تھیں۔

وہ سب سے وعدے لے رہی تھی کہ اگر اس کے عشق میں سچے ہیں تو پھر انہیں ایسا ہی کرنا پڑے گا اور وہ لوگ اس سے وعدے کر رہے تھے۔ وعدے نبھانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

پہلے میں نے اپنے دل پر جبر کر کے چائے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب میں اپنی مرضی اور خوشی سے سب کو چائے پلوا رہا تھا۔ بسکٹوں کا آرڈر بھی دے دیا تھا۔ زبیدہ ان سب کے درمیان کسی ستارے کی طرح جگمگا رہی تھی اور کسی بلبل کی طرح چہکتی پھر رہی تھی۔

... حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سب ہی خوش تھے۔ واقعی جادو ہو تو ایسا ہو۔ میٹنگ ختم ہو گئی... اور سب ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔ صرف میں اور زبیدہ رہ گئے...

"زبیدہ یہ سب کیا تھا؟" میں نے جذبات سے بھری ..... آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں پروفیسر صاحب۔" وہ مسکرا دی۔ "بس اپنے محلے کو سنوارنے کی کوشش۔"

"لیکن کیوں، تمہیں ایسی باتوں سے کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ مجھے اسی محلے میں رہنا ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ اچھا تو نہیں لگتا کہ ہم جہاں ہوں وہاں گندگی رہے۔"

"زبیدہ آخر تمہیں ایسی باتیں کس نے سکھائیں؟" میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم نے تو صرف کتابیں پڑھی ہیں۔ جن میں بہت اچھی اچھی باتیں ہوتی ہیں لیکن آج ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے صرف جھک ماری ہو۔ اصل علم تو تمہارے پاس ہے۔"

"پروفیسر، بات تو تب ہوگی جب میرے چاہنے والے میری بات پر عمل کریں۔"

"وہ عمل کریں یا نہ کریں لیکن تم نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔" میں نے کہا پھر وہ چلی گئی اور میں اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔ خدا نے ایک درزی کی ان پڑھ لڑکی کو کیسا وجدان اور کیسا عرفان عطا کیا تھا اور اس کے چاہنے والوں نے بھی اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا تھا۔

اس محلے میں انتہائی خوشگوار تبدیلی دوسرے ہی دن سے شروع ہو گئی..... بانکے حلوائی نے اپنی دکان صاف رکھنی شروع کر دی۔ کالے خان نے بے ایمانی کم یا ختم کر دی۔ زبیدہ نے جن گھروں کے سامنے گندگی کی نشان دہی کی تھی، اب وہاں صفائی رہنے لگی۔ لوگ اس مہم میں مشغول دکھائی دیتے..... یعنی ایک طرح کی دوڑ شروع ہو چکی تھی اور اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ ٹرافی کس کے ہاتھ آتی ہے۔

زبیدہ کا وہی حال تھا یعنی وہی محلے والوں سے چھیڑ چھاڑ۔ کسی سے مسکرا کر باتیں کر لیں۔ کسی کو دور سے دیکھ کر سلام کر دیا، کسی کو دیکھ کر مسکرا دی۔ یعنی اس نے ہر انداز سے

اپنے عاشقوں کو الجھا رکھا تھا اور سب کے سب اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار تھے۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ "زبیدہ یہ تو بتاؤ کہ تم نے سب کو کام پر لگا دیا ہے لیکن ٹرافی کس کو ملے گی کیونکہ ایک وقت میں اتنے لوگوں کو تم نے سدھارنا شروع کر دیا ہے۔ ان میں سے کوئی تو فرسٹ آئے گا؟"

"ارے پروفیسر صاحب، تم دیکھ لینا کچھ دنوں کے بعد یہ ٹرافی ہر ایک کے حصے میں آئے گی۔"

"ہر ایک کے حصے میں کس طرح آ سکتی ہے، تم تو ایک ہو؟"

"تم بس دیکھتے رہو۔ میں نے بہت آگے کی سوچ رکھی ہے۔"

محلے کے دوسرے لوگوں نے بھی محلے میں ہونے والی اس خوشگوار تبدیلی کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا اور جب انہیں یہ پتا چلا کہ یہ سب کچھ زبیدہ کی وجہ سے ہو رہا ہے تو وہ سب حیران رہ گئے۔

محلے والوں کو بھی اس میٹنگ کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے اب اسے کوئی حرافہ نہیں کہتا تھا بلکہ حیران ہو کر اس کا ذکر کرتے۔

"یار اس چھوکری نے تو کمال کر دیا۔"

"کس کو معلوم تھا کہ وہ ایسی نکلے گی۔"

"یار، اس کی وجہ سے محلہ کتنا صاف ہو گیا ہے اور آپس میں بھائی چارہ کتنا ہے۔"

گویا اس ایک لڑکی نے پورے محلے کو خوش گوار زندگی کی گرفت میں لے لیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ سارے عشاق شور کرتے ہوئے اس کا گھیراؤ کر لیں گے کہ دیکھو ہم نے تمہاری بات مان لی اور ہم سب اپنے اپنے طور پر اس دوڑ میں اول آ گئے ہیں۔ اب تم ہمیں انعام دو، پیار کا انعام۔ جس کا تم نے وعدہ کیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ ایسا کچھ ہوتا تو وہ بہت بری طرح پھنس جاتی لیکن دوسری طرف یہ بھی سوچتا... کہ اس نے یوں ہی اتنا بڑا قدم نہیں اٹھایا ہوگا اس کے ذہن میں یقیناً کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی کیونکہ اس نے جو بھی کیا بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

میں خود اس محلے میں رہ چکا ہوں۔ اس لیے میں ان واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔

بہر حال کچھ دنوں کے بعد ایسا ہوا کہ محلے والوں کو اس طرح رہنے کی عادت پڑ گئی۔ ایسا..... جیسے وہ زبیدہ کو ہی بھول گئے ہوں۔ صرف اس کی دلائی ہوئی تحریک انہیں یاد رہی ہو۔

وہ ان ہی کاموں میں مصروف نظر آتے۔ جن کے وعدے انہوں نے زبیدہ سے کیے تھے اور شاید وہ پورا محلہ، پورے شہر کا مثالی محلہ بنتا جا رہا تھا اور اس مثالی محلے کا مثالی کردار زبیدہ تھی اور جب کسی ایک کو ٹرافی دینے کا وقت آیا تو زبیدہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح خدا نے اس کی زبان کی لاج رکھ لی تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ ہر ایک کی نہیں ہو سکتی تھی اور اس دوڑ میں اپنے اپنے طور پر سب ہی اول آ گئے تھے۔

زبیدہ اس حادثے میں جانبر نہیں ہو سکی... اور اس کا باپ بیٹی کو یاد کر کے پورے محلے میں گھانتا پھرتا..... اس کی ماں زور زور سے دہاڑ کر ایکسیڈنٹ کرنے والوں کو گالیاں دیتی... لیکن وہ لڑکی زبیدہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

اس کے جنازے میں تقریباً پورا محلہ ہی شریک تھا۔ اس کے سارے عاشق آنسو بہاتے ہوئے جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ اس کی روح اس وقت یہ سب دیکھ کر مسکرا رہی ہوگی۔

محلے والوں نے اس کی موت کے بعد اس محلے کا نام گلشن زبیدہ رکھ دیا۔ اور آج تک وہ محلہ گلشن زبیدہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مجھے اس محلے سے گئے برسوں ہو گئے ہیں۔ لیکن اب بھی جب میں اس محلے کی طرف جاتا ہوں تو وہ محلہ مجھے مثالی دکھائی دیتا ہے سب سے الگ۔ جیسے وہ پاکستان کا حصہ ہی نہ ہو۔ اس کے عاشق بھی اب وہاں نہیں رہے۔ بہت سے مر گئے..... اور بہت سے ادھر ادھر ہو گئے لیکن اس محلے کی روایتیں ابھی بھی قائم ہیں۔

اس محلے میں اب بھی زبیدہ کو حاصل کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے اور میں وہاں جا کر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کیا یہ پورا ملک گلشن زبیدہ نہیں ہو سکتا، کیا پورے ملک کو گلشن زبیدہ بنانے کے لیے کسی زبیدہ کی ضرورت ہے یا لوگ خود ہی کبھی نہ کبھی اتنا شعور حاصل کر لیں گے...؟

میرے اس سوال کا جواب کون دے گا...!

http://digestpk.blogspot.com/

KULL

طاہر جاوید مغل

تیرھویں قسط

ان عاشق پروانوں کا، جو اپنے خاص جولانی اور للکار رکھنے کے حق تھے

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں
اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے
یار کے طواف میں محو رہتا ہے۔۔۔ مگر آج عشق کی اقدار میں
تبدیلی۔۔۔ وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے۔۔۔ جس نے
عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے۔۔۔ کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی
ہے۔۔۔ سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے
جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ
دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔۔۔ ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق
پیشہ ہے۔۔۔ عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی
اور قدر ہے۔۔۔ جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے۔
زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر۔۔۔ عقل و
شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے۔۔۔
کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر۔۔۔ ایک للکار ہے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شریف اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے۔ لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت خیریت سے گھر واپس تو آ گئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لے لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر سیٹھ سراج نے مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ اس نے پتا چلایا کہ ثروت کو اغوا کرنے والے واجی کا باپ سیٹھ سراج نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک رنگین عورت میڈم منظورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم منظورا کی چھوٹی بہن نادیہ بڑی بے باک لڑکی تھی۔ وہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران سرکس کا ایک مقبول [illegible] تھا۔ وہ سرکس میں اپنے شوق کی خاطر نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ ابرار صدیقی کے پاس بدھا کا ایک نادر مجسمہ تھا جسے میڈم منظورا ہر صورت خریدنا چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھے۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس مجسمے کے پیچھے تھے۔ مجید شعوہ نامی شخص کی ہلاکت پر... شک کی بنا پر میڈم منظورا نے عمران کو اغوا کر لیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بیانی سے منظورا کو قائل کر لیا کہ وہ اس کا مطلوبہ مجسمہ ابرار صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام خوش اسلوبی سے کر دیا۔ میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں عمران کی طرح [illegible] لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ ہزاروں تماشائیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہو سکا۔ میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک تالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہل خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو موقع سے بھگا دیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجروح کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی المناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے لیے چڑھتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ جان کر حیران کر دیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ راستے میں [illegible] کا ایک خونخوار شخص بھی ایک شیر خوار بچے سمیت ہم سے آن ملا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھاٹا نیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں: زرگاں اور [illegible] پانی۔ زرگاں میں ٹھمر جی کا اختیار چلتا ہے۔ ٹھمر جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دسترس سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی [illegible] پانی میں آ گئی۔ یہاں ٹھمر جی کا چھوٹا بھائی [illegible] رہتا تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ چھوٹے سرکار کے اہلکار سلطانہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالحق کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سر کی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھولا ہوا ہوں۔ مجھے بھی چھوٹے سرکار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور بعد ازاں مجھے اور سلطانہ کو ٹھمر جی کے لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ زرگاں میں مجھے گجوڑا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم منظورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے گجوڑا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ مجھ پر تشدد کر کے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے مجھے وہاں سے بھیج دیا اور خود وہیں رک گئی۔ پھر عمران کے کہے ہوئے الفاظ نے مجھے ہمت بخشی اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے پھر اپنے تعاقب میں کچھ لوگ نظر آئے۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گروہ کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا جو ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنی [illegible] کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک جھرنے کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ لنگڑا ہی تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ پھر چوہان اور میں نے یہ دیکھا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے۔ ماریا کے اغوا کی خبر ہم نے ٹھمر جی کے اہلکاروں تک پہنچا دی۔ غار کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ ادھر ماریا [illegible] عجیب الخلقت شخص نے مجھ پر کچھ باتیں عیاں کیں۔ وہ جوا کرانے کا ماہر [illegible] تھا اور یہاں ماریا اور ٹھمر جی کے [illegible] دیتے آ رہا تھا۔ [illegible] لڑکی کے عشق نے اسے ٹھمر جی کے عتاب کا شکار بنا دیا۔ ماریا نے مجھے جوؤں کے حوالے سے اہم باتیں بھی سکھائیں۔ ماریا کے [illegible] ہو چکی تھی۔ انور خان اور ٹھمر جی کے اہلکاروں میں بات چیت کے دوران مجھے ایک نام سنائی دیا۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ انڈین اسپیشل فورسز کا سابقہ افسر جس نے مجھے کسی چوری [illegible] پاکستان سے پکڑ کر یہاں انڈیا میں قیدی بنا لیا تھا۔ رنجیت پانڈے نے دھوکے سے [illegible] بلا لیا تاہم انہیں ناکامی ہوئی لیکن ایک ساتھی فیروز اس حملے میں مارا گیا۔ اس کے رد عمل کے طور پر اسحاق نے ماریا کی ایک انگلی کاٹ کر [illegible] کو بھیج دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے ساتھ [illegible] کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے [illegible] وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں انور اور [illegible] سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے اور ایک جگہ گھنے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ میں خاموشی سے وہاں سے نکل پڑا۔ دوسرے دن چلتے چلتے اچانک مجھے زمین پر [illegible] کے نشانات ملے اور میں اسے کھوجتا ہوا [illegible] تک جا پہنچا۔ پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہاں مقابلہ شروع ہو گیا۔ میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ ایک موقع پر میں بے بس ہونے والا تھا مگر پھر چوہان، نور خان اور چھوٹے سرکار کے اہلکار وہاں پہنچ گئے۔ دشمن کو وہاں سے مار بھگایا۔ اس کامیابی میں سلطانہ نے اہم کردار ادا کیا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے اور [illegible] کو [illegible] چھوٹے سرکار کے دیوان میں [illegible] دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ گل پانی پہنچنے والوں میں شگفتہ بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غیاب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ اسی تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے دھوکے میں شگفتہ تک پہنچ گئے۔ شگفتہ کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے شگفتہ کو جنگی کے بارے میں نہیں بتایا مگر ایک رات شگفتہ جنگی کے کمرے میں گئی۔ جنگی اس کی آغوش میں تھا۔ جنگی کی حالت خراب تھی۔ صبح ڈاکٹر لی وان کو بلایا گیا۔ اس نے جنگی کو اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر راستے میں ہی جنگی نے دم توڑ دیا۔ دھرم نگر میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ پر شک کیا جا رہا تھا۔ میرے جسم میں پلانٹ کی گئی چپ کے حوالے سے ڈاکٹر لی وان نے آپریشن کا مشورہ دیا تھا مگر آپریشن اسٹیٹ سے باہر کیا جاتا۔ میری حالت عجیب تھی۔ میں اپنے جسم کو وقت دینے کا عادی ہو گیا تھا۔ پھر ایک روز دیوان میں رنجیت پانڈے گھس آیا۔ میری اس سے دو بدو لڑائی ہوئی۔ رنجیت کو منہ کی کھانی پڑی اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا مگر اس نے کئی لوگوں کی جان لی۔ پھر مجھے اطلاع ملی کہ ٹھمر اور جارج کے لوگوں نے سلطانہ کو ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا ہے۔ اس کے بعد میں ایک روز اچانک اپنی نگرانی پر مامور لوگوں کو چکمہ دے کر دیوان سے نکل پڑا۔ میں ایک ہندو جنگی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ کٹر ہندو تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سلطانہ کو اپنے طور پر سزا دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے پنڈت کے مطابق وہ سزا ایک خاص [illegible] ہو جو مجھے مجبور کر رہے تھے۔ رام پرشاد کے بیٹے جگدیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز جگدیش نے بتایا کہ انہوں نے سلطانہ کو جارج اور ٹھمر جی کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے اور اسے سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے گیا۔ جگدیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ میں پریشان تھا۔ وہاں کافی لوگ تھے اور وہاں سے سلطانہ کو بچا کر نکالنا تقریباً ناممکن تھا۔ چتا کو آگ دینے کا وقت آ گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں مشعل نما لکڑی تھما دی گئی۔ پھر ایک نوجوان اس پر تیل لے کر آیا۔ اس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا۔ اس نے عمران کا ذکر کیا تو میں ساکت رہ گیا۔ پھر وہ ہنسا تو اس کے ہموار دانتوں کی قطار نظر آئی۔ وہ عمران تھا۔ میں اردگرد سے بیگانہ ہو کر جیسے ہواؤں میں معلق ہو چکا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مجھے لگا جیسے میں ایک بہت خوب صورت سپنا دیکھ رہا ہوں... لیکن یہ سپنا نہیں تھا۔ عمران جیتی جاگتی صورت میں میرے سامنے موجود تھا۔ بھبوت سے تھڑے ہوئے چہرے کے اندر سے عمران کا جانا پہچانا چہرہ جھانک رہا تھا۔ قریباً تین برس پہلے کی اُس تاریک و پُرآشوب رات کو میں نے نالے کے پُل پر اسے آخری بار دیکھا تھا۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں مجھے وہ ایک تیز رفتار پانی پر ایک پُل صراط جیسے رستے پر کھڑا دکھائی دیا تھا۔ اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا رکھے تھے پھر اس کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا۔ وہ ڈگمگایا اور اجل کے پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔

میری تمام تر حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگا کہ حیرت اور خوشی کے سبب میرا دل سینے میں پھٹ جائے گا اور میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گا۔

بے پناہ شور کے درمیان میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ ”تم... زندہ ہو... عمران؟“

”عجیب بے وقوفی کا سوال ہے۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ سانس لے رہا ہوں، بول رہا ہوں، اس کے باوجود تمہیں شبہ ہو رہا ہے کہ میں شاید حیات نہیں ہوں۔ اگر مردے ایسے ہوتے ہیں تو پھر زندہ لوگ تو یقیناً قبروں میں آرام کر رہے ہوں گے... اور دوسری بات سے ہٹ کر، اس طرح بھوتنوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر مجھے مت گھورو۔ ان لوگوں کو شک ہو جائے گا کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بالکل سنجیدہ ہو جاؤ۔ تمہارے ہاتھ والی لکڑی میں میں نے تیل ڈال دیا ہے۔ اس کو آگ دکھاؤ اور چتا جلانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

میرا دل چاہا کہ دوڑ کر عمران سے لپٹ جاؤں۔ اس کو اپنے بازوؤں میں کس لوں اور دھاڑیں مار مار کر روتا چلا جاؤں۔ میرا سر بدستور چکرا رہا تھا۔ عمران کا چہرہ میری آنکھوں کے آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ سینے میں ایک دم ہی سیکڑوں سوال مچلنے لگے تھے لیکن ابھی سوال و جواب کا وقت کہاں تھا۔ ابھی تو ہم ایک نہایت سنگین مقام پر کھڑے تھے۔ یہاں ایک جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا۔ جنونیوں کا گروہ کسی وحشی قبیلے کے لوگوں کی طرح دیوانہ وار چتا کے گرد ناچ رہا تھا۔ شنکھ بجا رہا تھا اور نقارے پیٹ رہا تھا۔ جس جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا، وہ سلطانہ تھی... میری بیوی تھی۔

ایک دم مجھے لگا کہ میرے جسم میں توانائی کا ایک نیا سمندر لہریں لینے لگا ہے۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ میرے رگ و پے میں ایک بے نام حرارت اترتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ اب کوئی مشکل... مشکل نہیں رہی۔ اب کوئی دیوار میرا راستہ نہیں روک سکے گی۔ اب میں اکیلا نہیں تھا... اب کوئی میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا تھا اور یہ ”وہ“ تھا جس کے دیرینہ ساتھ کے لیے میں ایک مدت تک ترسا تھا۔ پُرآشوب گھڑیوں میں، میں نے پل پل جس کی توانا مسکراہٹوں کا انتظار کیا تھا، وہ آ گیا تھا... وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ [illegible]

http://digestpk.blogspot.com

توانا بازو سب کچھ [illegible] کا دعویٰ تھا۔ سب کچھ دینے کا دعویٰ

تھا...
''اوئے بامدرا میں پھر کہتا ہوں، ایسے مت گھورو۔ ان لوگوں کو شک ہوگا۔ دائیں طرف جو پیالہ دیا جل رہا ہے، اس سے یہ لکڑی روشن کرلو۔'' عمران کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
''عمران!'' میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ ''میں ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ جو چتا میں لیٹی ہے، وہ میری بیوی ہے...''
''تو ایک شوہر کے لیے اس سے اچھا موقع اور کیا ہوسکتا ہے۔ نہ مقدمہ نہ عدالت، نہ سزا... ایسی سچویشن کے انتظار میں تو شوہر لوگ اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں۔''
''عمران... اسے مذاق مت سمجھو... یہ میری بیوی ہے۔ میرے بچے کی ماں ہے۔ یہ سخت مصیبت میں ہے۔''
''تو میں اس مصیبت کو کون سا بڑھا رہا ہوں؟ میں اسے آگ لگانے کو تو نہیں کہہ رہا۔ بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ آگ لگانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ اسے آگ نہیں لگے گی۔ کم از کم آج تو نہیں لگے گی۔''
''تم کیا کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔'' میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔
''تمہاری سمجھ میں کبھی پہلے میری کوئی بات آئی تھی جو اب آئے گی؟'' اس نے کہا اور محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ تاڑی کے نشے میں وہ سب لوگ بری طرح اچھل کود رہے تھے۔ ترشول لہرا رہے تھے اور اشلوک پڑھے جارہے تھے۔ ہر آنکھ میں اس بے بس لڑکی کے لیے نفرت، انتقام کی چنگاریاں تھیں جو چتا کے اندر بے حس و حرکت لکڑی کے تختے پر لیٹی تھی اور جن آنکھوں میں چنگاریاں نہیں تھیں، ان میں بے حسی تھی۔
عمران نے مالا جپتے ہوئے مہا گرو کی طرف اشارہ کیا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا پیٹ کسی براؤن غبارے کی طرح پھولا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ میرے کان کے قریب آکر قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''چتا کو آگ دکھانے کی آگیا (اجازت) مہا گرو صاحب کو دینی ہے۔ اور وہ آگیا تب دیں گے جب شبھ گھڑی آجائے گی... اور شبھ گھڑی آج نہیں آئے گی۔''
''تت... تمہیں کیسے پتا؟''
''مجھے اس لیے پتا ہے کہ مہا گرو میرے قبضے میں ہے۔''
''تمہارے قبضے میں ہے؟ کیا مطلب؟''
''یعنی میں نے اس پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں کوئی زندہ انسان تھوڑی ہوں۔ میں تو ایک روح ہوں جو اس رات اپنے پیکر خاکی سے نکل آئی تھی جس رات مجھے سینے پر گولیاں لگی تھیں۔ اب میں ایک بدروح ہوں یا سلیس لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ ایک چڑیلا ہوں... یعنی چڑیل کا مذکر... بڑی فائیو اسٹار شخصیت ہے میری۔''
میں نے یونہی نیچے دیکھا تو وہ فٹ بولا۔ ''شاید تم میرے پاؤں ملاحظہ کررہے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ پاؤں چڑیل کے الٹے ہوتے ہیں، چڑیلے کے نہیں۔ چڑیلے کے جسم کے ایک دو اور پارٹ الٹے ہوتے ہیں جو میں فی الحال تمہیں دکھا نہیں سکتا...'' وہ بے پر کی اڑا رہا تھا۔
اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس کا ہلکا پھلکا انداز دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ آج کوئی نہ کوئی کرشمہ ہوجائے گا۔ شاید یہ المیہ آج ٹل جائے جس کی پوری پوری تیاری کی جاچکی ہے۔
میں حیرت کا بت بنا کھڑا رہا اور عمران کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا سرمہ تھا۔ آنکھوں کے گرد رنگ لگایا گیا تھا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا شاندار کسرتی جسم چمک رہا تھا۔ مہا گرو آنکھیں بند کرکے مالا جپتا رہا اور آگے پیچھے جھولتا رہا... عمران کے اشارے پر میں نے اپنے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی کو آگ دکھادی اور ساکت کھڑا ہوگیا۔
مہا گرو کی مراقبہ ٹائپ کیفیت طویل ہوتی جارہی تھی۔ نقارے مسلسل بج رہے تھے۔ قریباً تین چار منٹ مزید اسی تناؤ بھری صورت حال میں گزرے پھر اچانک مہا گرو نے اپنا لاوا لا ہاتھ اٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔
نقارے رک گئے۔ بھجن اور اشلوکوں کی آواز بھی تھم گئی۔ سب مہا گرو کی طرف دیکھنے لگے۔ مہا گرو عجیب سے انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور بلند آواز میں بولا۔ ''یوگ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ شبھ گھڑی ٹل رہی ہے۔ اس رسم کو پوری طرح سے ادا کرنے کے لیے ایک خاص سمے کی ضرورت ہے، جو اب ہمارے پاس نہیں ہے۔ اب اس خاص سمے کی آشا تین دن بعد ہی کی جاسکتی ہے۔''
وسیع ہال کمرے کے اندر سناٹا سا چھا گیا۔ پھر افراد کی ٹولی ایک بار پھر اشلوک پڑھنے لگی لیکن اب ان اشلوکوں میں جوش اور ہیجان کی جگہ ایک طرح کا ٹھہراؤ تھا۔ یہ مذہبی شعر اب طبع میں اچھال پیدا کرنے کے بجائے ہمواری پیدا کررہے تھے۔
''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔
''یہ روح کی کارستانی ہے اور روح تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ اگر تفصیل پوچھنا ہو تو وہ بھی تمہیں بتاؤں گا۔

مجھے تمہارے گھر کا پتا ہے، میں آج آدھی رات کے بعد تمہارے پاس آؤں گی... میرا مطلب ہے آؤں گا۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ میں چڑیل نہیں بلکہ چڑیلا ہوں... انسان تھا تو اچھی بھلی یادداشت تھی۔ اب تو ان لوگوں جیسا ہوگیا ہوں جنہوں نے بینکوں سے قرض لے رکھا ہے۔ اچھا، چلتا ہوں۔ لگتا ہے کہ گرو صاحب میری طرف ہی آرہے ہیں۔'' وہ چبوترے سے اترا اور لوگوں کے ہجوم میں گم ہوگیا۔ میری نگاہیں مسلسل اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ پھر کہیں گم نہ ہوجائے۔ اس سے پہلے کہ میں بے ساختہ اس کے پیچھے لپک جاتا، ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ستیش میرے پیچھے کھڑا تھا، وہ بولا۔
''یہ وقتی نراشا ہے۔ گرو جی نے کہا ہے کہ دو دن میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ دو دن بعد ایک بار پھر یہ محفل سجے گی اور یہ اپرادھن لڑکی اپنے انجام کو پہنچے گی۔''
ستیش نے مشعل نما لکڑی میرے ہاتھ سے لے کر پانی کے برتن میں بجھادی اور مجھے لے کر چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ سلطانہ اسی طرح بے ہوشی کی حالت میں چتا کی لکڑیوں پر پڑی تھی۔ میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری بیوی تھی لیکن دوسروں کی دسترس میں تھی۔ میں اسے چھونے کا مجاز نہیں تھا۔

☆☆☆

رات ایک بجے کا وقت تھا، جب دروازہ کھلا اور عمران میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اب وہ معقول لباس میں نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک عام سی پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے پر سفید بھبھوت بھی نہیں تھا۔ قمیص کے اوپر ایک نیلا سویٹر تھا۔ ہونٹوں پر وہی پیاری مسکراہٹ تھی جو اسے عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور ہم بھاگ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ آنسو میری آنکھوں سے گرم آبشاروں کی طرح بہہ رہے تھے۔
''تم کہاں چلے گئے تھے یار! تمہیں کیا پتا میں نے یہ وقت تمہارے بغیر کیسے گزارا ہے؟'' میں نے سسک کر کہا۔
کوئی مزاحیہ فقرہ اچھالنے کے بجائے وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی جذباتی کیفیت میں ہے۔
میں آنسوؤں کے درمیان بولتا چلا گیا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں۔ مجھے کسی طرف سے تمہارے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں مل سکی تھی۔ میڈم صفورا بھی ابھی اس اسٹیٹ میں موجود ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ تم اس رات گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے... میں نے... میں نے اس رات خود تمہیں گولیاں لگتے دیکھی تھیں پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں اس ڈیک نالے کے کنارے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا تھا۔ کیا تمہیں پانی سے نکال لیا گیا تھا؟ میرا مطلب ہے... میرا مطلب ہے...'' میں ہکلا کر رہ گیا۔
اس کی شوخی طبع پلٹ آئی۔ وہ میرے گلے سے لگے لگے بولا۔ ''میں پانی میں کہاں گرا تھا یار! میں تو آسمان کی طرف اٹھ گیا تھا... سیدھا اوپر بالکل راکٹ کی طرح۔ وہاں جب میں کسی ستارے کے قریب پہنچا تو بہت سی ارواح خبیثہ سے میری ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے زبردستی مجھے اپنے گروہ میں شامل کرلیا۔ یہ عقل دشمن ارواح خبیثہ آج کل امن اور آشتی کے خلاف ایک زبردست مہم چلا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کسی ستارے کے پاس ہی ایک ٹی وی چینل بھی قائم کررکھا ہے۔ اس کا نام ہے ''فساد پلس'' اور اس کا سلوگن ہے... ایک ہی رستہ ایک ہی منزل... افراتفری افراتفری۔ اس چینل میں ملازمت ملنے کی سب سے پہلی شرط ہی یہ ہے کہ بندے نے جاہلیت میں ڈبل ایم اے کیا ہوا ور کم سے کم دس جگہ سے دھکے دے کر ملازمت سے نکالا جاچکا ہو۔ سو میرے یار! آج کل میں اسی ''فساد پلس'' کا نمائندہ ہوں اور قریہ قریہ گھوم کر خبریں اکٹھی کررہا ہوں۔''
میری آنکھوں سے مسلسل آنسو رس رہے تھے۔ میری کیفیت دیکھ کر اسے بھی کچھ سنجیدہ ہونا پڑا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ بید کی کرسیوں پر آبیٹھا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری یہ حیرت بجا ہے تابی! سینے پر براہ راست برسٹ کھا کر زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا لیکن ایک بات شاید تم بھول رہے ہو۔ جب ہم لاہور سے باہر گاڑی بھگا رہے تھے اور سیٹھ سراج اپنے ہرکاروں سمیت ہمارے پیچھے تھا، تم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ میں پہلے سے کچھ صحت مند لگ رہا ہوں۔ میری صحت مندی یعنی موٹے پن کا راز وہ امریکن بلٹ پروف جیکٹ تھی جو میں نے قمیص کے نیچے پہن رکھی تھی۔ یہی جیکٹ میری زندگی کا بہانہ بنی۔''
عمران نے اپنا سویٹر اوپر اٹھایا اور قمیص و بنیان کے نیچے سے اپنے پیٹ پر گولی کے دو زخم دکھائے۔ ایک گولی تو شاید پہلو کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی، دوسری پیٹ میں لگی تھی۔ وہ بولا۔ ''بس یہی دو گولیاں تھیں جو مجھے لگیں۔ باقی کی [illegible] نے بلاک کردیں۔

http://urgesipk.blogspot.com/

میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرزنے لگے۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ٹھنڈے ٹھار پانی میں گرا۔ پانی کی رفتار بڑی تیز تھی۔ میں غوطے کھاتا ہوا کافی آگے نکل گیا پھر سرکس کی ٹریننگ کام آئی۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلائے اور کسی طرح کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں ایک نوجوان زمیندار ریاست علی مجھے اپنی ٹریکٹر ٹرالی میں ڈال کر اسپتال تک لے گیا... پوری روداد کافی لمبی ہے۔ اگر اس کو مختصر نہیں کروں گا تو باقی رات اسی میں گزر جائے گی... اور تمہاری بھابی پوچھے گی... چن کتھاں گزاری آئی رات وے...“

”بھابی... کیا مطلب؟“

”تو یار کیا تم اکیلے ہی رستم زماں ہو جو آناً فاناً شادی کھڑکا سکتے ہو؟ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو بڑی بڑی مصیبتوں کو دعوت دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“

”کیا کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے تم نے؟“

”دیکھو، اگر اس فقرے میں تم نے شادی پر زور دیا ہے تو اور بات ہے لیکن اگر لڑکی پر زور دیا ہے تو تمہارا سوال اور بھی مذاقیہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے، شادی لڑکی سے ہی ہوگی لیکن شادی بھی کیا ضروری ہے؟ یہ نیا دور ہے یار! اس میں شادی تو اس وقت کی جاتی ہے جب بچے کہتے ہیں... سویٹ پاپا ممی، اب شادی کر لیں۔ اور پھر شادی کے بعد تو ویسے بھی رومانس کو ایک دم فل اسٹاپ لگ جاتا ہے اور ہم تو بھی رومانس کے بندے ہیں۔ ایک پیارا سا چہرہ مل گیا ہے یہاں بھی۔ ہو سکا تو دو چار روز میں تمہیں ملواؤں گا اس سے۔ بڑی اونچی شے ہے۔ کتھک ناچ ناچتی ہے اور ناچ ناچ کر اس نے جسم ایسا شیشے جیسا کر لیا ہے کہ کیا بتاؤں... اُف۔“

وہ بے تکان بول رہا تھا۔ حالات کی سنگینی اور میری بے پناہ حیرتوں کا جیسے اسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! مجھے اب بھی اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ لگتا ہے کہ ابھی دماغ کو ایک جھٹکا سا لگے گا اور سب کچھ ٹوٹ کر بکھر جائے گا... مجھے بتاؤ عمران! تم یہاں کب اور کیسے پہنچے؟ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟ کیا تمہیں پتا تھا کہ میں یہاں ہوں؟ اور تم نے وہاں ہال کمرے میں بھیس کیوں بدل رکھا تھا؟ کیا تم اس گروہ میں شامل ہو؟ اور...“

”بس بس۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ایک ہی سانس میں تم نے اتنے سوال کر دیے ہیں کہ تمہارا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آ سکتا ہے لیکن وہاں بھی تو سفارش اور تعلقات چلتے ہیں۔ دیکھو، میری بات سنو۔ ان سوالوں جوابوں کے لیے ابھی بہت سا وقت پڑا ہے۔ فی الحال ہم صرف وہ باتیں کریں گے جو کرنا بہت ضروری ہیں۔ ابھی تم بس اتنا سمجھ لو کہ میں صرف تمہارے لیے یہاں موجود ہوں۔ اس گروہ کے لوگوں میں مجھے امیت کمار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک میں ایک اسمگلر ہوں اور انڈین ”بی ایس ایف“ سے جان چھڑاتا ہوا اس راجواڑے میں گھس آیا ہوں۔ فی الحال یہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی رہیں گے۔ کسی طرح کی کوئی شناسائی بھی ہم دونوں کے لیے سخت ترین مشکلیں پیدا کر سکتی ہے۔ کچھ کچھ اندازہ تو تمہیں ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔“

”مجھے صرف ایک بات بتا دو، کیا سلطانہ بچ جائے گی؟“

”تم بھی مجھے صرف ایک بات بتاؤ۔ کیا یہ واقعی تمہاری بیوی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

وہ عجیب نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ چہرے کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ پھر اس نے ہولے سے پوچھا۔ ”اور وہ، تمہارا جنون... ثروت؟“

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”عمران! جس طرح میرے سوالوں کے جواب بہت لمبے ہیں، اسی طرح تمہارے اس سوال کا جواب بھی بہت طویل ہے لیکن مجھے ابھی صرف اتنا بتا دو کہ ثروت کہاں ہے؟“

”میری آخری معلومات کے مطابق وہ جرمنی میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔“

”اور اس کی شادی؟“

”مجھے اس بارے میں ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔“ عمران نے جواب دیا۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ میں یہ جاننے میں ناکام رہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اور عاطف اور میری بہن فرح؟“

”تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی، وہ دونوں بخیریت اور بالکل حفاظت سے ہیں۔ میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔“

دروازے سے باہر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ عمران ایک دم چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ لالٹین کی گول ناب پر رکھ دیا۔ غالباً وہ ارادہ رکھتا تھا کہ اگر خطرہ زیادہ محسوس ہو تو لالٹین

بجھا دے۔ بہرطور خیریت گزری۔ قدموں کی چاپیں آگے نکل گئیں۔

عمران بولا۔ ”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلطانہ خطرے سے دور ہے لیکن وقتی طور پر۔ ہم نے یہاں کے مہا گرو کی بیٹی رادھا دیوی کو اپنا ”مہمان“ بنا رکھا ہے۔ اسی ”مہمان نوازی“ کا دباؤ ہے جس کے سبب گرو کو کچھ گھڑی نہیں مل سکی اور اس نے چتا جلانے کی رسم دو دن کے لیے ملتوی کر دی ہے۔ وہ سب کچھ اس نے مجبوری کے سبب کیا ہے لیکن اپنی بیٹی کو مصیبت سے بچانے کے لیے وہ دیر تک اس منحوس رسم کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے پتلون کی جیب احتیاط سے ٹٹولی اور بولا۔ ”جس طرح کچھ جنات کی جان طوطے میں ہوتی ہے، اسی طرح گرو کی دھرم بیٹی کی جان بھی ایک طوطے میں ہے۔ اور یہ طوطا میرے قبضے میں ہے۔ میں جب چاہوں، اس طوطے کی گردن شریف موڑ کر گرو کی بیٹی کو جہانِ بالا کی سیر کرا سکتا ہوں۔ اور اگر دیکھا جائے تو گرو کی بیٹی خود بھی ایک طوطے کی طرح ہے اور گرو کی جان اس دوسرے طوطے میں ہے۔ اگر بیٹی جہانِ بالا کو گئی تو ہو سکتا ہے کہ گرو خود بھی اس کے پیچھے نکل جائے۔ اسے ادھیڑ عمری میں اور اتنی معمولی شکل صورت کے ساتھ اتنی جوان اور سندر بیٹی ملی ہے، وہ ہزار جان سے اس پر فدا ہے۔ بیٹی کو جہانِ بالا کی سیر سے بچانے کے لیے وہ اپنی پوری پوری کوشش کرے گا۔“

”تم میری الجھنوں کو اور بڑھا رہے ہو عمران... تم جنوں اور طوطوں کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ایک چیلا ہوں اور صرف چیلا ہی نہیں، نیوز چینل کا نمائندہ بھی ہوں۔ ایسا ”بم بلاسٹ شخص“ جنوں بھوتوں کی باتیں نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا؟“

اس نے ایک بار پھر پتلون کی جیب ٹٹولی اور اس میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹا سا برقی آلہ نکال لیا۔ اس کی صورت چھوٹے موبائل فون جیسی تھی لیکن موبائل فون کے کی بورڈ کی طرح اس پر زیادہ بٹن نہیں تھے۔ صرف تین بٹن نظر آ رہے تھے۔ ایک سرخ اور دو سفید۔ یہ برقی آلہ سبز رنگ کا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”یہ دیکھو، اس کا رنگ ہرا ہے۔ اسی لیے تو میں اسے طوطا کہتا ہوں۔ گرو کی بیٹی کی جان اس میں ہے... خاص طور سے اس بٹن میں۔“ وہ سرخ بٹن پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

ان لمحوں میں اس کے بظاہر معصوم چہرے پر وہی جارحیت نظر آنے لگی جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ادھر یہ بٹن دبے گا، ادھر رادھا دیوی کی پتلی کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ دھماکے سے اڑ جائے گی۔ اور محبوب کی کمر چاہے کتنی بھی پتلی ہو لیکن ہونی تو چاہیے نا یار... اور میرے خیال میں مہا گرو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے۔“

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ کتنی آسانی سے کتنی خوفناک بات کہہ رہا تھا۔ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ ویسے کا ویسے ہی تھا۔ دھیما، سادہ، ہنس مکھ... اور کبھی اس کے ساتھ ساتھ بہت بھیانک بھی۔ اب اگر مہا گرو کی بیٹی کی کمر کے ساتھ واقعی کوئی بارودی بیلٹ بندھی ہوئی تھی تو سوچنے کی بات تھی کہ یہ بیلٹ عمران کو کہاں سے ملی تھی؟ اس بیلٹ اور بیلٹ کے ریموٹ کنٹرول کی اکیوری کیا تھی؟ اور یہ بیلٹ کس طرح رادھا کی کمر تک پہنچی تھی؟ میں یہ سب کچھ عمران سے پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے پتا تھا کہ ان میں سے کسی ایک سوال کا معقول جواب بھی مجھے نہیں ملے گا۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا... اور میں چونک گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا ہے کہ ”ہم“ نے گرو کی بیٹی کو اپنا مہمان بنا رکھا ہے۔ ”ہم“ سے کیا مطلب ہے؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

”پچھلے تین سالوں میں کافی ہوشیار ہو گئے ہو تم اور کافی بدل بھی گئے ہو۔“ اس نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں تعریف کی جھلک تھی۔ اس نے میرے سینے پر ہلکا سا مکا مارا پھر دائیں بائیں دیکھ کر رازداری کے انداز میں بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ اقبال میرا دمِ چھلا ہے۔ اور دم جہاں ہوگی، چھلا بھی وہیں ہوگا۔ وہ مہا گرو کی قیام گاہ پر سیوک کے طور پر موجود ہے، یعنی خادم کے طور پر... اور گرو کی بیٹی کی ”سیوا“ کر رہا ہے۔ وہ پرسوں سے ذرا بیمار ہے نا۔“ عمران نے آنکھ دبا کر کہا۔

مجھے یاد آیا کہ کل جب میں نے گرو کی بیٹی رادھا کو داسیوں کے ساتھ راہداری سے گزرتے دیکھا تھا تو وہ کچھ گم صم نظر آئی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر عجیب سی زردی تھی۔ اب صورتِ حال کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ عمران اور اقبال یہاں موجود تھے۔ مجھے [illegible] پاس سے

http://digestpk.blogspot.com

بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ ان دونوں نے یہاں مہاگرو کی پتنی کو آڑے ہاتھوں لیا ہوا تھا۔ وہ غالباً دھماکا خیز مواد کے نشانے پر تھی اور یہ سوا ریموٹ کنٹرول تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی اور سنسنی میرے رگ و پے میں اترنے لگی اور ایک عجیب سی ترنگ سینے میں جاگ گئی۔ لیکن ابھی تک بہت کچھ اندھیرے میں تھا۔ میں عمران سے درجنوں بلکہ شاید سیکڑوں سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے ایک بار پھر تاکید کی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اس نے یا اقبال نے جب مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا تو وہ خود ہی کریں گے۔

جانے سے پہلے وہ تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔ ہم ایک بار پھر پُرجوش انداز میں گلے ملے۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”سب کچھ بتاؤں گا... سب کچھ۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے شہزادے، تھوڑا سا اور کرلو۔“

اس کے جانے کے بعد میں جیسے ایک طوفان کی زد میں رہا۔ راجواڑے کے اس دور دراز کھنڈر میں عمران یوں میرے سامنے آئے گا اور حالات ایک دم ایسا رخ اختیار کریں گے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اگلا سارا دن بھی عجیب کشمکش اور سوچ بچار میں گزرا۔ شکیلہ سے بھی دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حال میں تھی۔ اس کی بے چارگی بار بار میرے تصور کو کچوکے لگاتی تھی۔ اس کے ساتھ یہاں ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا تھا اور اب پچھلے تین چار روز سے اس سے مٹی بھی کھدوائی جارہی تھی۔ اس مشقت کا مقصد معلوم نہیں تھا... مجھے شکیلہ کی ستی ہوئی صورت یاد آئی۔ اس کے ہاتھوں کے چھالے یاد آئے اور دل اس کے لیے درد سے بھر گیا۔

اگلی رات پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس زیرِ زمین کھنڈر میں مکمل سناٹا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ شاید وہی دو چار افراد جاگ رہے ہوں جو پہرے پر تھے۔ کسی قریبی کمرے میں ارجن اور اس کے بدقماش دوست بھی غالباً شیطانی کھیل کھیلنے کے بعد آرام فرما رہے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے ہولے سے ہلایا...

”کون؟“ میں نے پوچھا۔

دوسری طرف عمران تھا۔ اس کی مدھم آواز پہچان کر میں نے دروازہ کھول دیا۔

”خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے۔“ اس نے ترت جواب دیا۔

”تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا، ورنہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔“

”لیکن تم تو کہتے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے۔“

”مگر اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ کم از کم آج کی رات تو بالکل نہیں۔ اقبال زخمی ہو گیا ہے۔“

”کیسے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔ خود ہی دیکھ لینا۔“ اس نے کہا۔

”لیکن...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جلدی کرو، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے... میں سیدھا چلتا جاؤں گا تم آٹھ دس قدم چھوڑ کر میرے پیچھے آنا۔ میں جس دروازے میں گھسوں، تم بھی گھس جانا مگر احتیاط کرنا کہ کوئی تمہیں گھستے ہوئے دیکھے نہیں۔“

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ صورتِ حال واقعی سنگین ہے۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے کمرے کی لالٹین میں نے بجھا دی تھی اور دروازہ اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کھنڈر استھان کا یہ زیرِ زمین حصہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ راہداریاں خالی تھیں۔ لالٹینوں اور گیس لیمپس کی روشنیاں بھی جیسے غنودگی میں تھیں۔ ہم بڑے ہال کمرے کے قریب سے گزرے۔ وہاں بھی بڑے آتش دان میں کوئلے سلگ رہے تھے۔ ان کوئلوں کے قریب بہت سے افراد چٹائیوں اور گدوں پر بے سدھ پڑے تھے۔ ہال کمرے سے نکلنے والی ایک راہداری میں سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ یقیناً یہاں کے پہرے دار تھے۔ میں رات کو اکثر ان لوگوں کی آوازیں سنتا تھا۔ یہ بلند آواز میں قہقہے لگاتے تھے اور خود کو بیدار رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے دھول دھپا بھی کرتے رہتے تھے۔ ہم اس راہداری کے سامنے سے گزر گئے لیکن اس میں داخل نہیں ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا رخ اسی طرف ہے جس طرف سے ہم یعنی میں اور سنتوش وغیرہ چار پانچ دن پہلے یہاں داخل ہوئے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ جلد ہی پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم اس آبشار کے سامنے پہنچ گئے جو پتھروں پر گرتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اس حوض یا چھوٹی جھیل میں پتھر کا ایک بڑا مجسمہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ یہاں [illegible] عمران ان دروازوں کے سامنے سے گزرتا ہوا اچانک ایک

http://digestpk.blogspot.com/

دروازے میں داخل ہو گیا۔ عمران کی ہدایت کے مطابق میں نے ارد گرد دیکھا۔ دور فاصلے پر کسی شخص کا متحرک سایہ نظر آ رہا تھا۔ شاید کوئی دھرمی پجاری یا پیرے دار پوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ تاہم وہ اتنی دور تھا کہ مجھے اس کی طرف سے دیکھے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ میں عمران کے پیچھے دروازے میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی پتا چل گیا کہ یہ مہا گرو کی رہائش گاہ ہے۔ طاقوں میں جابجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں اور تصویریں تھیں۔ ایک دیوار پر جاپ کرنے کے لیے بہت سی مالائیں جھول رہی تھیں۔

گرو کی رہائش گاہ کے دو حصے تھے۔ ایک کو مردانہ اور دوسرے کو زنانہ کہا جا سکتا تھا۔ ہم مردانے حصے میں داخل ہوئے تھے۔ تاہم گرو صاحب یہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک الماری میں گرو صاحب کے مختلف لباس ٹنگے ہوئے تھے۔ ان کی جوتیاں اور کھڑاؤں وغیرہ پڑی تھیں۔ خشک میوے اور بیسن کا بہت سارا حلوہ ایک تھال میں ڈھکا رکھا تھا۔ عمران نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بولا۔ ”میں یہاں گرو کا ذاتی خدمت گار ہوں۔ چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ یہ حاجت خانے میں جاتا ہے تو لوٹا بھی مجھے پکڑنا پڑتا ہے۔ کسی وقت تو خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے طہارت بھی مجھے ہی نہ کرانی پڑے۔“

”اب کہاں ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”پانی میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ ہر سنیچر کی رات کو یہ جاپ اسے کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں گھر واپس آ جائے گا۔ آؤ، میں تمہیں اس کی سُندر پتنی سے ملواؤں۔“

عمران مجھے لے کر ایک دروازے سے گزرا۔ ہم گھر کے مردانے حصے سے زنانے حصے میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی در و دیوار پر خوب گاڑھا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ ریشمی پردے لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں بہت سے ساز پڑے تھے۔ یہ غالباً بھجن گانے میں استعمال ہوتے تھے۔ کتھک ناچنے والوں کی ایک بڑی تصویر بھی اس کمرے میں آویزاں تھی۔ مجھے ایک دروازے کے عقب سے کچھ دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے کوئی عورت کراہ رہی ہے اور اس کی آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

”یہاں کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تیرہ من کی دھوبن، کیونکہ ایک من کے تو یہ زیور ہی پہنتی ہے۔ پچھلے جنم میں یہ یقیناً کوئی بھینس یا ہتھنی وغیرہ رہی ہے۔ اس جنم میں بھگوان نے اسے گرو کی دھرم پتنی کی داسی بنایا ہے۔ ایک نمبر کی خرانٹ عورت ہے۔ اقبال اسی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔“

عمران نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر مجھے کراہنے والی عورت کی جھلک دکھائی۔ وہ واقعی کسی سومو پہلوان کی طرح صحت مند تھی۔ اس نے چاندی اور پیتل کے بہت سے کڑے پہن رکھے تھے۔ ان کڑوں نے اس کے بازو کہنیوں تک چھپائے ہوئے تھے اور نصف پنڈلیاں بھی اوجھل نظر آ رہی تھیں۔ وہ کسی بھینس ہی کی طرح نائیلون کی رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ غوں غاں کی آوازیں نکال رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر نیل تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں وہ سخت سردی محسوس کر رہی تھی اور اس کی بے چینی کا سبب بھی یہی تھا۔ عمران نے ایک طرف پڑا ہوا ایک لحاف اٹھا کر اس پر ڈال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد میں نے زخمی اقبال کو بھی دیکھ لیا۔ عمران نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ یہاں اقبال کا نام راج ہے اور میں گرو کی پتنی کے سامنے اقبال سے شناسائی ظاہر نہ کروں۔ آج میں ایک طویل عرصے بعد اقبال کو دیکھ رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ ذرا سا فربہ ضرور ہوا تھا مگر اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جس چیز نے مجھے ششدر کیا، وہ اقبال کی آنکھیں تھیں۔ آنکھیں گہری سرخ تھیں اور اتنی سوج چکی تھیں کہ پپوٹوں کے درمیان بس ایک درز سی باقی رہ گئی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل پانی بھی رس رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی شدید تکلیف کے باعث مشکل سے ہی دیکھ پا رہا ہے۔ وہ ایک تنائیچے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ہی ایک مسہری پر گرو کی سُندر پتنی رادھا کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اس کے سرہانے ہومیو پیتھک ادویہ کی کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں وہ ایک دم مرجھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔

اقبال نے مجھے دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے... ہمارے دل چاہ رہے تھے کہ بھاگ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جائیں مگر عمران کی ہدایات آڑے آ گئی تھیں۔ ہمارے چہروں نے ہمارے جذبات کی عکاسی کی...

عمران نے اقبال یعنی راج سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”راج! یہ ہے گوپال... سمجھو کہ یہ ہمارا نیا ساتھی ہے۔ اور گوپال! یہ راج ہے۔ اس خبیث موٹی نے راج کی

آنکھوں میں سرخ مرچیں پھینکی ہیں اور صرف مرچیں ہی نہیں تھیں ان میں کچھ اور الا بلا بھی تھا۔ پپوٹوں کے نیچے سے تھوڑا تھوڑا خون بھی رِستا ہے۔ اس کی آنکھوں کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے... اس کی جگہ اب تمہیں چار پانچ گھنٹوں کے لیے رادھا دیوی کے پاس رہنا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں...“

”کیوں؟ تم بھی تو یہیں ہو۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، مجھے ابھی تین چار گھنٹوں کے لیے یہاں سے جانا ہے۔ تالاب پر جا کر گرو جی کی سیوا کرنی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے میں اور گرو جی اکٹھے ہی واپس آئیں گے... ہر سنیچر کی رات کو یہی کچھ ہوتا ہے۔“

گرو کی پتنی بالکل ساکت لیٹی تھی۔ ذرا سی جنبش بھی نہیں کر رہی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس نے جسم کو ہلایا تو کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ پھٹ جائے گی۔ اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی جو پھانسی گھاٹ کی طرف چل کر جانے والے مجرم کے چہرے پر ہوتی ہے... موت کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر بہت گہری تھیں۔

عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا کہ اگر ہم چاہیں تو ساتھ والے کمرے میں جا کر ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اور دو چار منٹ گزار سکتے ہیں۔ پہلے اقبال اٹھ کر گیا پھر میں بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ہم نے وہ سارے فقرے بولے جو بہت دیر سے بچھڑے ہوئے بے تکلف دوست دوبارہ مل کر بولتے ہیں اور خود کو خوشی کے دریا میں بہتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ میں نے اقبال سے پوچھا کہ اس کی آنکھوں کے ساتھ یہ معاملہ کیونکر ہوا ہے۔ اس نے مختصر لفظوں میں جو کچھ بتایا وہ یوں تھا۔

گرو کی پتنی والا چکر پچھلے تین چار روز سے چل رہا تھا۔ اس کی کمر کے ساتھ ایک بارودی بیلٹ موجود تھی جس کا ریموٹ کنٹرول عمران یا پھر اقبال کے پاس موجود رہتا تھا۔ عمران اور اقبال مہا گرو کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ سلطانہ کی جان بچانے میں مدد کرے۔ وہ شکیلہ کی بے بسی کے بارے میں بھی سب کچھ جانتے تھے اور اس کی بھی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مہا گرو ایک کٹر مذہبی شخص تھا اور منہ زور گھوڑے کی طرح تھا۔ اگر اس کی جوان سُندر پتنی عمران اور اقبال کے ہتھے نہ چڑھتی اور وہ بارودی بیلٹ کی مدد سے اسے زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوتے تو گرو کے منہ میں ہرگز لگام نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ گرو نے اور اس کی پتنی نے اپنے ساتھ ہونے والے اس سنگین معاملے کو ہر کسی سے چھپایا تھا بلکہ انہیں چھپانا پڑا تھا۔ ریموٹ کنٹرول ہر وقت عمران یا اقبال کی تحویل میں رہتا تھا اور وہ کسی بھی وقت گرو کی چہیتی بیوی کو ٹکڑوں اور لوتھڑوں میں تبدیل کر سکتے تھے۔ گھر کے اندر آنے اور ملنے جلنے والوں کو یہی پتا تھا کہ رادھا دیوی کی کمر میں شدید درد ہے اور وہ آج کل زیادہ وقت بستر پر ہی گزار رہی ہے۔ راج یعنی اقبال یہاں رادھا کے معالج کے طور پر موجود تھا۔ اقبال یوں تو عمران ہی کی طرح یہاں مہا گرو کا سیوک تھا، تاہم اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہومیو پیتھک دواؤں کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتا ہے۔ وہ ہر دو تین گھنٹے بعد رادھا کو کوئی نہ کوئی دوا کھلا رہا تھا اور دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ وہ گرو کی پتنی کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے۔ رادھا کی خاص داسی بھی ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ وہی پہلوان نما عورت تھی جسے ہم نے کچھ دیر پہلے ایک چھوٹے کمرے میں بندھا پایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ داسیاں رادھا کی خدمت کے لیے یہاں آتی جاتی تھیں مگر انہیں اصل صورتِ حال کا کچھ علم نہیں تھا۔ صرف پہلوان نما داسی بھاگ متی جانتی تھی کہ یہاں کیا چکر چل چکا ہے اور مالک و مالکن کتنی بڑی مصیبت میں ہیں۔ آج رات پہلے پہر پہلوان نما بھاگ متی نے نمک حلالی کی ایک زبردست کوشش کی تھی اور اقبال پر اس وقت حملہ کر دیا تھا جب وہ رادھا کی مسہری کے قریب چٹائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ایک دم اقبال پر جھپٹی تھی اور اس کی آنکھوں میں پسی ہوئی مرچوں اور کسی تیز کیمیکل سے بنایا گیا سفوف ڈال دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو اقبال جیسے اندھا ہو گیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے عمران کو پکارا تھا۔ عمران اس وقت گرو کا حلوہ تیار کر رہا تھا۔ وہ غیر معمولی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے اقبال کو ”پہلوان داسی“ کے چنگل سے نکالا۔ اسے چند سیکنڈ کی دیر بھی ہو جاتی تو پہلوان داسی بھاگ متی نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دینا تھا۔ وہ ریموٹ کنٹرول اقبال سے چھین چکی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک ٹانگ ابھی تک اقبال کے ہاتھ میں تھی اور وہ بھاگ نہیں پا رہی تھی۔ عمران پہنچ گیا اور اس نے بھاگ متی کو اپنی گرفت میں جکڑا۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے اقبال شدید کرب میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے مسلسل خنجر گھونپے جا رہے تھے۔

اقبال نے مجھے اپنی مختصر روداد سنائی اور وہیں بے دم سا ہو کر ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے بتایا کہ آنکھیں بند کر لینے سے اور ان پر ٹھنڈا پانی ڈالنے سے اسے قدرے سکون ملتا ہے۔

http://digestpk.blogspot.com/

ریموٹ کنٹرول میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سفید بٹن ایکٹیویشن کا ہے۔ اس وقت یہ آن ہے۔ یہ دوسرا بٹن لاک کا ہے۔ اس کو میں نے کھول دیا ہے۔ اب اس سرخ بٹن پر ذرا سا دباؤ بھی پڑے گا تو رادھا دیوی کا دھماکا ہو جائے گا۔ بھگوان کی کرپا سے دس پندرہ ٹکڑے تو ضرور ہوں گے۔ اس لیے احتیاط سے رہنا اور چوکس بھی۔۔۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اب بے فکر رہو۔ باہر سے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

”اور اگر آیا تو؟“

”فرض محال آیا تو دروازہ نہیں کھولنا۔ لالٹین کی لَو بالکل نیچی کردو۔“

میں نے لَو نیچی کر دی۔ کمرا نیم تاریک ہو گیا۔ عمران نے ریموٹ احتیاط سے میرے سامنے ایک تپائی پر رکھ دیا۔ مجھے ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ رادھا بھی لیٹی لیٹی اونگھنے لگی تھی۔ اس کے کالے گھنگھرالے بالوں کی ایک لٹ اس کے زرد رخسار پر جھول رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ آج کل کچھ کھا پی نہیں رہی۔ اس کے ہونٹ سوکھ کر سانولے ہو چکے تھے۔ پتا نہیں وہ کیسے اس فربہ اندام ادھیڑ عمر گرو کی بیوی بن گئی تھی۔ شاید اس میں کچھ عمل دخل لالچ کا بھی رہا ہو۔ گرو کی اس رہائش گاہ اور رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی خوش حال ہے۔ استھان میں جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے اور نذر نیاز پیش کی جاتی تھی، اس کا بڑا حصہ یقیناً اس مہا گرو کے پاس آتا تھا۔ یہاں کے ریشمی پردے، قالیچے، قیمتی ساز و سامان اور خود رادھا کا لباس بھی گواہی دیتے تھے کہ اس جگہ خوش حالی کا دور دورہ ہے۔

کچھ دیر بعد رادھا نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ میری کمر میں بہت زیادہ چبھ رہا ہے، کیا تم اسے تھوڑا سا ڈھیلا کر سکت ہو۔“ اس کا اشارہ اپنی کمر کی بارودی بیلٹ کی طرف تھا۔

میں نے کمبل ہٹایا پھر رادھا کی قمیص اوپر اٹھائی۔ ریشمی قمیص کے نیچے اس کی دبلی پتلی ریشمی کمر تھی اور کمر کے ساتھ براؤن رنگ کی وہ خوفناک بیلٹ ایک انچ چوڑے اسٹریپس کے ذریعے بندھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ ”اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہے تو میں اسے ڈھیلا کر سکتا ہوں لیکن اس میں خطرہ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانکاری نہیں ہے۔“

خطرے کا لفظ سن کر رادھا کا زرد رنگ کچھ اور زرد ہو گیا۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں رہنے دو۔۔۔ رہنے دو۔“

میں نے کہا۔ ”اس کو ڈھیلا کرنے کا کام امیت زیادہ اچھے طریقے سے کر سکے گا۔“

”لیکن اس کو تو گرو جی کے ساتھ ہی واپس آنا ہے اور ان کے آنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی ہیں۔“ وہ فوراً کراہ کر بولی۔ وہ سچ کو گرو جی ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر ناراض لہجے میں بولی۔ ”تم دھرمی ہو کر بھگوان کے سیوک اور اس کی دھرم پتنی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کر رہے ہو۔ تمہیں ذرا خوف نا ہیں کہ تمہارے اس اپرادھ کا انجام کیا ہووے گا؟“

میں نے کہا۔ ”یہی تو مشکل ہے دیوی جی! یہاں پاپ اور پُن کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ ایک ناری کو یہاں زندہ جلایا جانے والا ہے، کچھ لوگ اسے بہت بڑا پُن کہہ رہے ہیں اور بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جن کے نزدیک یہ مہا پاپ ہے۔“

”ایسے فیصلے میں اور تم نا ہیں کر سکتے۔ ایسے فیصلوں کے لیے ہی گرو جی اور ان جیسے دوسرے گیانی دھیانی لوگ ہوتے ہیں۔ ہم جیسے عام منشوں کو ان کے فیصلے ماننا پڑتے ہیں۔ اس لڑکی کے لیے یہ سزا بہت زیادہ کٹھور ہے مگر اس کا اپرادھ بھی تو چھوٹا نا ہیں ہے۔ اس نے اوتار ذری کے ایک منش کو بے دردی سے قتل کیا ہے۔ جو سزا اس لڑکی کو مل رہی ہے، وہ اس کا بھی بھلا کرے گی۔ اس کے پاپ دھل جاویں گے، اس کا اگلا جنم کسی بہت اچھے روپ میں ہووے گا۔“

وہ دیر تک بولتی رہی۔ میرے اور میرے دونوں ساتھیوں کی غداری کو بدترین انجام سے جوڑتی رہی۔ آخر میں اس نے اپنا لہجہ نرم کیا اور مجھے سمجھانے بجھانے کی کمزور کوششیں کرنے لگی۔ وہ بولی۔ ”ایک بات یاد رکھو، گرو جی اپنے دھرم کے خلاف کچھ نا ہیں کریں گے۔ وہ جانت ہیں کہ ایسا کرنے کا انجام کتنا برا ہووے گا۔ نرگ کی اگنی کے سامنے اس سنسار کی ساری سزائیں بالکل معمولی ہیں۔ گرو جی میری ہتھیا قبول کر لیویں گے، اپنی ہتھیا بھی قبول کر لیویں گے۔۔۔ لیکن سوچو اس کے بعد کیا ہووے گا؟ کیا یہاں کے لوگ تمہیں زندہ چھوڑیں گے؟ کبھی نا ہیں۔ اس لیے میں اب بھی کہتی ہوں کہ کوئی اور راستہ اختیار کر لو۔ اپنے دوستوں کو سمجھاؤ کہ یہ ضد چھوڑ دیں۔ یہ سب کو بہت مہنگی پڑے گی۔“

”ضد چھوڑنا ہی تو مشکل ہے۔ کیا تمہارا پتی اور اس کے ساتھی اپنی ضد چھوڑ رہے ہیں؟“

”وہ ضد نا ہیں ہے۔ وہ تو دھرم ہے۔ بھگوان کی اکشا ہے اور اس کے خلاف چلنا مہا پاپ ہے۔“

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں دیوی جی۔ مہا پاپ اور مہا پُن کا فیصلہ ہی تو ہم سے ہو نہیں رہا۔ ہم اپنے جھوٹے عقیدوں اور واہموں کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔“

اس نے لرز کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور پھر پوجا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”ایشور تمہیں شما کرے۔ تم اپنی نا سمجھی میں بہت غلط باتیں کہہ رہے ہو۔“

”یہ غلط باتیں نہیں ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ۔۔۔“

”بس بس، اب چپ ہو جاؤ۔“ وہ تیزی سے میری بات کاٹ کر بولی۔ ”جن باتوں کی تمہیں جانکاری نا ہیں، ان کے بارے میں بول کر اپنا انجام خراب مت کرو۔۔۔ بس چپ ہو جاؤ۔“

بات کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے خوف زدہ نظروں سے سبز رنگ کے ریموٹ کنٹرول کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ شاید عمران نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ ریموٹ کنٹرول ایک طوطے کی طرح تھا اور اس میں گرو کی پتنی کی جان تھی۔

اس دوران میں اندرونی کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ غوں غاں کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ پہلوان نما داسی شاید پھر مضطرب ہو رہی تھی۔ جس طرح بندھی ہوئی گائے بھینس ذبح ہونے سے پہلے ٹانگیں چلاتی ہیں، وہ بھی ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ جب یہ سلسلہ دراز ہوا تو میں نے جا کر دیکھنا مناسب سمجھا۔ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک تھمی سی چیز تیزی سے باہر نکل گئی۔ یہ ایک چوہا تھا۔ داسی بھاگ متی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت کتنی بھی دلیر ہو، چوہا، چھپکلی، کاکروچ اور اس نوع کے دیگر جان دار اس کی کمزوری رہے ہیں۔ اگر عمران یہاں موجود ہوتا تو اس سچویشن پر چند دلچسپ فقرے ضرور چست کرتا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور واپس رادھا کے پاس آ گیا۔ اس نے صورتِ حال پوچھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی نوکرانی پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔

رادھا گاہے بگاہے عجیب انداز سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ آخر وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”تم نے اتنی سخت ٹھنڈ میں بھی بس یہ قمیص پہن رکھی ہے۔ تمہیں سردی نا ہیں لگتی؟“

”نہیں لگتی۔ یا یوں سمجھ لو کہ لگتی ہے لیکن میں محسوس نہیں کرتا۔“

”کیا مطلب؟“

”بس یہ عقیدے عقیدے کی بات ہے۔ مجھے سردی جھیلنے میں مزہ آتا ہے، بالکل جیسے تمہارے پتی دیو کو سنیچر کی رات ٹھنڈے پانی میں جاپ کر کے مزہ آتا ہوگا۔“

”لل۔۔۔ لیکن وہ پانی ٹھنڈا تو نا ہیں ہوتا۔“

”تم نے ابھی خود بتایا تھا کہ وہ آدھی رات کے بعد ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ فرماتے ہیں۔ امیت بھی یہی کہہ رہا تھا۔“

”وہ پانی اس لحاظ سے ٹھنڈا ہووت ہے کہ اسے آگ پر گرم نا ہیں کیا جاتا۔“ وہ لیٹے لیٹے بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”یہ دھرم کی باتیں ہیں۔ میری تمہاری بدھی (عقل) میں نا ہیں آسکتیں۔“

”لیکن اتنی بات تو ایک بالک کی سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ پانی کو آگ سے ہی گرم کیا جاسکتا ہے یا پھر دھوپ میں رکھ کر اس کی ٹھار ماری جا سکتی ہے۔۔۔ مگر آدھی رات کو تمہارے پتی دیو کو دھوپ کہاں ملتی ہوگی؟“

”آگ آگ میں فرق ہووت ہے۔“ رادھا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”گرو جی کہوت ہیں کہ سنیچر کی رات والے پانی کو ایسے آدھ بجھے کوئلوں سے گرم کیا جاسکت ہے جن میں اگنی کی لپک نہ ہو۔ وہ تانبے کے جس حوض میں بیٹھ کر جاپ کرت ہیں، اس کے گرداگرد ملازم آدھ بجھے کوئلے ڈالتا رہتا ہے۔“

رادھا نے اس بارے میں کچھ مزید تفصیل بتائی۔ وہ جیسے خود بھی باتیں کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا دھیان اپنی بیلٹ اور ریموٹ کنٹرول وغیرہ سے ہٹا رہے۔ وہ کسی حد تک سادہ بھی تھی۔ اپنے شوہر یعنی گرو جی کے کمالات کا بہت سارا رعب اس کے دل و دماغ پر موجود تھا۔ میں دل ہی دل میں گرو کی چالاکی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ایسی سخت سردی میں ٹھنڈے پانی کے اندر بیٹھ کر جاپ کرنے میں کوئی گھپلا ہوگا۔ اب یہ گھپلا سامنے آگیا تھا۔ گرو جی جیسے لوگوں کے پاس حیلے بہانے اور تاویلیں تو ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ پانی کو گرم کرنے کے لیے اس نے یہ تاویل ڈھونڈ لی تھی کہ پانی کو آگ سے گرم نہیں کیا جا سکتا لیکن آدھ بجھا انگارہ جس میں شعلہ نہ ہو، آگ نہیں کہلائے گا۔۔۔ واہ واہ کیا سچائی تھی؟

میں دوسرے کمرے میں جا کر گاہے بگاہے اقبال کی مزاج پرسی کرتا رہا۔ رادھا سے باتیں بھی کیں لیکن کرم داد اور عمران کا

http://digestpk.blogspot.com/

انتظار بھی۔ رادھا کی گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ جو شخص رات بھر اودھ بجھے انگارے گرو کے حوض کے لیے مہیا کرتا رہتا ہے، وہ امیت یعنی عمران ہی ہے۔ وہ آدھی شب سے لے کر آخری پہر تک لکڑیوں کے ایک ڈھیر سے نبرد آزما رہتا ہے۔ تین بڑے چولہے جلتے رہتے ہیں اور تانبے کے حوض کو اودھ بجھے انگاروں کی سپلائی جاری رہتی ہے۔

خدا خدا کر کے انتظار کا وقت کٹا اور دروازے سے باہر گرو اور عمران کی آمد ہوئی۔ یہ دروازہ مردانے حصے کی طرف تھا۔ میں درمیانی دروازے میں سے گزر کر مردانے میں پہنچا اور دروازہ کھولا۔ گرو نے خود کو ایک بھاری کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ عمران مودب انداز میں اس کے پیچھے تھا۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے تک اس نے اپنے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا جو ابھی ابھی دھویا گیا تھا۔ ان کے ساتھ دو مزید افراد بھی تھے۔ یہ نوجوان پجاری تھے۔ گرو کی طرح ان کے بال بھی بھیگے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے گرد کمبل لپیٹ رکھے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ بھی گرو کے ساتھ ہی پانی میں پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں۔ ان دونوں افراد کو گرو نے کچھ پرشاد دیا اور تھوڑی سی گفتگو بھی کی۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے۔ جب تک وہ موجود رہے، عمران کا رویہ گرو کے ساتھ بہت مودب رہا لیکن اس کے فوراً بعد وہ اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ اس نے گرو کو زنانے میں چلنے کو کہا۔ انداز حکم دینے والا ہی تھا۔ گرو چار و ناچار اپنی توند مٹکاتا ہوا زنانے میں آ گیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ یہاں رادھا مسہری پر اسی طرح بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ میاں بیوی نے بے چارگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

گرو کو سردی لگ رہی تھی۔ اس نے عمران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”بھاگ متی نے انگیٹھی نہیں جلائی؟“

عمران نے اطمینان سے نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بھاگ متی نے انگیٹھی تو نہیں جلائی لیکن اس نے تمہارے جانے کے بعد ایک اور طرح کی آگ لگانے کی کوشش فرمائی تھی۔ اس ناکام کوشش کے نتیجے میں اب وہ چھوٹے کمرے میں بندھی پڑی ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ گرو بوکھلا گیا۔

”اس نے راج کی آنکھوں میں مرچیں جھونکیں اور اس سے طوطا (کنٹرول) چھیننے کی کوشش فرمائی۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ خاص قسم کی مرچیں بھاگ متی کو تم نے ہی سپلائی کی ہوں گی۔“

گرو کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”نا ہیں... میں نے ایسا کچھ نا ہیں کیا۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں۔“

گرو کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور بھاگ متی نے جو کچھ کیا ہے، اپنے طور پر کیا ہے... مگر عمران نے گرو پر دباؤ برقرار رکھا اور اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ کافی غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے گرو کو دوسرے کمرے میں لے جا کر اقبال کی حالت دکھائی اور پھر اسے دھکیلتا ہوا واپس رادھا کے پاس لے آیا۔ اس نے دوٹوک لہجے میں گرو سے کہا۔ ”میں اب تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم نے جو فیصلہ بھی کرنا ہے، ابھی کرو اور زیادہ سے زیادہ کل تک اس پر عمل ہو جانا چاہیے۔“

گرو نے اپنے موٹے بھدے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بے دم سا ہو کر لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس نے چند لمبی سانسیں لیں اور جیسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”دیکھو امیت! بھگوان کی کتنی بڑی کرپا ہے کہ اس نے تمہیں ایک ہندو گھرانے میں پیدا کیا۔ انسان کے بھیس میں پیدا کیا اور سنسار کی ساری نعمتیں تم کو دیں۔ تم کسی مسلے یا عیسائی کے گھر میں بھی پیدا ہو سکتے تھے... تمہاری جون انسان کے بجائے کسی کتے بلی کی بھی ہو سکتی تھی۔ ہم دن رات بھگوان کا شکر ادا کرتے رہیں تو بھی کم ہے۔ ہم شکر ادا نا ہیں کر سکتے لیکن کم از کم اس طرح کا مہا پاپ تو نہیں کریں۔ اس ناری کا چتا میں جلنا اس کے لیے ہی نا ہیں، ہم سب کے لیے بھی چھٹکارے کا سبب بنے گا۔ اس کے اپرادھ کے مقابلے میں یہ سزا تو کچھ بھی نا ہیں اور اگر...“

”تم یہ بکواس بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔“ عمران نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”میں یہ سب کچھ بہت دفعہ سن چکا ہوں۔ اب دوٹوک بات کرنی ہوگی۔ ہاں یا نہ...“

”مگر امیت...“

”بس گرو... ہاں یا نہ۔“ عمران نے بے لچک لہجے میں کہا۔

اس دفعہ رادھا بولی۔ ”اتنی جلدی مت کرو امیت... چلو، ہمیں دو پہر تک کا سمے اور دے دو۔“

”تاکہ تمہارے کسی چہیتے کو سرخ مرچوں جیسی چالاکی دکھانے کا ایک موقع اور مل جائے۔“ عمران نے ترت جواب دیا۔

”میں تمہیں وچن دیتا ہوں امیت، اب ایسا کچھ نا ہیں ہوگا... اور میرا وشواس کرو، جو کچھ ہوا ہے اس میں بھی میرا یا رادھا کا دوش بالکل نا ہیں۔“

”نہیں گرو۔“ عمران کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ”تمہیں جو کچھ

کرنا ہے کل کرنا ہوگا، ورنہ اپنی اس چہیتی پتنی کے دس پندرہ ٹکڑے اٹھانا ہوں گے۔ چتا کے پھول تیار کرنے کے لیے...“

عمران کے انداز نے گرو کا تاریک چہرہ تاریک تر کر دیا... وہ اپنے تھر تھر کانپتے جسم کو کمبل میں لپیٹتے ہوئے بولا۔ ”رادھا کو مارنے کے بعد تم تینوں بھی تو زندہ نا ہیں رہ سکو گے۔ یہ کبھی ہو نا ہیں سکتا کہ تمہیں اور بڑے گرو جی کو یہاں سے زندہ جانے دیں... اور سلطانہ کو تو پھر بھی مرنا ہی مرنا ہے۔ جیون بڑی پیاری چیز ہے امیت! یہ بھگوان کا تحفہ ہے... اسے یوں کھونا بدھی کی بات نا ہیں ہے۔“

”تم ہمیں موت سے نہ ڈراؤ گرو... ہم موت کے آگے نہیں، پیچھے بھاگنے والے لوگ ہیں۔“ عمران نے اطمینان سے کہا۔ اس کے لہجے میں وہی جانی پہچانی سچائی تھی جس نے مجھے دیوانہ بنایا تھا۔ یہ اس شخص کا لہجہ تھا جو واقعی جان ہتھیلی پر لے کر پھرتا تھا۔ موت اس کی محبوبہ تھی اور وہ اس سے بغل گیر ہونے کے لیے ہر وقت تیار تھا۔

گرو نے ایک بار پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ عمران نے بڑے انداز سے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا ریوالور نکال لیا۔ اس نے ریوالور کا چیمبر کھولا۔ وہ بھرا ہوا تھا۔ عمران نے اس میں سے چار گولیاں نکال لیں۔ پھر چرخی کو دو تین بار گھما کر ریوالور گرو کی گود میں پھینک دیا۔ گرو حیران سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں عمران کے اس پرانے کھیل کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

عمران بولا۔ ”چلو، سب کچھ بھگوان پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ابھی تم پانی کے اندر بڑی لمبی پرارتھنا کر کے نکلے ہو۔ بہت سے آشیرباد تمہارے ساتھ ہوں گے۔ چلو، مجھ پر گولی چلاؤ... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“

”کک... کیا مطلب؟“

”گولی چلانے کا مطلب گولی چلانا ہی ہوتا ہے، پرشاد کھانا نہیں۔ مجھ پر گولی چلاؤ، میری ٹانگ کا نشانہ لو۔ اگر گولی مجھے لگ گئی تو ہم تمہاری پتنی کی کمر سے پٹی اتار لیں گے اور تمہیں بغیر کچھ کہے یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر گولی نہ چلی تو پھر ایسے ہی چرخی گھما کر میں تم پر گولی چلاؤں گا۔ اس طرح دیکھتے ہیں کہ بھگوان کی طرف سے کیا اشارہ ملتا ہے۔“

ریوالور گرو کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی کپکپاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے لیے محسوس ہوا کہ شاید وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے... لیکن پھر جلد ہی اس کے تاثرات نارمل ہو گئے اور وہی خوف آمیز بے بسی اس کے فربہ چہرے کو ڈھانپنے لگی جس کا مشاہدہ میں اب تک کر رہا تھا۔ اس نے ریوالور اٹھا کر دوبارہ عمران کے پاس رکھ دیا۔ ”تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نا ہیں آ رہی۔“ وہ کراہ کر بولا۔

”لیکن مجھے تمہاری ساری سمجھ آ رہی ہے... تم صرف سمے ضائع کر رہے ہو اور کسی چمتکار کے انتظار میں ہو۔ لیکن ہم کب تک چمتکار کا انتظار کریں گے؟ کیوں نہ ہم خود ہی چمتکار کے پاس پہنچ جائیں۔“

”کیا مطلب؟“ گرو نے کہا۔

”مہاتما صاحب! یہ چمتکار ہی تو ہے۔“ عمران نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گولی لگ گئی تو چمتکار... تمہیں نہ لگی تو بھی چمتکار... چلو اگر تم میں اتنی شکتی نہیں تو میں خود ہی گھوڑا دبا دیتا ہوں۔ پہلے خود پر ٹرائی کرتا ہوں... پھر تم پر...“ عمران نے بڑے اعتماد سے ریوالور کی سیاہ نال اپنی دائیں ران پر رکھ لی۔

گرو اور رادھا کے چہرے دیدنی تھے۔ خاص طور سے گرو کا چہرہ تو بالکل تاریک ہو گیا۔ عمران نے شہادت کی انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ عمران کے اس کھیل میں عمران کا اعتماد ہی سب کچھ تھا اور یہ اعتماد ساون کی منہ زور بارش کی طرح تابڑ توڑ اس کے چہرے پر برس رہا تھا۔ ریوالور کی چرخی میں دو گولیاں موجود تھیں۔

چند ہی سیکنڈ بعد گرو کی ہمت جواب دے گئی۔ ”ٹھہرو۔“ وہ کراہا۔ ”ایسا مت کرو۔ اس طرح کی شرطیں باندھنا دھرم میں پاپ ہے۔ تمہارے دماغ کو خون چڑھا ہوا ہے، تم شاید بدھی کی کوئی بات سوچ ہی نا ہیں سکت ہو۔“

”تمہارے دماغ کو تو خون نہیں چڑھا ہوا، پھر تم اس نروش لڑکی کو زندہ جلانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟“ عمران پھنکارا۔

”میں یہاں کا کار مختار نا ہیں ہوں۔ مجھ سے تو بس رائے مانگی جاوت ہے۔ اصل حکم تو بڑے گرو کا ہی چلتا ہے یا پھر ستیش کا۔“

”لیکن دھرم کے ٹھیکیدار تو تم ہو، بڑا گرو تو نوے سال کا بڈھا کھوسٹ ہو چکا ہے۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ یہاں کوئی تمہاری رائے کے خلاف نہیں چل سکتا۔“

”جتنا دھرم کو میں جانت ہوں، اتنا وہ بھی جانت ہیں۔ میں کوئی غلط بات کہوں گا تو بھگوان کا دوشی ٹھہروں گا اور ساتھ

http://digestpk.blogspot.com

''لیکن تم گرو اور استاد ہو... استادی ہوتی ہی یہ ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکالا جائے۔ اور درمیانی راستے تو ہر وقت تمہاری مٹھی میں رہتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا یہ سنیچر کی رات والا اشنان ہے۔ تم گرم پانی میں بیٹھ کر جاپ کرتے ہو اور کوئی تمہیں پکڑ بھی نہیں سکتا۔ اس کی ایک مثال تمہاری یہ پتنی ہے۔ یہ تم سے دس پندرہ سال تو چھوٹی ضرور ہے اور سندر بھی ہے۔ تمہارے جیسے گرو تو اکثر برہم چاری ہوتے ہیں لیکن تم دونوں مزے لے رہے ہو۔ گرو گھنٹال بھی بنے ہوئے ہو اور اپنا بستر بھی گرما گرم رکھتے ہو۔ یقیناً اپنے لیے یہ رعایت بھی تم نے کسی نہ کسی پوتھی (کتاب) سے ڈھونڈ ہی نکالی ہوگی۔''

گرو کی بولتی بند ہوتی جارہی تھی۔ یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آرہی تھی کہ اپنے ساتھی کے زخمی ہونے کے بعد امیت (یعنی عمران) فیصلہ کن موڈ میں ہے۔

اس نے کچھ دیر تک مزید آئیں بائیں شائیں کی۔ پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ عمران سے اجازت لے کر اس نے تھوڑی دیر تک پوجا پاٹ کی اور اپنی آنکھوں کو نم ناک کیا پھر کچھ پرانی پوتھیاں لے کر بیٹھ گیا اور ان کے ورق الٹ پلٹ کرنے لگا۔ جہاں تک میں نے اس کا تجزیہ کیا تھا، وہ ڈرامے باز گرو نہیں تھا۔ اس کے دل میں دھرم کا خوف اور اپنے عقیدے کا پختہ پن بھی موجود تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اور اپنی پتنی کی جان بھی پیاری تھی۔

اسی دوران میں عمران نے انگیٹھی دہکا کر گرو کے قریب رکھ دی تاکہ وہ پوری یکسوئی سے اپنے ''مطلب'' کی کوئی تحریر ڈھونڈ سکے۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ مونگ پھلی نکال کر مجھے دی اور خود بھی ٹھونگ ٹھونگ کر کھانے لگا۔ اس کے بعد وہ دوسرے کمرے میں اقبال کی خبر گیری کے لیے چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو گرو پوتھیوں کی ورق گردانی سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینہ تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دوسری ہتھیائیں تو کسی نہ کسی طرح شما ہوسکتی ہیں لیکن موہن کمار کی ہتھیا ایک ایسا مہا پاپ ہے جس کی چھوٹ کسی طور بھی نا ہیں ہے...''

''تو پھر۔'' عمران نے معنی خیز انداز میں میز رنگ کی ڈیوائس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بس ایک چیز ایسی ہے جس کے بارے میں وچار کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے ایک بوسیدہ کتاب میں سے ایک نشانی لگے صفحے کو سامنے کیا اور اس پر لکھے ہوئے سنسکرت کی اشلوک زیر لب پڑھنے لگا۔

میری اور عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ گرو توضیح کرتے ہوئے بولا۔ ''کسی بھی مندر، دھرم استھان یا دھرم شالہ میں انسانی خون کا گرایا جانا سخت پاپ ہے۔ اگر اس بات کا وشواس ہو جائے کہ ہمارے کسی کرم کے کارن خون بہے گا تو پھر اس کرم سے رک جانا ضروری ہے...''

''اور تمہیں پورا وشواس کر لینا چاہیے کہ اگر تم ہماری بات نہیں مانو گے تو خون بہے گا اور بہت زیادہ بہے گا۔''

گرو نے چند لمحوں کے لیے مسہری پر دراز اپنی خوب صورت بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا گورا رنگ، بھرا بھرا جسم، اس کے ریشمی بال... سب کچھ ان لمحوں میں برق کی طرح اس کی آنکھوں میں لہرا گیا اور اس کے ساتھ ہی زندگی کی وہ ساری چاشنی، حرارت اور رنگا رنگی بھی جس کا تجربہ وہ اس استھان کے ایک کھلیا فرد کی حیثیت سے کر رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ دھرم اور استھان کے پالن کی خاطر میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں اس پوتر جگہ کو ہتھیا کے خون سے گندا نا ہیں ہونے دوں گا۔''

عمران کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے مدد کے طریقۂ کار پر کوئی بات نہیں کی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ طریقۂ کار پر پہلے بات ہو چکی ہے اور اب جو کچھ ہوگا، اس کے مطابق ہوگا۔

عمران نے قریب رکھی پلیٹ میں سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور دوسرا ٹکڑا گرو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اپنا اور اپنی پتنی کا نیا جیون مبارک ہو۔''

گرو نے مجبوراً مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا لیکن اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مٹھائی نہیں، کونین کی گولی کھا رہا ہے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ عمران نے گرو سے جس ''مدد'' کی بات کی تھی، اس کا طریقۂ کار پہلے بھی زیر بحث آچکا تھا۔ استھان کی پہرے داری میں بائیس افراد کے ذمے تھی۔ یہ لوگ رات نو بجے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر آتے تھے اور صبح کا اجالا نمودار ہونے تک رہتے تھے۔ ایک دوسرا جتھا دن کے وقت پہرے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ چند دن کے وقفے سے یہ ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی۔ دن کے پہرے دار رات کی شفٹ میں چلے جاتے تھے اور رات والے دن کی شفٹ میں۔ ان میں بائیس افراد میں سے آٹھ کے قریب تو استھان کے اندر ہی مختلف جگہوں پر ہوتے تھے، باقی نکاسی کے راستوں پر۔ ان کی ساری تفصیل عمران کو معلوم تھی۔ ان کی جسمانی حالت، ان کے

ہتھیاروں کی تعداد، ان کی صلاحیت غرض سب کچھ اس کے علم میں تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مہینوں سے یہاں موجود ہے... اور یقیناً اقبال بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

رات کے بھوجن کے بعد سب لوگ تاڑی سے شغل کرتے تھے۔ عام لوگ تو دل کھول کر پیتے تھے لیکن پہرے دار بھی اس ''نیک کام'' میں کسی حد تک شریک رہتے تھے۔ یہ خاص قسم کی تاڑی تھی جس میں بھنگ کا نشہ بھی شامل کیا جاتا تھا۔ ایک طرح سے یہ ان لوگوں کا مذہبی مشروب تھا جس کے پینے میں پاپ کے اندیشے کے بجائے ثواب کی توقع رکھی جاتی تھی۔ اس مشروب کے سربمہر مٹکے گرو کی تحویل میں رہتے تھے۔ گرو کے لیے یہ کام بہت آسان تھا کہ وہ اس تاڑی میں کوئی ایسی چیز شامل کر دیتا جس سے پینے والے مکمل طور پر اتنا مخبل ہو جاتے... اقبال کی آنکھوں کا کباڑا کرنے والی خاص سرخ مرچوں جیسی کچھ اور چیزیں بھی گرو کے پاس موجود تھیں... اور انہی چیزوں میں دستور رہے کا وہ کشتہ بھی تھا جسے تاڑی میں ملائے جانے کا پروگرام تھا۔

عمران نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے اپنے ٹھکانے پر واپس جانا چاہیے تاکہ کسی کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ سب اچھا ہونے والا ہے اور وہ موقع دیکھ کر کل کسی بھی وقت مجھ سے ملاقات کرے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی طرح سلطانہ کی خیر خیریت دریافت کرے اور مجھے بتائے، اس کے علاوہ شکیلہ کے بارے میں بھی باخبر رہے۔ میں نے انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہوئے اسے شکیلہ کی حالتِ زار کے بارے میں بتایا۔ وہ اس بارے میں پہلے سے کچھ نہیں جانتا تھا، تاہم اسے شک ضرور تھا کہ اس مسلمان لڑکی کو یہاں ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ میں نے تین دن پہلے جو کچھ شکیلہ کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا، وہ عمران کے گوش گزار کیا۔ عمران کی آنکھوں کی بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ گرو اور رادھا کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ ہماری باتیں سمجھ نہیں پارہے۔

میں عمران سے بہت کچھ... بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ابھی ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ عمران مجھے گرو کی رہائش گاہ سے لے کر نکلا اور واپس میرے ٹھکانے کی طرف لے کر چل دیا۔ آدھے راستے سے میں نے اسے واپس بھیج دیا کیونکہ میں اب اپنے کمرے تک جاسکتا تھا۔

ابھی میں کمرے سے کچھ دور ہی تھا کہ مجھے رات کے سناٹے میں دھپ دھپ کی مدھم آواز سنائی دی جیسے کوئی بیلچے یا کسی سے مٹی کھود رہا ہو۔ فوراً میرا دھیان شکیلہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے بھی تو کالی ماتا کے بیلچے اور مٹی کھودنے کی بات کی تھی۔ میں محتاط قدموں سے آواز کی سمت بڑھا۔ کمروں کی عقبی دیوار کے ساتھ کچے احاطے میں جہاں بہت سی خشک لکڑیاں پڑی تھیں اور تین بڑے بڑے چولہے بنے ہوئے تھے، مجھے دو تین سائے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی چولہے ہیں جن کا ذکر کچھ دیر پہلے گرو کی سادہ لوح پتنی رادھا نے کیا تھا۔ ان چولہوں میں گرو کے جل جاپ یعنی پانی کی پوجا کے لیے اُدھ بجھے انگارے تیار کیے جاتے تھے۔ یعنی جو پانی 10 کلو لکڑی سے گرم ہو سکتا تھا، اس کے لیے ڈیڑھ دو من لکڑی جلائی جاتی تھی۔ ایک چولہے میں ابھی تک مدھم آگ روشن تھی۔ ان تین سایوں کی حرکت اسی روشنی

http://digestpk.blogspot.com

وفادار شوہر

ہفتے کی رات تھی۔

وہ کلب کے ہنگاموں میں رات تین بجے تک مگن رہا۔

گھر پہنچا تو اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے شوہر کو دیکھا تو پوچھا۔ ''آج کلب میں کیا شغل رہا؟''

''آج کلب میں عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ تمبولا شروع ہونے سے پہلے سیکریٹری نے اعلان کیا کہ جو شخص کھڑا ہو کر سب کے سامنے اس امر کا دعویٰ کرے کہ جب سے اس کی شادی ہوئی ہے اس نے اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کی تو اس کی خدمت میں یہ نیا ہیٹ پیش کیا جائے گا۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''ڈارلنگ، تم سن کر حیران ہوگی کہ سارے مجمع میں سے کسی بھی شخص نے اس امر کا دعویٰ نہیں کیا۔''

''مگر تم نے کیوں دعویٰ نہیں کیا؟''

''میں نے...؟ میں تو کھڑے ہو کر اعلان کرنے ہی والا تھا کہ یکا یک مجھے خیال آیا کہ یہ ہیٹ میرے سائز کا نہیں۔''

چاند بی بی کا تعاون چکوال سے

میں دیکھ سکا تھا۔

ان میں سے ایک یقیناً لڑکی تھی۔ وہ کندھوں تک ایک گڑھے میں تھی، اس کے بازوؤں کی حرکت سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ رات کے اس یخ بستہ سناٹے میں مٹی کھود رہی ہے۔ نہ جانے یہ کیا معما تھا۔ اس رات شکیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تلسی کے پودے کے نیچے اس لیے مٹی کھود رہی تھی تاکہ اسے وہاں سے شیواجی کے نام کی مہر مل سکے، اگر ایسا ہو گیا تو یہ لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ ادرجن وغیرہ کا ڈھونگ ہی لگا تھا۔

میں شاید کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرتا اور کچھ ٹوہ لگانے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں ایک آواز نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک تومند پہرے دار کی آواز تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ چمک رہی تھی۔ "مہاشے! یہاں کیا کر رہے ہو آپ؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

پھر اس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پھینکی اور چونکی ہوئی آواز میں بولا۔ "گوپال صاحب! آپ یہاں... اس وقت... خیریت تو ہے؟"

"بس ذرا سینے میں جلن ہو رہی تھی اس لیے ٹہل رہا ہوں۔"

"اگر طبیعت خراب ہے تو بتایئے۔ یہاں دوا دارو کا انتظام بھی ہے۔" اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ شکیلہ کی صورت تادیر نگاہوں میں گھومتی رہی۔ اس کا قصور کچھ نہیں تھا، اگر کوئی قصور تھا تو وہ اس کے بھائی کا تھا... اور وہ بھی بس اتنا کہ وہ ایک برہمن زادی کے دل میں سما گیا تھا۔ اس قصور کی پاداش میں اس کی ایک بہن قتل ہو چکی تھی اور وہ خود زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ اسے اس حال میں چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اسے اس دردناک صورتِ حال سے نکالنے کے لیے آخری حد تک کوشش کروں گا۔ اگر میرے علم میں یہ بات نہ آئی ہوتی تو اور بات تھی، اب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر فراموش کر دینا ممکن نہیں تھا۔

سہ پہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف عمران تھا۔ وہ جلدی سے اندر آ گیا۔ اس کے یہاں آنے کا مطلب یہ تھا کہ اقبال کی حالت اب بہتر ہے اور وہ ریموٹ کنٹرول کے ساتھ رادھا دیوی کے سرہانے موجود ہے۔ میرا یہ خیال درست نکلا۔ عمران نے کہا۔ "اس کی آنکھوں کی سوجن تو کم نہیں ہوئی لیکن جلن اب ٹھیک ہے۔ وہ اب رادھا دیوی کو سنبھال سکتا ہے۔"

"اسے کسی اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"لیکن جگر! یہاں سب مریض ہیں... نفسیاتی مریض، روحانی مریض... جنونی اور پتا نہیں کیا کیا... میں ان کو کیا لعن طعن کروں، میں خود ایک چریلا ہوں۔"

پھر اچانک عمران کی نظر میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر پڑی۔ ریت کے تھیلے کے ساتھ میں گھنٹوں تک جو طبع آزمائی کرتا تھا، اس نے میری انگلیوں کی گانٹھوں کو سیاہ کر دیا تھا اور یہاں سے جلد سخت چمڑے جیسی ہو گئی تھی۔ میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا، تاہم مجھے یقین تھا کہ میں کسی دروازے کے موٹے سے موٹے تختے کو مکا مار کر توڑ سکتا ہوں۔ میں لگاتار اپنی ضرب کی سختی کو جانچتا رہتا تھا اور مجھے روز افزوں بہتری کا احساس ہوتا تھا۔ عمران نے حیرت آمیز انداز میں میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے انگوٹھے سے میرے ہاتھ کی پشت کو سہلایا... پھر میرے دوسرے ہاتھ کی پشت کو دیکھا۔

"یہ سب کیا ہے تابی؟ میں تم میں بہت زیادہ تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔"

"اچھی یا بُری؟" میں نے پوچھا۔

"اچھی... بلکہ شاید بہت اچھی... تم ایک... بدلے ہوئے شخص ہو اور یہ نشان جو تمہاری جلد پر ہیں، یہ بھی کوئی نئی کہانی سنا رہے ہیں۔ کہیں کوئی فائٹنگ شائٹنگ کا آرٹ تو نہیں سیکھ رہے ہو تم؟"

"فائٹنگ کا آرٹ تو نہیں... ہاں تم جینے کا آرٹ کہہ سکتے ہو۔" میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"کوئی باکمال استاد ہی لگتا ہے بھئی۔" عمران نے آنکھیں نچائیں۔ "کون ذات شریف ہے؟"

"ہے نہیں... تھا۔"

"کون؟"

میں نے گہری سانس لی اور آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ "وہ بہت انوکھا تھا عمران... بہت جدا... جب میں تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا اور مجھے ہر چہرے میں تمہارا چہرہ نظر آتا تھا تو ایک روز اچانک وہ میری زندگی میں آ گیا... تمہارا بدل بن کر... تمہارے مداوے کی طرح... وہ مجھے ایک پرانی کشتی میں ملا... وہ عشق کے راستے کا تباہ حال مسافر تھا... ایک کمزور اپاہج اور حقیر سا شخص۔ لیکن وہ جو نظر آتا تھا، وہ نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک بڑا انسان چھپا ہوا تھا۔ ایک بہت طاقتور، دلیر اور دانا شخص۔ وہ مارشل آرٹ کا ایک انٹرنیشنل سپر اسٹار تھا۔ بارونڈا جیکی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟"

"ہاں، کچھ کچھ لگ تو رہا ہے۔ شاید اس نے کسی فلم میں بھی کام کیا تھا۔" عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔

"فلم اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ زندہ رہتا تو شاید فلموں کی ضرورت بن جاتا... وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ساتھ کوئی خدائی تحفہ لے کر دنیا میں آتے ہیں۔"

"تو کیا وہ زندہ نہیں؟"

"ہاں عمران، وہ مر گیا... لیکن مرنے سے پہلے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا گیا۔ جو کمی تم نے رہنے دی تھی، وہ اس نے پوری کر دی۔ اس لیے تو کہتا ہوں کہ وہ تمہارا بدل بن کر مجھے ملا تھا۔"

"کیا ہوا اس کے ساتھ؟"

"وہی جو پیار کرنے والوں اور اس پر قائم رہنے والوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ دنیا نے اسے محبت کی سزا دی اور اس نے ہنستے ہنستے قبول کر لی۔" میری آنکھوں کے کنارے پھر جل اٹھے۔

"یہ تو کوئی لمبی کہانی لگتی ہے۔" عمران نے کہا۔ "اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کہانی نے تمہیں بہت دکھی کیا ہے۔"

"ہاں، میرے بارے میں تمہارے اکثر اندازے بالکل درست ثابت ہوتے ہیں عمران۔ اس کی جدائی نے مجھے بُری طرح توڑا پھوڑا ہے... لیکن میں قدرت کی کرشمہ سازی پر حیران ہوں۔ جب میں تمہارا خلا بُری طرح محسوس کر رہا تھا تو اسے پُر کرنے کے لیے بارونڈا جیکی آ گیا اور جب بارونڈا جیکی کے بعد مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا... مجھے پھر سے تم مل گئے۔ میں سچ کہتا ہوں عمران... مجھے ابھی تک اپنے حواس پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ تم کہاں چھپ گئے تھے؟ اور اب یہاں انڈیا کی اس دور دراز اسٹیٹ میں یہاں انتہا پسندوں کے اس ٹھکانے پر؟ یہ سب کچھ اتنا ڈرامائی ہے کہ بس ایک خیال کی طرح لگتا ہے۔"

"میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ تمہیں سب کچھ بتاؤں گا اور پوری تفصیل کے ساتھ۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ جذباتی نظر آیا مگر پھر اس کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ میرے ہاتھوں کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "زبردست۔ اب یہ ہاتھ مردوں والے ہاتھ لگتے ہیں۔ اب تو تمہارے بارونڈا کے بارے میں مزید جاننے کو دل چاہتا ہے۔"

"میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں گا؟ میں تو خود بھی اسے زیادہ نہیں جان سکا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے اب تو..." وہ ایک دم کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کی ساری دلکشی، شگفتگی اچانک اندوہ میں ڈھل گئی۔ آنکھوں میں دکھ کے سائے تیر گئے۔

"کیا بات ہے، تم کچھ کہنے لگے تھے؟"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں کنپٹی کھجائی اور گمبھیر لہجے میں بولا۔ "باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن ایک بُری خبر ہے۔"

میں ٹھٹک گیا۔ "سلطانہ تو ٹھیک ہے؟" میرے منہ سے بےساختہ نکلا۔

"سلطانہ تو ٹھیک ہے... لیکن شکیلہ..."

"کیا ہوا شکیلہ کو؟"

"وہ... نہیں... رہی۔"

"نہیں رہی... کیا مطلب؟"

عمران کے لہجے میں عجیب سی آتش بھڑک گئی۔ "انہوں نے... مار دیا اسے۔ آج صبح سویرے تمہارے یہاں واپس آنے کے کچھ ہی دیر بعد۔"

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج گئیں... نگاہوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جو آج سحری کے وقت میں نے دیکھا تھا۔ کمروں کے پچھواڑے کچے احاطے میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس کچھ سائے حرکت کر رہے تھے۔

"اوہ خدایا۔" میں نے اپنا سر تھام لیا۔ "کیا تمہیں یقین ہے عمران کہ ایسا ہو گیا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، آج صبح سویرے اس کے سر پر چوٹ لگا کر اسے مار دیا گیا... پھر اس کی اپنی کھودی ہوئی قبر میں ہی دفن کر دیا گیا۔"

"اپنی کھودی ہوئی قبر؟"

"یہ درندگی کی ایک اور یادگار مثال ہے۔ وہ بےچاری پچھلے چار پانچ روز سے خود ہی تھوڑی تھوڑی کر کے اپنی قبر کھود رہی تھی۔ یہ بھی یہاں کی انوکھی رسموں میں سے ایک رسم ہے۔ دھرم دشمنی کے جرم میں قتل کیا جانے والا کوئی شخص اگر اپنی قبر خود کھودتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے خون کا بوجھ، خون کرنے والوں پر کم سے کم ہو جائے گا۔ گرو سو بھاش صاحب فرما رہے تھے کہ کوئی ایک ہزار سال پہلے یہ استھان ایک رانی کا

http://digestpk.blogspot.com/

گولیاں استعمال ہوتی تھیں۔ گاہے بگاہے سنکھ بجنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں یا پھر پوجا کی گھنٹیاں درو دیوار میں گونجنے لگتی تھیں۔ مذہب کے نام پر ان لوگوں نے اپنا ہی ناٹک رچا رکھا تھا۔ سفاکی اور ختم انتہا پسندی اس ناٹک کے اہم ترین عناصر تھے۔ عمران نے جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس سے پتا چلا تھا کہ یہ استھان گھنے جنگل میں واقع ہے... اس کے اوپر ایک بہت بڑی پھلواری ہے۔ اس پھلواری کو بالکل صاف پانی سے سینچا جاتا ہے اور اس کے پھول اسی پانی کے سہارے مندروں اور استھانوں وغیرہ کو بھیجے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس پھلواری کے نیچے پرانے استھان میں انتہا پسندوں کا اڈا قائم ہے اور پھلواری میں کام کرنے والے بیسیوں مزدور درحقیقت خطرناک دہشت گرد ہیں۔

مجھے یہاں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لایا گیا تھا تاہم خوشبو کی وہ تیز لہریں میں نے ضرور محسوس کی تھیں جو یقیناً پھلواری کے اندر سے اٹھ رہی تھیں۔ یعنی اوپر خوشبو تھی اور نیچے بدبو و بدصورتی۔

رات کے دس بجے تک آوازیں دھیرے دھیرے معدوم ہو گئیں اور استھان خاموشی اور تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اب بس کہیں کہیں لالٹینوں یا مٹی کے تیل والے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ لکڑی کے قدیم دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ستیش تھا۔ اس کے ماتھے کا سفید قشقہ اور آنکھوں کا سرخی مائل رنگ لالٹین کی روشنی میں نمایاں تھا۔ "کہو گوپال! خیریت سے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں... کوئی تکلیف نا ہیں... لیکن انتظار کچھ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔"

"میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ پرنتو کٹھن سے گزر گیا ہے۔ گرو جی کا کہنا ہے کہ ستاروں کی چال اچھی ہے۔ کل دوپہر تک سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ وہ شام کو شبھ گھڑی نکالیں گے اور رات آٹھ نو بجے تک تمہارا کام مکمل ہو جاوے گا۔"

"یہ آپ نے اچھی جانکاری دی ہے۔" میں نے مؤدب انداز میں کہا۔

"ماتا جی نے تمہیں پیار بھیجا ہے... اور اب تک جو تکلیف تمہیں اٹھانا پڑی ہے، اس کے لیے پتا جی نے شکریہ ادا کیا ہے۔"

"ستیش جی! آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔ آپ کے پریوار کی وجہ سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں ایک ادھرم ناری کو اپنے ہاتھ سے انجام تک پہنچاؤں۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کا کام ہے۔"

"مجھے وشواس ہے، ایشور تمہیں اس کا بدلہ دے گا..."

جس وقت میں برہمن زادے ستیش سے باتیں کر رہا تھا، میں نے اقبال کو دیکھا۔ وہ میری طرف آ رہا تھا۔ مجھے اور ستیش کو ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ یقیناً وہ ستیش کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ ستیش کے جانے کے بعد چار، پانچ منٹ کے اندر دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ اقبال ہی ہے۔ میرا خیال درست نکلا۔ اقبال نے ایک گرم چادر لپیٹ رکھی تھی، اس کی آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ ہاں، کل کے مقابلے میں افاقہ نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں تو پہلے ہی تیار تھا۔ ستیش کی فراہم کردہ کپڑے کی جیکٹ پہن چکا تھا۔ یہاں میں نے کسی کے پاس چمڑے کی جیکٹ یا جوتی نہیں دیکھی تھی۔ غالباً اپنے کٹر پن کی وجہ سے وہ چمڑے کا استعمال پاپ سمجھتے تھے۔

عمران نے کل رات مجھے جو پسٹل دیا تھا، وہ بھی میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اقبال اور میں آگے پیچھے چلتے ہوئے گرو کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے اپنے درمیان پندرہ بیس قدم کا فاصلہ رکھا تھا۔ یہ قدیم استھان حسبِ سابق شب کے سناٹے میں اونگھ رہا تھا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے، کچھ سونے کی تیاری میں تھے۔ آبشار گرنے کی آواز سنائی دینے لگی اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، یہ آواز نمایاں ہوتی گئی۔ پانی کے قدرتی تالاب کے اندر اوندھا پڑا مجسمہ دکھائی دیا اور پھر گرو کی رہائش گاہ کے دروازے کی جھلک نظر آئی۔ اس اوندھے پڑے مجسمے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک علامت ہے، فرسودہ عقیدوں اور کہنہ رسموں کے زوال کی۔ یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ شاید سوچنے والوں کو دعوتِ فکر دے رہا تھا۔ انہیں وقت کے جدید تقاضوں کی طرف بلا رہا تھا۔

ہم گرو کے گھر میں داخل ہوئے۔ زنانے میں اس کی جوان بچی ایک تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ کل ہی کی طرح ہلدی تھا۔ اس کے قریب عمران فرشتۂ اجل کی صورت موجود تھا۔ "ہرا طوطا" اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرو بھی ایک طرف گم صم بیٹھا تھا۔ جو تیسری چیز نظر آئی، وہ بھاگ متی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھی ہولے ہولے پان چبا رہی تھی۔ اس کا ایک رخسار ابھی تک گہرا نیلا تھا۔ فضا کا تناؤ بتا رہا تھا کہ نازک ترین گھڑیاں آن پہنچی ہیں۔

http://digestpk.blogspot.com/

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کو دیکھا۔ اقبال

درجے کی پجارن تھیں۔ انہوں نے جیون بھر کنوارہ رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا... لیکن پھر ایک رات وہی کچھ ہوا... جو آج کل کی فلموں میں ہوتا ہے۔ ایک طوفانی رات میں ایک مسافر اس استھان میں آ کر ٹھہرا۔ انسانی تقاضوں کے ریلے کے سامنے صبر و تحمل کی ساری ریشمی دیواریں بہہ گئی تھیں۔ یہ بات چھپی نہ رہ سکی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رانی صاحبہ نے خود کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا... اور یہ سزا موت تھی۔ کوئی انہیں موت کی سزا دینے کو تیار نہیں تھا۔ رانی صاحبہ کا رتبہ اور مرتبہ ہر کسی کو ڈرا رہا تھا۔ تب رانی صاحبہ نے خود اپنے لیے ایک گڑھا کھدوا اور اپنے ایک وفادار سیوک کے ذریعے خود کو اس میں زندہ دفن کر لیا۔ تاہم کچھ روایتوں میں کہا جاتا ہے کہ رانی گلاب کماری کا یہ بلیدان ان کی موت کے بغیر ہی قبول ہو گیا اور اگلے روز جب لوگوں نے مٹی ہٹائی تو رانی صاحبہ کا شریر وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ زندہ حالت میں بنارس پہنچ چکی تھیں۔"

عمران کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ جلالی روپ پیش کر رہا تھا۔ اس کا یہی روپ تھا جو اس کی خوش مزاجی اور کھلنڈرے پن سے بالکل علیحدہ تھا... اور جو دیکھنے والے کو مسمرائز کر ڈالتا تھا۔

اس نے مجھ سے زیادہ بات چیت نہیں کی اور آج رات کے لیے تیار رہنے کی ہدایت دی۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب مزید انتظار بالکل کرنا نہیں چاہتا۔ شاید میری طرح اس کے دل میں بھی یہ اندیشہ آن موجود ہوا تھا کہ شکیلہ کی طرح کہیں سلطانہ کے معاملے میں بھی تاخیر نہ ہو جائے۔ یہ بے حد خطرناک لوگ تھے۔ جنون کی حد تک کٹر اور انتہا پسند۔ وہ کسی لمحے کچھ بھی کر سکتے تھے۔

عمران نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "تم سب کچھ روزانہ کے مطابق ہی کرنا۔ رات کو کھانا کھا کر لیٹ جانا اور لالٹین بجھا دینا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اقبال کو بھیجوں، وہ آ کر تمہیں لے جائے گا۔"

اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا پسٹل نکالا۔ اسے رومال میں لپیٹا گیا تھا۔

"یہ رکھ لو... لوڈڈ ہے۔ کل تمہیں اس کے مزید راؤنڈز دوں گا۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہ بڑی فائیو اسٹار چیز ہے۔"

میں نے پسٹل لے کر بستر کے نیچے چھپا دیا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں عمران سے ثروت... عاطف اور فرح کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا

چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔

عمران کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ شکیلہ نام کی اس لاچار لڑکی سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔ وہ مرنے کے لیے بالکل تیار تھی اور وہ مر گئی تھی۔ ایک سفاک انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ عجیب سے پچھتاوے نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب چند گھنٹے پہلے میں نے تاریکی میں پچھواڑے کے احاطے میں متحرک سائے دیکھے تھے۔ یقیناً یہ وہی وقت تھا جب شکیلہ کو قتل کیا جا رہا تھا۔ ایک ہانپتی اور تھکی ہوئی زرد رو لڑکی تصور میں آئی۔ وہ بے خبری میں اپنی قبر خود کھود رہی تھی اور مشقت سے کراہ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے کس طرح مارا گیا تھا؟ وہ جلدی مر گئی تھی یا تکلیف سے؟ آہ... انسان کسی وقت جانوروں اور درندوں سے کتنی سبقت لے جاتا ہے۔

قل پانی کی شکیلہ لاچاری کی ایک ایسی ناقابلِ فراموش تصویر بن کر میرے ذہن سے چپک گئی جسے اب مدت تک خیالوں سے محو نہیں ہونا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس پہرے دار کو کوسنے لگا جو سحری کے وقت وہاں آ گیا تھا اور جس کی وجہ سے میں جھٹ کمرے میں جانے پر مجبور ہوا تھا۔ اگر میں کچھ دیر وہاں اور ٹھہرا رہتا تو شاید یہ بات میری سمجھ میں آ جاتی کہ شکیلہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور اگر ایسا ہو جاتا تو شاید میں اسے بچانے کے لیے کچھ کر سکتا۔ یہ "شاید" کا لفظ بھی بہت عجیب ہے۔ کوئی غیب داں کوئی پیشین گو یا بڑے سے بڑا عالم بھی اس لفظ کا متبادل نہیں کر سکتا۔ بارو عدا بجگی نے ایک دن اس لفظ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ میرے دماغ میں گھومنے لگا۔

... جوں جوں رات قریب آ رہی تھی، میرے جسم میں سنسنی کی لہریں ابھرتی اور پھیلتی جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ دھیرے دھیرے ایک ہنگامے کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اس قسم کی تناؤ والی صورتِ حال مجھے تین چار سال پہلے توڑ پھوڑ دیا کرتی تھی۔ میں اتنا اعصاب زدہ ہو جایا کرتا تھا کہ اپنے آپ پر ترس آنے لگتا تھا... لیکن اب موسم بدل چکے تھے۔ میں وہ نہیں رہا تھا جو کبھی تھا اور اب تو میں اور بھی طاقتور ہو چکا تھا کیونکہ عمران میرے آس پاس موجود تھا۔

قدیم استھان کے اس زیرِ زمین حصے میں روزمرہ کے معمولات جاری تھے۔ کہیں پاس ہی کسی جگہ پر پٹاخے سے چھوٹ رہے تھے۔ یہ دراصل رائفل شوٹنگ کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے مصنوعی ٹارگٹ اور ربر کی

بولا۔ ”ہال کمرے میں تو خاموشی ہے۔ شاید ایک آدھ بندہ ہی جاگ رہا ہو۔ درمیانی ہال کی طرف سے کچھ آوازیں آرہی تھیں مگر زیادہ روشنی وہاں بھی نہیں تھی۔“

عمران بولا۔ ”مجھے زیادہ خطرہ بس اس کیدو کی طرف سے ہے۔ وہ خانہ خراب پانی کی طرح پیتا ہے۔ ایک دو پیالوں سے تو اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی طرف سے تسلی کرنا ہوگی۔ آج اس کی ڈیوٹی کس طرف ہے؟“

”میرے حساب سے تو وہ سیڑھیوں والے دروازے پر ہوگا۔ اروں، جگیل اور گاڑی بان بھولا ناتھ وغیرہ بھی وہیں پر ہیں۔“

عمران اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک چکر ادھر کا لگا آؤں۔ خاص طور سے اس کیدو کو دیکھ لوں۔“ کیدو سے اس کی مراد ارجن تھی۔

”پانچ دس منٹ اور ٹھہر جاؤ۔“ اقبال نے رائے دی۔

ان باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ گرو سوبھاش نے اپنا کام کر دیا ہے۔ بھنگ اور دھتورا ملی ہوئی تاڑی پہرے داروں کو پلائی جا چکی ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران اور اقبال پوری طرح تیار ہیں۔ عمران کے قریب ہی ایک سیون ایم ایم رائفل رکھی تھی۔ عمران کی جیکٹ کی جیبیں پھولی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان میں بھی رائفل کے فالتو راؤنڈز اور میگزین موجود تھے۔ اقبال کی جیکٹ بھی اسی طرح بھاری بھرکم نظر آرہی تھی۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ انہوں نے اپنے اپنے ہتھیار چیک کیے اور مجھے مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہمیں کیا اور کس طرح کرنا ہے۔

گرو کی پُرزور درخواست اور گارنٹی پر پہلوان نما ملازمہ کو کل رات ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ بھاگ متی نے ہی آج کسی طرح سلطانہ سے ملاقات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ تیار رہے، آج رات اسے اور اس کے بھتیجے کو یہاں سے نکال لیا جائے گا۔

جو کارروائی یہاں ہونے والی تھی، اس کے بارے میں ضروری ہدایات بھی بھاگ متی نے ہی سلطانہ تک پہنچائی تھیں۔ سلطانہ بڑے گرو کی ذاتی حویلی میں تھی اور اسے ایک ایسی کال کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا جس میں لوہے کا بس ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔

اس سے پہلے کہ عمران کمرے سے باہر نکلتا، کچھ فاصلے سے چلانے کی آوازیں آئیں۔ کوئی شخص آہ و بکا کرتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں فوراً چھپا دیں۔ اقبال نے مردانے میں جا کر باہر جھانکا اور پھر پریشان آواز میں بولا۔ ”یہ تو وہی لنگڑا ارجن ہے۔“

”او ہو گاڈ۔“ عمران نے بے ساختہ کہا۔

چند سیکنڈ بعد دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ارجن کی پھٹی پھٹی آواز سنائی دی۔ ”گرو جی... دروازہ کھولیں... گرو جی۔“

گرو کے چہرے پر کچھ مزید ہوائیاں اڑنے لگیں۔ عمران نے گرو کو اشارہ کیا کہ وہ خود دروازہ کھولے۔

گرو نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ارجن لڑکھڑاتا اور ڈگمگاتا ہوا اندر آگیا۔ گرو نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سنبھالا۔ وہ بدمست آواز میں بولا۔ ”گرو جی! غضب ہو گیا ہے۔ کسی نے تاڑی میں کچھ ملا دیا ہے۔ سب بے ہوش ہو گئے ہیں۔ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے... کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔“ ارجن خود بھی جھوم رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی بھی وقت زمین بوس ہو جائے گا۔

عمران کے اشارے پر گرو اسے جلدی سے زنان خانے میں لے آیا۔ ارجن پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھدی آواز میں بولا۔ ”جلدی سے کچھ کریں گرو جی! مجھے تو لگتا ہے کہ شاید حکم جی کے لوگ یہاں گھس آئے ہیں۔“

گرو نے تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپکا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ارجن ایک ایسے شخص کے پاس فریاد لے کر پہنچا تھا جو خود ساری صورتِ حال کا ذمے دار تھا۔ عمران کے اشارے پر گرو سوبھاش، ارجن کو اس چھوٹے کمرے میں لے گیا جہاں دو دن پہلے تک فریب اندام داسی بھاگ متی بند تھی۔ عمران نے ارجن کو زور سے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر دہشت زدہ نظر آنے لگا۔ اس کے حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بس ایک آدھ منٹ میں وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح ان ٹنفیل ہو جائے گا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا کر عمران نے چادر کی بکل ماری اور رائفل اٹھالی۔ یہ چھوٹے بیرل والی اسمارٹ سی رائفل تھی۔ باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ عمران مسلح ہے۔ کچھ یہی حال اقبال کا بھی تھا۔ عمران نے مجھے ایک مفلر نما گرم کپڑا دیا اور کہا کہ میں اس سے اپنا چہرہ ڈھانپ لوں۔

”اس سے کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم بعد میں اپنی بیوی سے منہ دکھائی وصول کر سکو گے۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی مرضی تھی کہ سلطانہ مجھے گرو اور رادھا وغیرہ کے سامنے نہ پہچانے۔

”چلو گرو جی۔“ عمران نے تحکم سے کہا۔ ”اور تم بھی شریمتی جی۔“ عمران نے رادھا کی طرف اشارہ کیا۔

رادھا کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بوٹے سے قد کی متناسب جسم والی لڑکی تھی لیکن کمر میں بندھی ہوئی بیلٹ کی وجہ سے اس کا پیٹ بھاری نظر آرہا تھا۔ بادی النظر میں وہ حاملہ لگتی تھی۔ گرو پہلے سے کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عمران سے سوال کیا۔ ”سلطانہ تمہارے حوالے ہو جاوے گی تو پھر تم رادھا کی کمر سے پیٹی اتار لو گے اور ہمیں واپس آنے دو گے؟“

”میرے خیال میں یہ بات میں تم سے دس پندرہ دفعہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں... اور شاید اتنی ہی دفعہ راج (اقبال) نے بھی کہی ہے۔ اب صرف اسٹامپ پیپر پر انگوٹھا لگانے کی کسر رہ گئی ہے۔“

گرو سوبھاش ایک دم بجھا نظر آنے لگا۔ ہم آگے پیچھے گرو کی رہائش گاہ سے نکلے۔ گرو کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گڑوی تھی اور لکڑی کے موٹے دانوں کی مالا بھی۔ ایسی ہی مالا رادھا کے ہاتھ میں بھی تھی۔ اس کے صراحی دار گلے میں رات کی رانی کے پھولوں کا ہار بھی تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ وہ دونوں کسی خاص پوجا کے لیے بڑے ہال کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔ آبشار کے پاس سے گزر کر ہم استھان کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر ہم بڑے گرو کی قیام گاہ کی طرف آگئے۔

یہاں دیواروں پر مذہبی انتہا پسندی سے متعلق نعرے درج تھے اور دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ایک پتھریلی دیوار کے قریب کم از کم پانچ افراد بے سدھ پڑے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی ان کے پاس ہی تھیں۔ چار افراد ایک جگہ تھے، پانچواں کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ گرا ہے جس کی وجہ سے اسے چوٹ لگی ہے لیکن بعد ازاں یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ منہ سے خون رسنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

گرو سوبھاش نے اس وزنی پہرے دار کی جیبیں ٹٹولیں اور چٹکل کی دو لمبی چابیاں نکال لیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ نظر آرہا تھا۔ یہ موٹی دیواروں والی وہی کال کوٹھڑی تھی جہاں سلطانہ کو رکھا گیا تھا۔ گرو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کے بھضی قفل میں چابی گھمائی۔ وزنی دروازہ مدھم آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اندر لالٹین کی زرد روشنی میں مجھے سلطانہ اور پندرہ سولہ سالہ طلال نظر آئے۔ وہ دونوں دروازہ کھلنے کے انتظار میں ہی تھے۔ دونوں خستہ حال اور مدقوق دکھائی دیتے تھے۔ سلطانہ کی طرح طلال کے چہرے پر بھی چوٹوں کے تنے پرانے نشان تھے۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ سلطانہ کو کسی جانور کی طرح ایک زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ یہ زنگ آلود زنجیر اس کے دونوں پاؤں کو جکڑے ہوئے تھی۔ طلال زنجیر کے بغیر تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سلطانہ ان لوگوں کے نزدیک زیادہ خطرناک قیدی ہے یا پھر ہو سکتا تھا کہ اس نے قید کی حالت میں بھی مزاحمت جاری رکھی ہو۔ دوسری چابی سے گرو نے سلطانہ کی زنجیر کا قفل کھولا اور اس کے زخمی پاؤں آزاد کیے۔ سلطانہ نے مجھے دیکھا لیکن دیکھ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ اس نے اپنے گرد ایک پھول دار گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ طلال ایک بوسیدہ سے کوٹ میں تھا۔

ہم ان دونوں کو لے کر واپس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب ساتھ والے حجرہ نما کمرے کا دروازہ کھلا اور بالکل سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والا ایک نہایت بوڑھا شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ لاٹھی کے سہارے بہ مشکل کھڑا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے باہر کا سارا منظر دیکھا۔ اس کا رعشہ زدہ سر کانپتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے پوپلے منہ کے ساتھ گرو سوبھاش سے کچھ کہا۔

گرو سوبھاش نے آگے جا کر اپنا منہ بوڑھے گرو کے کان کے ساتھ لگایا اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”مہاراج... اپنے بستر پر واپس جاؤ، سب ٹھیک ہے۔“

جواب میں بوڑھے گرو نے کچھ کہنا چاہا لیکن گرو سوبھاش نے اسے تقریباً دھکیل کر واپس کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

گرو سوبھاش کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑا گرو اب بس نام کا ہی گرو رہ گیا ہے، ورنہ اب یہاں اس کی کوئی سنی نہیں ہے۔

ہم سلطانہ اور طلال کو لے کر واپس چل دیے مگر یہی وقت تھا جب ہم پر سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ارجن کسی طرح اس کمرے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب رہا ہے جہاں ہم اسے بند کر آئے تھے۔ وہ آفت کا پرکالا گرو کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آبشار کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سینے کی پوری قوت سے چلا رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔ ہم سے [illegible] افراد بھاگتے ہوئے اس کی طرف آئے اور اسے سنبھالا۔ ان

http://digestpk.blogspot.com/

میں سے ایک طلال کی عمر کا ایک بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ وہ بھی اس استھان میں رضاکارانہ خدمت انجام دیتا تھا۔ میں نے اسے مختلف کمروں میں پھول سجاتے اور کھانا لاتے دیکھا تھا۔ دوسرا ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ ارجن نے ان دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا اور چنگھاڑ کر بولا۔ ”گرو جی ان لوگوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ انہوں نے پہرے والوں کو زہریلی تاڑی پلا دی ہے... کچھ کرو، جلدی کچھ کرو...“

میں نے دیکھا کہ عمران کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ ”کتے کا بچہ۔“ وہ پھنکارا۔ اس کی یہ گالی یقیناً ارجن کے لیے تھی۔ اس نے اپنی چادر اتار پھینکی۔ چھوٹی نال والی رائفل سیدھی کی۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ تقریباً 40 میٹر کی دوری پر گولی ارجن کے پیٹ میں کہیں لگی مگر اس گولی نے اتنا ہی نقصان کیا جتنا سر پر لگنے والی گولی کرتی۔ ارجن پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، گولی کھا کر سیدھا تالاب کی گہرائی میں گیا۔ میں نے دیکھا، اس کا سر پانی میں اوندھے پڑے پتھر پہ بنے مجسمے کے دیوہیکل کندھے سے ٹکرایا اور یقیناً کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

عمران کا دوسرا نشانہ ارجن کے قریب کھڑا دراز قد پہرے دار تھا۔ یہ گولی سر میں لگی اور بھیجا پھاڑ کر نکل گئی۔ نوعمر رضاکار لڑکا اندھا دھند بڑے ہال کی طرف بھاگا۔ عمران نے اس کی طرف رائفل سیدھی کی۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا کہ عمران اسے نشانہ نہ بنائے مگر میری سوچ کے مکمل ہونے تک وہ نشانہ بن چکا تھا۔ اسے پشت پر دو گولیاں لگیں اور وہ بھاگتے بھاگتے دو تین قلابازیاں کھا گیا۔

یہ سب کچھ بس دو یا تین سیکنڈ کے اندر ہوا۔ استھان میں ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ لوگ ہڑبڑا کر اٹھے اور دھماکوں کے ماخذ کی طرف بڑھے۔ کچھ رائفلیں بھی لہراتی ہوئی نظر آئیں۔ ہم سلطانہ، طلال اور گرو وغیرہ سمیت الٹے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ سیڑھیاں ہمیں بالائی منزل کی اس راہداری کی طرف لے جاسکتی تھیں جو نکاسی کے راستے کی طرف جاتی تھی۔

یکایک ایک کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ... وہیں رک جاؤ۔ میں گولی چلا دوں گا۔“

میں نے دیکھا، ایک دیوار کی اوٹ میں نیم سرخ آنکھوں والا ستیش موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید رائفل تھی۔

ستیش کی اس للکار نے ارد گرد موجود ہر شخص کو چوکس کر دیا۔ کئی رائفلیں نظر آئیں اور رائفل بردار ہماری سمت بڑھے۔ اب فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عمران کی طرح اقبال نے بھی چادر اتار پھینکی اور رائفل سیدھی کر لی۔ میں پہلے ہی کولٹ پسٹل جیب سے برآمد کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر میں نے پسٹل کی نال گرو سوبھاش کی کنپٹی سے لگا دی۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں مخالفین پر تان رکھی تھیں اور اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لی تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ دونوں طرف سے کوئی ایک گولی بھی چل جاتی تو پھر خون ریزی کو روکنا ممکن نہیں تھا۔

عمران نے ستیش کا نشانہ لے رکھا تھا اور ستیش نے شاید عمران کا۔ عمران کی جانی پہچانی گرج میرے کانوں تک پہنچی۔ ”ستیش! ہمیں روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے گرو کی لاش گرے گی... پھر اس کی پتنی چندرہ بیس ٹکڑوں میں تبدیل ہوگی۔ ہم نے اس کی کمر سے ٹی این ٹی باندھ رکھا ہے۔ بس... یہ ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہے۔“ عمران نے گرین رنگ کا ریموٹ کنٹرول ہوا میں لہرایا۔

عمران کی طراری اب سمجھ میں آرہی تھی۔ اس کی سوچ ہمیشہ سے بڑی تیز رفتار رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس نے ارجن سمیت تین افراد کو گولیوں سے اڑایا تھا تو اس عمل میں تھوڑی سی سفاکی نظر آئی تھی، خاص طور سے نوعمر لڑکے کے قتل میں... لیکن اس کا یہ اقدام بلاوجہ نہیں تھا۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی بچتا تو گرو سوبھاش کی وہ حیثیت نہ رہتی جو اب تھی۔ اب وہ استھان کا غدار نہیں تھا۔ زہریلی تاڑی سے اس کا تعلق صیغۂ راز میں تھا۔ اب اس کی جان کی پروا کی جاسکتی تھی... اور ستیش اور اس کے رائفل برداروں کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ پروا کرنے پر مجبور ہورہے ہیں۔

عمران نے اشارہ کیا۔ ہم سب الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ جوں جوں ہم پیچھے ہٹتے گئے، ستیش اور اس کے ساتھی آگے بڑھتے گئے۔ ان میں گاڑی بان بھولا ناتھ بھی تھا۔ اس کی اونچی ناک کے دونوں طرف اس کی عقابی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے ہٹنے والے ہر قدم کے بدلے ستیش اور اس کے ساتھی ایک قدم آگے بڑھا رہے تھے لیکن گولی چلانے کی ہمت ابھی تک کسی کو نہیں ہوئی تھی۔

ہم سیڑھیوں پر پہنچے تو ستیش نے ایک بار پھر خونی لہجے میں دھمکی دی۔ ”ہم تم لوگوں کو اس طرح یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔ ہمیں گولی چلانا پڑے گی۔“

گرو سوبھاش گڑگڑایا۔ ”ستیش! انہوں نے رادھا کی کمر سے بارودی پیٹی باندھ رکھی ہے۔ یہ بٹن دبا دیں گے۔“

گرو کی آواز میں دل دوز فریاد چھپی تھی۔ وہ ستیش سے اپنی اور اپنی پتنی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ دوسری طرف ستیش اور بھیل وغیرہ کو شرمناک شکست نظر آرہی تھی۔ وہ اپنی جس مجرمہ کو جان ہتھیلی پر رکھ کر گرو جی کے ہرکاروں سے چھین کر لائے تھے، وہ ان کے ہاتھوں سے بھی چھن رہی تھی۔ اپنی فرار دراصل سزا کے قریب پہنچ کر وہ صاف بچ رہی تھی۔

ستیش نے پھر کہا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اتنا بڑا پاپ نہ کرو۔ یہ تم کو ہضم نہیں ہوے گا اور نہ ہم ہونے دیں گے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، چلاؤ گولی اور دیکھ لو تماشا۔“ اقبال نے بے پناہ اعتماد سے کہا۔ عمران اور اقبال کا یہی اعتماد تھا جو حریفوں کو لرزہ براندام کر رہا تھا۔

ہم قدم قدم پیچھے ہٹتے گئے... ستیش اور اس کے ساتھی قدم قدم آگے بڑھتے گئے۔ اب ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے تھے اور اس طویل راہداری میں تھے جس کی دونوں جانب ہوا کی آمدورفت کے لیے روزن سے بنے ہوئے تھے۔ سب سے آگے عمران اور اقبال تھے۔ دونوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ان کے عقب میں گرو، رادھا اور میں تھے۔ میں نے پسٹل کی نال گرو کے کنپٹی سے لگائی ہوئی تھی۔ آخر میں سلطانہ اور طلال تھے۔ درحقیقت اس استھان کے اصل رکھوالے تو وہی بیس بائیس پہرے دار ہی تھے جو تاڑی کی وجہ سے مدہوش پڑے تھے۔ یہ جو دوسرے لوگ تھے، ان میں ستیش اور اس کے ایک دو ساتھیوں کے علاوہ کسی میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ پورے جی جان سے ہمارے مقابل آسکتا۔

یکایک ستیش کے چہرے پر شدید اضطراب کے آثار نظر آئے، شاید اس نے کچھ بھانپ لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کر پاتا، عمران اور اقبال پہلے کی طے شدہ پروگرام کے مطابق تیزی سے دائیں بائیں ہٹے اور انہوں نے راہداری کا ایک آہنی دروازہ بڑی پھرتی سے بند کر دیا۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز سے تین چار گولیاں چلیں لیکن انہوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ایک گولی اقبال کے سر کے اوپر سے گزر گئی، دو دروازے کے آہنی تختوں سے ٹکرائیں۔ عمران اور اقبال نے تیزی سے دروازے کا آہنی کھٹکا چڑھا دیا۔

”بھاگو۔“ عمران نے پکار کر کہا۔

ہم سب پلٹ کر دوڑے۔ دوسری طرف دروازے کو اندھا دھند دھکے دیے جارہے تھے لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی ٹینک کو پستول کی گولی سے توڑنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ بہت وزنی دروازہ تھا۔ گرو سوبھاش کو ہمارے ساتھ بھاگنا پڑ رہا تھا لیکن یہ کام اس کے لیے جتنا مشکل تھا، اتنا ہی مضحکہ خیز بھی تھا۔ اس کی توند بری طرح ہل رہی تھی اور لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اپنی توند کے بوجھ کی وجہ سے اوندھے منہ گر جائے گا۔ ہم نے ڈیڑھ دو سو میٹر کا فاصلہ تیزی سے طے کیا اور جھاڑ جھنکاڑ سے بند راستے کو کھول کر کھلی جگہ پر آگئے۔ یہاں دو گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں۔ گاڑی بان اندر ہی کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔

عمران نے ایک گاڑی میں گھس کر گاڑی بان کو رائفل کے ٹہوکے سے جگایا۔ وہ سکھ تھا۔ وہ ششدر نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گرو سوبھاش کو پہچان لیا۔ عمران نے کہا۔ ”سردار! گرو جی کے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ ان کو محفوظ جگہ پر پہنچانا ہے۔ گاڑی بھگاؤ اور جتنی رفتار سے چل سکتے ہو چل پڑو۔“

سکھ گاڑی بان نے کہا۔ ”گرو جی کے لیے تو جان بھی حاضر ہے جی... پر وہ ہے کون جو گرو جی کا دشمن ہو رہا ہے...؟“

”اس کا تو ابھی ٹھیک سے ہم کو بھی پتا نہیں۔“ اقبال نے کہا۔

اس دوران میں عمران نے دوسری گھوڑا گاڑی کے دونوں گھوڑے کھول دیے اور انہیں چھڑیاں مار کر بھگا دیا۔ اب کوئی اس دوسری گاڑی پر ہمارا پیچھا نہیں کرسکتا تھا۔ ہم سب سلطانہ اور طلال سمیت گاڑی پر سوار ہو گئے۔ گرو ابھی تک تذبذب میں کھڑا تھا۔ عمران نے تحکم سے کہا تو وہ اور اس کی پتنی بھی سوار ہو گئے۔ عمران کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ابھی میاں بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ گرو اور رادھا کے سوار ہوتے ہی گاڑی تیزی سے روانہ ہوگئی۔ ہم کچھ دیر تک ایک ڈھلوان راستے پر اترتے رہے۔ خوشبو کی زبردست لپٹیں ہمارے نتھنوں تک پہنچیں۔ میں نے نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ہم واقعی ایک بہت بڑی پھلواری سے گزر رہے تھے۔ تاروں کی روشنی میں دور تک پھول دار پودوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ دن کے وقت یہ منظر واقعی قابلِ دید ہوگا۔ ہم استھان سے دور آگئے تھے مگر ابھی تک خطرے سے دور نہیں تھے۔ عمران اور اقبال پوری طرح چوکس تھے۔ ان کی نگاہیں عقب میں دور تک دیکھ رہی تھیں۔ میری نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا جب تاڑی [illegible]

http://digestpk.blogspot.com

کرتا تالاب نما پانی میں گرا تھا اور اس کا سر چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ شکیلہ کا کم از کم ایک قاتل تو میری نگاہوں کے سامنے اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

☆☆☆

جب دن کا اجالا پھیلا، ہم اس قدیم استھان کی مہلک تاریکی سے قریباً تیس میل دور آ چکے تھے۔ یہ گنجان جنگلی علاقہ تھا۔ کہیں کہیں راستہ مسدود ہو جاتا اور ہمیں چکر کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا۔ راستے میں دو تین جگہ گھوڑوں کو آرام بھی دینا پڑا۔ اب ہم جنتر کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ایک نشیبی علاقے میں تھے اور خود کو کافی محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ گھوڑے بری طرح تھک گئے تھے۔ ہمارے انجر پنجر بھی ہل گئے تھے۔ عمران نے گاڑی ایک ایسی ہموار جگہ پر روکی جہاں درخت جھنڈ کی صورت میں موجود تھے اور پانی بھی تھا۔

گھوڑے پانی پر لپک پڑے۔ ہم بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے نیچے اتر آئے۔ عمران کے چہرے سے خشونت رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک بار پھر شگفتگی کا ڈیرا تھا۔ ہم نے راستے میں بہت کم بات کی تھی اور میں تو تقریباً خاموش ہی رہا تھا۔ وہ مفلر نما گرم کپڑا ابھی میں نے چہرے سے لپیٹ رکھا تھا جو عمران نے استھان میں مجھے دیا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ نیم تاریکی میں ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی تو پھر بھی قدرے گرم تھی، باہر سردی کی یلغار تھی۔ دوسروں کے برعکس میں صرف ایک ہلکی پھلکی قمیص میں تھا۔ سردی گرمی کو برداشت کرنا مجھے اچھا لگتا تھا اور اب میرا جسم اس کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ میری جیکٹ گاڑی میں موجود تھی لیکن میں اسے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

عمران نے گرو کو گاڑی سے باہر بلایا اور کہا۔ ''جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس شکیلہ نام کی لڑکی کی موت کے بدلے تم دونوں کو یہاں کسی کیچڑ والے گڑھے میں زندہ دفن کر دیا جائے تاکہ تم قیامت تک سردی سے ٹھٹھرتے رہو۔ اس بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟''

گرو نے پرنام کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں امیت... میں استھان کا کارمختار نہیں ہوں۔ مجھ سے صرف رائے لی جاتی ہے جو میں پوتھیوں (کتابوں) کے مطابق دے دیتا ہوں۔ میں کسی کو بچا سکتا ہوں نہ مار سکتا ہوں۔''

''تو پھر تمہاری کیا مرضی ہے؟ کیا تم استھان واپس جانا چاہتے ہو؟'' اقبال نے پوچھا۔

گرو کا جواب غیر متوقع تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اب میرے لیے وہاں بھی بہت خطرہ ہو گا۔ مجھے اب وشواس نہیں کہ تاڑی میں دھتورا ملانے والی بات زیادہ دیر چھپی رہ سکے گی۔ لوگ یہی کہیں گے کہ میں نے اپنی اور بچی کی جان بچانے کے لیے اپنے ہی ساتھیوں کی جان لی ہے۔''

''تم نے کس کی جان لی ہے؟ تمہارا دوش تو صرف اتنا ہے کہ تم نے پہرے داروں کو دھتورے والی تاڑی پلائی ہے۔''

''میرے وچار میں بات اس سے بڑھ کر ہے۔ تاڑی نے پہرے داروں کو صرف بے ہوش نہیں کیا۔''

''کیا مطلب؟''

''ان میں سے کئی مر گئے ہیں۔'' گرو نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ''میں نے جب پہرے دار کی جیب سے چابیاں نکالی تھیں، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا... اس کی سانس بند ہو چکی تھی۔ ایک دوسرے پہرے دار کو بھی میں نے اسی حالت میں دیکھا ہے۔''

ہم سناٹے میں رہ گئے۔ پتھریلی دیوار کے پاس پہرے دار جس طرح گرے پڑے تھے، وہ منظر واقعی تشویشناک تھا... مگر ان میں سے کچھ یکسر ختم ہو چکے تھے، یہ بات اب گرو سے پتا چل رہی تھی... گرو کراہتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ جو تین لوگ تمہاری گولیوں سے مرے ہیں، ان کی موت کا کارن بھی تو میں ہی ٹھہرتا ہوں... مجھے نہیں لگتا کہ اب میں اور رادھا واپس استھان جا سکتے ہیں۔''

''تو پھر کیا چاہتے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مم... میں برباد ہو کر رہ گیا ہوں۔'' گرو بے دم سا ہو کر ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گیا۔ عمران کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ گرو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اتنی ٹھنڈی ٹھار زمین پر دھرنا دو گے تو تمہاری تشریف سن ہو جائے گی۔ دماغ تو تمہارا پہلے ہی سن ہو چکا ہے، اوپر نیچے سے مفلوج ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے۔ تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے۔ تمہارے جیسے برباد حال اور بے ٹھکانا لوگوں کے لیے ایک بڑی اچھی جگہ ہے میرے پاس۔ نیوز چینل ''فساد پلس۔'' میں وہاں تمہیں ملازمت دلا سکتا ہوں۔ دماغ تو تمہارا آل ریڈی سن ہے، تم بڑی آسانی سے اینکر پرسن بن سکو گے۔ اینکر پرسن سمجھتے ہو نا تم؟ وہی شخص جو تین چار افراد کو سامنے بٹھا کر سوال پوچھتا ہے اور کسی کو جواب نہیں دینے دیتا۔ اور جب کوئی جواب دینے لگتا ہے تو بریک لے لیتا ہے۔''

''اور اس کی بیوی کا کیا بنے گا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''گرو صاحب کی توند دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے اچھے کھانے پکا لیتی ہو گی۔ اس لیے اسے آسانی سے کسی کھیلوں کے پروگرام کی میزبان بنایا جا سکتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''کھیلوں کی میزبان؟'' اقبال نے حیرت ظاہر کی۔ ''اگر وہ اچھے کھانے پکاتی ہے تو پھر اسے کسی کوکنگ پروگرام کی میزبان ہونا چاہیے۔''

''اوئے پائین! کوکنگ پروگرام کی میزبان تو بنے گی کوئی کھلاڑی۔ ان ٹی وی چینلز میں کوئی کام ڈھنگ سے ہو جائے تو پھر یہ انتظامیہ کی بہت بڑی نالائقی سمجھی جاتی ہے۔ منتظم افراد کو دقیانوس اور نامعقول گردانا جاتا ہے۔ وہ شرم سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ گرو جی! آپ فرمائیں کیا پروگرام ہے؟''

گرو نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ جو کچھ ہم دونوں کے ساتھ ہونے والا ہے... اس سے تو بہتر ہے کہ تم ہمیں گولی ہی مار دو۔''

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کی طرف دیکھا۔ وہ جھٹ بولا۔ ''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' وہ جلدی سے گھوڑا گاڑی میں گیا اور رادھا کو لے کر باہر نکل آیا۔ وہ ساڑی میں تھی۔ اوپر سے اس نے ایک گرم شال لے رکھی تھی۔ وہ سکڑی سمٹی ہوئی باہر آ گئی۔ استھان میں چلنے والی گولیوں اور ان سے ہلاک ہونے والے تین افراد کی موت کا منظر جیسے اب تک اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ عمران کے کندھے سے لگی ہوئی رائفل کو بے حد ہراساں نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''یہ کیا کرنے لگے ہو اقبال؟'' عمران نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''گرو جی کو قتل کرنے لگا ہوں۔''

''لیکن یہ تو گرو کی پتنی ہے؟'' عمران نے کہا۔

''اسی میں تو گرو کی جان ہے یار! اسے ماروں گا تو گرو خود بخود عالم بالا کی سیر کو نکل جائے گا۔''

عمران نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ گرو اور رادھا دونوں کے رنگ ہلدی کی طرح نظر آنے لگے۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے۔ عمران نے رادھا کو کچھ فاصلے پر اس طرح بٹھا دیا کہ اس کی ٹیک ایک درخت کے ساتھ لگ گئی۔ اقبال نے سبز ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے لیا۔ رادھا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ وہ جوان تھی، خوب صورت تھی۔ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک بڈھے، بے ڈھنگے شوہر کی وجہ سے اسے بھی موت کا مزہ چکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے گھگھیائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ غالباً بھگوان کا واسطہ دیا کہ اس کی جان بخش دی جائے... عمران اور اقبال نے بالکل کان نہیں دھرے۔

عمران نے کہا۔ ''میرے خیال میں سلطانہ کو بھی یہ منظر دکھانا چاہیے۔ وہ کہاں ہے؟''

اقبال نے آگے جا کر گاڑی میں جھانکا اور بتایا کہ وہ سو رہی ہے۔

وہ راستے میں بھی اونگھتی رہی تھی اور اب گاڑی کے اندر ہی سوئی ہوئی تھی۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ واقعی سوئی ہوئی ہے یا اور گرو سے ناتا توڑنے کے لیے ایسا ظاہر کر رہی ہے۔ راستے میں طلال نے عمران کو چپکے سے بتایا تھا کہ اس کی خالہ کو وہاں استھان میں کوئی ایسی شے کھلائی جاتی رہی ہے جس سے وہ زیادہ تر اونگھتی رہی ہیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کال کوٹھڑی میں بھی اپنی مزاحمت جاری رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں زنجیر پہنائی گئی اور اسے کوئی نشہ آور دوا بھی دی جاتی رہی...

گھوڑا گاڑی بان نے عمران کی ہدایت پر خشک لکڑیاں جمع کر کے الاؤ بھڑکا دیا تھا اور اب عمران بڑے سکون سے اس الاؤ کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور جیکٹ کی جیب سے چنے نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے ابھی چند گھنٹے پہلے تین افراد کو جان سے مارا ہے۔ وہ گرو کو سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یار اقبال! مجھے نہیں لگتا کہ یہ اپنی پتنی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد یہ خود بخود مر جائے گا۔''

''نہیں مرے گا تو کیا ہو گا۔ ایک گولی ہی اور ضائع کرنا پڑے گی۔''

عمران نے پہلی بار اقبال کو اس کے اصل نام سے مخاطب کیا تھا۔ یہ نام سن کر گرو سوبھاش کو پتا چل گیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس کے مردہ چہرے پر ذرا سی زندگی جھلکی۔ وہ آخری کوشش کے طور پر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں ایک بار پھر کہتا ہوں، میں بالکل نردوش ہوں۔ وہاں استھان میں مجھ سے صرف رائے لی جاتی تھی جو میں پوتھیوں میں سے پڑھ کر دے دیتا تھا۔ میں اور کچھ نہیں کرتا تھا۔''

''تم سب کچھ کرتے تھے اور کر سکتے تھے۔'' عمران نے ہاتھ [illegible] خطرہ پڑا تو تم نے دھرم کو موم کی ناک بنا لیا۔ جو شے کھوری تم

http://digestpk.blogspot.com

نے پانچ منٹ میں ڈھونڈ لی تھی، وہ تمہیں دو گھنٹے بعد بھی نہیں ملی۔ پھر تم نے پوتھیوں کے اندر سے ہی یہ مسئلہ بھی ڈھونڈ لیا کہ اگر استھان میں خون ریزی کا خطرہ ہو تو... جناب عالی... ناڑی میں دھتورے والی بھنگ ملائی جا سکتی ہے۔ اور یہ تو بس ایک دو چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں، ایسی پتا نہیں کتنی قلابازیاں تم اپنی مرضی سے لگاتے رہتے ہو اور ان مقدس پوتھیوں کے سر تھوپتے رہتے ہو۔"

گرو لاجواب ہو گیا مگر اس نے اپنی داد و فریاد جاری رکھی۔ وہ پھر گھگھیایا۔ "دیکھو پرنتو اتم لوگن اس وقت غصے میں ہو اور غصہ بدی کو کھا جاتا ہے۔ میں سچ کہوت ہوں، میرا ادھکار وہاں زیادہ نا ہیں تھا۔ تم شبھ گھڑی کی بات کر رہے ہو، اگر میں وہاں دوسری بار بھی شبھ گھڑی نہ نکالتا تو پھر مجھے کیول ایک موقع اور دیا جاتا۔ اس میں بھی شبھ گھڑی نہ نکلتی تو ستیش وغیرہ بڑے گرو کی طرف سے خود ہی شبھ گھڑی نکال لیتے اور لڑکی کو جلا دیتے۔ میں سچ کہوت ہوں۔" گرو کی آواز زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس نے اشک بار آنکھوں سے اپنی جوان پتنی کی طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، جوانی اور خوب صورتی میں طاقت ہوتی ہے۔ تم بھی جان بچانے کے لیے کچھ کہو، شاید ان لوگوں کے دل پسیج جائیں۔

لڑکی سسک کر بولی۔ "تم لوگن مسلمان ہو اور میں نے سنا تھا کہ مسلمان اپنے قیدی سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ بے شک ہم دونوں تمہارے اپرادھی ہیں مگر اپنے کرموں پر تم سے شرمندہ ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر تم سے جیون کی بھیک مانگت ہیں۔" وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ "تیری تو وہ بدنصیب شکیلہ بھی تھی۔ وہ بھی رو رو کر زندگی کی بھیک مانگتی رہی ہوگی۔"

گرو بلک کر بولا۔ "میں بڑی سے بڑی سوگند کھانے کو تیار ہوں۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے ستیش، پٹیل اور ارجن وغیرہ کرتے ہیں۔ خاص طور سے ستیش کی بات چلتی ہے اور ستیش وہی کچھ کرت ہے جو اس کی ماتا کہوت ہے۔ وہ بڑھیا بڑی کٹھور عورت ہے۔"

عمران بولا۔ "تم موت کو سامنے دیکھ کر خود کو اس کٹھور پنا سے علیحدہ کر رہے ہو... ورنہ تم بھی اس بے رحمی کا اٹوٹ انگ ہو۔ تمہاری منت سماجت پر تمہاری سزا تو معاف نہیں ہو سکتی۔ ہم بس اتنا کر سکتے ہیں کہ تمہیں زیادہ تکلیف نہ پہنچائیں اور جلدی سے تمہارے پرانوں کو تمہارے شریر (جسم) سے مکتی دلا دیں۔" عمران نے ریموٹ کنٹرول اقبال کے ہاتھ سے لے لیا۔

گرو جیسے مرنے سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ فریادی انداز میں زمین پر گر پڑا اور دُہائی دینے لگا۔ "میرا جیون بخش دو۔ میں سوگند کھاوت ہوں، جیون بھر تمہارا داس بن کر رہوں گا۔ تمہاری غلامی کروں گا۔" وہ جانتا تھا کہ اگر عمران کہہ رہا ہے تو مار بھی دے گا۔ وہ استھان میں عمران کے ہاتھوں تین افراد کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

عمران اور اقبال لطف لے رہے تھے۔ عمران نے گرو کو حکم دیا کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھے۔

وہ اپنی توند سے مٹی جھاڑتا ہوا بیٹھ گیا۔ استھان میں سانڈ کی طرح دندنانے والا گرو یہاں اس ویرانے میں کیچوے سے زیادہ حقیر نظر آ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ "میں نیوز چینل فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ میں نے اپنی فیلڈ میں بڑے بڑے مطلبی لوگ دیکھے ہیں لیکن تم تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ ابھی تم نے فرمایا ہے کہ... میرا جیون بخش دو... یعنی اب تم نے اپنی داد و فریاد میں سے اپنی پتنی کو بھی خارج کر دیا ہے۔ صرف خود کو بچانا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ فقرہ سنہری حرفوں میں لکھا جانے کے قابل ہے... بھئی واہ۔"

"نا ہیں... نا ہیں... وہ تو بے دھیانی میں کہہ دیا... ہم دونوں تم سے جیون کی بھکشا مانگت ہیں۔" گرو کراہا۔

رادھا ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اقبال نے آگ کے پاس بیٹھتے ہوئے، رائفل گود میں رکھی اور بولا۔ "تم نے لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ دھرم کو جدھر چاہو اپنی مرضی سے موڑ لیتے ہو۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ کرنا ہے۔ بتاؤ، اس معاملے میں تم لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو یا نہیں؟"

گرو نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ ہکلایا۔ "میں نے... تو صرف..."

"بکواس نہیں چاہیے۔" اقبال نے طیش میں اس کی بات کاٹی۔ "ہاں یا نہ میں بتاؤ۔ تم دھوکا دے رہے ہو یا نہیں؟"

گرو کا سارا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس لرزش کی وجہ سے اس کی گول توند میں بھی ارتعاش تھا۔ اس نے اپنی ناک سے بہنے والا رقیق مادہ، اپنی چادر کے پلو سے صاف کیا اور پھر نہایت ندامت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیوں کرتے تھے ایسا؟" اقبال نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ اقبال نے زیادہ کرخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو وہ کراہا۔ "میری عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ شریر

میں اتنی شکتی نا ہیں اس لیے... ایسا کرنا پڑا..." اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"تمہاری عمر زیادہ ہو گئی ہے، شریر میں طاقت نہیں اس کے باوجود تم نے ایک نو عمر لڑکی کو پتنی بنایا ہوا ہے... اس کا مطلب ہے جب تم اور زیادہ بوڑھے ہو جاؤ گے تو تین چار پتنیوں کے بغیر تو تمہارا گزارہ ہی نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تمہیں زیادہ بوڑھا ہونے ہی نہ دیا جائے۔ کیا خیال ہے عمران؟"

"بالکل بجا ارشاد فرماتے ہو تم۔" عمران نے تائید کی اور ریموٹ کنٹرول کو "ایکٹی ویٹ" کر دیا۔ ایک ننھا سا سرخ بلب جل اٹھا۔ گرو کی گھگھی بندھ گئی۔ رادھا کا رہا سہا لہو بھی نچڑ گیا۔ بالکل آخری کوشش کے طور پر گرو نے ایک بار پھر وہی انداز اختیار کیا اور ٹھنڈی جگہ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ عمران کے پاؤں کو چھو رہے تھے۔ وہ زندگی کے لیے گڑگڑایا۔ "ہمیں شما کر دو۔ میں تمہیں وچن دیوت ہوں، ہم دونوں جیون بھر تمہارے ادنیٰ سیوک بن کر رہیں گے۔ جو تم کہو گے وہ کریں گے۔ اپنی غلطیوں کا پرائشچت کریں گے۔ بس ہمیں ایک موقع دے دو..."

رادھا نے بھی اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا تھا اور گٹھڑی سی بن کر روتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ عمران ان دونوں کو چھوڑے گا یا نہیں لیکن کم از کم رادھا کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھا، پھر اقبال کی طرف۔ کچھ دیر تک لرزاں و ترساں میاں بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ تب گہری سانس لے کر بولا۔ "تم دونوں کو کچھ شرطیں ماننا ہوں گی..."

وہ دونوں جیسے بلک پڑے۔ یقیناً انہیں ایسے ہی محسوس ہوا تھا جیسے تختۂ دار پر عین آخری وقت میں زندگی کی نوید مل گئی ہو۔ گرو سوبھاش گھگھیائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہمیں ہر شرط منظور ہے۔ بغیر سنے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ ہم جیون بھر تمہاری غلامی کریں گے۔"

عمران نے ریموٹ کنٹرول کو ڈی ایکٹی ویٹ کر دیا۔ اس نے اقبال کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے رادھا کو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ وہ معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس نے اسے کمر عریاں کرنے کو کہا۔ رادھا نے پہلے شال اتاری پھر ساڑی کا پلو گرا کر کمر عریاں کر دی۔ اب مختصر چولی سے ساڑی کی بیلٹ تک اس کا تراشا ہوا جسم دن کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اقبال نے عمران کو آنکھ ماری پھر بڑی احتیاط سے بیلٹ کے اسٹریپس کھولنے شروع کیے۔ وہ کافی کس کر باندھی گئی تھی۔ کھولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ رادھا سی سی کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بالکل ساکت تھی۔ اس اندیشے سے شاید سانس بھی نہیں لے رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

یہ لمحے بڑے نازک محسوس ہو رہے تھے۔ گرو نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اقبال نے ذرا زور لگایا تو ایک اسٹریپ جھٹکے سے ٹوٹ گیا... رادھا بے ساختہ چلا اٹھی۔ ساتھ ساتھ وہ زیر لب اشلوک بھی پڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال رادھا کی کمر سے بیلٹ علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک سنسنی خیز صورت حال کا ہیپی اینڈ تھا۔ الاؤ کی آگ اب کافی بھڑک اٹھی تھی اور ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو راحت پہنچا رہی تھی۔ دن کی روشنی میں قرب و جوار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ یہ علاقہ جنتر اور کیکر کے خودرو درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ پتوں پر اوس چمک رہی تھی اور یہ اتنی زیادہ تھی کہ زمین بھی نم نظر آتی تھی۔ ہلکی دھند سردی کے احساس میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب عمران نے گھوم کر پیچھے دیکھا اور پکارا۔ "پکڑو۔"

اقبال گھوڑا گاڑی کے قریب تھا۔ وہ عمران کی آواز سن کر پلٹا اور دوڑا۔ تب مجھے پتا چلا کہ اقبال کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ بھاگنے والے سلطانہ اور طلال تھے۔ وہ نہ جانے کس وقت گاڑی سے نکلے تھے... وہ اندھا دھند گھنے درختوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سکھ گاڑی بان ہوشیار سنگھ لکڑیاں اکٹھی کر کے مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو سلطانہ اور طلال کو روکنے کے لیے ان کے راستے میں آیا۔ یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔ سلطانہ نے بھاگتے بھاگتے پوری قوت سے ہاتھ گھمایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ کلہاڑی ہوشیار سنگھ کی تھی اور اس نے گاڑی کی اگلی نشستوں کے نیچے چھپا رکھی تھی، سلطانہ نے وہاں سے نکال لی تھی۔ الٹی کلہاڑی کا وار ہوشیار سنگھ کی گردن پر لگا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا اور خشک لکڑیاں اس کے ہاتھوں سے نکل کر چاروں طرف بکھر گئیں۔

میں اور عمران بھی ایک ساتھ الاؤ کے پاس سے اٹھے اور اقبال کے پیچھے لپکے... "رک جاؤ... گولی مار دوں گا۔" اقبال بھاگتے بھاگتے چلایا۔

http://digestpk.blogspot.com/

وہ دونوں نہیں رکے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ میں تین قدم

آگے جا کر طلال بُری طرح پھسلا اور ایک آٹھ دس فٹ گہرے بارشی گڑھے میں جا گرا۔ اس گڑھے کی تہ میں دو تین فٹ تک کیچڑ کھڑا تھا۔ کچھ آگے جا کر اقبال نے سلطانہ کو چھاپ لیا۔ سلطانہ نے گھوم کر بے دریغ سیدھی کلہاڑی کا وار کیا لیکن مدمقابل بھی کوئی معمولی نہیں تھا۔ اقبال نے تیزی سے جھک کر یہ وار بچایا۔ سلطانہ نے چلّا کر دوسری مرتبہ کلہاڑی گھمائی۔ تاہم اس بار اقبال نے شروع میں ہی اس کی کلائی جکڑ لی۔ سلطانہ کے جسم میں وحشیانہ طاقت تھی۔ اس نے زور مارا اور اقبال جیسا شخص بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ دونوں اوپر نیچے جنگلی گھاس میں گرے۔ سلطانہ اوپر تھی اور کسی صورت کلہاڑی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ دیوانہ وار تو ور لگا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال کی انگلی بے ساختہ رائفل کے ٹریگر پر دب گئی۔ دھماکے سے گولی چلی اور گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا بُری طرح اچھل کود کرنے لگا۔

میں سلطانہ کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی تندی تیزی اور بے خوفی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ آج میرے سامنے تھا۔ وہ ایک جنگجو راجپوت نظر آتی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یہی لگا کہ شاید وہ اقبال کو بُری طرح گھائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اپنا صافہ نما کپڑا چہرے سے اتار پھینکا تھا۔ ”سلطانہ... سلطانہ۔“ میں نے پکار کر کہا اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ اس کے لمبے بالوں نے بکھر کر اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں لگا کہ اس نے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا لیکن پھر یکایک وہ بُری طرح ٹھٹکی۔ اقبال نے ایک جھٹکے سے کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

”سلطانہ! ہوش کرو، یہ میں ہوں...“

چند سیکنڈ میں اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جیسے اس حیران کن صورتِ حال کا تجزیہ کر رہی تھی۔ تب اس کے چہرے پر ایک بار پھر خشونت نظر آئی۔ اس نے اپنا جسم چھڑایا اور کراہ کر بولی۔ ”مجھے چھوڑ دو... مجھے جانے دو... میں کسی کی نہیں... میرا کوئی نہیں... مجھے جانے دو۔ مجھے مر جانے دو۔“

”ہوش کرو سلطانہ... میں مہرو ہوں... تمہارا شوہر۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“ میں نے اس کے شانوں پر اپنی گرفت سخت کر دی۔

”میرا کوئی نہیں... مجھے چھوڑ دو...“ اس نے ایک دم اپنے شانے چھڑائے اور اٹھنا چاہا۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا پھر الٹے ہاتھ کا دوسرا تھپڑ۔ اس کے ریشمی بال اچھل کر رہ گئے۔ اس نے چند سیکنڈ کے لیے ششدر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے تھپڑوں نے اس کی ہسٹریائی کیفیت کو ایک دم کنٹرول کیا۔ اس کے جذبات کی شدت نے دفعتاً رخ بدلا۔ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں گھاس میں اس کے قریب ہی بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دل دوز آواز میں روتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ روتے روتے سسکنے لگی۔ ”میں اس کتّے کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں اسے مار دوں گی... یا خود مر جاؤں گی۔“

میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ وہ اسی شخص کی بات کر رہی تھی جو میرے دل کا بھی داغ تھا۔ وہ شیطان صفت جارج گورا کی بات کر رہی تھی۔

☆☆☆

میں نے ایک بار سلطانہ کو اپنے ساتھ لگایا تو پھر خود سے جدا نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے ساتھ لگائے لگائے اسے میں گھوڑا گاڑی کی نیم گرم فضا میں لے آیا۔ اس کا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ میرے سینے سے پیوست تھا۔ طلال کو کیچڑ آلود گڑھے سے نکالا جا چکا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔ اقبال اور سلطانہ کی دھینگا مشتی میں جو ایک گولی اتفاقاً چل گئی تھی، اس نے ہوشیار سنگھ کے ایک گھوڑے کو زخمی کر دیا تھا۔ تاہم یہ زخم بھی سنگین نوعیت کا نہیں تھا۔ گولی، بے چارے گھوڑے کی گردن کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ہوشیار سنگھ اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ گردسو بھاش اور رادھا اسی طرح الاؤ کے گرد سر جوڑے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کی کیفیت عجیب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے زخموں سے چور جسم میں جتنا بھی پانی ہے، وہ آج آنکھوں کے رستے بہا دے گی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی گرم دھاریں میری گردن سے ہو کر میرے سینے تک جا رہی تھیں۔ وہ دل گیر آواز میں بولی۔ ”میں اپنا بدلہ لوں گی مہرو جی... میں اس سفید سور کو یونہی نہیں چھوڑوں گی۔“ اس کا لہجہ غیر معمولی تھا اور اس کا جذبہ بھی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں زندہ ہوں۔ ابھی تم ایسی بات نہ کرو۔ اس شیطان کو میں اس کے انجام تک پہنچاؤں گا... اگر میں نہ رہا تو پھر تمہارا جو جی چاہے کرنا۔“

اس نے میرے سینے سے سر اٹھایا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان میں حیرت، خوشی، بے یقینی، بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ شاید اسے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے جو الفاظ سنے ہیں، وہ میں نے کہے ہیں۔

میں نے اس کا سر دوبارہ اپنے ساتھ لگا لیا۔ پچھلے چند مہینوں میں سلطانہ نے مجھے بتدریج بدلتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ مجھے بہت زیادہ مختلف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ”سلطانہ! ڈیڑھ دو سال پہلے تم نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ کوئی اور تھا۔ اب جو شخص تمہارے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھا ہے یہ اور ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، بہت کچھ بدل چکا ہے۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ تم دیکھنا، قدرت کی مدد شاملِ حال ہو گی۔ اس شخص کا انجام تمہاری توقع سے زیادہ بُرا ہو گا۔“

”میں تمہارے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی... یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔“ وہ کراہی۔

”تو تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے لیے خطرہ مول لے لوں؟“

”میری بات چھوڑو مہرو جی... میں اب مجرم بن چکی ہوں۔ میں نے چار بندوں کو قتل کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ اب یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور پھر جب میں نے مرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ میں اس کتّے کو مار کر مروں۔“

میں نے پُرعزم انداز میں اس کا شانہ دبایا۔ ”کوئی تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا سلطانہ۔ تم نے جو دکھ سہے تھے، وہ سہہ چکی ہو۔ اب کوئی آنچ نہیں آئے گی تم پر۔ میں تمہاری طرف بڑھنے والا ہر ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گا۔“

اس نے ایک بار پھر میرے سینے سے سر اٹھایا اور حیرت آمیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی ناک بالکل سرخ ہو رہی تھی۔ گھنے بال نصف چہرے کو ڈھانپ رہے تھے اور نصف کو نمایاں کر رہے تھے۔ وہ دھوپ چھاؤں کا عجیب امتزاج تھی۔ کہیں آگ تھی، کہیں شبنم، کہیں ریشم تھی، کہیں فولاد... میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہاں گھوڑا گاڑی کی اس نیم گرم فضا میں میرے اور سلطانہ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ مجھے بالو کا ذکر بھی بار بار آیا۔ سلطانہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اس منحوس استھان میں کب اور کس طرح پہنچا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے یہ روداد سنا دی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئی کہ میں ایک ہندو گوپال کی حیثیت سے اس استھان میں موجود رہا ہوں۔ سلطانہ نے طلال کو بھی اندر بلا لیا تھا۔ طلال کی پنڈلی پر چوٹ آئی تھی جہاں اقبال نے پٹی وغیرہ باندھ دی تھی۔ وہ خاموش آنکھوں والا ایک ناراض اور بہت گہرا لڑکا تھا۔ بہت کم بات کرتا تھا لیکن جتنی کرتا تھا، وہ بہت وزنی ہوتی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اس دبلے پتلے لڑکے نے اپنی خالہ کے ساتھ مل کر دو گھنٹوں میں چار باحیثیت افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے مگر جب اس کی خاموش آنکھوں میں کوندتی ہوئی نفرت میں جھانکا جاتا تو یقین آنے لگتا تھا۔ اس کی مسیں ابھی پوری طرح بھیگی نہیں تھیں لیکن چھاتی چوڑی اور قوی اسٹیل کی طرح سخت تھے۔ اسے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ حکم کے بندوں نے ریسٹ ہاؤس سے ان دونوں کو پکڑنے کے بعد اس کی خالہ کو بُری طرح مارا پیٹا تھا اور وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہاں اسے خود جو چوٹیں لگی تھیں ان کی پروا اسے نہیں تھی۔

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہم کھانا کھانے سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ یہ کھانا ہم کو چاچا عبدالغنی نے دیا تھا۔ ہم کو ذرا بھی شک نہیں تھا کہ اس میں کچھ ملا ہوگا۔ اگر ہم ہوش میں ہوتے تو حکم کے لوگ ہمیں ہاتھ بھی نہ لگا سکتے۔“

اس نے یہ بھی بتایا کہ استھان میں حراست کے دوران میں کچھ لوگ اسے ترغیب دیتے رہے ہیں کہ اگر وہ اپنا مذہب تبدیل کر لے تو وہ اس کی جان بخشی کر دیں گے۔

اسی دوران میں کہیں پاس سے فائر کی آواز آئی۔ یہ گن فائر تھا۔ میں بُری طرح چونک گیا۔ میں نے گھوڑا گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ فائر کی آواز یقیناً عمران نے بھی سنی تھی لیکن وہ مطمئن بیٹھا تھا۔

”یہ کیسی آواز تھی؟“ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر عمران سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ اقبال نے کوئی تیتر وغیرہ مارا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، بہت دن ہو گئے ہیں تیتر کے کباب کھائے ہوئے۔“

اقبال ارد گرد موجود نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فائر اس نے کیا ہو گا۔ جلد ہی صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔ اقبال اور سردار ہوشیار سنگھ ایک [illegible] سے نمودار ہوئے۔ اس میں سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ عمران

http://...igestpk.blogspot.com/

ایک دم خوش نظر آنے لگا۔ وہ پکار کر بولا۔ ”تابی! باہر آجاؤ... مجھے لگتا ہے کہ ابھی تک تمہارا ولیمہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے اس فرض سے سبکدوش ہونے کا۔“

میں نے سنی اَن سنی کر دی۔ وہ گھوڑا گاڑی میں آ کر خود مجھے اور سلطانہ کو باہر لے گیا۔ اس کی نگاہوں میں سلطانہ کے لیے محبت تھی۔ اس نے اسے آگ کے قریب بٹھایا اور اس کے شانوں پر گرم چادر رکھی۔ پھر چہکا۔ ”بھابی! اب میں آ گیا ہوں۔ اب تمہیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے اس نامعقول بندے کو میں تیر کی طرح سیدھا کر دوں گا۔ تمہارے اشاروں پر چلے گا۔ سمجھو کہ تتلی بن جائے گا، جس طرح چاہو نچا لینا... لیکن اس کے لیے تمہیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے گی۔ یہ دیکھو... میں تمہارے پاؤں پکڑ لیتا ہوں۔ انکار نہ کرنا...“

اس نے واقعی شتابی سے سلطانہ کے پاؤں تھام لیے۔ سلطانہ نے گھبرا کر چھڑانا چاہے تو اس نے اقبال کو بھی اشارہ کر دیا۔ اس نے بھی جھٹ سلطانہ کے پاؤں تھام لیے... اقبال ذرا سا مسکرا رہا تھا۔ عمران نے بائیں ہاتھ سے اس کے سر پر چھانپڑ رسید کیا اور بولا۔ ”کھوتے کے پُتر! روتی صورت بناؤ۔ آنکھوں میں تھوڑی سی نمی لاؤ۔ بھابی کو منانا ہے، کوئی کوڑا اکٹھا کرنے کی وصولی نہیں کرنی ہے۔“

اقبال نے فٹ روتی صورت بنالی۔ عمران کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی تھی۔ ”خدا کے لیے بھابی! بس ایک بات مانی ہے۔ پچھلی ساری باتوں کو بھول جانا ہے۔ جو کچھ ہوا، جیسا ہوا، سمجھو وہ بس ایک بُرا خیال تھا۔ گزر گیا، فنا ہو گیا۔ اگر اسے یاد رکھنا ہے تو ہم رکھیں گے۔ ہم تیرے بھائی... تیرے نامعقول شوہر کے معقول یار... ہاں، ہم وہ سب کچھ یاد رکھیں گے اور یاد رکھنے کا حق بھی ادا کریں گے۔ تیرا کلیجا ایسے ٹھنڈا کریں گے بھابی کہ انڈیا کا بچہ بچہ مدتوں تک یاد رکھے گا... لیکن تمہیں ہماری بات ماننی ہے اور سب کچھ بھول جانا ہے...“

سلطانہ حیرت سے گنگ تھی۔ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی عمران اور اقبال کی طرف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا پالا کیسے لوگوں سے پڑا ہے۔ میں اسے کیا بتاتا، مجھے خود آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

”میرے پاؤں چھوڑیں۔“ سلطانہ نے کراہ کر کہا۔

”چھوڑ دیتے ہیں بھابی! لیکن پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہو گا۔ اگر فوری طور پر وعدہ نہیں کر سکتی ہو تو کم از کم ہمیں امید ضرور دلانا پڑے گی۔“ عمران نے کہا۔

”اور امید دلانے کا طریقہ یہ ہے کہ تمہیں ایک بار... مسکرا کر دکھانا ہو گا۔“ اقبال نے لقمہ دیا۔

وہ روہانسی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں پھر نمی جاگ گئی۔ ”میں نہیں مسکرا سکتی۔“ وہ دل دوز انداز میں بولی۔

”بالکل... بالکل غلط۔ بلکہ یہ فقرہ ہی غلط ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”خاص طور سے ایک مسلمان تو ایسا فقرہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔ تم آج نہیں مسکرا سکتی ہو لیکن کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تم کل یا پرسوں بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ اگلی جمعرات یا اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ تک بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ یہ تو غیب دانی کا دعویٰ ہے اور ایسے دعوے اس گرو سوبھا سنگھ جیسے لوگ تو کر سکتے ہیں، ہم نہیں۔“

”تم نے بالکل غلط فقرہ کہا ہے بھابی! اب تو ہم تمہارے پاؤں بالکل نہیں چھوڑیں گے۔“ اقبال نے کہا۔

”اور مجھے رو کر نہ دکھانا۔“ عمران نے لقمہ دیا۔ ”میں تم سے زیادہ رو سکتا ہوں اور اگر میں ایک بار رو پڑوں تو پھر مجھے چپ کرانا آٹھ دس بندوں کا کام نہیں ہوتا۔ ہاتھوں سے نکل نکل جاتا ہوں... پچھاڑیں کھاتا ہوں۔ محلوں کے محلے اکٹھے کر لیتا ہوں... اور کئی بار تو روتے روتے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دیتا ہوں۔“

سلطانہ نے ایک بار پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

”اس نامعقول کی طرف نہ دیکھو بھابی!“ عمران نے اس کا چہرہ پھیر دیا۔ ”جو کچھ کرنا ہے، ہمیں کرنا ہے۔ تمہارے پاؤں چھوڑنے نہ چھوڑنے اور رو رو کر خود کو ہلکان کرنے جیسی ساری اتھارٹی ہمارے پاس ہے۔ تمہیں مسکرانا پڑے گا۔ اگر نقد و نقد نہیں... مسکرا سکتی ہو تو ارادہ ظاہر کرنا پڑے گا۔ ارادے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بھابی! آدھا ثواب تو ارادے سے ہی مل جاتا ہے۔ ہمیں بس تاریخ دے دو کہ کس دن مسکراؤ گی؟ ہم اسی سے مطمئن ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کچھ بھی کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اقبال نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا بھابی! چلو اتنا بتا دو کہ آج کی تاریخ میں مسکراؤ گی یا پھر کسی دن؟“

سلطانہ کی آنکھیں مسلسل رستی رہیں اور وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ عمران نے کہا۔ ”میں اس کو تھوڑا سا اور آسان کر دیتا ہوں۔ آخر باڈی لینگویج بھی کوئی چیز ہوتی ہے بھابی! اگر تم... اگر تم اپنا بایاں پاؤں ہلاؤ گی تو اس کا مطلب ہو گا کہ آج ہی کسی وقت ہمیں اپنی مسکراہٹ سے نوازو گی۔ اگر دایاں پاؤں ہلاؤ گی تو مطلب ہو گا کہ کسی اور دن۔ یعنی نو ٹینشن، انکار نہیں، ٹھیک ہے؟“

چند سیکنڈ بعد شاید سلطانہ کا ایک پاؤں بے ساختہ ہی ہل گیا تھا۔ عمران چہکا۔ ”زبردست... زبردست... یو آر گریٹ بھابی! تم نے ہمارا مان رکھ لیا۔ چلو دایاں پاؤں ہلایا لیکن ہلایا تو سہی۔ کوئی بات نہیں۔ ہم تمہاری مسکراہٹ دیکھنے کے لیے دو چار دن اور انتظار کر لیں گے۔ شکریہ، تھینکس، دھنیواد۔ اب تم کہو گی کہ شکریہ کس بات کا؟ نہیں بھابی! یہ سب تکلف کی باتیں ہیں۔ اتنے بڑے حالات میں بھی تم نے مسکرانے کا وعدہ کیا، یہ کوئی معمولی بات نہیں... سچ، میرا جی چاہتا ہے کہ خوشی سے الٹی قلابازیاں لگاؤں اور میں صرف محاورتاً نہیں کہہ رہا۔ میں لگا بھی سکتا ہوں۔ یہ تو میرا پروفیشن ہے۔ اگر تم کہو بھابی تو میں لگا کے بھی دکھا سکتا ہوں۔“

اس سے پہلے کہ سلطانہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتی، وہ طلال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”خاموشی کا مطلب ہے نیم رضامندی... یہ دیکھو۔“

وہ بیٹھے بیٹھے کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اچھلا اور ہوا میں دو الٹی سمرسالٹ لگا کر عین اسی جگہ لینڈ کر گیا جہاں سے فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس کی مہارت قابلِ دید تھی۔ میرے اور اقبال کے سوا سبھی دنگ رہ گئے۔ گرو کا چہرہ حیرت کی تصویر نظر آنے لگا۔ ہوشیار سنگھ جو اپنی سوجی ہوئی گردن پر غور کر رہا تھا، آنکھیں پھاڑ کر عمران کو دیکھتا چلا گیا۔ ”واہ... واہ۔ آپ تو بڑے کاریگر نکلے ہو جی۔“ وہ ششدر لہجے میں بولا۔ ”ایسا کام تو روسی سرکس والے کرتے ہیں یہاں انڈیا کے وڈے وڈے شہروں میں۔ یا پھر جمناسٹک والے کھلاڑی ہوتے ہیں۔“

”میں تمہیں کیا لگتا ہوں... کھلاڑی یا سرکس والا؟“

وہ مسکرایا۔ ”میری مت نہیں ماری ہوئی کہ آپ کو سرکس والا کہہ کر آپ سے چھانپڑ کھاؤں۔ میرے خیال میں تو آپ کھلاڑی ہی ہیں۔“

”اور مجھے لگتا ہے کہ تم پکے سردار ہی نہیں ہو کیونکہ میں نے سنا تھا کہ سردار چغد ہوتے ہیں۔“

ہوشیار سنگھ بولا۔ ”شاید تھوڑا بہت نام کا اثر ہے جی۔ ورنہ کام تو میرے بھی اکثر بڑے ہائی کلاس ہوتے ہیں۔“ اس نے خاموش بیٹھی سلطانہ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”اب بھی دیکھ لیں۔ بی بی کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی لیکن مجھے دور سے ہی لگ گیا کہ یہ ہانڈی میں پھیرنے والی ڈوئی ہے۔ یہ تو بھلا ہو میری بھین کا کہ انہوں نے الٹی ڈوئی... میرا مطلب ہے کلہاڑی ماری ورنہ میرا تو جھٹکا ہو جاتا تھا کھڑے

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوّی اعصاب ہم پہنچائیں گے

http://digestpk.blogspot.com/

کھڑے۔''

''حیرت ہے، تمہیں ڈوئی اور کلہاڑی کے فرق کا پتا نہیں چلا۔ حالانکہ وہ ٹائم بھی کوئی ایسا ویسا نہیں تھا۔'' اقبال نے کہا۔

''میں سمجھ گیا جی! آپ بارہ بجے کی طرف اشارہ کررہے ہیں لیکن اب وہ بات پرانی ہوگئی ہے۔ اب ساری دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، گلوبل ولیج۔ اور اس ولیج میں کہیں نہ کہیں تو بارہ بجے ہی رہتے ہیں... ہو ہو ہو۔'' وہ خود ہی منہ کھول کر ہنس دیا۔

اقبال نے جیب سے شکاری چاقو برآمد کیا اور تیزی سے ہرن کی کھال اتارنے میں مصروف ہوگیا۔ ہوشیار سنگھ عارضی انگیٹھی بنانے کے لیے دو تین پتھر اٹھا لایا۔

''مسئلہ نمک مرچ کا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

عمران فٹ بولا۔ ''تو میں یہاں کس لیے ہوں، قصاد پلس کا نمائندہ؟ میرا تو کام ہی نمک مرچ لگانا ہے۔ میں تو چودہ دن کے باسی آلومٹر کو ایسا تڑکا لگا سکتا ہوں کہ وہ تروتازہ تندوری چرغا بن جائے۔ یہ تو پھر ہرن ہے یار۔''

''تو پھر کرو اس کو ٹھکن؟'' اقبال نے کہا۔

''تم اس کی کھال تو اتارو۔ تمہیں پتا ہی ہے پکھ نہ پکھ ہو جائے گا۔''

''تم بھی کچھ مدد فرماؤ نا۔ کھال ٹھنڈی ہورہی ہے۔'' اقبال بولا۔

''مجھے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ میں چینل کا نمائندہ ہوں۔ چھوٹے موٹے کاموں سے میری توہین نہ کرو یار! کسی بال کی کھال اتارنی ہو یا کوئی اس سے بھی باریک شے ہو تو میرا احسان لینا۔ میں تمہارے لیے نمک کا انتظام کرتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر گھوڑا گاڑی میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک کاغذ میں، مناسب مقدار میں نمک لے کر آگیا۔ میری طرح ہوشیار سنگھ بھی حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ نمک کہاں سے برآمد ہوگیا ہے۔ ہاں، اقبال کو حیرانی نہیں ہوگی۔

الاؤ اب خوب اچھی طرح بھڑک رہا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے گوشت بھوننے کے لیے کافی سارے کوئلے بنالیے تھے۔ میں نے سرگوشی میں عمران سے پوچھا۔ ''یہ نمک کہاں سے آگیا؟''

''یار! جادو برحق ہے۔''

''مذاق نہیں۔ یہ کیا کیا ہے تم نے؟''

وہ مسکرایا۔ ''سچ بتاؤں؟''

''جی تو چاہتا ہے کہ کبھی یہ انہونی ہوجائے۔'' میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں میں بھید بھری چمک ابھری۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''بارودی بیلٹ میں سے نکالا ہے۔''

''بارودی بیلٹ؟ جو راد ھا کی کمر سے اتاری ہے؟''

''ہاں۔''

''بارودی بیلٹ میں نمک بھی رکھا ہوا تھا؟''

''یار... بس نمک ہی تو رکھا ہوا تھا۔'' وہ ایک آنکھ میچ کر بولا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''یار! خود ہی تو سچ بولنے کو کہتے ہو پھر بھی ہکے بکے ہو جاتے ہو۔ اب یہ اپنا بھاڑ جیسا منہ بند کرو۔ مکھی گھس جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ گرو کو بھی شک ہو جائے۔ اگر اس کو پتا چل گیا کہ بیلٹ میں بارود اتنا بھی نہیں تھا، جتنا ہمارے سیاست دانوں میں خوف خدا ہوتا ہے تو پھر اس کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے، اسے لگے گا کہ اس کا تمام رونا دھونا بیکار گیا ہے... ہمیں اس طرح کسی کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔''

''اور وہ ریموٹ کنٹرول؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! تم نے اس ہرے طوطے کو غور سے نہیں دیکھا۔ وہ تو ''اڑا پٹر'' ہے ایک داگی تائی کا... یونہی اقبال کو کہیں سے مل گیا تھا۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''مطلب کہ یہ سارا دھوکا تھا؟''

''دھوکا نہیں، تم اسے ڈراوا کہہ سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ استھان میں ہماری بے بے تو نہیں بیٹھی ہوئی تھی، ہمارے لیے بارودی بیلٹس اور ریموٹ کنٹرول لے کر۔ جو کچھ آس پاس سے ملا، ہم نے اس سے کام چلایا۔''

میں بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا۔ ''عمران! تم کب سے ہو یہاں؟''

''ایک بار پھر سچ بتاؤں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''مجھے اور اقبال کو یہاں تقریباً ایک برس ہوچکا ہے۔ زبردست روداد ہے۔ سفرنامہ ''نکلے تیری تلاش میں'' اور اس طرح کی دوسری کارگزاریاں تو کوئی شے ہی نہیں ہیں۔ بہت جگہ کی خاک چھانی ہے تمہارے لیے جگر! آج رات کو ساری تفصیل بتاؤں گا۔''

اگلے دو تین گھنٹے ہم کافی مصروف رہے۔ بغیر مناسب ساز و سامان کے شکار شدہ ہرن کو کوئلوں پر بھوننا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے سات آٹھ بڑے بڑے پارچے بنائے گئے۔

ہم دیر سے اس کی مدد کو پہنچے... اب اس کے دماغ میں سما چکی ہے کہ یہ اس ویران جزیرے کا دوسرا درخت ہے

محمد طاہر مجاہد، چھالیہ سے کلکاریاں

ان میں کٹ وغیرہ دے کر نمک لگایا گیا اور پھر بڑی احتیاط سے بھونا گیا۔ یہ ایک مزے دار کھانا ثابت ہوا۔ عمران اسے چپکے چپکے میرے دیسی کا نام دے رہا تھا اور اس حوالے سے مختی تیز باتیں کررہا تھا۔ گرو سو بھاش اور رادھا نے گوشت نہیں کھایا اور بس بیٹھے تھوک نگلتے رہے۔ میری اور عمران کی کوشش کے باوجود سلطانہ نے بھی ایک دو لقموں سے زیادہ نہیں لیے۔ وہ بدستور گمبھیر کیفیت میں تھی۔ اس نے مجھ سے بس اتنا کہا۔ ''کو چیاں سے کہیں مجھے معاف کردے۔ میں نے اسے کلہاڑی مار کر زخمی کردیا ہے۔''

میں نے اس حوالے سے اسے تسلی دی۔ کھانے کے بعد سردار ہوشیار سنگھ پھر درختوں کی طرف نکل گیا۔ اس مرتبہ وہ خشک لکڑیوں کے ساتھ ساتھ خوبانی کی طرح کا ایک جنگلی پھل بھی لے کر آیا۔ یہ پھل ایک دفعہ میں نے بھی دیکھا تھا مگر بھوک کے باوجود کھانے کا رسک نہیں لیا تھا۔ یہ نیم میٹھا اور کسیلا پھل گرو اور رادھا کی پیٹ پوجا کے کام آسکتا تھا لیکن ابھی تک وہ صدمے میں تھے اس لیے کھانے سے انکار کر دیا۔

سب موجودہ صورت حال سے مطمئن تھے۔ ہوشیار سنگھ کا بھی یہ خیال تھا کہ ہم استھان اور پھلواری سے کافی دور آچکے ہیں اور گھنے درختوں سے گھری ہوئی اس ناپونا جگہ پر بالکل محفوظ ہیں لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کسی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں گی اور وزرگاں کے ان گنت گھڑسوار ہمیں گھیر لیں گے۔ یہاں میرے خوف کی وجہ میرے سوا اور کون جان سکتا تھا؟ ایک منحوس الیکٹرانک چپ میرے جسم میں موجود تھی اور ہر جگہ میرے دشمنوں کو میری لوکیشن کا سراغ دے رہی تھی۔ وہ جلد یا بدیر مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔

میں عمران کو جلد از جلد اس صورت حال کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا لیکن اس سے اکیلے میں اطمینان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سردیوں کا چھوٹا سا دن جلد ہی مغربی افق کے پیچھے اوجھل ہوگیا اور اس ویران جگہ کو کہر آلود اندھیرے نے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ ویرانے میں رات بسر کرنے کے حوالے سے ہوشیار سنگھ کافی ہوشیار اور تجربہ کار لگتا تھا۔ اس نے گھوڑا گاڑی کے چاروں طرف درختوں سے تین چار مشعلیں باندھ دیں اور دو تین الاؤ بھی دہکا دیے۔ یوں گھوڑا گاڑی کی اندرونی فضا زیادہ گرم ہوگئی اور جنگلی جانوروں کی مداخلت کا خطرہ بھی کم سے کم ہوگیا۔ ہوشیار سنگھ اب ساری صورت حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم گرو سو بھاش کو کسی سے بچانے کے لیے استھان سے نہیں بھاگے تھے بلکہ گرو کو لے کر بھاگے تھے۔ اور اس لیے لے کر بھاگے تھے کہ گرو کا ''شش ہا عم'' ایک بے قصور لڑکی کو واجب القتل ٹھہرانے والا تھا۔ مکمل صورت حال جاننے کے بعد اب ہوشیار سنگھ کی ساری ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوگئی تھیں اور وہ ایک ساتھی ہی کی طرح ہمارے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ وہ خاصا زندہ دل شخص تھا۔

عمران مسلسل اس کوشش میں تھا کہ سلطانہ اور طلال اپنی افسردہ کیفیت میں سے نکل آئیں۔ اس نے اقبال کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت بھیانک آواز میں گا سکتا ہے۔ اگر یہ گانا شروع کردے تو رات بھر کوئی جنگلی جانور ہمارے قریب نہیں پھٹکے گا۔''

پھر وہ ایک واقعہ سنانے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ ''ایک بار ہم ضلع شیخوپورہ میں سور کے شکار پر تھے۔ ہمارے سرکس کے مالک چودھری اشفاق

http://afigekspk.blogspot.com

کے ڈی پی او اور کچھ دیگر لوگ بھی ساتھ تھے۔ ہم اپنا شوق

پورا کرنے کے لیے گھوڑوں پر سوار تھے۔ رات کو ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ جنگلی سوروں کے حملے کا ڈر تھا۔ رات کو اقبال کی ڈیوٹی تھی۔ یہ ایک خالی ٹین بجاتا اور ساتھ ساتھ اپنی کرخت آواز میں گاتا رہا۔ اس کی آواز کے سبب جانور تو دور ہی رہے، ہمارے اپنے گھوڑوں میں سے بھی تین ڈر کر بھاگ گئے۔''

عمران اور اقبال کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھوک شروع ہو گئی۔ طلال ان پُرمزاح باتوں میں تھوڑی دلچسپی لینے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی لوگ سونے کے لیے گھوڑا گاڑی میں چلے گئے۔ میں، اقبال اور عمران آگ کے گرد بیٹھے رہے۔ میں نے الاؤ کے شعلوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''عمران! میں تم دونوں کو ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن تم کچھ خاص باتیں سننا بھی تو چاہتے ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''اب فیصلہ کرلو، پہلے خاص باتیں سناؤ گے یا سنو گے؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، پہلے تم سنالو پھر میں بتاتا ہوں۔''

عمران نے کسی کہانی گو کی طرح ایک درخت سے ٹیک لگائی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ سرد ہوا میں اڑتی ہوئی چنگاریاں ماحول کو گرما رہی تھیں۔ ثروت، عاطف اور فرح کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے میری بے تابی پھر بڑھتی چلی گئی۔

عمران نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''وہ بڑے دردناک دن تھے تابی! جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کے درد سے بھرے ہوئے۔ میں اسپتال میں تھا۔ وہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیفنس والی کوٹھی میں تمہاری والدہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے اور یہ قتل سیٹھ سراج اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ تمہارا بھائی اور بہن فرح دونوں اوجھل تھے۔ ان کے بارے میں امید تھی کہ وہ نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ میں سب سے پہلے انہیں تلاش کر کے کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف چھوٹی میڈم نادیہ اسپتال میں دم توڑ چکی تھی اور میڈم صفورا کا غم و غصہ پورے عروج پر تھا۔ میں زخمی حالت میں ہی اسپتال سے نکل آیا تھا۔ تین چار دن کی سرتوڑ کوشش کے بعد میں اور اقبال عاطف کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ گوجرانوالہ میں تھا۔ میں نے عاطف اور فرح کو فوراً راولپنڈی پہنچا دیا۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈھونڈنے اور سیٹھ سراج سے حساب برابر کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میرے ایک خاص بندے نے مجھے اطلاع دی کہ سیٹھ سراج اور شیرا زیرِ زمین جا چکے ہیں اور اب چند مہینوں تک سامنے نہیں آئیں گے۔ میڈم صفورا کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ سے غائب تھی۔ اس کے بااعتماد ملازم بھی کچھ بتا نہیں پا رہے تھے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ کچھ پراسرار لوگ میڈم صفورا کے ارد گرد دیکھے گئے ہیں... اور ان لوگوں کا تعلق بدھا کے اس مجسمے سے ہے جو پہلے ابرار صدیقی کے پاس تھا اور اب میڈم صفورا کے پاس آیا ہے۔ پھر یہ انکشاف ہوا کہ میڈم صفورا ہی نہیں، وہ خاص بدھا بھی غائب ہے جسے میڈم نے بڑی کوشش سے میرے ذریعے حاصل کیا تھا۔ کچھ ایسی شہادتیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ بدھا کے ساتھ ساتھ میڈم صفورا اور مولانا ابرار صدیقی کو بھی انڈیا پہنچایا جا چکا ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات لگ رہی تھی...''

ہماری گفتگو جاری تھی۔ اچانک میں بُری طرح چونک پڑا۔ اگر میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے تو میں نے انجن کی مدھم آواز سنی تھی۔ یہ آواز ہوا کے کسی آوارہ جھونکے پر تیر کر آئی تھی اور یقیناً عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ میں نے عمران کو بھی چونکتے دیکھا۔ عمران نے اپنا ہاتھ رائفل کی طرف بڑھا دیا۔ اقبال نے بھی اس کی تقلید کی اور چوکنا نظر آنے لگا اور یہی وقت تھا جب آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ کافی واضح تھی۔ یہ کوئی جیپ نما گاڑی تھی جو ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

''اس ویرانے میں یہ کون ہو سکتا ہے؟'' اقبال نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن میں موجود تمام تر اندیشے ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''تم سے کہا تھا کہ پہلے میری خاص بات سن لو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ وہی ہے جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔''

میرے لہجے کی تشویش محسوس کر کے عمران کی پریشانی بڑھ گئی۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اب یہ سب کچھ بتانے کا وقت نہیں۔ اب پہلے یہ دیکھو کہ یہ آنے والے کون ہیں؟'' اس دوران میں درختوں کے درمیان سے ہیڈلائٹس کی مدھم سی جھلک نظر آئی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ جھلک اوجھل ہو گئی۔ انجن کی آواز بدستور آ رہی تھی اور اب مزید قریب آ گئی تھی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ گاڑی والوں نے ہیڈلائٹس بجھا دی ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ دال میں کافی زیادہ کالا موجود ہے۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

''ہو سکتا ہے کہ کوئی بھٹکے ہوئے مسافر ہوں... یا پھر شکاری...؟'' عمران نے جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ اتفاقاً یہاں پہنچے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں لیکن اگر یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں تو پھر ان کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے تھی، کم از کم بیس تیس لوگ ہوتے... پانچ چھ گاڑیاں ہوتیں۔''

''ہو سکتا ہے کہ باقی لوگ پیچھے ہوں۔'' میں نے اختلاف کیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ گاڑی اب تاریکی میں رک گئی ہے۔ ہیڈلائٹس بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ گاڑی والوں کا یہ انداز انہیں اور زیادہ مشکوک بنا رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''عمران! ہمیں انہیں دیکھنا ہو گا۔''

عمران میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم یہیں رکو گھوڑا گاڑی کے پاس، ہم دونوں جاتے ہیں۔''

''یس باس۔'' اقبال نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

میں اور عمران جھاڑیوں کے درمیان احتیاط سے چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ عمران کے ہاتھ میں رائفل اور میرے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ رگوں میں خون لہریں لے رہا تھا۔ کچھ کرنے اور اپنا حوصلہ آزمانے کو دل چاہ رہا تھا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں جھاڑیوں کے درمیان ایک سیاہ ہیولا سا نظر آیا۔ یقیناً یہ ایک بند جیپ تھی۔ اس کی چھت پر کچھ لدا ہوا تھا۔ شاید یہ چھولداری تھی۔ اچانک میرا پاؤں ایک گڑھے میں گیا اور میں سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا گر پڑا۔ میرے گرنے سے دھپ کی آواز پیدا ہوئی اور پسٹل کھٹاک سے کسی پتھر کے ساتھ ٹکرایا۔

''کون... کون ہے؟'' کہیں پاس سے ایک ٹھٹکی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔

ہماری موجودگی راز نہیں رہی تھی۔ یکایک بھاگتے قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ قدم ہماری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ پھر دو سائے تیزی سے جیپ میں داخل ہوئے... اور جیپ آناً فاناً اسٹارٹ ہو کر حرکت میں آ گئی۔ وہ جو بھی تھے، بھاگ رہے تھے۔

''ان کو پکڑو۔'' میں نے زمین سے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں اور عمران ایک ساتھ جیپ کی طرف دوڑے۔ وہ گھوم چکی تھی اور اب ہمیں اس کی سرخ ٹیل لائٹس دکھائی دے رہی تھیں۔ ''رک جاؤ۔'' عمران دہاڑا۔

اس کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''رک جاؤ۔'' عمران نے پھر کہا اور بھاگتے بھاگتے سیون ایم ایم رائفل سے دو فائر کیے۔ ایک گولی جیپ کے پچھلے ٹائر میں لگی اور اسے برسٹ کر گئی۔ جیپ کنٹرول سے باہر ہو کر لہرائی اور پھر سائڈ کی طرف سے بُری طرح ایک درخت سے ٹکرائی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ جیپ کا دایاں اگلا پہیا ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر چڑھ گیا۔ جیپ میں سے دو سائے نکل کر بھاگے۔ ایک کا رخ دائیں طرف اور ایک کا بائیں طرف تھا۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ ایک کے پیچھے میں بھاگا، دوسرے کے پیچھے عمران لپکا۔ میرے والا کچھ زیادہ ہی پھرتیلا تھا اور وہ غیر مسلح بھی نہیں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے قریب پہنچ رہا ہوں، اس نے ایک دم پلٹ کر مجھ پر فائر کیا۔ دھماکے سے ایک شعلہ نکلا اور گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری۔ یہ پستول کا فائر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا یا میں جوابی گولی چلاتا، اسے بُری طرح ٹھوکر لگی اور وہ دور تک رپٹتا چلا گیا۔

میں نے اسے چھاپ لیا لیکن وہ آسان مدمقابل نہیں تھا۔ اس نے بالکل غیر متوقع طور پر لیٹے لیٹے اپنے سر کے عقبی حصے سے میرے چہرے پر ضرب لگا دی۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچے اور وہ میری گرفت سے نکل گیا۔ اس نے مجھ پر ٹانگ چلائی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور پھر اس کی دوسری ٹانگ کھینچ کر اسے اپنے برابر گرا لیا۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا مگر میرا ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس پر گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پستول کی ضرب اس کے بھاری بھرکم کندھے پر لگائی تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ لمبی جنگلی گھاس پر ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ تیس چالیس سیکنڈ کے اندر میں نے اس کا سارا دم خم نکال دیا۔ وہ دُہائی دینے لگا۔ ''ہم کو مت مارو، ہمارے پاس زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے، وہ تم لے لو...''

میں نے عمران کو آوازیں دیں۔ میری تیسری چوتھی آواز پر وہ بھی ایک شخص کو آگے لگائے ہوئے نمودار ہوا۔ تاروں کی روشنی میں غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ مقامی لوگ ہی ہیں۔ انہوں نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی اور کمر سے پٹکے

http://digestsurdu.blogspot.com/

گھرانوں کے نوجوان لگتے تھے۔ ایک کے گلے میں امپورٹڈ دوربین لٹک رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" عمران نے ایک کو سر کے بالوں سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"شکار کے لیے نکلے ہیں بھائی، ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ نہ ہی کسی سے کوئی دشمنی ہے۔ میرا نام راہول ہے، یہ میرا چچازاد بھائی دلیپ ہے۔ ہم اکثر ہفتے کی رات کو نکلتے ہیں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"بوہرا سے۔ ہمارا وہاں ڈیری فارم ہے۔"

"تم ہمیں دیکھ کر بھاگے کیوں تھے؟"

"سچی بات یہ ہے کہ... ہمیں خطرہ محسوس ہوا تھا کہ آپ ہم سے ہمارا سامان وغیرہ چھین لیں گے۔ پچھلے دو تین مہینے میں کئی شکاریوں کے ساتھ اس طرح کی وارداتیں ہوئی ہے۔"

"تم نے ہماری جلائی ہوئی آگ دیکھی اور پھر دور ہی گاڑی بند کر کے کھڑے ہو گئے؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم شش و پنج میں تھے۔ جاننا چاہ رہے تھے کہ آپ کون لوگ ہیں۔ بغیر تصدیق کے ہم آپ لوگوں کے پاس جانا نہیں چاہتے تھے۔"

میں نے بڑے کٹے شخص کا گریبان پکڑتے ہوئے عمران کو بتایا۔ "اس نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری ہے۔"

"میں بہت بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ کون لوگ ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ اگر میں نے آپ پر گولی نہ چلائی تو آپ مجھ پر گولی چلا دیں گے۔" وہ لجاجت سے بولا۔

"کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟" عمران نے بڑے کٹے شخص سے پوچھا۔

"نہیں۔ ہم دونوں ہی ہیں۔ ہمارے دو اور دوستوں نے آج دوپہر ہمارے ساتھ شامل ہونا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ آ نہیں سکے۔ ہم بہت تھک چکے تھے، یہاں کہیں چھولداری لگانے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈ رہے تھے کہ آپ لوگوں کی جلائی ہوئی آگ پر نظر پڑ گئی...." بڑے کٹے دلیپ نے جواب دیا۔

اندھیرے میں سے بہ مشکل دلیپ کا گرا ہوا پستول ڈھونڈا گیا۔ پستول میں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ ہم ان دونوں کے ساتھ جیپ کی طرف واپس آئے۔ اس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ لائٹس بھی آن تھیں۔ ایک طرف کی کھڑکیوں کو کچھ نقصان پہنچا تھا۔ جیپ کی اندرونی روشنی میں ہم نے دیکھا۔ یہ دونوں کزن تجربہ کار شکاری لگتے تھے۔ جیپ کی نشستوں کے پیچھے ہموار جگہ پر کوئی دو درجن شکار کیے ہوئے چھوٹے بڑے پرندے موجود تھے۔ اس کے علاوہ کئی جنگلی خرگوش اور ایک بڑے سائز کا چیتل بھی تھا۔

دونوں افراد سے گفتگو کے بعد ہم کسی حد تک مطمئن ہو چکے تھے۔ ہم نے مل کر جیپ کے اگلے پہیے کو لکڑی کے تختے پر سے اتارا اور پھر برسٹ ٹائر کے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھ کر پڑاؤ میں واپس آ گئے۔ گولی چلنے کی آواز اقبال نے بھی سن لی تھی اور وہ پریشان نظر آتا تھا۔ بہرحال ہمیں بخیریت دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ ہم نے اقبال کو بھی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ گفتگو کے دوران میں ہی ہم نے مل کر گاڑی کا ٹائر بھی تبدیل کر دیا۔

یہ دونوں افراد خوش حال گھرانے سے لگتے تھے اور پڑھے لکھے بھی تھے۔ اپنی گفتگو میں گاہے بگاہے انگریزی کے الفاظ بھی بولتے تھے۔ ان کی لینڈ روور جیپ بھی تقریباً نئی ہی تھی۔ ایک اسٹائلش وائی نائی اور مہنگے سگریٹوں کے پیکٹ ڈیش بورڈ پر رکھے تھے۔

عمران نے راہول سے پوچھا۔ "اس وائی نائی سے پرندوں کو کال کرتے ہو؟"

وہ مسکرایا۔ "نہیں جی... آپ کو دوسری پارٹی کا بتایا ہے نا۔ انہوں نے ہمیں جوائن کرنا تھا۔ ان سے رابطے کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ ویسے بھی شکاری مہم کے دوران میں ایسی چیزوں کا فائدہ ہوتا ہے۔"

پھر راہول نے ذرا جھجکتے ہوئے ہم سے ہمارے بارے میں پوچھا۔ عمران نے انہیں بتایا کہ شادی کی ایک تقریب میں شریک ہونے کے لیے زرگاں جا رہے ہیں۔

اسی دوران میں ہوشیار سنگھ بھی آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ وہ ذرا تعجب سے ان دو نئے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا اور ان کی گاڑی کو بھی۔ وہ اپنی گردن کی چوٹ کی وجہ سے ذرا تکلیف میں نظر آتا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی گردن دیکھ کر دلیپ نے پوچھا۔ "اس سردار کو کیا ہوا ہے؟"

عمران بولا۔ "وہی ہوا ہے جس کا تم دونوں کو ڈر پڑ گیا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"یہاں سفر کرنے والوں کو ڈاکوؤں کا ڈر تو اکثر رہتا ہے۔ ہمیں بھی ڈر تھا۔ ہمارا ڈر صحیح نکلا۔ پیچھے بوہرا انڈی کے پاس تین چار گھڑسواروں نے ہمارا راستہ روکا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم تھکے ہیں۔ تھوڑی سی مارا ماری ہوئی پھر جب ہم نے رائفلیں نکالیں تو وہ تتر بتر ہو گئے۔"

دلیپ ہنسا۔ "یعنی جن کو ہم ڈاکو سمجھے تھے وہ خود ڈاکوؤں کے ڈسے ہوئے ہیں۔"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

راہول نے کہا۔ "ویسے یہ علاقہ آج کل پہلے سے زیادہ خطرناک بنا ہوا ہے۔ شاید تمہیں پتا ہو ایک مسلمان راجپوت لڑکی کے لیے بڑی کشمکش چل رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر زرگاں میں کئی ہندوؤں کی ہتھیا کی ہے۔ اب اسے کسی اور گروہ نے اغوا کر لیا ہے۔ زرگاں والے اسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بڑی مارا ماری چل رہی ہے۔"

"چھوڑو یار!" اقبال نے کہا۔ "یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک لڑکی اتنا کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ وہ اکیلی ہی سب کچھ کرتی رہی ہے۔ بس پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا اس کے ساتھ ہے۔"

"ہاں، یہ بات بھی کی جاوت ہے۔" راہول نے تسلیم کیا۔ "وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ اس کی ماں نے جنم جی کی جان بچائی تھی اور اس کے بدلے میں ٹھکم کے بڑا رانے پرتاپ بہادر نے اس راجپوت پریوار کو بہت کچھ دیا تھا۔ لیکن سچ کہوت ہیں، اچھوں سے برے اور بروں سے اچھے جنم لیوت ہیں۔ یہ لڑکی نڈر اور دلیر تو بہت ہے لیکن غلط رستے پر چل نکلی ہے۔ اس نے پہلے ایک دم شادی کی اور راج بھون کی بہو بننے سے انکار کیا، اب موہن جی جیسے بندے کی ہتھیا کر کے اس نے سب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔"

دلیپ نے کہا۔ "پچھلے دنوں میں زرگاں گیا تھا۔ وہاں لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ کچھ تو یہ سمجھت ہیں کہ اس میں کوئی بری آتما گھسی ہوئی ہے۔ ورنہ ایک کمزور لڑکی اس طرح زرگاں میں دندنا سکت ہے؟ اور خون خرابا کر سکت ہے؟ بڑے پنڈت مہاراج کا وچار تو یہ ہے کہ ایسی اپراودھن ناری کو زندہ جلا دینا چاہیے تاکہ اس کی نحوست سے راجواڑے کو چھٹکارا مل جائے۔ مگر..."

"مگر کیا؟" اقبال نے پوچھا۔

"لگت ہے کہ جارج گورا صاحب، اسٹیل صاحب اور اس جیسے دوسرے لوگن اسے زندہ گرفتار کرنا چاہت ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو کچھ کیا جائے قانون کے مطابق ہو۔ اس پر زرگاں میں چوہرے قتل کا مقدمہ چلے۔"

"اچھا یار! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تمہیں کچھ کھانا پینا ہے تو بتاؤ۔"

دلیپ نے کہا۔ "بھوک تو بے شک لگی ہے لیکن ہم آپ لوگن کو تکلیف نہیں دیں گے۔ جو کچھ کریں گے خود ہی کریں گے۔ ہمارے پاس روسٹ کرنے کا پورا سامان موجود ہے۔ بس آگ کی کمی تھی، وہ آپ لوگن نے جلائی ہوئی ہے.... بلکہ آپ بتائیں آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟"

عمران چہکا۔ "میں نے کچھ چیزیں زندگی میں کبھی نہیں کھائیں یا اگر کھائی ہیں تو مجھے پتا نہیں چلا۔ مثلاً مچھلی تو بہت کھائی ہے لیکن کبھی مچھلا نہیں کھایا۔ بڑا مزے دار خرگوش اور کبوتر کھایا ہے لیکن بڑی مزے دار خرگوشنی یا کبوتری کبھی نہیں کھائی... تم لوگوں نے جل مرغ تو شکار کر رکھا ہے۔ اگر کوئی جل مرغی بھی ہے تو میں ضرور کھانا پسند کروں گا۔"

دلیپ مسکرایا۔ "آپ دلچسپ بندے ہیں۔ اس پہلو سے تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ویسے یہ کافی تحقیق طلب اور مشکل کام ہے۔"

"پرندے یا جانور کی جنس جاننا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بس ہم نے طے کر رکھا ہے کہ ہر مچھلی مونث اور ہر خرگوش مذکر ہوتا ہے۔" ایک قہقہہ پڑا۔

دلیپ اٹھ کر اپنی جیپ کی طرف گیا اور جیپ کی اندرونی لائٹ جلا کر شکار شدہ پرندوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کا انداز ماہرانہ تھا۔ وہ روسٹ کرنے کے لیے شکار منتخب کر رہا تھا۔ میں بھی یونہی ٹہلتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کے نیچے اچانک میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ اپنے جسم کا سارا خون مجھے اپنے سر کی طرف دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جو چمکتی ہوئی شے میں نے دیکھی، وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔

میں دلیپ سے پوچھے بغیر آگے بڑھا۔ میں نے خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کو دائیں بائیں ہٹایا اور اس چمکیلی شے کو وضاحت سے دیکھا۔ میں نے پوری طرح پہچان لیا۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی انٹینا تھا جو میں اس سے پہلے رنجیت پانڈے کے لوگوں کے پاس دیکھ چکا تھا۔ ٹیلے کے قریب جب ہمارے اور پانڈے کے درمیان گھمسان کا رن پڑا تھا اور پانڈے کو بھاگنا پڑا تھا تو یہ منحوس انٹینا ہمیں دیگر سامان کے ساتھ پڑا ملا تھا۔ یہ وہی سگنل وصول کرنے والی ... پالا ... چ

http://digestpk.blogspot.com/

خوں خوار ساتھیوں کے ساتھ میرے اور جیکی تک پہنچ چکا تھا۔
دلیپ نے بھی دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا ہے اور کیا دیکھا ہے۔ اس کے چہرے نے ایک دم رنگ بدلا۔ وہ پلٹا اور تیزی سے بھاگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی ٹانگوں میں جتنی طاقت ہے، وہ ساری استعمال کر کے نکل جانا چاہتا ہے۔ میں نے پستول نکالا اور اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اس پر دو فائر کیے۔ میرا ایک فائر اس کے سر میں عین گردن کے بالائی حصے پر لگا۔ وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک درخت سے ٹکرایا اور ساکت ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا دوسرا ساتھی بھی جو اپنا نام راہول بتا رہا تھا، اٹھ کر اندھا دھند دوڑا۔ اس جانب درخت قریب ہی تھے۔ وہ ان میں گھس گیا۔ عمران تو لپکتا ہوا میری طرف آ رہا تھا، اس دوسرے شخص کا پیچھا ہوشیار سنگھ نے کیا۔ ہوشیار سنگھ اس پر ہاتھ ڈالنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ اسے سنبھال نہیں سکا۔ اس کی قمیص کا ایک ٹکڑا پھٹ کر ہوشیار سنگھ کے ہاتھ میں رہ گیا اور وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا تاریک درختوں میں اوجھل ہو گیا۔
یہ سارا واقعہ بس دس پندرہ سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہو گیا۔ شور و غل اور فائرنگ کی آوازوں نے گھوڑا گاڑی میں موجود افراد کو بھی جگا دیا۔ طلال، گروسو بھاش اور سلطانہ وغیرہ بھونچکے سے باہر نکل آئے۔
"یہ کیا ہوا ہے تابی؟" عمران نے مجھ سے پوچھا۔
"ہم سب خطرے میں ہیں عمران! ہمیں کسی بھی وقت گھیرا جا سکتا ہے۔ ہمیں فوراً یہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔ ابھی... اسی وقت..."
"لیکن پتا تو چلے۔"
"میں ابھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا اور بتاؤں گا بھی تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس یہ سمجھو کہ یہ دونوں حرامزادے، حکم کے ہرکارے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ واکی ٹاکی کے ذریعے حکم کے گارڈز کو ہمارے بارے میں اطلاع دے چکے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔"
اسی دوران میں اقبال شکار شدہ پرندوں کے نیچے سے وہ چمکیلا انٹینا نکال چکا تھا... "یہ کیا ہے تابش؟" اس نے پوچھا۔
"اس کے بارے میں بھی بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا چاہیے۔"
میرے لب و لہجے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے عمران نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اٹھا کر بڑے الاؤ پر ڈال دی۔ پھر ایک ایک کر کے مشعلیں بھی بجھا دیں۔ کچھ ہی دیر میں وہاں صرف تاروں کی روشنی باقی رہ گئی۔ اس روشنی میں حکم کے جواں سال ہرکارے کی لاش اوندھے منہ گھوڑا گاڑی کے پہیے کے پاس پڑی تھی۔ شکاریوں کے بھیس میں یہ لوگ حکم کے کھوجی تھے اور وہ کھوج لگاتے ہوئے ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ اب یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں مثلاً رنجیت پانڈے... یا بلرام راتے وغیرہ کو اپنی کامیابی کی اطلاع دے چکے ہوں۔ مرنے والے کے سر کے عقبی حصے سے بہنے والا خون زمین پر ایک سیاہ نقشہ سا بنا رہا تھا۔ صرف دو منٹ پہلے یہ خون اس شخص کی رگوں میں تھا اور یہ ایک پرلطف ڈنر کا انتظار کر رہا تھا۔
ہم نے پوری سرعت سے اپنا سامان سمیٹا اور گھوڑا گاڑی میں رکھ دیا۔ عمران نے جیپ کی تلاشی لی۔ اس کے اندر سے ایک برانڈی کی بوتل، ایک شاٹ گن، ایک واکی ٹاکی اور کچھ دیگر اشیا ملیں۔ جیپ کے اندر کافی مقدار میں فیول موجود تھا۔
عمران نے کہا۔ "ہم جیپ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آگے جا کر فیصلہ کریں گے کہ اسے چھوڑنا ہے یا گھوڑا گاڑی کو۔"
میں نے اور اقبال نے اس رائے کی تائید کی۔ تاہم میں نے یہ کہا کہ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا کر رکھیں گے۔
زخمی گھوڑے کو بھی گاڑی میں جوت دیا گیا۔ مردہ شخص کی لاش کو جوں کا توں چھوڑ کر ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں عمران کے ساتھ جیپ میں تھا۔ جیپ عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ پوری طرح ایکشن میں تھا اور کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار۔
"یار! کچھ اشارہ تو دو۔" وہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے پیچھے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔
"اشارہ یہ ہے کہ حکم کے کتے ہر جگہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں کہیں بھی جاؤں، وہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"یہ جدید دور ہے۔ اس میں سب کچھ ممکن ہے۔"
"تم پہیلیاں بھجوا رہے ہو تابی۔" عمران کے لہجے میں بے چینی تھی۔ جیپ کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے سرد ہوا فرائے بھرتی اندر آ رہی تھی اور عمران کے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔
اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔ میں نے اس کا بایاں ہاتھ تھاما اور اٹھا کر اپنے سر کے پچھلے حصے پر رکھا۔ میں نے اس کی انگلیوں کی دو پوروں کو اس خاص جگہ سے چھو لیا جہاں میں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کی پوروں کو تھوڑی سی حرکت دی۔ "کچھ محسوس کیا تم نے؟" میں نے پوچھا۔
"بس، ایک ابھار سا ہے۔"
"یہی ابھار ہے جس نے میرے لیے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ جہاں پہنچتا ہوں، میری مصیبتیں میرے ساتھ وہاں پہنچ جاتی ہیں... اور اسی کی وجہ سے پچھلے تین سال سے میں بے شمار کوششوں کے باوجود اس منحوس اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں پایا۔"
"یہ... یہ کیا؟"
"ایک الیکٹرانک چپ... جو میرے اسپائنل کینال کے اوپری سرے کے ساتھ پلانٹ کی گئی ہے۔ یہ سگنل نشر کرتی ہے۔ یہ وہی تکنیک ہے جو ریسرچ، جانوروں پر استعمال کرتے ہیں۔ انہیں چپ یا کالر لگا کر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن وہ آزاد نہیں ہوتے۔ وہ جہاں بھی ہوں، انہیں ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔"
"او گاڈ۔" عمران نے ہونٹ سکیڑے۔
کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولا۔ "کچھ عرصے پہلے میں نے ایک خاص بندے سے اس سے ملتی جلتی بات سنی تو تھی۔ اس نے کہا تھا کہ حکم جی اور جارج گورا اپنے خاص قیدیوں کو کہیں بھاگنے نہیں دیتے۔ سادہ لوح لوگوں کا خیال ہے کہ حکم جی اپنی روحانی شکتی سے ہر وقت ان پر نظر رکھتا ہے مگر پڑھے لکھے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کسی جدید طریقے سے اپنی نگرانی میں رکھا جاتا ہے۔"
"بس یہی ہے وہ نگرانی... اور اس نگرانی کا انچارج جارج گورا کا بہنوئی ڈاکٹر اسکل ہے۔ وہی یہ خاص چپ باڈی میں پلانٹ کرتا ہے۔ یہ پیچھے جو انٹینا پڑا ہے، اس کا تعلق اسی چپ سے ہے۔"
"کیا تمہارے ذہن میں کبھی اسے نکلوانے کا خیال آیا؟" عمران نے سنسناتی آواز میں پوچھا۔
"یہی تو ان لوگوں کی اصل خباثت ہے عمران۔ تم نے تل پانی کے جاپانی سرجن ڈاکٹر لی وان کا نام سنا ہے؟"
عمران نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا۔ "وہ بڑا قابل بندہ ہے۔ میرا ایک ڈاکٹر دوست مجھے اس تک لے کر گیا تھا۔ اس نے چند ٹیسٹ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ یہ چپ نکالنے کے لیے زیادہ سہولتیں درکار ہیں اور یہ یہاں اسٹیٹ میں نہیں تھا۔ یہ چپ نکالتے ہوئے اسپائنل میرو کو نقصان پہنچ سکتا ہے جو زندگی کے لیے خطرناک ہے۔"

اسپیشل گیند

بیٹسمین، ایک باؤلر کی زبردست پٹائی کر رہا تھا۔ باؤلر کا حوصلہ پست ہو گیا تاہم اس نے اپنے کیپٹن سے کہا۔ "میں اب اسے اپنی اسپیشل گیند کراؤں گا۔ آپ دیکھیے گا، وہ پریشان ہو جائے گا۔"
کیپٹن نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔
باؤلر نے اسپیشل گیند کرائی اور بے بسی سے گیند کو باؤنڈری لائن کے پار جاتے دیکھتا رہا۔ کیپٹن نے قریب آ کر اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "واقعی، تم نے اسے پریشان کر دیا۔" اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "وہ ڈبل مائنڈ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گیند پر چوکا مارے یا چھکا؟"

کراچی سے دور رہشم کا انتخاب

گھوڑا گاڑی ہمارے آگے جا رہی تھی۔ اس میں سلطانہ اور طلال کے علاوہ گروسو بھاش اور اس کی سدھ بدھ (؟) رادھا بھی موجود تھی۔ ان کی حفاظت و نگرانی کے لیے اقبال سیون ایم ایم رائفل کے ساتھ گھوڑا گاڑی کے اندر تھا۔ تاروں کی روشنی میں اونچے نیچے راستوں پر گھوڑا گاڑی درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ اس کے پیچھے تھی۔
"کچھ پتا ہے ہم کس طرف جا رہے ہیں؟" میں نے عمران سے پوچھا۔
"میرا خیال ہے کہ ہمارا رخ کچے کی طرف ہے اگر ہم..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہیں جیپ کے عقب نما آئینے پر تھیں۔
"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔
وہ چند لمحے تک آئینے میں دیکھتا رہا، پھر اس نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ جنتر، کیکر اور جنگلی بیریوں کی گھنی قطاروں کے عقب میں کچھ روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ ساکت نہیں متحرک روشنیاں تھیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ لگانا فی الحال مشکل تھا۔ "کون ہو سکتے ہیں یہ؟" عمران نے سنگین لہجے میں پوچھا۔
http://digestpk.blogspot.com/
"نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ حکم جی کے

بتائے۔"

عمران خاموش رہا۔ میں بھی خاموش رہا۔ ہم اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بڑی سنگین سچویشن تھی۔ مجھے لگا کہ میرے سینے میں دھڑکن کسی نقارے کی طرح گونج رہی ہے... کسی جنگلی نقارے کی طرح۔ یہ جان کر مجھے دلی راحت ہوئی کہ میرے اندر خوف نہیں ہے۔ اور اگر تھوڑا بہت ہے بھی تو وہ ایک میٹھے میٹھے جوش کی لہروں میں دبا ہوا ہے۔ یہ تو شاید میرے سپنوں کی رات تھی... ایک گھنا جنگل... ایک سرد اندھیری رات۔ اس رات میں سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے خطرات کے سائے... ہر پیڑ کے عقب میں موت کی گھات، ہر موڑ پر آسیبی پرچھائیاں... اور میرے ساتھ عمران جیسا دوست، میرے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے۔ وہی عمران جو سنگین ترین اندیشوں کو سینے سے لگانے کا فن جانتا تھا۔ جو جان لیوا خطرات کو قہقہوں میں اڑاتا تھا اور جس کا کفن ہر وقت ایک چمکیلی دستار کی طرح اس کے سر سے بندھا رہتا تھا۔ ہاں، یہ میرے پسندیدہ ترین تصورات کی رات تھی۔

اس سے پہلے لاہور کے گلی کوچوں میں بھی کچھ مواقع ایسے آئے تھے جب میں اور عمران ایک ساتھ کسی خطرے میں گھرے تھے مگر تب کی بات اور تھی۔ تب میں ایک اپاہج کی طرح عمران کے ساتھ گھسٹتا تھا... یا شاید وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتا تھا۔ آج میں اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ عمران کا ساتھ دینے کا حق ادا کر سکتا تھا۔

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ واقعی حکم جی کے لوگ ہیں اور الیکٹرانک چپ کے بارے میں جو کچھ تم نے کہا ہے، وہ بھی صحیح ہے تو پھر ایک بات طے ہے۔ ہم جس طرف بھی جائیں گے یہ لوگ ہمارے پیچھے آئیں گے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے... لیکن ایک بات ہے... اس سے پہلے میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک زمین دوز سرنگ میں تھا۔ وہاں اس چپ نے کام نہیں کیا تھا۔"

"لیکن ایسی سرنگ اب کہاں ڈھونڈیں گے؟ یا پھر ایک اور طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

سنگین صورتِ حال کے باوجود عمران کا کھلنڈرا پن لوٹ آیا تھا۔ وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا۔ "سرنگ بنا لیتے ہیں... اوس کی وجہ سے زمین نرم ہو رہی ہے۔ گھوڑا گاڑی میں ایک بیلچہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ دو تین چاقو بھی ہیں ہمارے پاس۔"

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہمیں یہ تصدیق کرنی چاہیے کہ یہ حکم کے لوگ ہی ہیں۔ اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اگلے آدھ پون گھنٹے میں ایک دو بار اپنا رخ بدلیں۔"

"تم اب چھنا چھنی بھی کرنے لگے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔"

سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ مدھم آوازیں ہم تک پہنچیں۔ یقیناً یہ بھیڑیوں کی آوازیں تھیں۔ یہ جنگلی کتوں کی آوازوں سے بالکل مختلف تھیں۔ میں اب انہیں پہچاننے لگا تھا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ جیسے کوئی زبردست چال اس کے ذہن میں آ رہی ہو۔

اس نے جیپ کی رفتار تھوڑی سی بڑھائی اور اسے گھوڑا گاڑی کے برابر لے آیا۔ ہوشیار سنگھ بڑی چابک دستی سے دونوں گھوڑوں کو ہانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگین چابک تھا۔ وہ تن کر اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

عمران نے کہا۔ "ہوشیار سنگھ! اب تم ہمارے پیچھے آؤ۔ ہم اپنا راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔"

"کیا کہا جی؟ رستا تبدیل کر رہے ہیں؟" وہ ہماری طرف جھک کر بلند آواز میں بولا۔

"نہیں یار! راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔ میں اب تمہارے آگے چلتا ہوں۔ اس کو پنجابی میں کہیں گے... میں تیرے اگے اگے چلاں گا۔"

ہوشیار سنگھ نے بتیسی نکالی اور اثبات میں سر ہلایا۔ عمران نے لینڈ روور کو گھوڑا گاڑی کے آگے لگا دیا۔ ہم بائیں رخ پر مڑ گئے۔ کہیں دور گھنے جنگل میں تیندوے کی مخصوص آواز ابھری اور سنسناہٹ بن کر دور تک پھیل گئی۔ ابھی ہم اس آواز کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک اور آواز نے بری طرح چونکا دیا۔ یہ کسی دہشت زدہ شخص کے چلانے کی آواز تھی اور یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ کوئی جنتر کے درختوں میں ہمارے نزدیک موجود تھا... اور کرب کے عالم میں آہ و بکا کر رہا تھا۔ مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

مالِ غنیمت

تنویر ریاض

ایک گاڑی کی چوری سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی... سراغرساں کے نزدیک یہ ایک معمولی نوعیت کا کیس تھا... جسے وہ بہ آسانی پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا... مگر رفتہ رفتہ کیس خونی رنگ اختیار کرتا چلا گیا۔

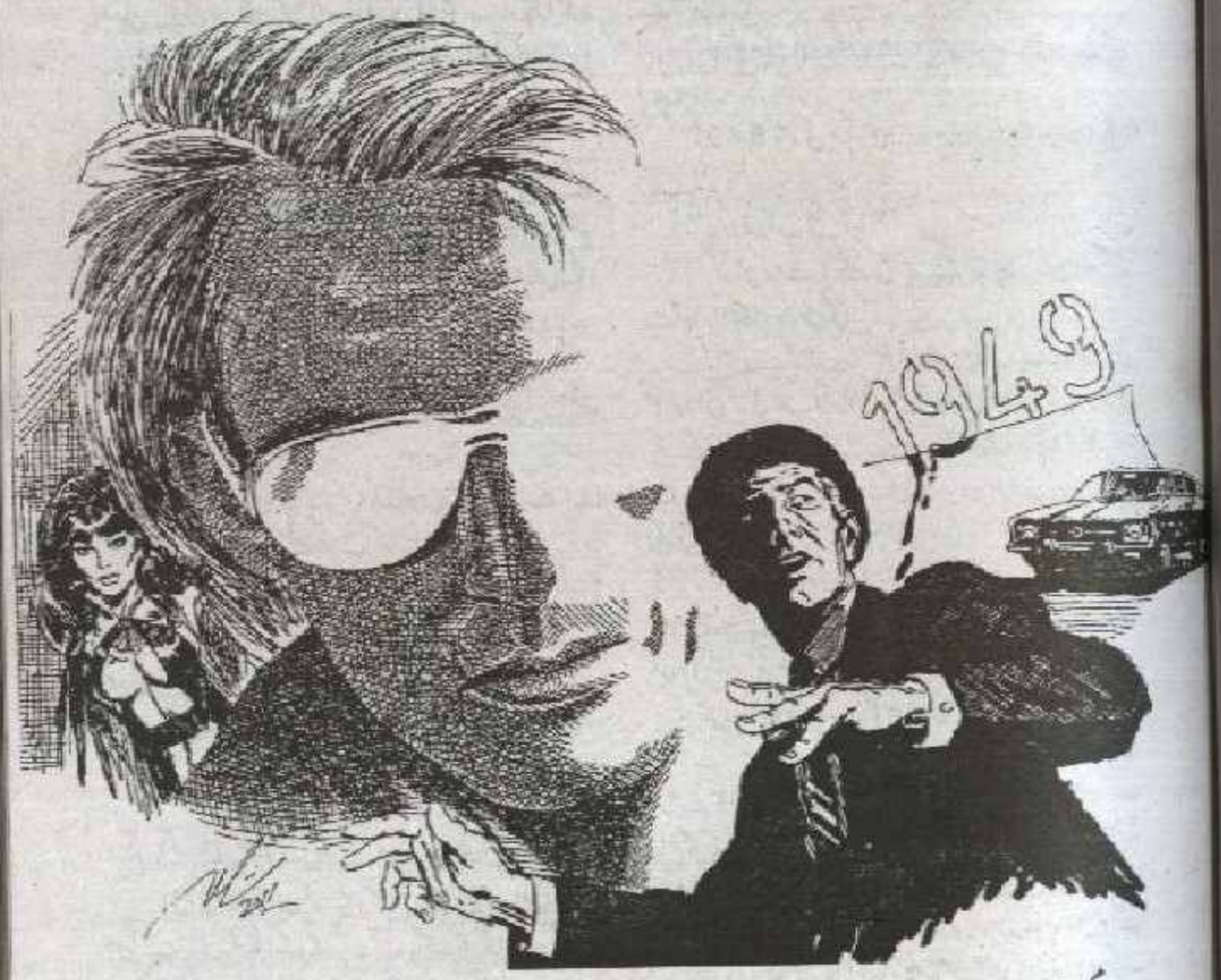

دولت و ہوس کا کھیل... جہاں سب سے ارزاں انسانی زندگی تھی

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ سنہری بالوں والی عورت میرے ہی انتظار میں کھڑی ہوئی ہے۔ وہ مئی کی ایک خوش گوار صبح تھی جب میں اپنے دفتر جانے کے لیے روز بلڈنگ کی ساتویں منزل پر لفٹ سے باہر آیا۔ میں اتنی جلدی میں تھا کہ اس کی وہاں موجودگی کا نوٹس ہی نہیں لیا بلکہ میری نظر اپنے بائیں جانب اس شخص پر گئی جو دیوار کا سہارا لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ ایک بڑے سے ہیٹ سے چھپا ہوا تھا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا اور دیکھنے میں وہ کوئی سرکس کا مسخرہ نظر آ رہا تھا۔

میرا دفتر دائیں جانب تھا۔ میں ہال سے گزرتا ہوا اس طرف آیا تو میری نظر اس عورت پر گئی جو میرے دفتر کے دروازے پر کھڑی تھی۔ [illegible]

http://digestpk.blogspot.com

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رات ٹھیک سے نہیں سو سکی تھی۔ میں نے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''گڈ مارننگ!''

''کیا تم ہی سراغ رساں ہو؟'' اس نے بے یقینی سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اگر مجھے یقین ہوتا کہ صبح ایسے بے اعتبار لوگوں سے واسطہ پڑے گا تو گھر میں پرائیویٹ سراغ رساں کی تختی ڈال کر آتا لیکن کسی اجنبی سے سخت لہجے میں بات کرنا میرے اصول کے خلاف تھا۔ کیا پتا وہ کوئی کارآمد گاہک ہو لہٰذا میں نے ایک بار پھر دل پر جبر کیا اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں ہی پرائیویٹ سراغ رساں فریک سویر ہوں۔ اندر آ جاؤ۔''

میں نے دفتر کی لائٹس جلائیں۔ اندرونی شیشے کے دروازے پر میری فرم کا نام لکھا ہوا تھا۔ ''اولڈ دائن ڈیٹکٹیو ایجنسی۔'' میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور دفتر میں رکھی کرسیوں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''

''مجھے مسز کیرن میلاڈو کہتے ہیں۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' میں نے اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے وائلڈ گولڈ لنگ کا پیکٹ نکالتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں ایک سگریٹ پی سکتی ہوں؟''

''ہاں، ہاں... کیوں نہیں۔'' میں نے اس کی طرف ایش ٹرے بڑھائی۔

''شکریہ۔'' وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر سویر! میں ایک مشکل میں ہوں۔ میری کار چوری ہوئی ہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی کیونکہ میرے پاس عموماً ایسی عورتیں آتی تھیں جو کسی بلیک میلر کی ستائی ہوئی ہوں اور اس سے جان چھڑانا چاہتی ہوں۔

''مسز میلاڈو!'' میں نے ایک ہاتھ اپنے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوتی لیکن میں کار چوری کے کیس نہیں لیتا۔ بہتر ہوگا کہ تم یہ کام پولیس کے سپرد کر دو۔ کیا تم نے کار چوری کی رپورٹ درج کروائی ہے؟''

''نہیں۔''

''تو سب سے پہلے تمہیں یہی کام کرنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم ایسا نہیں کرو گے۔ میرا مطلب ہے کہ میں پولیس کی مدد لینا نہیں چاہتی۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''حالانکہ پولیس ہی اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہے۔''

کیرن میلاڈو کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، میں اس معاملے میں پولیس کو نہیں لانا چاہتی۔ میرا شوہر بہت ناراض ہوگا۔ بالکل نئی کار ہے۔ اس نے حال ہی میں میرے لیے خریدی تھی۔''

''کار کا میک اور ماڈل بتاؤ۔'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔

''1949ء کی مرکری۔ وہ دروازوں والی۔ نارنجی رنگ۔''

''یہ واقعہ کب پیش آیا؟''

''گزشتہ رات۔ مجھے صبح چھ بجے پتا چلا۔ میں دو گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

''ممکن ہے کہ ان دو گھنٹوں میں پولیس نے از خود کوئی کارروائی کر لی ہو۔ اگر کوئی شخص تمہاری گاڑی میں سواری کر کے لطف اندوز ہو رہا ہے تو اب تک پکڑا جا چکا ہوگا۔ وہ نئے ماڈل کی کار ہے اور ایسی گاڑیاں سڑکوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔''

''میں چاہتی ہوں کہ تم اس کار کو تلاش کرو۔'' وہ اپنا پرس کھولتے ہوئے بولی۔ ''یہ دو سو ڈالرز ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری فیس کتنی ہوگی لیکن فی الحال میرے پاس یہی ہیں۔''

میں عام طور پر اپنے گاہکوں کی حیثیت کے مطابق فیس کی بات کرتا ہوں۔ اس مختصر سی گفتگو کے ذریعے مسز کیرن کی حیثیت کا اندازہ لگانا آسان نہ تھا، چنانچہ میں نے اسے ایک عام گاہک سمجھتے ہوئے نارمل فیس بتا دی۔ ''میں پچیس ڈالرز یومیہ لیتا ہوں۔ دیگر اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔''

''فی الحال تم یہ دو سو ڈالرز رکھ لو۔ مزید دو سو اس وقت دوں گی جب کار مل جائے گی لیکن تمہیں تیزی دکھانا ہوگی۔ سب کام چھوڑ کر اسی پر لگ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری خاطر یہ کام کر سکتا ہوں لیکن میری اب بھی یہی رائے ہے کہ پولیس کے پاس زیادہ وسائل ہوتے ہیں اور اس طرح کے معاملات میں ان کی کامیابی کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے جبکہ مجھے تنہا یہ کام کرنا ہوگا۔''

''مجھے پیسوں کی پروا نہیں ہے۔ بس مجھے ہر قیمت پر اپنی کار چاہیے۔''

ان دنوں میرا کام مندا جا رہا تھا۔ کئی دنوں سے کسی گاہک کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میز پر پڑے ہوئے نوٹ میرے صبر کو آزمانے کے لیے کافی تھے۔ پھر بھی میں نے جلد بازی نہیں دکھائی اور کہا۔ ''اگر میں تمہاری کار تلاش کر سکتا ہوں تو پولیس کیوں نہیں یہ کام کر سکتی جبکہ وہ اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لے گی پھر تم چار سو ڈالرز کیوں خرچ کرنا چاہتی ہو؟''

''میں نہیں چاہتی کہ میرے شوہر کو کار کی گمشدگی کا علم ہو۔ وہ بہت جلدی غصے میں آ جاتا ہے۔ تم میری کار تلاش کر کے مجھے پہنچا دو۔ فی الحال میں ٹیکسی میں گھر چلی جاؤں گی اور کہہ دوں گی کہ گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی تھی اس لیے اپنی سہیلی کے یہاں چھوڑ دی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہاری کار کہاں سے چوری ہوئی؟''

''ویسٹرا اسٹریٹ سے۔''

''کیا گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی تھی؟''

''نہیں، پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ تم نے سورنیو ان کا نام تو سنا ہوگا؟''

''یہ تو کسی موٹیل کا نام ہے۔'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں نے وہیں اپنی گاڑی پارک کی تھی اور جب صبح سو کر اٹھی تو کار وہاں نہیں تھی۔''

میں حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ ایک شادی شدہ عورت عام سے ہوٹل میں رات گزار کر آئی تھی۔ اس کی کار چوری ہو گئی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے شوہر کو یہ بات معلوم ہو۔

''کیا تم نے وہاں تنہا قیام کیا تھا؟''

''نہیں لیکن تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ میرے ساتھ کون تھا۔ اس سے تمہیں کار تلاش کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔''

''آل رائٹ مسز میلاڈو۔ میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ کیا تمہارے پاس رجسٹریشن بک ہے؟''

''نہیں، وہ بھی کار میں ہی ہے لیکن مجھے گاڑی کا نمبر یاد ہے۔'' اس نے جو نمبر بتایا، وہ میں نے ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا۔

''کار کس کے نام پر ہے... تمہارے یا شوہر کے؟''

''شوہر کے نام پر۔ آگسٹن میلاڈو۔''

''تمہارے پاس گاڑی کی چابی تو ہوگی؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اپنے بیگ میں سے چابیاں نکال کر مجھے پکڑا دیں۔ میں نے میز پر پڑے ہوئے نوٹ اور چابیاں اپنے کوٹ کی جیب میں رکھیں اور بولا۔ ''تم سے کس طرح رابطہ ہو سکتا ہے؟''

''میرا نمبر تمہیں ڈائریکٹری سے مل سکتا ہے مگر تم مجھے فون مت کرنا۔ ممکن ہے میرا شوہر فون اٹھا لے۔ میں خود ہی تم سے چھ گھنٹے بعد رابطہ کروں گی۔ اگر تم سے بات نہ ہو سکی تو میں ہر ایک گھنٹے بعد تمہیں فون کرتی رہوں گی۔''

اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس کی گمشدہ کار کا سراغ لگانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے دائن کا گلاس پکڑا اور ٹہلتا ہوا کھڑکی تک چلا گیا۔ کیرن میلاڈو تیز تیز قدم اٹھاتی فٹ پاتھ پر جا رہی تھی اور اس کا رخ یونین اسکوائر کی جانب تھا۔ پھر میں نے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔ وہی شخص جو میرے دفتر کے باہر دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا، اچانک ہی بلڈنگ کے صدر دروازے سے باہر آیا اور اسی راستے پر چل دیا جس پر مسز میلاڈو جا رہی تھی۔

☆☆☆

جارج نامی وہ سیاہ فام شخص اس گیراج میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے وہیں سے اپنی تفتیش شروع کی۔ اس نے میری بات غور سے سنی اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''کیا کہا... گزشتہ رات چوری ہوئی تھی؟ اب تک تو وہ کئی حصوں میں تقسیم ہو چکی ہو گی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''جی جناب!'' اس نے اپنی ڈانگری کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''کاریں چرانے والے انہیں بھی بیچنے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ ان کی رجسٹریشن کا مسئلہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کوئی گاہک معقول رقم دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس لیے فائدہ اسی میں ہے کہ چوری شدہ کار کے پارٹس الگ کر کے بیچے جائیں۔ مثلاً ٹائرز، پہیے، جنریٹر، گیئرز، ریڈیو یہاں تک کہ انجن بھی آسانی سے فروخت ہو جاتا ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ پارٹس کس گاڑی سے نکالے گئے ہیں یا کس کی ملکیت ہیں۔ انتہائی کم قیمت پر بیچنے کے باوجود چور کو اچھے خاصے پیسے مل جاتے ہیں۔ اس کا انحصار گاڑی کے میک اور ماڈل پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کیڈی لاک کے پارٹس دو ہزار ڈالرز تک میں فروخت ہو جاتے ہیں۔''

http://digestpk.blogspot.com/

''وہ انچاس ماڈل کی مرکری ہے۔'' میں نے اسے یاد

دلا دیا۔

"اوہ۔" جارج کے چہرے کے تاثرات فوراً ہی بدل گئے۔ "یہ تو برانڈ نیو ماڈل ہے اور اس کی طلب بہت زیادہ ہے۔ اگر آپ شوروم میں خریدنے جائیں تو یہ گاڑی آپ کو فوراً نہیں ملے گی۔ آرڈر دینے کے بعد بھی انتظار کرنا پڑے گا۔ شاید چھ ہفتے یا اس سے بھی زیادہ۔ کار چور کو اس کا گاہک تلاش کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ وہ اس کار کو پارٹس میں تبدیل کرنے میں وقت ضائع نہیں کرے گا۔ مارکیٹ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسی گاڑیاں خرید لیتے ہیں۔"

"یہ بتاؤ کہ اگر میں ایسی ہی نئی کار فوراً خریدنا چاہوں تو یہ مجھے کہاں سے مل سکتی ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا کیونکہ میں نے کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ کار چوروں کے پاس پہلے سے ان گاڑیوں کے گاہک ہوتے ہیں اور وہ کارروائی مکمل ہوتے ہی گاڑی متعلقہ گاہک تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگر تمہیں ہسپانوی زبان بولنا آتی ہے تو تمہیں کسی میکسیکن سے رابطہ کرنا چاہیے۔ وہ یقیناً تمہیں کسی ایسی جگہ کا پتا بتا دے گا جہاں سے تمہیں اپنے مطلب کی گاڑی مل سکتی ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر دس ڈالر کا نوٹ رکھا تو اس کا لہجہ ہی بدل گیا اور مجھے ہسپانوی زبان بولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

☆☆☆

مطلوبہ مقام پر جانے سے پہلے میں نے موقعِ واردات کا معائنہ کرنا ضروری سمجھا۔ سورنٹیو موٹر ان، ایک دو منزلہ عمارت میں واقع تھا جسے جم کی کہر نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس وقت سوا دس بج رہے تھے اور موٹل کے زیادہ تر کمرے خالی تھے۔ میں نے اپنی گاڑی دفتر کے ساتھ ہی پارک کی اور اندر چلا گیا۔ استقبالیہ پر ایک نوعمر لڑکا بیٹھا ہوا تھا جس کی عمر بہ مشکل بیس برس ہوگی۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دکھایا اور کہا کہ ایک کیس کی تحقیقات کے سلسلے میں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس نے سر ہلا کر رضامندی ظاہر کی تو میں نے پوچھا۔

"تم صبح کس وقت کام پر آتے ہو؟"

"سات بجے۔"

"میرے ایک کلائنٹ کی کار گزشتہ شب یہاں سے چوری ہوگئی ہے۔ کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"میرے آنے کے کچھ دیر بعد ایک شخص ڈھیلی ڈھالی پینٹ اور بنیان میں ملبوس یہاں آیا۔ اس وقت شاید سات بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور سر پر بڑا سا ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کمرا نمبر 209 میں مقیم ہے اور اس کی کار چوری ہوگئی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پولیس میں رپورٹ درج کرا دے۔ جب میں نمبر ڈائل کرنے لگا تو اس نے اپنا ہاتھ کریڈل پر رکھ دیا اور بولا کہ ابھی پولیس کو فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی بیوی نے گاڑی کہیں اور پارک کی ہو اور اسے یاد نہ آ رہا ہو۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔"

"کیا میں رجسٹر دیکھ سکتا ہوں؟"

اس نے رجسٹر میری طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے مسٹر اور مسز پی ویلڈس کے نام سے کمرا نمبر 209 بک کروایا تھا اور اس کے ساتھ ہی نارنجی رنگ کی مرکری کار کا بھی اندراج تھا جس کا نمبر وہی تھا جو مسز میلاڈو نے مجھے دیا تھا۔

"کیا انہوں نے یہ کمرا پہلے سے بک کروایا تھا؟"

"جی نہیں، زیادہ تر لوگ یہاں سے گزرتے ہوئے ستانے کے لیے آجاتے ہیں۔ بہرحال، مسٹر ویلڈس آٹھ بجے کے قریب دوبارہ آئے اور انہوں نے کمرے کی چابی واپس کرنے کے ساتھ ساتھ کرایہ بھی ادا کر دیا۔ ان کے ساتھ آنے والی خاتون باہر کھڑی رہیں۔ کھڑکی سے ان کی پشت ہی نظر آ رہی تھی۔"

"چھوٹے قد کی میکسیکن۔ سیاہ بال، بھاری جسم کی۔" میں نے ہوا میں تیر چلایا۔

وہ تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "مسز ویلڈس... وہ تو لمبے قد کی سنہری بالوں والی تھی۔"

میں نے کمرا نمبر 209 دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور چابی مجھے پکڑا دی۔

اوپر جانے کے لیے سیمنٹ کا زینہ بنا ہوا تھا جس پر لوہے کی سیاہ ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ کمرا نمبر 209 بالکل کونے میں تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ کمرا نیم تاریک تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا تو بجلی لیمپ کی مدھم روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ کمرے کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ ابھی تک اس کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ ٹوکری میں ایک خالی بوتل اور میز پر دو خالی گلاس رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر لپ اسٹک کے نشانات بھی نظر آ رہے تھے۔ بستر کی چادر اور کمبل کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کمرے کے مکینوں نے رات کس طرح گزاری ہوگی۔ اس کے علاوہ مجھے وہاں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ میں نے لائٹ آف کی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔

میں نے جنوب کی جانب چلنا شروع کیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے وہ جگہ مل گئی جہاں سے گمشدہ کار کا کوئی سراغ مل سکتا تھا۔ لوپیز موٹرز۔ یہاں پرانی گاڑیاں فروخت ہوتی تھیں۔ میں ایک چار دروازوں والی پیکارڈ کے قریب کھڑا اسے ایک گاہک کی طرح پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ٹریلر کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک خوش پوش شخص برآمد ہوا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ایک ماہر سیلز مین کی طرح بولنا شروع کر دیا۔

"سر! یہ گاڑی بہترین حالت میں ہے اور صرف اکتیس ہزار میل چلی ہوئی ہے۔ آپ اسے خرید کر معقول رقم بچا سکتے ہیں۔ میں نے بھی نیلام سے خریدی ہے۔ بہت کم قیمت میں دے دوں گا۔"

میں نے اس کے لہجے سے ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ میکسیکن ہے چنانچہ ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

"میرا نام کینیڈی ہے... فرانس کینیڈی۔ حال ہی میں یہاں آیا ہوں۔"

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ اگر یہ پیکارڈ پسند ہے تو تم اسے چلا کر دیکھ سکتے ہو۔"

"نہیں، یہ میرے لیے بہت بڑی ہے۔ میں تو کوئی چھوٹی کار دیکھ رہا ہوں... دو دروازوں والی۔"

اس نے مجھے مختلف گاڑیاں دکھائیں۔ میں نے ایک باذوق گاہک کی طرح ان میں سے کئی کاروں کی تعریف بھی کی اور پھر مطلب کی بات پر آ گیا۔ "مسٹر لوپیز! دراصل میں کسی ایسی گاڑی کی تلاش میں ہوں جو جنگ کے بعد بنائی گئی ہو... جیسے انچاس کی مرکری۔"

"سوری... میرے پاس ایسی گاڑی نہیں ہے۔ اس کے لیے تمہیں گولڈن گیٹ مرکری جانا ہوگا۔"

"میں وہاں جا چکا ہوں۔" میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دراصل مجھے نارنجی رنگ میں چاہیے جبکہ ان کا کہنا ہے اس کے لیے مجھے کم از کم دو ماہ انتظار کرنا ہوگا۔"

"اوہو... یہ تو بہت برا ہوا۔" اس نے مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں ایک اچھی استعمال شدہ گاڑی چاہیے تو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ وہ اچھی حالت میں ہے۔"

"گزشتہ شب میں نے روزا میں ڈنر کیا تھا۔" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "تم جانتے ہو کہ اچھے میکسیکن کھانے وہیں ملتے ہیں۔ میں نے وہاں ایک لڑکے کے پاس انچاس کی مرکری دیکھی تھی۔ اسی نے مجھے تمہارا پتا بتایا تھا۔"

"وہ کوئی اور لوپیز ہوگا۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور ٹریلر کی جانب چل دیا۔

"تین ہزار ڈالرز۔" میں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ "دو ہزار سات سو گاڑی کی قیمت اور تین سو ڈالر تمہارا کمیشن کیونکہ مجھے گاڑی ابھی اور اسی وقت چاہیے۔"

لوپیز چلتے چلتے رک گیا اور بولا۔ "یہ سچ ہے کہ اس بزنس میں میرے کئی لوگوں سے تعلقات ہیں اور کبھی کبھی ہمیں ایسے ذرائع سے بھی گاڑیاں مل جاتی ہیں جو عام طور پر نئی کاروں کے ڈیلرز استعمال نہیں کرتے۔ اس کے لیے مجھے کچھ لوگوں سے بات کرنا ہوگی۔ کیا تم مجھے اپنا نمبر دے سکتے ہو؟"

میں نے اسے ایک کاغذ پر اپنے دفتر کا نمبر لکھ کر دے دیا۔

☆☆☆

میں نے قریبی ریستوران میں لنچ کیا۔ اس کے بعد موٹر وہیکل رجسٹریشن آفس میں جا کر چوری ہونے والی گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ کار آگسٹین میلاڈو کے نام پر رجسٹرڈ تھی اور صرف دو ماہ پہلے خریدی گئی تھی۔ میں نے گاڑی کا انجن نمبر اور میلاڈو کے گھر کا پتا معلوم کیا اور چلا آیا۔ اس کا گھر بیکر بیچ کے قریب سی کلف میں تھا۔ اس کے بعد میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا اور چوری ہونے والی گاڑیوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ گزشتہ دو ہفتوں کے دوران اس ماڈل اور میک کی کسی گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کروائی گئی تھی۔ ان سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے دفتر واپس آ گیا اور کیرن میلاڈو کے فون کا انتظار کرنے لگا۔

یہ امید بھی تھی کہ لوپیز مجھے فون کرے گا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ تین بج کر دس منٹ پر اس کا فون آ گیا۔ "میں نے کچھ لوگوں سے بات کی ہے اور مجھے امید ہے کہ رات تک تمہارے مطلب کی کار مل جائے گی۔ کیا تم نو بجے تک آ سکتے ہو؟"

http://...digest...com/

"تمہارا خیال درست ہے لیکن آج شام میں تمہاری

خاطر دیر تک بیٹھ سکتا ہوں۔"

میں نے اسے کہا کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم یہ کام صبح بھی کر سکتے ہیں مگر اس کا کہنا تھا کہ یہ ایک بہت ہی خاص ڈیل ہوگی اور وہ چاہتا ہے کہ یہ کام ایسے وقت کیا جائے جب ارد گرد دوسرے لوگ موجود نہ ہوں۔

میں نے اسے بتایا۔ "مجھے وہاں کسی دوسری گاڑی میں آنا ہوگا تاکہ واپسی میں اپنی نئی کار خود چلا کر گھر لا سکوں اس لیے میں نو بجے تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس سے زیادہ دیر نہ ہو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ایک بار پھر تمہیں یاد دلا دوں کہ یہ ایک خاص ڈیل ہے۔ اسی لیے میں دیر تک رکوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں علم ہو۔ لہٰذا تم میرے پاس اکیلے ہی آؤ گے۔ اپنے دوست سے کہنا کہ وہ تمہیں سڑک پر ہی اتار دے۔ وہاں سے ایک بلاک کا فاصلہ تمہیں پیدل طے کرنا ہوگا۔ اور ہاں، رقم ساتھ لے کر آنا... تین ہزار ڈالرز۔"

پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس مرتبہ کیرن میلاڈو لائن پر تھی۔ میں نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

"مسز میلاڈو! ابھی تک کوئی بات یقینی نہیں ہے لیکن شاید میں رات تک تمہیں کوئی خبر دے سکوں۔"

"میرا شوہر کاروباری سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہے اور مجھے امید ہے کہ رات وہیں گزارے گا۔ اگر تمہیں کار مل جائے تو تم اسے لے کر میرے گھر آ سکتے ہو؟"

"کیا تم گھر پر اکیلی ہو؟"

"میرے ساتھ ایک چینی ملازمہ ہے۔ اس کے علاوہ آج رات گھر میں کوئی نہیں ہوگا۔ ہم اس پر بھروسا کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر کام بن گیا تو میں تمہیں فون کر دوں گا۔ مجھے آنے میں گیارہ یا بارہ بج سکتے ہیں۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

☆☆☆

میں نو بجنے میں دس منٹ پر لوبیز کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ میں نے سامنے سے جانے کے بجائے عقبی راستہ اختیار کیا اور باڑ میں سے رینگتا ہوا کاروں کی قطار کے درمیان سے گزرتا ہوا ٹرالر کی جانب بڑھنے لگا۔ نو بجے کے قریب میں نے لوبیز کو آتے دیکھا۔ وہ سیدھا آفس میں چلا گیا۔ تقریباً تیس سیکنڈ بعد عقبی حصے میں لگی ہوئی بڑی لائٹس بجھ گئیں جبکہ آفس کے باہر لگی ہوئی چھوٹی لائٹ جلتی رہی اور وہیں میں نے گہری نارنجی رنگ کی انچاس ماڈل مرکری کھڑی دیکھی۔ اس گاڑی پر نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ اب میں صرف سیریل نمبر سے ہی اسے چیک کر سکتا تھا لیکن میرے پاس اس گاڑی کو اندھیرے میں شناخت کرنے کا ایک آسان طریقہ بھی تھا۔ جی ہاں، میری جیب میں مرکری کی چابیاں تھیں۔

میں گاڑیوں کے بیچ سے گزرتا ہوا آگے بڑھا پھر ایک کھلی جگہ آ گئی۔ مجھے مرکری تک پہنچنے کے لیے پندرہ فٹ کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل جھکا اور اسی پوزیشن میں چلتا ہوا مرکری تک پہنچ گیا۔ جیب سے چابی نکال کر دروازے میں لگائی اور گاڑی میں داخل ہو گیا۔ دروازہ کھلنے کا مطلب تھا کہ میرے پاس اسی گاڑی کی چابیاں تھیں۔ پھر میں نے بڑے احتیاط انداز میں اگنیشن آن کیا۔ کچ پر پاؤں رکھا اور آہستہ سے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھایا۔ گاڑی کا انجن غرایا، اب میرے پاس بالکل مہلت نہیں تھی۔ میں نے گاڑی فرسٹ گیئر میں ڈالی اور ٹریلر کے عقب سے نکل کر لومبارڈ اسٹریٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ عین اسی وقت میں نے لوبیز کو ٹریلر کا دروازہ کھولتے دیکھا۔ وہ تیزی سے لکڑی کی سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آ رہا تھا۔ اس نے اپنی پیٹی سے ریوالور نکالا لیکن میں اس وقت تک اس کی پہنچ سے نکل چکا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے گاڑی اپنے گیراج میں بند کی اور اس کا بونٹ اٹھا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کا انجن نہ گرم ہو گیا ہو پھر میں نے جیب سے ٹارچ نکالی اور گاڑی کا سیریل نمبر چیک کیا۔ یہ وہی نمبر تھا جس پر آگسٹن میلاڈو کی کار رجسٹر ہوئی تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے ڈکی کا جائزہ لیا۔ اس میں کسی مرد کی نیلے رنگ کی جینز اور جیکٹ، ایک چھوٹا چمڑے کا تھیلا اور کینوس کا بڑا تھیلا رکھا ہوا تھا۔ جیکٹ کی سامنے والی جیب پر آکلینڈ کے رہنے والے پاچو ویلڈس کا شناختی کارڈ لگا ہوا تھا جبکہ دوسری جیب میں ایک لفافہ رکھا ہوا تھا جس میں تھوڑی سی مقدار میں ہیروئن اور کچھ سگریٹ کے کاغذ پڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد میں نے چمڑے کا تھیلا کھولا جو دس ڈالر کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان نوٹوں کو پیکٹ کی شکل دی گئی تھی اور یہ تعداد میں تقریباً پندرہ پیکٹ تھے۔ کینوس کا تھیلا کافی بڑا تھا۔ یہ تھیلا اینٹوں سے بھرا ہوا تھا جن کا سائز دو انچ ضرب دس انچ تھا۔ یہ اینٹیں براؤن رنگ کے کاغذ میں لپٹی ہوئی تھیں اور ہر ایک کو گلابی ڈوری سے باندھا گیا تھا۔ میں نے چاقو کے ذریعے ایک اینٹ میں لمبا شگاف کیا تو اس میں سے ایک ناگوار بو آئی۔ یہ نشہ آور پودا تھا جس سے منشیات تیار کی جاتی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ اینٹ کو واپس اس کی جگہ پر رکھا، ڈکی بند کی اور اندر چلا آیا۔

دس بجے کے قریب میں نے کیرن میلاڈو کو فون کیا۔ "تمہاری کار مل گئی ہے اگر تم چاہو تو میں آ سکتا ہوں۔"

"میری کار۔" وہ خوشی سے چلائی۔ "وہ ٹھیک حالت میں تو ہے نا؟"

"ہاں، مجھے اس کی باڈی پر کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ البتہ نمبر پلیٹ غائب ہے۔ خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں دوسری نمبر پلیٹ لگا کر آ جاتا ہوں۔"

☆☆☆

میلاڈو ہاؤس پچیسویں ایونیو پر واقع تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے نقشے سے مدد لینا پڑی۔ وہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔ میں نے گاڑی ڈرائیو وے میں کھڑی کی اور مرکزی دروازے پر جا کر گھنٹی بجائی۔ چند سیکنڈ بعد ایک چھوٹے قد کی چینی لڑکی نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "اندر جاؤ۔"

چند قدم چلنے کے بعد اس نے ہال میں بنی ہوئی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میڈم کیرن اوپر ہیں۔ تم وہیں چلے جاؤ۔"

اس بار میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خاصی پرکشش اور قبول صورت تھی اور اس نے جو لباس پہن رکھا تھا، وہ ہرگز کسی ملازمہ کا نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر وہ تھوڑا سا گڑبڑائی۔ اس نے پلٹ کر مرکزی دروازہ بند کیا اور میرے پاس سے گزرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اس کے کہنے کے مطابق سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ بائیں جانب ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر قدم رکھا۔ اس کمرے کی اندرونی آرائش دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کیرن کا بیڈروم ہے۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ البتہ ملحقہ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا تاکہ کیرن کو میری آمد کا علم ہو جائے۔ جواب میں اس نے ملازمہ کو آواز دے کر کہا۔ "یاؤ! میرا تولیا لاؤ۔"

میری نگاہ بستر پر گئی۔ وہاں ایک بڑا سا تولیا پڑا ہوا تھا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹا کر وہ تولیا اس کے حوالے کیا اور خود کھڑکی کی جانب منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز آئی۔ "میری کار آ گئی؟"

"ہاں۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ "اب مجھے معلوم ہوا کہ تم اس کار کو حاصل کرنے کے لیے چار سو ڈالرز دینے پر کیوں تیار ہو گئی تھیں۔"

"تمہیں کار پسند آئی؟" وہ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں، کار واقعی بہت اچھی ہے لیکن تم کار نہیں بلکہ اس میں رکھے ہوئے سامان کے لیے پریشان تھیں۔"

"اوہ! تو تم نے ڈکی کی بھی تلاشی لے لی؟"

"ہاں، مجھے پیسے بھی مل گئے اور ڈکی میں رکھا ہوا سامان بھی۔"

"تب تو تم نے میری جان بچالی مسٹر سویور۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "پوچھو تم کیا جاننا چاہتے ہو؟"

اس نے جو کچھ مجھے بتایا، اس کے مطابق میلاڈو منشیات کی درآمد میں ملوث تھا اور اس کام کے لیے اپنی بیوی کو استعمال کرتا تھا۔ گاہکوں سے ملنے، مال کی سپلائی اور رقم کی وصولی سب کچھ کیرن ہی کرتی تھی۔ آکلینڈ کا رہنے والا پاچو ویلڈس بھی ایسا ہی ایک گاہک تھا۔ کیرن نے جو کچھ بتایا، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ آگسٹن میلاڈو ایک درمیانی عمر کا شخص تھا اور اپنی بیوی سے چوبیس سال بڑا تھا۔ ان کی شادی کو پانچ برس ہو چکے تھے لیکن میلاڈو اسے بیوی نہیں بلکہ ایک کارندے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اسی وجہ سے کیرن کا احساس محرومی بڑھ گیا۔ وہ محبت کی متلاشی تھی جو میلاڈو اسے نہیں دے سکتا تھا۔ کیرن کو ایسے مرد کی طلب شدت سے محسوس ہو رہی تھی جو ایک جوان عورت کے فطری تقاضے پورے کر سکے۔ کاروبار کے سلسلے میں اس کی ملاقات پاچو سے ہوتی رہتی تھی۔ اس بار جب انہیں ڈیل کا موقع ملا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور ایک رات کے لیے پاچو کی مہمان بن گئی۔ شاید یہ بھی اس کے نزدیک میلاڈو سے انتقام لینے کا ایک طریقہ تھا۔

وہ گزشتہ شب پاچو سے ملنے گولڈن پارک پہنچی اور مال اس کے حوالے کر کے رقم وصول کر لی پھر انہوں نے دونوں چیزیں ڈکی میں رکھیں اور سوڈینو موٹر ان چلے آئے۔ یہ جگہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے کوئی خطرہ محسوس کیے بغیر گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور ڈکی کو تالا لگا کر کمرے میں چلے آئے۔ وہ صبح اٹھے تو کار چوری ہو چکی تھی۔ پاچو کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ اس کی جیکٹ، شناختی کارڈ، غیر قانونی سامان اور رقم سب کچھ کار کی ڈکی میں تھا۔ سب سے زیادہ اسے میلاڈو کی فکر تھی جو اس پر دھوکا دہی کا الزام عائد کر کے اس کی زندگی عذاب کر سکتا تھا۔ اس نے کیرن کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ بڑی مشکل سے اسے یقین دلا سکی کہ اس معاملے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ تب وہ

http://digestpk.blogspot.com/

اسے لے کر روز بلڈنگ آیا اور مجبور کیا کہ وہ میرا انتظار کرے۔

''تمہیں میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے کیرن سے پوچھا۔

''پاچو نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ اس کام کے لیے کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی مدد حاصل کی جائے کیونکہ ہم کسی بھی صورت پولیس میں رپورٹ نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے تمہارا پتا نوٹ کیا۔ تمہارا دفتر ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے دیکھے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ اسی لیے پاچو نے تمہارا انتخاب کیا۔''

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ آئندہ سال ٹیلی فون ڈائریکٹری سے اپنا نام نکلوا دوں گا۔

''پاچو نے مجھے ایک ٹیکسی میں سوار کروایا اور اپنی کار میں بیٹھ کر آکلینڈ چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے مجھے ہدایت کی کہ جیسے ہی تمہاری طرف سے کوئی خبر ملے، میں اسے فون کر دوں۔''

''کیا تم نے اسے فون کر دیا؟'' میں نے بے چین ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، تمہارا فون سننے کے بعد میں نے اسے اطلاع دے دی تھی لیکن اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ تم یہاں پہنچ چکے ہو۔''

''تم نے آگسٹن کو کیا بتایا؟''

''میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی تھی اس لیے اپنی سہیلی کے گھر چھوڑ آئی ہوں۔ اس نے رقم کے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے بتا دیا کہ وہ بھی گاڑی میں ہی ہے۔ اسے میری باتوں پر کچھ شک ہوا تو اس نے سچ اگلوانے کے لیے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں اس کا تشدد نہ سہہ سکی اور اسے پاچو کے ساتھ رات گزارنے اور کار کے چوری ہونے کے بارے میں بتا دیا۔ یہ سن کر اس نے مجھے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو وہ جا چکا تھا۔ ملازمہ مجھے بڑی مشکل سے اوپر لے کر آئی۔''

''کیا تم نے آگسٹن کو یہ بھی بتا دیا کہ کار کی بازیابی کے لیے تم نے میری خدمات حاصل کی ہیں؟''

''ہاں، میرے پاس سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب اسے کار اور پیسے مل جائیں گے تو وہ میرے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرے گا۔''

کیرن نے لباس تبدیل کیا اور میرے ساتھ باہر آ گئی۔ میں نے گاڑی کی ڈکی کھولی تو اس نے سب سے پہلے رقم کا تھیلا اٹھایا۔ میں نے سامان کا تھیلا اٹھانا چاہا تو وہ بولی۔

''اسے رہنے دو۔ مجھے فوراً ہی پاچو سے مل کر یہ چیزیں اس کے حوالے کرنا ہوں گی، تبھی میں محفوظ رہ سکتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اندر جانے لگی تو میں نے کہا۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے۔''

''میں تمہیں مزید دو سو ڈالرز دے رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رقم کا تھیلا کھولا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ پہلے ہی مجھے معقول معاوضہ دے چکی ہے جو ایک دن کے کام کے لیے کافی ہے۔ تب وہ بولی۔ ''اچھا، ایک منٹ ٹھہرو۔ میں لباس تبدیل کر لوں پھر تمہیں گھر تک چھوڑ دیتی ہوں۔''

''اس وقت سوا گیارہ بج رہے ہیں۔'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ہی مجھے ٹیکسی مل جائے گی۔''

''پاگل مت بنو۔ مجھے تو ویسے بھی ہر حال میں پاچو سے ملنے جانا ہے۔ تم جہاں کہو گے، وہیں ڈراپ کر دوں گی۔''

☆☆☆

کیرن کے گیراج میں اضافی نمبر پلیٹ موجود تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ گاڑی کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دوں۔ میں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے ڈرائیونگ کی پیشکش کی لیکن اس نے اصرار کیا کہ وہ خود ہی گاڑی چلائے گی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے ایک سگریٹ سلگایا اور پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''منشیات کے بارے میں کیا خیال ہے... کیا تم پولیس کو اس کی اطلاع دو گے؟''

میں اس کے احمقانہ سوال پر گڑبڑا گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ خود ہی کہہ چکی تھی کہ وہ یہ سب چیزیں پاچو کے حوالے کرنے جا رہی ہے پھر اس نے ایسی بات کیوں کہی؟ کیا وہ مجھے ٹٹولنا چاہ رہی تھی؟ میں نے سگریٹ سلگایا اور کہا۔

''تم نے میری خدمات کار ڈھونڈنے کے لیے حاصل کی تھیں۔ میں نے تمہارا کام کر دیا۔ اب اگر میں پولیس کے پاس جاتا ہوں تو اس سے تمہارا اعتماد مجروح ہو گا اور یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔''

میں نے اس کے اطمینان کے لیے یہ بات کہہ تو دی لیکن اندر سے خود بھی مضطرب تھا۔ ڈکی میں رکھے ہوئے پوڈوں کی بو میرے دماغ میں گھس رہی تھی۔ اچانک ہی مجھے ایک خیال آیا اور میں بول پڑا۔ ''تم اپنی ملازمہ پر کس حد تک بھروسا کر سکتی ہو؟''

''پوری طرح۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''آگسٹن نے شادی کے فوراً بعد ہی یہ ملازمہ میرے لیے رکھی تھی۔ وہ میرا ہر کام کرتی ہے اور آگسٹن کے کاروبار کی نوعیت سے بھی واقف ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ ہماری وفادار ملازمہ ہے اور ہمیں اس سے ڈرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔''

مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔''

''کہو... میں سن رہی ہوں۔''

''ان لوگوں سے اپنی جان چھڑاؤ کیرن! یہ بہت خطرناک کھیل ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ ابھی تک آزادی سے گھوم رہی ہو۔''

''میں مجبور ہوں۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''منشیات سے وقتی طور پر تو سکون ملتا ہے لیکن حقیقت میں یہ زہر ہے جو انسان کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔ تمہیں اس کام سے الگ ہو جانا چاہیے۔''

''کیا تم میرے ساتھ آکلینڈ چلو گے تاکہ تمہاری موجودگی میں یہ چیزیں پاچو کو دے سکوں؟ اس طرح میں زیادہ محفوظ رہوں گی۔''

''تمہارے ساتھ جانے کا مطلب ہو گا کہ میں بھی اس جرم میں شریک ہو جاؤں۔'' میں نے عقب میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''تم میرے باڈی گارڈ کے طور پر ساتھ رہو گے۔ میں اس کا معاوضہ الگ سے ادا کروں گی۔'' اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی اور اپنا دایاں ہاتھ میری ران پر رکھ دیا۔ میں بچہ نہیں تھا جو اس کا اشارہ نہ سمجھ پاتا۔ پھر اس نے گاڑی پریسیڈیو ایونیو کی جانب موڑ دی۔ چند منٹ بعد ہم کیسا روز ان کے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے مجھے گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''ایک کمرا بک کروانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

میری عقل بالکل ہی گھاس چرنے چلی گئی تھی اس لیے سوچے سمجھے بغیر سر ہلا دیا۔ میں نے مسٹر اور مسز فرانسس کینیڈی کے نام سے کمرا لیا اور اس کا پیشگی کرایہ بھی ادا کر دیا اور روم نمبر چوبیس کی چابی لے کر کیرن کے ساتھ اس جانب بڑھ گیا۔ صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی روشنی کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی اور کیرن کے کپڑے ایک کرسی پر پڑے ہوئے تھے۔ میں بستر سے نکلا اور ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ کیرن شاور لے رہی ہے۔ میں نے اس کا نام لے کر پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے تنگ کر رہی ہے، چنانچہ مسکراتے ہوئے شاور کا پردہ ذرا سا ہٹایا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اور ٹب خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور غور سے دیکھا۔ کیرن وہاں نہیں تھی۔ میں نے پانی کا نل بند کیا اور کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔

میرا خیال تھا کہ جب نیچے اتروں گا تو کیرن کی گاڑی پارکنگ لاٹ میں نہیں ہو گی، جیسا کہ گزشتہ شب ہوا تھا لیکن میں اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈکی میں چابی لگی ہوئی تھی اور اس کا تالا کھلا ہوا تھا۔ سورج کی روشنی پھیل چکی تھی اس لیے میں نے کوٹ کی جیب سے دھوپ کا چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگا لیا۔ سڑک بالکل خالی تھی اور میرے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈکی کو کھولا...... وہاں کیرن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا پورا جسم گیلا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ نہاتے نہاتے ڈکی میں آ کر لیٹ گئی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی اور مایوسی سے سر جھکا لیا۔ کسی نے اس کی گردن توڑ دی تھی اور کیوبوں کا تھیلا غائب تھا۔ میں نے جلدی سے ڈکی بند کی اور چابیاں جیب میں ڈال لیں۔

کیرن کی لاش دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ میں الٹے قدموں کمرے میں واپس آیا تاکہ وہاں سے اپنی موجودگی کے نشانات مٹا سکوں۔ میں نے ایک کپڑا لے کر ہر اس جگہ کو صاف کیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔ ایک تکیے کے غلاف میں کیرن کے کپڑے اور سگریٹ کا پیکٹ رکھا۔ بستر کی چادر پر کچھ بال پڑے ہوئے تھے، انہیں چن کر ٹوائلٹ میں بہایا۔ پھر میری نظر فرش پر پڑے دھوپ کے چشمے پر گئی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی شخص صبح سویرے دھوپ کا چشمہ لگا کر کمرے میں آیا تھا۔ میں نے وہ چشمہ اٹھا لیا اور پچھلے زینے سے عقبی گلی کی طرف جا نکلا۔ میرا خیال تھا کہ جس نے بھی کیرن کو مارا ہے، اس نے واپسی کے لیے اس گلی کو استعمال کیا ہو گا لیکن مجھے وہاں کوئی سراغ نہیں ملا۔ چنانچہ میں کیرن کی گاڑی میں بیٹھ کر میلاڈو ہاؤس کی جانب روانہ ہو گیا۔

http://digestpk.blogspot.com/

☆☆☆

میلاڈو ہاؤس میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں

نے گاڑی کچھ فاصلے پر پارک کی اور پیدل ہی اس جانب چل پڑا۔ ڈرائیو وے میں ایک نئی جیگوار کھڑی ہوئی تھی جبکہ مرکزی گیٹ کے باہر سڑک پر ایک پرانی شیورلیٹ بھی موجود تھی۔ میں نے سامنے سے جانے کے بجائے عقبی راستہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ چاقو کی مدد سے دروازے کا تالا کھولا اور میلاڈو کے کچن میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے نکل کر ڈائننگ روم سے ہوتا ہوا مرکزی لاؤنج تک آیا جہاں میں نے دو آدمیوں کو موجود پایا۔ ان میں سے ایک نے شارک اسکن سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کی پشت میری طرف تھی جبکہ دوسرا شخص ایک معمولی سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا چہرہ میری جانب تھا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا تو معمولی سوٹ والا بولا۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

دوسرے شخص نے بھی مڑ کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تم یقیناً مسٹر سویور ہو۔''

''اور تم آگسٹن میلاڈو ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بے خوفی سے کہا۔ ''میں تمہاری مرکری کار واپس لے آیا ہوں۔ واقعی چلنے میں بہت اچھی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے گاڑی کی چابیاں اس کی جانب اچھال دیں۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا پھر اس نے برق پھرتی سے وہ چابیاں اچک لیں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''دستک دیے بغیر اندر آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ دراصل آج صبح میں نے کافی نہیں پی تھی لہٰذا سوچا کہ تمہارے کچن میں ہی جھانک لوں۔''

یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ''تم نے اپنے دوست سے میرا تعارف نہیں کروایا۔''

اس دوران میں دوسرا شخص اپنی جیب سے ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے وہ ریوالور مجھ پر تان لیا۔ بہرحال، میں اس سے بارہ پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔

''ہاں، ہاں... کیوں نہیں۔'' میلاڈو نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''یہ پاچو ویلڈس ہے اور پاچو... ان سے ملو فریک سویور۔ انہوں نے ہی تمہارا سامان برآمد کیا ہے۔''

''کیا مجھے اپنی نشانہ بازی کا مظاہرہ کرنا ہوگا میلاڈو؟'' پاچو نے غراتے ہوئے کہا۔

''مجھے امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ تم اپنا ریوالور جیب میں رکھ لو۔''

''نہیں، مجھے یہ شخص بہت خطرناک معلوم ہو رہا ہے۔''

میلاڈو کے چہرے پر سختی آ گئی۔ اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے آٹومیٹک ریوالور نکالا اور بولا۔ ''اپنا ریوالور جیب میں رکھ لو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اسے میرے گھر میں گولی مارو۔''

یہ دھمکی کام آ گئی اور پاچو نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''اس کی تلاشی لو۔'' میلاڈو نے میری طرف دیکھتے ہوئے اسے حکم دیا۔

پاچو ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھا۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس نے اچھی طرح مجھے ٹٹولا اور بولا۔ ''اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔''

میلاڈو نے گہری سانس لی اور ریوالور دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

''ہائی دی وے، تمہاری بیوی کی طبیعت کیسی ہے؟ تمہاری اس سے ملاقات ہوئی؟'' میں نے میلاڈو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔'' اس نے نفرت سے قالین پر تھوکتے ہوئے کہا۔

''میں اسے گھر لے آیا ہوں۔ وہ مر چکی ہے اور میرا خیال ہے کہ پاچو کو یہ بات معلوم ہے۔''

پاچو یہ سنتے ہی بھڑک اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دائیں ہاتھ سے مجھے گھونسا مارنے کی کوشش کی۔ میں نے تیزی سے اپنا سر پیچھے ہٹایا لیکن اس کے باوجود اس کے گھونسے کی اچٹتی سی ضرب میرے منہ پر لگی اور ہونٹ سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ میں نے رومال سے اپنا ہونٹ صاف کیا اور بولا۔

''اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کارنامہ پاچو نے ہی سرانجام دیا ہے۔ مسٹر میلاڈو! شاید تمہارے علم میں نہ ہو کہ گزشتہ شب وہ میرے ساتھ تھی۔''

''اور اسی لیے ماری گئی۔ تمہارے علاوہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ایسی کئی راتیں گزار چکی تھی۔ میں نے ہی پاچو کو اسے مارنے کے لیے کہا تھا۔ اسے یہ بات معلوم ہونی چاہیے تھی کہ میں اسے اس بے راہ روی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔''

''تم نے پاچو کو اسے مارنے کے لیے بھیجا تھا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، جب تم کار واپس لے کر آئے تو میں نے پاچو کو فون کر کے تم دونوں کا تعاقب کرنے اور اپنی چیزیں حاصل کرنے کے لیے کہا اور یہ پیشکش بھی کی کہ اگر وہ کیرن کو ٹھکانے لگا دے تو میں اس کے عوض اس کی ادا کردہ رقم واپس کر دوں گا۔''

''ہاں۔'' پاچو بولا۔ ''اب ہمیں مطلب کی بات کرنا چاہیے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔''

''تمہاری رقم کا تھیلا لائبریری کی دراز میں ہے۔ تم وہاں سے نکال لو۔'' میلاڈو نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پاچو کے جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب ہمیں یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ یہاں آؤ اور بیٹھ جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے دوبارہ اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

میں چند قدم آگے بڑھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ٹہلتا ہوا کھڑکی تک گیا اور پردہ ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''مرکری کہاں ہے؟''

''قریب ہی کھڑی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ گزشتہ رات میں کار لے کر یہاں آیا تھا؟''

''میں ابھی کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تم نے گاڑی کہاں پارک کی ہے؟ کیرن کی لاش کہاں ہے؟''

''میں بھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' میں نے ڈھٹائی سے کہا تو وہ دو قدم آگے بڑھا اور گولی چلا دی۔ میں فوراً ہی جھک گیا اور گولی میرے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا مگر درد کی لہر نے میرے سیدھے بازو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی وقت پاچو ویلڈس وہی سیاہ تھیلا لیے ہوئے لائبریری سے باہر آیا جو میں نے کار کی ڈکی میں دیکھا تھا۔ میلاڈو اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''پاچو! ہمیں مرکری کو تلاش کرنا ہوگا۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں گزشتہ رات اسے تلاش کر چکا ہوں اور میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ تمہارا مسئلہ ہے۔''

میلاڈو کے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ''اس شخص نے ڈکی میں لاش دیکھ لی ہے اور تم نے اسے مارا ہے۔ اب تمہیں میری پناہ کی ضرورت ہے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے میری رقم مل گئی ہے، اب میں جا رہا ہوں۔''

میلاڈو نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ پاچو نے پھرتی سے بیگ آگے کیا اور گولی اس میں سوراخ بناتی ہوئی نکل گئی۔ پھر ایک دھماکا ہوا اور میلاڈو اپنا پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ میلاڈو زمین پر گر گیا۔ پاچو نے ریوالور کا رخ میری طرف کیا اور بولا۔ ''اب میں تمہیں بھی بآسانی نشانہ بنا سکتا ہوں۔''

میں جانتا تھا کہ وہ جس جگہ کھڑا ہے، وہاں سے کم روشنی کی وجہ سے میرا نشانہ نہیں لے سکتا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈائننگ روم کی طرف بھاگا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔

''اوہ، گویا مجھے گولی مارنے کے لیے تمہارے قریب آنا ہوگا۔''

یہ کہہ کر اس نے میری طرف بڑھنا شروع کیا۔ ابھی وہ لیونگ روم کے درمیان میں ہی تھا کہ عقب سے ایک چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ یوں لڑکھڑایا جیسے اسے تیر لگ گیا ہو پھر ایک اور دھماکا ہوا اور پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کا لباس خون سے تر بتر ہو چکا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس کے پیچھے چینی ملازمہ یان باؤ گن ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

''میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ اس نے مادام کیرن کو مارا ہے۔''

☆☆☆

میں لائبریری میں گیا۔ وہاں میز پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا۔ باؤ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئی اور بولی۔ ''تم کسے فون کر رہے ہو؟''

''پولیس کو۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''فون نیچے رکھ دو۔ پولیس بلانے کی ضرورت نہیں۔''

''فون نیچے رکھ دو باؤ! میں کیرن کا دوست ہوں اور تم نے میری جان بچائی ہے۔''

دوسری طرف فون اٹھا لیا گیا تھا۔ وہاں سے آواز آئی۔ ''ہومی سائڈ۔''

''شاید یہ میری غلطی تھی۔'' باؤ بولی۔ ''میں پاچو کو تمہیں گولی مارنے دیتی اور خود اس جھگڑے میں نہ پڑتی۔''

''مجھے گولی مارنے کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور آہستہ سے میز پر رکھ دیا تاکہ رابطہ منقطع نہ ہو۔ میں دو قدم آگے بڑھا اور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں قانون کی مدد لینا ہوگی۔ پاچو نے پہلے کیرن کو مارا پھر اس نے میلاڈو پر گولی چلائی۔ اب پاچو بھی مر چکا ہے۔ اس سے پولیس کو زیادہ ... نہیں پڑے گی۔''

''مجھے جانا چاہیے۔ تم یہاں سے ہٹ جاؤ۔''

http://digestpk.blogspot.com

مشکوک قاتل

مریم کے خان

نیک دلی سے کی جانے والی کوششیں کامیاب تو ہو جاتی ہیں... لیکن ان کی تکمیل کے دوران میں جو رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں... وہ بعض اوقات دل گرفتہ اور قلعوں کو کمزور کر دیتی ہیں... ایک دلکش و خوش بدن دوشیزہ کے گرد گھومتی تحریر... وہ مسلسل نت نئے مسائل کی زنجیر میں الجھتی جا رہی تھی۔

اندھیروں اور اجالوں کی کشمکش سے نبرد آزما کرداروں کی معرکہ آرائیاں

برگس بنڈال ایک دل کش اور خوش بدن عورت تھی۔ قد پانچ فٹ اور پانچ انچ تھا جس میں اس کی لمبی ٹانگوں کا حصہ نمایاں تھا۔ پتلی کمر، متناسب اور بھرے بھرے اعضا اس کی خوب صورتی میں اضافے کا سبب تھے۔ گلابی رنگت، سیاہ ناگ بال، آنکھیں اور ناک سے نقوش اس کی خوب صورتی کو دو آتشہ کر دیتے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک مکمل عورت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ برگے کا ونٹی اسپتال میں داخل ہوئی تو اس نے سفید پھولوں کا ایک بوکے اٹھا رکھا تھا۔ پھول دار فراک میں اس کی جسمانی دل کشی عیاں تھی۔ اس کے بال پونی ٹیل کی صورت میں اس کی پشت پر جھول رہے تھے اور جب وہ دل کش چال

http://digestpk.blogspot.com/

لابی میں موجود ہر فرد کی نظر اس پر جم گئی۔

"سگریٹ پیو۔" میں نے اس کی طرف کیرن کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا جس میں اب بھی دو سگریٹ پڑے ہوئے تھے۔

"بے وقوف انسان! یہ سگریٹ بھرے ہوئے ہیں۔" وہ چلائی۔

میں نے مسکراتے ہوئے ایک سگریٹ ہونٹوں سے لگایا اور پیکٹ دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "پاچو کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں گزشتہ شب کار لے کر یہاں آیا تھا؟"

"مسز میلا ڈو نے اسے فون کیا تھا۔"

"میلا ڈو تو خود گھر پر نہیں تھا۔ اسے میرے آنے کا کیسے معلوم ہوا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ کیرن نے اسے فون کر کے بتا دیا ہوگا؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ بات تو تم اس سے ہی پوچھ سکتے تھے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کس نے اسے فون کیا تھا۔ میرے اور کیرن کے علاوہ صرف تم ہی گزشتہ رات یہاں موجود تھیں۔ تم اس کی ملازمہ نہیں بلکہ یہاں کی نگران ہو اور میلا ڈو کے کہنے پر اس کی نگرانی کرتی تھیں۔ تم میلا ڈو کی پارٹنر تھیں۔ بولو... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تم سب کچھ جان گئے ہو اس لیے تمہارا زندہ رہنا خطرناک ہے۔" یہ کہہ کر باؤ نے مجھ پر گن تان لی۔ اس کی آنکھوں سے درندگی اور سفاکی کی جھلک رہی تھی۔ میرے پاس اپنے بچاؤ کے لیے بہت کم مہلت تھی۔ مجھے فوری طور پر کچھ کرنا تھا۔ میں نے کرسی پر رکھا ہوا کشن اٹھایا اور پوری قوت سے اس پر دے مارا۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑائی تو میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ کمر کے بل زمین پر گری تو میں اس پر سوار ہو گیا اور اس کے دونوں بازوؤں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ وہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی اور کوشش میں تھی کہ کسی طرح دوبارہ گن تک رسائی حاصل کر لے جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔

عین اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ میں نے ٹیلی فون کا ریسیور میز پر رکھا تھا۔ رابطہ منقطع نہیں کیا تھا۔ میں زور سے چلایا۔ "کیا تم ابھی تک لائن پر ہو؟ میں فریک سوئیڈ بول رہا ہوں۔"

اس کی آواز سن کر ایسا لگا جیسے کسی دور دراز کے چھوٹے سے ریڈیو اسٹیشن سے کوئی پرانی ریکارڈنگ سنائی جا رہی ہو۔ "سوئیڈ! میں سن رہا ہوں۔ تم اپنی بات پوری کرو۔"

میں نے چلا چلا کر میلا ڈو ہاؤس کا پتا بتایا اور کہا۔ "یہاں تین لاشیں تمہاری منتظر ہیں۔ مسٹر اور مسز آگسٹن میلا ڈو کو پاچو ویلڈس نے مارا ہے۔ وہ مجھے بھی قتل کرنا چاہ رہا تھا لیکن میلا ڈو کی خادمہ یان باؤ نے مجھے بچانے کی کوشش میں اس پر فائر کر دیا۔ باقی تفصیلات بعد میں بتاؤں گا۔"

"وہ خادمہ کہاں ہے؟"

"فی الحال تو میں نے اسے قابو کیا ہوا ہے لیکن شاید زیادہ دیر ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔"

میری بات ختم ہوتے ہی باؤ نے ایک بار پھر زور آزمائی شروع کر دی۔ وہ میری گرفت میں بری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ "پولیس کے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو۔"

"نہیں، پہلے ہی بہت قتل و غارت گری ہو چکی ہے اور ویسے بھی یہ میرا کام نہیں ہے۔ میری جان بچانے کا شکریہ۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ تم نے میری جان بچانے کے لیے گولی چلائی تھی۔ ممکن ہے کہ اس حوالے سے تمہیں کچھ رعایت مل جائے۔"

پھر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ لائبریری کے کونے میں ایک بڑا سا گتے کا ڈبا رکھا ہوا تھا جس میں شاید کتابیں آئی ہوں گی۔ اس کے اوپر مجھے رسی رکھی ہوئی نظر آئی۔ میں نے باؤ کو اٹھایا اور اسے کرسی پر بٹھا کر رسی سے اچھی طرح باندھ دیا۔ پھر میں نے لائبریری کا دروازہ باہر سے بند کیا اور لیونگ روم کے وسط میں آیا جہاں پاچو کی لاش کے پاس نوٹوں سے بھرا چمڑے کا سیاہ بیگ پڑا ہوا تھا۔ میں نے وہ بیگ کچن میں ایسی جگہ چھپا دیا جہاں کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ میں بعد میں کسی وقت بھی یہ رقم یہاں سے لے جا سکتا تھا کیونکہ کچن میں آنے کا راستہ تو مجھے معلوم ہی تھا۔ پھر میں اطمینان سے ٹہلتا ہوا لیونگ روم میں آیا اور کیرن کے پیکٹ کا آخری سگریٹ سلگا کر پولیس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت مجھے کیرن شدت سے یاد آ رہی تھی۔

"ہائے۔" برگس نے اپنی مترنم آواز میں استقبالیہ پر موجود نرس ریجنا سے کہا۔ "کیا ہو رہا ہے...رک کیسا ہے؟"

ریجنا نے شانے اچکائے۔ "ٹھیک ہے...میرا خیال ہے کہ وہ جاگ گیا ہوگا۔"

"ڈاکٹرز اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"یہی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔" ریجنا نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

"او کے! کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں...اس سے ملنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔" ریجنا نے فوراً کہا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ برگس اس کے سامنے سے چلی جائے۔ ریجنا خود بھی خوبصورت لڑکی تھی لیکن برگس کے سامنے نہ جانے کیوں وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی تھی۔ صرف وہی نہیں، برگس کے سامنے اکثر عورتیں اور لڑکیاں ایسا ہی محسوس کرتی تھیں۔ برگس اس بات کو محسوس کرتی تھی لیکن اس کے خیال میں اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا کیونکہ اسے قدرت نے ایسا بنایا تھا...بالکل اسی طرح جیسے قدرت نے دوسروں کو بنایا تھا۔ وہ جنرل وارڈ میں آئی اور ایک کمرے کے سامنے رک گئی۔ اس نے دستک دی اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

اندر بستر پر ایک ستائیس اٹھائیس برس کا نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سرہانہ اٹھا ہوا تھا اور وہ ٹی وی پر کوئی میچ دیکھ رہا تھا۔ وہ اسپتال کے لباس میں بھی وجیہہ اور شاندار لگ رہا تھا اور بہ ظاہر بالکل ٹھیک تھا...سوائے ماتھے پر بائیں جانب ایک چھوٹی سی چپک جانے والی پٹی کے موجود زخم کے۔ دستک پر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر برگس اندر آئی تو اسے دیکھ کر نوجوان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے برگس کی آمد اس کے لیے انتہائی خوشی کا باعث ہو۔

"ہیلو رک...کیسے ہو؟" برگس نے بوکے اس کے سرہانے رکھ دیے۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ "کل میں سارا دن تمہارا انتظار کرتا رہا۔"

"سوری، دراصل کل میں کام میں پھنس گئی تھی۔" برگس نے معذرت کی۔ "دفتر میں سالانہ ریکارڈ ترتیب دیا جا رہا ہے اور تمام اسٹاف کی شامت آئی ہوئی ہے۔"

"میں سمجھ گیا تھا کہ تم مصروف ہوگی۔" رک نے جلدی سے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں اس کا شکوہ برگس کو ناگوار نہ گزرے۔ وہ بہرحال نہ تو اس کی دوست تھی اور نہ ہی گرل فرینڈ اس لیے اس کی ذمے داری نہیں بنتی تھی کہ وہ اسے اسپتال دیکھنے آئے۔ وہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے رک کے پاس ہی بستر کے کنارے ٹک گئی۔ اسے اس قدر نزدیک دیکھ کر رک کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ برگس کے وجود سے بھینی بھینی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس وقت رک کو وہ دنیا کی حسین ترین عورت نظر آ رہی تھی۔

"تم میرا انتظار کر رہے تھے؟" برگس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو رک نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں، میں دل و جان سے تمہارا انتظار کر رہا تھا اور اگر آج تم نہیں آتیں تو میں اس اسپتال سے نکل کر بھاگ جاتا۔"

"کہاں؟" برگس نے پوچھا۔

اس سوال پر رک کے چہرے پر بے بسی کے تاثرات آ گئے۔ "پتا نہیں...شاید نیویارک چلا جاتا جہاں کا پتا میرے ڈرائیونگ لائسنس پر ہے۔"

"کیا تمہیں بالکل بھی کچھ یاد نہیں ہے؟" برگس نے نرمی سے پوچھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں...مجھے بالکل یاد نہیں ہے کہ میں کون ہوں اور یہاں تک کیسے آیا۔ مجھے اپنا ماضی بالکل یاد نہیں آ رہا۔"

برگس اسے غور سے دیکھ رہی تھی اور اسے رک کے چہرے پر سوائے معصومیت کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ برگس کو اس پر پیار آنے لگا۔ وہ کس قدر دل کش اور معصوم صورت نوجوان تھا۔ برگس نے کسی نوجوان میں ان دونوں چیزوں کا امتزاج کم ہی دیکھا تھا۔ اس نے رک کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تم فکر مت کرو اور ذہن پر زیادہ زور بھی مت دو۔ مجھے یقین ہے جلد تمہیں سب یاد آ جائے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" رک نے گہری سانس لی۔ "ورنہ مجھے لگ رہا ہے میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔"

"حوصلہ رکھو، یہ صورتِ حال عارضی ہے۔ دراصل سر کی چوٹ نے اثر کیا ہے اور جب اس کا اثر ختم ہو جائے گا تو تمہیں اپنا ماضی یاد آ جائے گا۔"

"اثر کب ختم ہوگا؟" رک نے بے دلی سے پوچھا۔

برگس کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے کہا۔ "دماغ کی چوٹ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے لیکن جیسی تمہاری کیفیت ہے، ڈاکٹر ہیری بہت پُرامید ہے۔"

"میں اس جگہ سے اکتا گیا ہوں۔" رک نے اسپتال کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا مجھے یہاں سے نجات نہیں مل سکتی؟"

"اس کا فیصلہ تو ڈاکٹر ہی کرے گا۔"

"تم سفارش تو کر سکتی ہو۔ دیکھو نا، جسمانی لحاظ سے میں

بالکل ٹھیک ہوں۔ صرف یادداشت کا مسئلہ ہے تو ممکن ہے یہاں سے نکل کر مجھ پر اچھا اثر ہو اور میری یادداشت لوٹ آئے۔"

برگس نے سوچا اور بولی۔ "ٹھیک ہے، ہیری آتا ہے تو میں اس سے بات کرتی ہوں۔ ویسے اگر تمہیں ڈسچارج کر دیا جائے تو تم کہاں جاؤ گے؟"

یہ تو رک نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ گزشتہ دو دن میں اسپتال سے اس قدر بیزار آ گیا تھا کہ فوراً یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ دو دن پہلے اسے اسپتال میں ہوش آیا تھا اور اسے اپنی گزری زندگی کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اس کی کار برگس کے گھر کے سامنے کھمبے سے ٹکرا گئی تھی اور اگر برگس فٹ پاتھ پر نہ جاتی تو رک کی کار اس پر بھی چڑھ سکتی تھی۔ اس وقت وہ دفتر جانے کے لیے نکل رہی تھی اور اس کی کار سڑک کے دوسری طرف پارک تھی۔ حادثے کے بعد برگس اور اس کے پڑوسیوں نے رک کو کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بے ہوش پایا تھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ آئی تھی۔ انہوں نے ایمبولینس کا انتظار کیے بغیر برگس کی گاڑی میں اسے اسپتال منتقل کیا جہاں دو گھنٹے بعد ہی اسے ہوش آ گیا مگر اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

رک کے پاس نئے ماڈل کی فورڈ وین تھی اور اس کے لباس سے ملنے والے پرس میں اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور ایک کریڈٹ کارڈ تھا۔ ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق اس کا نام رک جونز تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس برس اور پیشہ نامعلوم تھا۔ رک کے ہوش میں آنے کے بعد کاؤنٹی کے ڈپٹی شیرف رینڈل کارلوس نے اس سے بیان لیا۔ ڈپٹی کے ہر سوال کا جواب رک نے نفی میں دیا۔ اس کے سر پر آنے والی چوٹ معمولی نوعیت کی تھی اور اس کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرانے کے نتیجے میں آئی تھی۔ لیکن جب ہوش میں آنے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں آیا تو اس کا سی ٹی اسکین کیا گیا۔ اسکین میں دماغ میں کسی چوٹ یا اندرونی جریانِ خون کے آثار نہیں تھے۔ ڈاکٹر ہیری کے مطابق رک کی یادداشت عارضی طور پر متاثر ہوئی تھی، اسے جلد سب کچھ یاد آ جاتا۔

رک کے پرس میں کوئی بارہ سو ڈالرز کی رقم موجود تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس کے پاس کوئی موبائل نہیں تھا۔ اس نے برگس سے کہا۔ "میں کسی ہوٹل میں رک جاؤں گا...جب تک پولیس میرے بارے میں انکوائری نہیں کر لیتی اور مجھے سب کچھ یاد نہیں آ جاتا۔"

برگس کی رہائش انڈیانا کے ایک چھوٹے سے قصبے برسکے میں تھی۔ یہ مشی گن لیک سے کچھ فاصلے پر ہے۔ برسکے ہائی ویز سے ذرا دور پڑتا تھا اس لیے یہاں موٹل یا ہوٹل کی سہولت بہت کم تھی۔ برسکے میں ایک ہوٹل تھا جو معیار کے لحاظ سے رک کے لیے مناسب نہیں تھا۔ مشی گن لیک کے ساتھ کچھ تفریحی ہوٹلز تھے لیکن وہ قصبے سے دور پڑتے تھے۔ برگس ہچکچائی پھر اس نے کہہ دیا۔ "تم چاہو تو میرے ساتھ رک سکتے ہو۔ میرے گھر میں اوپری منزل پر ایک کمرا خالی ہے۔"

رک کے چہرے پر خوشی نمودار ہو گئی۔ ظاہر ہے برگس جیسی حسین عورت کے گھر میں رکنا کسی بھی مرد کے لیے خوشی کا باعث تھا۔ رک کے تاثرات دیکھ کر برگس شرما گئی۔ اس دوران میں ڈاکٹر ہیری وہاں آ گیا۔

"ہیلو...کیا ہو رہا ہے؟" اس نے رک کا چارٹ اٹھایا۔ "میرا خیال ہے اب تمہیں مزید اسپتال میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔" رک بولا۔

"ٹھیک ہے۔" ہیری نے اس کے چارٹ پر ڈسچارج لکھ دیا۔ "تم باہر نکل کر گھومو پھرو اور سیر کرو۔ یہ علاقہ بہت خوب صورت ہے۔ امید ہے اس دوران میں تمہاری کھوئی یادداشت لوٹ آئے گی۔"

"میں اسے اپنے گھر لے جا رہی ہوں۔" برگس نے کہا تو ایک لمحے کو ہیری ٹھٹک گیا لیکن اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ برگس اکیلی رہتی ہے اور رک بالکل اجنبی ہے۔ دو دن پہلے تک وہ اسے جانتی بھی نہیں تھی۔ البتہ اس نے اتنا کہا۔

"رینڈل کو اطلاع دیتی ہوں۔"

"تم فکر مت کرو، میں اسے خود اطلاع دے دوں گی اور اس نے رک سے مزید کوئی بات کرنی ہوئی تو میرے گھر آ جائے گا۔"

ایک نرس نے رک کا سامان اور کپڑے لا دیے۔ اس نے کپڑے بدلے اور برگس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ رک کسی قدر لمبا اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے برگس کو اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی فورڈ وین پولیس اسٹیشن میں کھڑی تھی۔ برگس نے اس سے کہا۔ "پہلے پولیس اسٹیشن چل کر تمہاری گاڑی اور سامان لے لیتے ہیں۔"

"سامان کیا ہے؟"

"ایک سوٹ کیس ہے جو لاک ہے۔ پولیس نے بھی اسے نہیں کھولا ہے۔ اب تم دیکھنا، ہو سکتا ہے اس میں کوئی ایسی چیز نکل آئے [illegible]"

http://digestpk.blogspot.com

"تو پھر پولیس اسٹیشن چلو۔" رک نے کسی قدر بے تابی

سے کہا۔

باہر برگس کی سرخ رنگ کی شیوی کار کھڑی تھی۔ رک نے اس کی تعریف کی تو برگس خوش ہو گئی۔ اسے اپنی کار بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ پولیس اسٹیشن پہنچے تو وہاں رینڈل موجود تھا۔ اس نے برگس کو دیکھتے ہی کہا۔

”ہائے برگ... کیسی ہو؟“

لیکن جب اس نے رک کو ساتھ دیکھا تو اس کا جوش و خروش ذرا کم ہو گیا۔ ”تمہیں کچھ یاد آیا؟“

”نہیں۔“ رک کے بجائے برگس نے کہا۔ ”ابھی اسے کچھ یاد نہیں۔ اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا ہے اور میں اسے اپنے گھر لے جا رہی ہوں۔“

”غالباً تم اسے اپنے ہاتھ کی بنی کافی پلانا چاہ رہی ہو۔“ رینڈل نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہاری کافی واقعی لاجواب ہوتی ہے۔“

”یہ میرے گھر کچھ دن رکے گا، جب تک اس کی یادداشت بحال نہیں ہو جاتی۔“ برگس نے رینڈل کو اطلاع دی تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ برگس کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔

”تم اسے اپنے گھر لے جا رہی ہو جبکہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟“

”ہاں لیکن یہ مجھے اچھا شخص لگ رہا ہے۔“ برگس نے سادگی سے جواب دیا۔ ”مجھے امید ہے اس کی وجہ سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”خدا کے لیے برگ...“ رینڈل نے کہنا چاہا۔

”رک کی کار کی چابی اور سامان۔“ برگس نے اپنی گلابی ہتھیلی اس کے سامنے کر دی۔

رینڈل نے بادلِ ناخواستہ چابی اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس برگس کے حوالے کیا۔ ”یہ اس کی کار کی ڈکی سے نکلا ہے اور اس میں نمبر والا لاک ہے اس لیے ہم نے اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔“

”نمبر والا لاک!“ برگس نے مایوسی سے کہا۔ ”رک کو اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں، سوٹ کیس کا نمبر کہاں یاد ہوگا۔“

رینڈل لمبا تڑنگا اور صحت مند تھا۔ گڑیا سی برگس کے سامنے تو وہ دیو ہی نظر آتا تھا۔ اس نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ ”تمہیں اس شخص کا کچھ زیادہ ہی خیال نہیں ہے؟“

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟“ برگس بولی۔ ”یہ بے چارہ میرے گھر کے سامنے حادثے کا شکار ہوا اور پھر ہوش میں آنے کے بعد یادداشت بھی کھو بیٹھا۔ یہ ہماری ہمدردی اور توجہ کا مستحق ہے۔“

”تو دو توجہ۔“ رینڈل جل کر بولا۔ وہ خود بہت سالوں سے برگس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بجا طور پر اس نوجوان سے حسد کر رہا تھا جس نے آتے ہی برگس کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ رینڈل نے اس کے سامنے ایک فارم رکھا۔ ”اس پر سائن کر دو۔“

برگس نے سائن کیے اور ایک بار پھر رینڈل کا شکریہ ادا کر کے رک کے ساتھ باہر نکل آئی۔ شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ اس نے رک کو اس کی کار کی چابی دی۔ ”تمہیں ڈرائیو کرنے میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا؟“

”نہیں۔“ رک نے یقین سے کہا۔

”تب میری کار کے پیچھے آؤ۔“ برگس نے اسے سوٹ کیس بھی تھما دیا اور اپنی کار کی طرف چلی گئی تھی۔ رک نے اسے دیکھ کر گہری سانس لی تھی۔ اسے اپنا ماضی یاد نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس نے شاذ ہی کسی اتنی حسین عورت کو پاس سے دیکھا ہوگا۔ اس کے گھر میں، اس کے پاس رکنا تو رک کے لیے جنت میں ٹھہرنے سے کم نہیں تھا۔ اس نے سوٹ کیس کار میں ڈالا اور برگس کی گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ قصبے کے شمال میں برگس کا گھر ایک چھوٹی سی لیکن خوب صورت اور سرسبز سڑک پر تھا۔ تمام گھروں کے سامنے چھوٹے لان تھے۔ اصل میں یہ مختصر فیملی کے لیے بنے ہوئے چھوٹے دو منزلہ مکانات تھے۔ برگس نے چند سال پہلے مکان بک کرایا تھا اور پھر اس نے بینک کو پوری رقم دے کر مکان خرید لیا۔ مکان کی قسط سے نجات حاصل کر کے ہی وہ نئی کار لینے میں کامیاب ہوئی تھی۔ یہ موقع اسے اپنے ایک دور دراز کے انکل کی غیر متوقع وفات کی وجہ سے ملا تھا کیونکہ انہوں نے اپنی دولت کا کچھ حصہ برگس کے لیے بھی چھوڑا تھا اور اس کی مدد سے اس نے قبل از وقت بینک کا قرض ادا کر کے مکان کی ملکیت حاصل کر لی تھی۔

اس نے کار لان کے ساتھ ڈرائیو وے میں روکی۔ مکان میں اندر گیراج کی سہولت نہیں تھی۔ رک نے اپنی وین سڑک کے ساتھ ہی روک دی اور اتر کر برگس کے پاس آیا۔ اس نے مکان کا دروازہ کھولا اور رک کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ رک نے لیونگ روم سے مکان کا معائنہ کیا اور تعریفی انداز میں بولا۔ ”تم نے مکان بہت اچھی طرح سے سجا رکھا ہے۔“

برگس خوش ہو گئی۔ ”واقعی... میں نے خود اس کی سجاوٹ کی ہے۔“

رک نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم جتنی خوب صورت ہو تمہارا ذوق بھی اتنا اچھا ہے۔“

”شکریہ۔“ برگس شرما گئی۔ ”آؤ میں تمہیں کمرا دکھا دوں۔ پھر میں رات کے کھانے کے لیے کچھ بناتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے، میں کھانا باہر ہی کھا لوں گا۔“ رک نے جلدی سے کہا۔

”ارے نہیں... ایک آدمی کا... کھانا بنانا کون سا مشکل کام ہے۔“ برگس نے رک رک کر کہا۔ ”پھر مجھے کھانے بنانے کا شوق ہے۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے ڈشز کم ہی بناتی ہوں۔ اب تمہارے لیے ڈشز بناؤں گی تو میرا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔“

رک شکر گزار نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے یاد تو نہیں لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھے گھر کے کھانے سے رغبت ہے۔“

برگس ایک لمحے کو چپ ہوئی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ممکن ہے تم شادی شدہ ہو۔“

رک ساکت رہ گیا پھر اس نے زیرِ لب کہا۔ ”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“

”اس کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔“ برگس اس کے ساتھ اوپر کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے نام سے اور گھر کے پتے سے فون نمبر نکالا جا سکتا ہے۔ اگر وہاں کسی نے کال ریسیو کی تو کام آسان ہو جائے گا۔“

وہ اسے اوپر والے بیڈ روم میں لائی۔ یہ چھوٹا تھا لیکن یہاں بیڈ سمیت تمام سہولیات تھیں۔ ساتھ میں واش روم بھی تھا۔ کبھی کبھی برگس سے ملنے اس کی ماں یا کوئی اور آتا تھا تو یہ بیڈ روم کام آتا تھا۔ ”کیسا ہے؟“

”بہترین۔“ رک نے سوٹ کیس ایک طرف کرسی پر رکھ دیا۔

”دراصل قصبے کا واحد ہوٹل مجھے تمہارے معیار کا نہیں لگا اس لیے میں تمہیں یہاں لے آئی۔“

”وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔“ رک نے کہا۔ ”لیکن تم نے میرے معیار کا اندازہ کیسے لگایا؟“

”تمہاری گاڑی، تمہارے لباس اور اس سوٹ کیس سے۔ تمہاری ہر چیز مہنگی اور نفیس ہے۔ اس کا مطلب ہے تم دولت مند بھی ہو اور ذوق بھی رکھتے ہو۔“

”لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”میں کون ہوں اور نیو یارک سے ایک ہزار میل دور یہاں کیوں آیا ہوں؟“

”فکر مت کرو، جلد یاد آ جائے گا۔“ برگس نے اسے تسلی دی۔ ”میں کھانا بنانے جا رہی ہوں۔ تم چاہو تو آرام کر لو یا پھر نیچے آ جانا۔ تم اپنا سامان اس الماری میں سیٹ کر سکتے ہو۔“

برگس نیچے آئی اور کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ وہ کھانا بنا رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف اس کی دفتر کی ساتھی اور دوست کم تھی۔ اس نے اسے بتایا۔ ”کل صبح جنرل میٹنگ ہے۔“

”کس سلسلے میں؟“ برگس نے پتیلی میں چمچہ چلاتے ہوئے پوچھا۔

”مسئلہ وہی ہے کہ ہم انفرادی طور پر کام کیوں کر رہے ہیں؟“

”اگر ہم انفرادی طور پر کام کر رہے ہیں تو اس سے اوپر والوں کو کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ کم بیزاری سے بولی۔ وہ کورین نژاد تھی لیکن امریکا میں پیدا ہوئی تھی۔ ”بہرحال، تم سات بجے تک آ جانا۔“

”او کے... میں کوشش کروں گی۔“ برگس نے کہا اور فون رکھ دیا۔ وہ مڑی تو رک کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

”اوہ تم... آ جاؤ، یہ کرسی لے لو۔“

”شکریہ۔“ رک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اگر تم برا نہ مانو تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ ابھی فون پر تم کس مسئلے کے بارے میں بات کر رہی تھیں؟“

”ہاں... میں منشیات کی بحالی کے ادارے میں کام کرتی ہوں۔ یہ سرکاری ادارہ ہے لیکن اس کی کارکردگی سے مطلوبہ نتائج نہیں نکل رہے تھے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ علاقے میں منشیات استعمال کرنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آ رہی تھی؟“

”بالکل یہی بات ہے۔ پھر میں نے اور میرے کچھ ساتھیوں نے مل کر ایک این جی او بنائی۔ اس کے لیے علاقے کے بہت سارے مخیر حضرات نے ہمیں فنڈ فراہم کیے اور ہم نے اس کا ذہنی میں منشیات استعمال کرنے والے افراد سے براہِ راست رابطہ کیا اور انہیں نشے سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ اس کا بہت اچھا نتیجہ نکلا اور بہت سارے لوگوں نے نشہ ترک کر دیا۔ ہم نے صرف لوگوں کو نشے سے ہی نہیں بچایا بلکہ انہیں کارآمد شہری بنا دیا کہ وہ کم سے کم ایک نشہ کرنے والے کی عادت چھڑائیں۔ اس کے نتیجے میں بہت سارے لوگ جو پہلے خود مختلف چیزوں کا نشہ کرتے تھے، اب ہمارے ساتھ بطور رضا

http://digestpk.blogspot.com

کا رہیں۔"

رک غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "یہ تو تم بہت اچھا کام کر رہی ہو... لیکن مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ..." برگس نے گہری سانس لی۔ "مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ادارے کے افسران نہیں چاہتے کہ ہم ادارے سے ہٹ کر کوئی این جی او بنا کر کام کریں کیونکہ اس سے ان کی افادیت پر انگلیاں اٹھ سکتی ہیں اور لوگ سوال کر سکتے ہیں کہ ان کے ٹیکس سے ایسے ناکارہ ادارے کیوں چلائے جا رہے ہیں جو اپنے مقاصد پورے کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں... اور ان سے کہیں کم وسائل رکھنے والی این جی او کیسے کامیاب ہو رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے برگس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

رک مسکرایا۔ "لگتا ہے تم اپنے افسران سے بہت تنگ ہو؟"

"ہاں کیونکہ ہماری کامیابیاں نہ صرف لوگوں کو منشیات سے بچانے میں موثر ثابت ہوئی ہیں بلکہ ہم نے منشیات کا کاروبار کرنے والوں کا سراغ لگا کر پولیس کو ان کے بارے میں اطلاع بھی دی۔ بہت سارے لوگ گرفتار ہوئے اور کئی سو کلوگرام منشیات برآمد ہوئی۔" برگس فخر سے بولی۔ "ان سے ہماری یہ کامیابیاں ہضم نہیں ہو رہیں۔"

"کن سے؟" رک سوچتے ہوئے بولا۔

"ہمارے افسران سے... وہ ہمارے پیچھے پڑے ہیں کہ ہم یہ این جی او بند کر دیں لیکن ہم نے انکار کر دیا ہے۔ ممکن ہے ہمیں آج آخری وارننگ دی جائے۔"

"کیا تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو نوکری سے نکال دیا جائے گا؟"

برگس پریشان نظر آنے لگی۔ "اگر ایسا ہوا تو ہم بہت پریشانی میں پڑ جائیں گے کیونکہ ہمیں ادارے کی جانب سے بہت اچھی تنخواہ ملتی ہے اور این جی او سے کچھ نہیں ملتا۔ اصل میں این جی او کے وسائل محدود ہیں۔"

"اوہ... اس کا مطلب ہے کہ تم میں سے کئی لوگ افسران کی بات ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ میں تو اکیلی ہوں لیکن اکثر بیوی بچوں والے ہیں اور ان کے اخراجات بھی اسی لحاظ سے ہیں۔"

رک نے اسے غور سے دیکھا۔ "یعنی تم این جی او نہیں چھوڑو گی؟"

برگس ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ "میں این جی او نہیں چھوڑ سکتی۔ میں نے ہی تو یہ این جی او بنائی ہے۔"

"اچھا، یہ تمہارا کام ہے؟" رک نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "تمہیں دیکھ کر لگتا نہیں کہ تم اتنا اہم کام کر رہی ہو۔"

"مجھے منشیات فروشوں کی جانب سے دھمکیاں ملتی رہتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ میرے کام سے خوف زدہ ہیں۔"

"ظاہر ہے تم ان کے بزنس کو تباہ کر رہی ہو۔"

"یہ بزنس نہیں موت کا کھیل ہے۔" برگس بولی۔ "تم نے شاید کسی منشیات استعمال کرنے والے کو مرتے نہیں دیکھا۔ ان میں سے نوے فی صد پچیس سال سے کم عمر ہوتے ہیں۔ ہماری نوجوان نسل موت کے منہ میں جا رہی ہے اور جو زندہ ہے، وہ سسک سسک کر جی رہی ہے۔"

رک اس کے...... جذبات سے متاثر ہوا۔ "تم یقیناً بہادر عورت ہو جو اتنے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑی ہوئی ہو۔"

"میں بہادر نہیں ہوں لیکن میں منشیات سے نفرت کرتی ہوں۔ میرا بڑا بھائی منشیات استعمال کر کے موت کے منہ میں چلا گیا۔ اس وقت میں صرف بارہ سال کی تھی۔ میں اور گریم اپنی ماں کی دو ہی اولادیں تھیں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میری ماں نے یہ صدمہ کس طرح برداشت کیا۔ وہ نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی اور دو سال اسپتال میں داخل رہی۔ میں نے بھائی کے مرنے پر فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کوئی ایسا کام کروں گی جس سے لوگوں کو منشیات سے بچایا جا سکے۔"

"اس لیے تم نے اس ادارے میں ملازمت کی؟"

"ہاں، میں گزشتہ سات سال سے یہاں ملازمت کر رہی ہوں۔ میں نے صرف ملازمت برائے ملازمت نہیں کی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کئی کورس بھی کر رکھے ہیں۔"

"جبھی تم ایک این جی او بھی چلا رہی ہو۔"

"میں نے کہا نا میں بہادر نہیں ہوں لیکن منشیات کے خلاف میں ہر جگہ لڑوں گی۔"

رک اسے دیکھتا رہا پھر اس نے خلوص بھرے انداز میں کہا۔ "اس سلسلے میں تمہیں تعاون درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔"

برگس کھل اٹھی۔

☆☆☆

ادارہ برائے بحالی منشیات زدگان کی عمارت خاصی خوب صورت تھی اور اسے دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ اس کی تعمیر اور آرائش پر بڑی رقم خرچ کی گئی ہے۔ اندر بھی مہنگے فرنیچر اور دیگر سازوسامان کے باعث اس کی آرائش دیدنی تھی۔ ادارے میں کل بیس افراد کا عملہ تھا جن پر کاؤنٹی سالانہ پچاس لاکھ ڈالرز تنخواہوں اور الاؤنسز کی مد میں خرچ کرتی تھی جبکہ

ادارے کا کُل بجٹ ڈیڑھ کروڑ ڈالرز سالانہ تھا۔ دفتر کے ساتھ ہی ادارے کی وہ عمارت بھی تھی جو منشیات کے عادی افراد کی بحالی کے لیے مخصوص تھی۔ یہ ایک سادہ سی عمارت تھی اور یہاں سہولیات بھی اتنی نہیں تھیں لیکن یہاں موجود عملہ تن دہی سے مریضوں کی خدمت کرتا تھا۔ ادارے کی رپورٹ کے مطابق یہاں سالانہ دو ہزار افراد کو منشیات ترک کرنے میں مدد دی جاتی تھی لیکن رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا کہ ان میں سے کتنے افراد مستقل منشیات ترک کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

دو سال پہلے تک یہ حال تھا کہ کاؤنٹی کے پارکوں اور جنگلوں میں منشیات کے عادی افراد کے گروہ نظر آنے لگے تھے۔ یہ بے گھر اور بے روزگار افراد تھے جنہیں صرف نشے سے مطلب ہوتا ہے اور یہ اس کے لیے چوری اور ڈکیتی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پھر برگس نے منشیات کے عادی افراد کی بحالی کے لیے ایک این جی او فرینڈز کے نام سے بنائی اور اس کے رضاکاروں نے منشیات کے عادی افراد سے براہِ راست رابطہ کیا اور یہ طریقہ موثر ثابت ہوا۔ بجائے اس کے کہ کسی کے منشیات ترک کرنے کا انتظار کیا جائے رضاکار خود ان تک پہنچتے اور انہیں قائل کرتے کہ نشہ کرنا ان کے اور معاشرے کے لیے کسی طرح بھی فائدہ مند نہیں ہے۔ وہ بحالی میں انہیں مدد دیتے تھے۔ جو افراد نشہ مکمل طور پر ترک کر دیتے تھے انہیں ملازمت دلاتے تھے اور انہیں معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے تھے۔ این جی او نے ایسے افراد کا ایک کلب بھی بنایا تھا جہاں وہ مختلف تفریحات میں حصہ لیتے تھے۔ دو سال کے عرصے میں منشیات استعمال کرنے والوں کی تعداد میں خاصی کمی آئی تھی اور اب وہ پارکوں اور جنگلوں میں گروہوں کی صورت میں نظر نہیں آتے تھے۔ اس سے جرائم میں بھی کمی آئی تھی۔ اس این جی او کی روحِ رواں برگس تھی۔

ادارہ کل چار افسران پر مشتمل تھا۔ کول مارک اس کا ڈائریکٹر تھا جبکہ جیمن ہٹسن اس کا ڈپٹی تھا۔ مائیکل ایڈمن آفیسر تھا اور کیلین اس کا رابطہ افسر تھا۔ اس وقت ان میں سے تین کول، جیمن اور کیلین میٹنگ کر رہے تھے۔ وہ کول کے دفتر میں موجود تھے۔ ان کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔

"میرا خیال ہے کہ آج کی وارننگ کے بعد یہ ڈراما ختم ہو جائے گا۔" کیلین نے کہا۔

"یہ تمہاری سوچ ہے۔" جیمن کے لہجے میں تلخی تھی۔ "بعض لوگ بہت ضدی ہیں اور وہ کسی صورت ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔"

"اس صورت میں یہ معاملہ پریس میں آجائے گا۔" کول بولا۔ "جو بھی جاب سے نکالا جائے گا، وہ لازمی اس کا رونا روئے گا۔"

"تو ہم کیا کریں... ان لوگوں کو برداشت کرتے رہیں؟" جیمن نے سوال کیا۔ "یہ تنخواہ ادارے سے لے رہے ہیں اور کام برگس کی این جی او کا ہو رہا ہے۔"

کول ان دونوں کی نسبت سچ مچ کول تھا۔ "اصل میں ہم سے غلطی ہوئی ہے اور اگر ہم برگس کی تجویز کو ادارے کی سطح پر مان کر نافذ کر دیتے تو وہ این جی او نہیں بناتی اور ہمارے قابو میں بھی رہتی۔"

"مشکل ہے... تم نے دیکھا نہیں، اس نے ذرا سی بھی لچک دکھانے سے انکار کر دیا ہے۔" کیلین نے کول کو یاد دلایا۔

"میں نے سنا ہے اسے منشیات فروشوں نے دھمکیاں بھی دی ہیں کہ اگر اس نے این جی او بند نہ کی تو..." جیمن نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اگر یہ درست ہے تو اس سے صورتِ حال اور خراب ہو جائے گی۔" کیلین بولا۔ "کسی بھی تشدد کے نتیجے میں معاملہ فیڈرل کے پاس چلا جائے گا اور وہ تمام معاملات کی کھوج کریں گے۔"

"اسی لیے تو ہماری کوشش ہے کہ معاملہ بغیر کسی ہنگامے کے نمٹ جائے۔" کول نے کہا۔

"اگر برگس مان جائے تو باقی ملازمین کا اتنا مسئلہ نہیں ہے۔" جیمن نے کہا۔ "مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ ماننے کی نہیں۔"

"ہاں، مسئلہ اسی کا ہے۔" کول نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ "بہر حال، آج کی میٹنگ میں دیکھتے ہیں۔"

جیمن اور کیلین اٹھ کر کول کے کمرے سے نکل گئے۔ ایک گھنٹے بعد وہ سب میٹنگ روم میں جمع تھے۔ عام طور سے جنرل میٹنگ بلانے کی نوبت کم آتی تھی بلکہ جنرل میٹنگ کے نام پر ملازمین کو احکامات دیے جاتے تھے۔ یہ شاید پہلا موقع تھا جب سچ مچ جنرل میٹنگ کی جا رہی تھی۔ کیلین اور جیمن کئی روز سے ملازمین کو رام کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور بعض افراد کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ ان کی کوششیں کامیاب رہی ہیں جبکہ کچھ کے چہروں پر سرکشی جھلک رہی تھی۔ ان میں سب سے نمایاں برگس کا چہرہ تھا۔ کول کو تعجب ہوتا کہ وہ چاہتی تو کوئی سپر ماڈل بن سکتی تھی۔ وہ ہالی ووڈ میں قسمت آزمائی کر سکتی تھی اور کم سے کم ماڈلنگ میں اسے کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن وہ اس ادارے میں اپنی محنت اور جوانی منشیات کے عادی افراد کے ساتھ ضائع کر رہی تھی۔

http://digestpk.blogspot.com/

مائیکل وہاں موجود تھا۔ ایڈمن آفیسر کی حیثیت سے اس نے میٹنگ کا ایجنڈا سنایا۔ اس کے بعد کول مطلب کی بات پر آگیا۔ "دوستو... جیسا کہ پہلے بھی اس پر بحث ہو چکی ہے کہ ایک ادارے کے ہوتے ہوئے ویسا ہی دوسرا ادارہ نہیں بنایا جا سکتا۔"

"کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟" برگس نے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا۔ "صرف نارکوٹکس کو لیا جائے تو وفاقی سطح پر کم سے کم نصف درجن ادارے کام کر رہے ہیں۔"

"وہ الگ مسئلہ ہے۔"

"یہ بھی الگ مسئلہ ہے۔" برگس سختی سے بولی۔ "اصل بات یہ ہے کہ ادارے میں کام کرنے کے بعد ہم اپنے طور پر کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہیں اور کوئی ہم پر پابندیاں نہیں لگا سکتا۔"

"یہ درست ہے۔" کول نے خلاف توقع برگس کی تائید کی۔ "لیکن اس سے ہمارے ادارے کے لیے کچھ مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ہم کسی این جی او کے انداز میں کام نہیں کر سکتے۔ ہمیں قیود و حدود کا پابند رہنا پڑتا ہے۔"

"اس سے ہمارا کیا تعلق ہے؟" برگس نے پھر کہا۔ "میری این جی او نے کبھی ادارے کے معاملات میں مداخلت نہیں کی۔"

"لیکن اس سے ہماری ساکھ پر حرف آتا ہے۔"

"سر... اس مسئلے کا حل کارکردگی بہتر بنانا ہے نہ کہ دوسروں کو کام سے روکنا۔" برگس کسی صورت اپنے موقف سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ کمین اور جیمن اس وقت حیران رہ گئے جب کول نے طے شدہ وارننگ دینے کے بجائے معاملے کو اگلی میٹنگ تک اٹھانے کا کہہ کر میٹنگ ختم کر دی۔ وہ میٹنگ روم سے نکلا تو کمین اور جیمن اس کے پیچھے لپکے اور انہوں نے کول کو اس کے دفتر کے باہر گھیر لیا۔

"یہ کیا... تم نے اصل بات تو کی ہی نہیں؟" کمین برہمی سے بولا۔

"تم نہیں جانتے کہ برگس کو نہ روکا گیا تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟" جیمن پرسکون لیکن کاٹ دار لہجے میں بولا۔

"میں سب سمجھتا ہوں لیکن ہمیں اس مسئلے کو نرمی اور ایسے سلجھانا ہوگا کہ بات ادارے سے باہر نہ جائے۔ اگر میں انہیں آج وارننگ دے دیتا تو کل تک میری میز پر کم سے کم نصف درجن استعفے پڑے ہوتے اور اس کے بعد معاملے کو پریس تک آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ یونین کونسل کے ایک رکن نے ایک اخباری انٹرویو میں ادارے کی کارکردگی کو تنقید کا ہدف بناتے ہوئے اس کے فنڈز کا مسئلہ اگلے اجلاس میں اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے؟" کمین نے کہا۔

"اس سے کچھ نہیں ہوگا۔" کول نے سکون سے کہا۔ "ابھی بجٹ کی منظوری میں چار مہینے ہیں۔"

"اس وقت تک صورت حال اور خراب ہو جائے گی۔" کمین کے لہجے میں مایوسی آگئی۔ "فنڈز میں کمی کا مطلب ہے لازمی آڈٹ... اور اس کا مطلب ہم تینوں اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"مجھے بھی مسائل کی شدت کا اندازہ ہے لیکن اس وجہ سے میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" کول نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اپنے دفتر میں چلا گیا۔ ان تینوں کو پتا نہیں تھا کہ کول کے کمرے کے برابر میں واقع ریکارڈ روم میں کم موجود تھی اور اس نے ان تینوں کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ ایک فائل لینے آئی تھی اور اس نے سب سن لیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ چپکے سے نکلی اور سیدھی برگس کے پاس آئی۔

"آج میں بال بال بچ گئی۔" اس نے اپنے کمپیوٹر پر مصروف برگس سے کہا۔ وہ سر اٹھائے بغیر بولی۔

"آج تم نے پھر رش ڈرائیونگ کی ہوگی۔"

"نہیں۔" کم نے سرگوشی میں کہا اور اسے وہ سب سنا دیا جو اس نے کمین، جیمن اور کول سے سنا تھا۔ "یہاں کوئی بڑا گیم کھیلا جا رہا ہے اور سب تمہارے تو شدید خلاف ہیں۔"

برگس فکر مند ہوئی لیکن بہت زیادہ نہیں۔ اس نے کم سے کہا۔ "تم ذرا ان لوگوں پر نظر رکھنا کہ یہ میرے یا این جی او کے خلاف کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔"

"لیکن یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" کم نے معصومیت سے پوچھا۔ وہ سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اس لیے سامنے کی بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ لوگ ادارے کے فنڈز کھا رہے ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ اگر یونین کونسل کی جانب سے معاملے کی تحقیقات کی گئیں تو ان کی کرپشن سامنے آجائے گی۔"

"میرے خدا..." کم کی ننھی منی آنکھیں پھیل گئیں۔

"لیکن تم اپنا خیال رکھ کر کام کرنا۔" برگس نے اسے ہدایت کی۔

☆☆☆

برگس جب گھر پہنچی تو چھ بج رہے تھے۔ رک اوپر کمرے میں تھا اور شاید سو رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آئی اور لباس بدل کر باہر نکلی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور

دروازے پر دستک دی۔ "یس!" اندر سے رک نے پکارا۔ برگس اندر داخل ہوئی۔ رک کھڑکی کے پاس کرسی لیے بیٹھا تھا۔

"کیا حال ہے؟"

اس نے بے دلی سے برگس کی طرف دیکھا۔ "ٹھیک ہوں لیکن آج سارا دن مجھے کوشش کے باوجود اپنا ماضی یاد نہیں آیا۔"

"آجائے گا... اس سلسلے میں اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل میں تم ایک اجنبی جگہ ہو۔ اگر اپنے ماحول میں ہوتے تو بہتر ہوتا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں... لیکن پولیس بھی کچھ نہیں کر رہی ہے۔"

"یہ ایک دیہی علاقہ ہے اور یہاں پولیس اتنی تیز نہیں ہے۔ امید ہے ایک دو دن میں کوئی نتیجہ نکل آئے گا۔ تب تک تم یہاں گھوم پھر کر دیکھو اور خود کو فریش کرو۔"

رک خوش ہو گیا۔ "ہاں، میں یہ کر سکتا ہوں لیکن کیا تم میرے ساتھ چلوگی؟"

برگس ہچکچائی مگر مان گئی۔ "لیکن ہم زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہیں گے۔ مجھے این جی او کے سلسلے میں کچھ کام ہے۔"

"ہم ساتھ چلتے ہیں... وہ کام بھی نمٹا لیں گے اور تمہیں باہر ڈنر بھی کرائیں گے۔" رک نے تجویز پیش کی تو برگس مان گئی۔ پھر اس کی نظر سوٹ کیس پر گئی۔

"تم نے اسے کھول کر نہیں دیکھا؟"

"نہیں، مجھے اس کا لاک کی کمبی نیشن یاد نہیں آرہا۔ میں نے کوشش کی تھی لیکن یہ کھلا نہیں۔"

"ممکن ہے اس میں کوئی ایسی چیز ہو جس سے تمہارے بارے میں بہتر طور پر معلوم ہو سکے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اگر کل تک مجھے کچھ یاد نہیں آیا تو میں اس کا لاک توڑ دوں گا۔"

برگس نے کہا۔ "تم تیار ہو کر آجاؤ، میں نیچے ہوں۔"

"مجھے کیا تیار ہونا ہے، بس منہ دھو کر اور کنگھی کر کے آتا ہوں۔ میرے تو کپڑے بھی سوٹ کیس میں ہیں۔" رک نے ہنس کر کہا۔

نیچے آکر برگس نے اپنا سب سے بہترین سوٹ نکالا۔ یہ سرخ رنگ کا لباس تھا جو محض دو ڈوریوں کی مدد سے اس کے شانوں پر ٹکا رہتا تھا۔ نیچے سے تنگ ہونے کی وجہ سے اس کی دائیں ٹانگ نمایاں ہو جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس لباس میں وہ جان لیوا حد تک حسین نظر آتی ہے۔ رک جب نیچے آیا تو وہ لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ دروازے پر دستک کے جواب میں اس نے کہا۔ "آجاؤ۔"

رک اندر آیا اور اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ برگس شرما گئی۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

رک آگے آیا اور نرمی سے اسے بانہوں میں لے کر عملی طور پر بتایا کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔ اس کی قربت میں برگس کی سانس تیز ہو گئی تھی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں سے نکل گئی۔ "یہ مناسب نہیں ہے۔"

رک مرجھا گیا۔ "ہاں، شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے تو اپنے بارے میں نہیں پتا کہ میں کون ہوں؟"

"جب تک تمہاری یادداشت کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، تمہیں کسی اور طرف توجہ نہیں دینی چاہیے۔" برگس نے کہا اور دوبارہ لپ اسٹک ٹھیک کرنے لگی۔ پھر وہ باہر آئے۔ طے ہوا کہ وہ برگس کی شیوی میں جائیں گے لیکن ڈرائیونگ رک کرے گا۔ تفریح گاہ برگس منتخب کرے گی اور بل رک دے گا۔

"آج سارا دن تم نے کیا کیا؟"

"کچھ نہیں، میں اپنے بارے میں یاد کرنے اور جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اپنا نیو یارک کا فون نمبر تلاش کر لیا لیکن وہاں بیل جا رہی ہے اور کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا۔"

برگس نے اطمینان کا سانس لیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم اکیلے رہتے ہو۔"

"شاید یہی بات ہے۔" رک نے خشکی سے کہا۔ "پھر میں نے رینڈل کو فون کیا۔ وہ شاید مجھے پسند نہیں کرتا۔ اس نے مجھ سے بہت خشک لہجے میں بات کی اور کہا کہ جب اسے میرے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے گا تو وہ خود مجھے کال کر لے گا۔ میں بار بار زحمت نہ کروں۔"

"رینڈل اچھا آدمی ہے۔" برگس نے آہستہ سے کہا۔

"تب وہ مجھ سے اس طرح کیوں پیش آیا؟"

"شاید وہ کچھ پریشان ہے۔" برگس نے جواب دیا۔ اس دوران میں وہ مطلوبہ تفریح گاہ تک پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

برگس کی طرح کم بھی ریکارڈ کے شعبے میں تھی اور وہ دیر تک دفتر میں رہتی تھی کیونکہ اس کی ڈیوٹی دوپہر بارہ بجے سے رات نو بجے تک کی تھی۔ اس کے بعد دفتر بند ہو جاتا تھا۔ ایک مہینے بعد شفٹ بدل جاتی تھی اور برگس رات نو بجے تک رکی تھی۔ شام چھ بجے تک اس کا بیشتر عملہ چھٹی کر جاتا تھا۔ اس کے بعد چند افراد ہی دفتر میں رہ جاتے تھے۔ ان میں ایک کول بھی تھا۔ اس وقت وہ اپنے دفتر میں کچھ بے چین سا بیٹھا تھا۔ جب اس نے محسوس [illegible]

http://digestpk.blogspot.com

جا چکے ہیں۔۔۔خاص طور سے ٹیلی فون آپریٹر جا چکی ہے اور اب تمام لائنیں براہِ راست ہیں تو اس نے فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا اور آہستہ سے بولا۔

"میں بات کر رہا ہوں۔۔۔ مشی گن لیک سے۔"

"بولو۔" دوسری طرف سے کسی نے بھاری لہجے میں کہا۔

"کام ابھی تک نہیں ہوا ہے۔"

"اس میں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے۔ ہمارا آدمی وہاں ہے اور وہ موقع ملتے ہی برگس کا کام تمام کر دے گا۔"

"تو اس نے یہ کام اب تک کیا کیوں نہیں؟" کول پریشان لہجے میں بولا۔ "اس تاخیر کی وجہ سے مجھے مشکل ہو رہی ہے۔ یہاں ادارے میں معاملات الجھتے جا رہے ہیں۔"

"ہمیں ادارے کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" دوسری طرف سے سرد لہجے میں کہا گیا۔ "برگس ہمارا اپنا مسئلہ ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں اس علاقے میں بہت نقصان اٹھانے پڑے ہیں۔"

"صرف تمہیں نہیں بلکہ ہمیں بھی نقصان ہوا ہے۔ اگر فیڈرل والے اس معاملے کی طرف متوجہ ہو گئے تو ہم بہت مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"تم کیا چاہ رہے ہو؟"

"یہی کہ فی الحال برگس کو نہ چھیڑا جائے۔ میں ادارے کے معاملات نمٹا لوں، اس کے بعد تم اس کے ساتھ جو چاہے کر سکتے ہو۔"

"میں نے کہا نا ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ ہمارا اپنا مسئلہ ہے۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو۔۔۔ تمہیں یہاں اپنا کام چلانے کے لیے ہمارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"پہلے بھی تھی۔۔۔ اب نہیں ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور فون لائن بے جان ہو گئی۔ کول نے دانت پیس کر ریسیور رکھ دیا۔ "کتے کا بچہ۔۔۔ یہ ہمیں مروا دے گا۔" اس نے کہا اور کچھ سوچ کر پھر فون اٹھا لیا۔

اسی اثنا میں کِم نے فون رکھ دیا۔ اس کے پاس ڈائریکٹ لائن نہیں تھی اور اسے کال کرنے کے لیے فون بکس تک آنا پڑا تھا۔ جب اس نے فون اٹھایا تو اسی وقت کول نے نمبر ملایا تھا۔ اس نے ساری بات سن لی تھی اور اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔ جب لائن بے جان ہو گئی تو اس نے بھی پھرتی لیکن آہستگی سے فون رکھ دیا۔ وہ ایک عام سی اور سادہ لڑکی تھی۔ یہ قتل کی بات اس کے لیے کسی بھیانک خواب سے کم نہیں تھی۔ وہ واپس اپنی میز پر آئی اور اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا موبائل اٹھایا اور برگس کا نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

وہ تفریح گاہ میں جلد آ گئے تھے، ابھی رونق عروج پر نہیں آئی تھی اس لیے انہوں نے بار کا رخ کیا اور چند جام لے کر بال روم میں آ گئے۔ وہاں پُرجوش موسیقی کی دھنوں پر جوڑے رقص کر رہے تھے۔ برگس اور رک بھی ان میں شامل ہو گئے۔ برگس بہت عرصے بعد ایسی کسی تفریح پر آئی تھی۔ اسے رک کا ساتھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دو راؤنڈ کے بعد وہ تھک گئے اور ہوٹل کے ٹیرس میں آ بیٹھے۔ یہاں سکون تھا۔ انہوں نے تمتماتے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس دیے۔ وہ بہت خوش تھے۔ رک نے ڈنر کے بارے میں پوچھا۔

"ابھی موڈ نہیں ہے۔" برگس نے جواب دیا۔ "ابھی ایک دو راؤنڈ اور ناچ کے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" رک نے خوش ہو کر کہا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد برگس ٹیرس سے سامنے مشی گن لیک کا خوب صورت منظر دیکھنے لگی جس میں جا بجا تیرتی کشتیوں کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک اس کے موبائل نے بیل دی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین دیکھی اور زیرِ لب کہا۔ "کِم۔" اس نے کال ریسیو کی۔ "کِم۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"برگ، تم کہاں ہو؟" کِم کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں باہر ہوں۔۔۔ کیوں، کیا بات ہے؟"

"بہت خوف ناک بات ہے۔ وہ تمہیں قتل کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"کون؟" برگس بولی۔

"مجھے نہیں معلوم۔ کول نے کسی کو کال کی تھی۔ وہ بھی تمہارا قتل چاہتا ہے اور اس نے کسی سے بات کی تھی لیکن قاتل کو کسی وجہ سے دیر ہو گئی اور اب کول چاہتا ہے کہ قاتل رک جائے ورنہ فیڈرل والے متوجہ ہو جائیں گے۔۔۔ مگر جس نے قاتل بھیجا ہے، اس کا کہنا ہے کہ کام ضرور ہو گا۔"

اس بار برگس دہل گئی۔ "کیسا کام۔۔۔ میرے قتل کا؟"

"ہاں۔۔۔ اس آدمی نے قاتل بھیجا ہے۔" کِم رونے لگی۔ "پلیز، تم فوراً گھر چلی جاؤ۔"

"میں رک کے ساتھ ہوں۔"

"برگ۔۔۔ رک بھی تو باہر سے آیا ہے اور اس نے تم پر گاڑی چڑھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ کہیں قاتل۔۔۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" برگس نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں دفتر میں ہوں۔"

"اور وہاں بیٹھ کر تم اس قسم کی باتیں کر رہی ہو؟ اب تم کچھ نہیں کرنا اور چھٹی کر کے گھر چلی جانا۔ کل اتوار ہے۔ ہم اس بارے میں کہیں باہر بات کریں گے۔"

"برگ۔۔۔ تم قاتل کا سوچو۔" کِم بولی اور اس نے کال منقطع کر دی۔ اس کی کال نے برگس کو نروس کر دیا تھا۔ اتنے میں رک بھی آ گیا اور اسے پریشان دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"برگ! کیا ہوا؟"

"ک۔۔۔ کچھ نہیں۔" اس نے کہا۔

"نہیں، تم پریشان ہو۔" رک اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"وہ۔۔۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" برگس نے اپنا سر تھام لیا۔

"ہم گھر واپس چلتے ہیں۔" رک پریشان ہو کر بولا۔ "تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"نہیں، ابھی میں کچھ دیر چپ رہوں گی تو خود ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں تمہارے لیے کچھ منگواؤں جس سے تم خود کو بہتر محسوس کرو؟"

برگس کو ڈرنک کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ رک نے اس کے لیے ایک گلاس شیری منگوا دی۔ برگس سوچ میں تھی۔ کِم کی بات سے اسے دھچکا نہیں لگا تھا کیونکہ اسے کچھ عرصے سے شک تھا کہ ادارے کے افسران منشیات فروش مافیا کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ کِم نے جو سنا تھا، اس سے اس کے شک کی تصدیق ہو گئی تھی۔ دوسرا آدمی ظاہر ہے مافیا کا ہو سکتا تھا اور اس نے برگس کے لیے کوئی قاتل بھیجا تھا۔ قاتل کا خیال آنے پر اس نے چور نظروں سے رک کو دیکھا۔ کیا وہ قاتل ہو سکتا ہے؟ اس کا دل بے ساختہ بولا کہ وہ قاتل نہیں ہو سکتا۔

برگس کو وہ منظر یاد آیا جب رک کی گاڑی بے قابو ہو کر اس پر چڑھنے والی تھی اور اس نے بمشکل اپنی جان بچائی تھی۔ پھر گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھنے کی وجہ سے کھمبے سے ٹکرا گئی تھی۔ اس وقت تک اس کی رفتار کم ہو گئی تھی اس لیے گاڑی یا رک کو نقصان نہیں ہوا بس اس کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرا گیا تھا۔ اس چوٹ کی وجہ سے اس کی یادداشت چلی گئی تھی لیکن حقیقتاً اس کی یادداشت چلی گئی تھی یا اس نے جان بچانے کے لیے یہ چکر چلایا تھا؟ ایک کے بعد ایک شک اس کے ذہن میں آ رہا تھا اور وہ ان سے لڑ رہی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کا سر سچ مچ درد کرنے لگا تھا۔ لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور چپ رہی۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

"بہتر ہے۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"کیا خیال ہے، ایک چکر جھیل کے کنارے کا نہ لگا لیں۔ کھلی فضا میں تم بہتر محسوس کرو گی۔"

برگس نے فوراً انکار کر دیا۔ "نہیں، میں یہیں ٹھیک محسوس کر رہی ہوں۔"

"اچھا۔" رک نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ برگس نے سوچا کہ کیا اس نے اس لیے انکار کیا ہے کہ اسے رک پر پہلے جیسا اعتبار نہیں رہا ہے؟ وہ اس کے ساتھ کسی ایسی جگہ جانے کے لیے تیار نہیں ہے جہاں وہ اس پر اکیلے میں قابو پا سکے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا خوف بڑھ رہا تھا۔ اب اسے رک کے ساتھ گھر واپس جانے کے خیال سے بھی خوف آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے رک سے کہا۔

"میں واش روم سے آتی ہوں۔"

وہ واش روم میں آئی۔ اس نے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے چپکے سے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ واش روم سے نکلی۔ اسے ایک چھوٹے سے حصے سے گزرنا تھا جہاں رک کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ رک سامنے جھیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ موقع غنیمت جان کر وہ تیزی سے گزر گئی اور تقریباً بھاگتے ہوئے پارکنگ تک آئی۔ یہاں رک کر وہ سانس درست کرنے لگی۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس طرح رک کو چھوڑ کر جا رہی ہے لیکن اس نے واپس تو برگس کے گھر ہی آنا تھا۔ وہ تذبذب میں پڑ گئی کہ اب کیا کرے؟

"برگ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اسے قریب سے رک کی آواز آئی تو وہ اچھل پڑی۔

"ت۔۔۔ تم یہاں کیسے آئے؟" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"برگ! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" رک فکرمند ہو گیا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں گھر چلنا چاہیے۔"

"ن۔۔۔ نہیں۔" برگس نے کہنا چاہا لیکن رک نے اس کی سنے بغیر اسے دروازہ کھول کر کار کے اندر بٹھا دیا اور خود دوسری طرف سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ برگس سہم گئی تھی۔ کیا اس کا شک درست تھا؟

"لیکن تھا۔۔۔؟"

http://[illegible].blogspot.com/

"اس کی فکر مت کرو... گھر میں کچھ کر لیں گے۔ میرا خیال ہے سینڈوچز بنانے تو مجھے بھی آتے ہیں۔"

برگس چپ ہو گئی۔ رک بھی خاموش رہا پھر اس نے اچانک ہی کہا۔ "برگس! کیا بات ہے... میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم خوف زدہ ہو؟"

"نن... نہیں ایسی بات تو نہیں ہے۔ بس سر میں درد ہے۔" اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں... تم آرام کرنا۔ میں تمہارے لیے سینڈوچز اور کافی بناؤں گا پھر تم کوئی پین کلر لے کر سو جانا۔" رک نے کہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ گھر پہنچ گئے۔ برگس اس کے ساتھ گھر میں جاتے ہوئے ڈر رہی تھی لیکن جانا تو تھا۔ وہ اندر آ گئے۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" رک نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی برگس دبے قدموں اس کے پیچھے آئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ رک اوپر کیوں گیا ہے۔ کمرے میں آ کر رک بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی تذبذب میں ہے۔ ٹہلتے ہوئے وہ سوٹ کیس کے پاس رکا اور بے ساختہ ایک نمبر سیٹ کر کے کھٹکا دبایا تو تالا کھل گیا۔ وہ اچھل پڑا۔ اس کا غیر ارادی طور پر ملایا جانے والا نمبر کام آ گیا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کھولا تو ایک بار پھر اچھل پڑا۔ سامنے ہی ایک جدید ساخت کا پستول اور ایک موبائل پڑا تھا۔ اس کے نیچے ایک سیاہ سی چیز تھی۔ اس نے پستول اٹھا کر اسے دیکھا اور سوچا کہ اس کے سوٹ کیس میں پستول کیوں ہے؟

اس لمحے کی ہول سے جھانکتی برگس نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی۔ اس کا شک درست نکلا تھا۔ رک قاتل تھا اور وہ ڈراما کر رہا تھا۔ اب اس نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ پلٹی اور اندھا دھند بھاگی۔ نیچے آتے ہوئے وہ ایک بار گرتے گرتے بچی۔ اس صورت میں وہ براہ راست نیچے پہنچ جاتی اور پھر شاید رک کو اسے قتل کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ بھاگتے ہوئے اس نے احتیاط نہیں کی تھی۔ رک نے اس کے بھاگنے کی آواز سن لی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر اسے پکارا۔ "برگس...!"

اس کی آواز سن کر برگس کے جسم میں اور تیزی آ گئی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ گھر سے پولیس کو کال کرے گی لیکن اب وقت نہیں تھا۔ رک کسی وقت بھی نیچے آ سکتا تھا۔ اس نے کمرے سے جھپٹ کر اپنا پرس اٹھایا اور دوڑتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا تو اسے یاد آیا کہ ڈرائیونگ رک کر رہا تھا اور چابی یقیناً اسی کے پاس تھی۔ وہ پھر بھاگی۔

پہلے اس نے کسی پڑوسی کے گھر پناہ لینے کا سوچا لیکن مسلح قاتل کے مقابلے میں اسے کون بچا سکتا تھا؟ اس لیے وہ سڑک پر سیدھی بھاگی اور گلی کے خاتمے پر واقع جھاڑیوں میں گھس گئی۔ یہاں قصبے کی حدود ختم ہوتی تھی اور جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ اس نے کئی بار مڑ کر دیکھا لیکن اسے رک یا کوئی بھی اپنے پیچھے آتا دکھائی نہیں دیا۔ درختوں کے درمیان پہنچ کر اس نے خود کو کسی قدر محفوظ محسوس کیا۔ اس نے پرس سے موبائل نکالا اور نائن ون ون ملانے جا رہی تھی کہ موبائل کی بیل بجی۔ رینڈل اسے کال کر رہا تھا۔ برگس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

"ہیلو... برگس! تم کہاں ہو؟" رینڈل نے پوچھا۔

"مم... میں خطرے میں ہوں۔" برگس روہانسی ہو گئی۔

"کیوں... کیا ہوا؟"

برگس نے جلدی جلدی رینڈل کو ساری بات بتائی اور بولی۔ "وہ مجھے قتل کرنے آ رہا ہے۔"

"میں نے یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ رک ایک مستند پیشہ ور قاتل ہے اور شاید وہ تمہیں قتل کرنے ہی یہاں آیا تھا۔"

"شاید نہیں یقیناً۔" برگس بولی۔ "میں اس سے بچ کر اپنی گلی کے سرے پر موجود جنگل میں آ گئی ہوں۔"

"ٹھیک ہے... تم وہیں رکو، میں آ رہا ہوں... اور میرے آنے تک نہ تو باہر نکلنا اور نہ ہی کسی سے رابطہ کرنا۔"

"تم پولیس کو اطلاع کر دو۔"

"فکر مت کرو، میں پہلا کام یہی کرتا ہوں۔" رینڈل نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ برگس نے سکون محسوس کیا۔ وہ ایک درخت کے تنے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ یہاں سے گلی کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا لیکن وہاں سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ رک کی صورت میں اپنے قاتل کو خود ہی گھر لے آئی تھی۔ اب تو رینڈل نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ اگر اسے گھر سے نکلنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوتی تو رک اپنا کام مکمل کر کے جا چکا ہوتا۔ وہ گلی کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس نے ایک سایہ دیکھا جو اسی طرف آ رہا تھا اور پھر وہ روشنی میں آیا تو برگس نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ رک تھا جس کا ایک ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں تھا اور وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر برگس نے اس کی آواز سنی۔

"برگس... تم کہاں ہو؟ مجھے سب یاد آ گیا ہے۔ میری یادداشت لوٹ آئی ہے۔ پلیز... میری آواز سن رہی ہو تو سامنے آؤ۔"

لیکن برگس دہشت زدہ ہو کر جنگل میں مزید اندر کی طرف بھاگی۔ اس کی کوشش تھی کہ قدموں کی آواز نہ آنے پائے ورنہ رک اس کے پیچھے آتا اور اپنا ادھورا کام مکمل کر لیتا۔ رینڈل نے نہ جانے پولیس کو اب تک کال کیوں نہیں کی تھی؟ وہ دبے قدموں بھاگ رہی تھی کہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے بوکھلا کر جلدی سے کال ریسیو کی کیونکہ رات کے سناٹے میں بیل کی آواز دور تک جا سکتی تھی۔ دوسری طرف رینڈل تھا۔

"برگس... تم کہاں ہو؟ میں جنگل کے دوسری طرف تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"تم نے پولیس کو اطلاع کر دی ہے؟"

"ہاں، وہ دوسری طرف سے آ رہی ہے۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے تم محفوظ ہاتھوں میں آ جاؤ، اس کے بعد پولیس گھیرا کر اسے گرفتار کرنے کی کوشش کرے گی۔"

"میں آ رہی ہوں... وہ مجھے تلاش کرتا ہوا جنگل تک آ گیا ہے۔" برگس چلتے چلتے بول رہی تھی۔ اس کی سانس تھکن سے زیادہ خوف سے پھول رہی تھی۔ "تم کہاں ہو؟"

"دیکھو، تمہیں ایک سرخ رنگ کی چھوٹی سی روشنی جلتی بجھتی نظر آ رہی ہے۔ تم اسی طرف چلی آؤ۔"

"مجھے نظر نہیں آ رہی۔"

"بس ذرا آگے آؤ گی تو نظر آ جائے گی۔"

"ہاں... آ گئی۔" اس نے جوش سے کہا۔

"بس تو اس طرف چلی آؤ۔" رینڈل نے کہا۔

برگس نے فون بند کر کے پرس میں رکھا اور روشنی کی طرف جانے لگی۔ رینڈل کوئی دو سو گز دور ایک کچے راستے پر اپنی پولیس کار سمیت کھڑا تھا۔ برگس مڑ کر بھی دیکھ رہی تھی کہ کہیں رک پاس نہ آ گیا ہو۔ اسے ڈر تھا کہ رک نے موبائل کی بیل سن لی ہوگی اور اسے کم سے کم اتنا تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ برگس جنگل میں ہے۔ وہ جلد از جلد رینڈل تک پہنچنا چاہتی تھی۔ رینڈل اسے اچھا لگتا تھا لیکن اس طرح نہیں جس طرح رینڈل چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک اچھا دوست تھا اور بس... لیکن آج اسے رینڈل بہت اچھا لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس کی جان بچانے آیا تھا۔ وہ روشنی کے پاس پہنچی تو اس نے رینڈل کو بھی دیکھ لیا۔ ایک چھوٹی سی ٹارچ اس کے ہاتھ میں تھی۔ برگس دوڑتی ہوئی جا کر اس سے لپٹ گئی۔

"شکر ہے تم آ گئے ورنہ جانے کیا ہوتا۔"

رینڈل نے اسے خود سے لپٹا لیا اور سرد لہجے میں بولا۔ "فکر مت کرو، وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا کیونکہ مُردوں کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

برگس کو یک دم جھٹکا لگا۔ اسے لگا جیسے اس نے کچھ غلط سنا ہے۔ اس نے رینڈل سے الگ ہونے کی کوشش کی۔ "کیا مطلب؟"

لیکن رینڈل نے اپنی گرفت سخت کر دی۔ "مطلب وہی ہے جو تم نے سنا ہے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو... کیا کر رہے ہو؟" برگس چلائی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر رینڈل کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی۔ وہ بیک وقت برگس کے گداز بدن سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا اور اسے بے دم بھی کر رہا تھا۔ آخر اس نے محسوس کیا کہ برگس نیم بے ہوش ہو گئی ہے تو اس نے اسے چھوڑ دیا اور وہ نیچے گر گئی۔ اسے سانس لینے کا موقع ملا تو اس کی حالت بہتر ہوئی لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کھڑی ہو سکے۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ "تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"کیونکہ مجھے تمہیں قتل کرنے کا حکم ملا ہے۔" رینڈل اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ پولیس کار کے اندر روشن بلب آس پاس بھی روشنی کر رہا تھا۔ برگس کو ایک بار پھر جھٹکا لگا۔

"تت... تمہارا مطلب ہے کہ وہ قاتل تم ہو؟"

"اب تم ٹھیک سمجھیں۔" رینڈل نے چہک کر کہا۔

"تم مجھے قتل کر دو گے؟" برگس نے بے یقینی سے کہا۔

"بہت خوشی سے۔" رینڈل کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "یاد ہے تم نے کس طرح میری محبت کو ٹھکرایا ہے... اب مجھے تم سے نفرت ہے۔ اس لیے جب مجھے حکم ملا کہ میں تمہیں قتل کر دوں تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس روز یہ احمق اگر تمہارے گھر کے سامنے حادثہ نہ کر دیتا تو میں اسی روز تمہیں اس دنیا سے رخصت کر چکا ہوتا۔ خیر... اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔"

"تو رک قاتل نہیں ہے؟" برگس نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، وہ پتا نہیں کون ہے۔ میں نے تو اسے استعمال کر کے تمہیں باہر بلایا ہے لیکن تم کہہ رہی ہو کہ وہ تمہارے پیچھے ہے۔"

"اس کے پاس پستول میں نے خود دیکھا تھا۔" برگس نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ بھی کوئی جرائم پیشہ ہو... لیکن تمہارا قاتل میں ہی ہوں۔"

http://digestpk.blogspot.com/

"تم پولیس مین ہو کر بھی منشیات فروشوں کے لیے کام کرتے ہو؟" برگس نے نفرت سے کہا۔

"ہاں کیونکہ وہ مجھے بہت بڑی رقم ہر مہینے ادا کرتے تھے۔ یہ اتنی دولت ہے کہ چند سال بعد میں استعفا دے کر کہیں اور جا کر عیش سے زندگی گزاروں گا۔"

رینڈل نے پستول نکالا تو برگس سمجھ گئی کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ وہ اسے مار کر یہیں چھوڑ جاتا اور اس کے قتل کا الزام ڈرگ مافیا پر آتا لیکن کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اسے کس نے مارا ہے۔ اس نے ہاتھ اوپر کیا اور التجا کی۔

"پلیز..."

"سوری ڈیئر۔" رینڈل نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا۔ "میں مجبور ہوں۔"

اس کے الفاظ کے برعکس اس کا لہجہ مسرور کن تھا۔ برگس نے آنکھیں بند کر لیں اور گولی چلنے کا انتظار کرنے لگی۔ گولی چلی مگر اسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اس کے بجائے اسے رینڈل کے کراہنے اور پھر گالی دینے کی آواز آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو رینڈل نے اپنا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اس کا پستول غائب تھا۔ برگس کو ذرا دیر سے احساس ہوا کہ رینڈل کا ہاتھ زخمی ہے۔ وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر رینڈل غرایا۔

"کیتا..." وہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ رک کی آواز آئی۔

"اب تم نے حرکت کی تو تمہارے سر میں سوراخ ہو جائے گا۔" برگس نے دیکھا کہ رک ایک طرف کھڑا ہے۔

"برگ... تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں لیکن..."

"تم فکر مت کرو، میں نے سب سن لیا ہے۔" رک آگے آیا اور اس نے رینڈل کو دونوں ہاتھ گاڑی پر رکھنے کا حکم دیا۔ وہ پستول کے سامنے بے بس تھا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی تو رک نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے ان میں ہتھکڑی ڈال دی۔

"یہ ہتھکڑی کہاں سے آئی؟"

رک مسکرایا۔ "میں اسٹنٹ نارکوٹکس ایجنٹ ہوں اور تمہاری حفاظت کے لیے ہی یہاں آیا تھا... لیکن بدقسمتی سے مجھے حادثہ پیش آ گیا اور میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ میرا سارا سامان بھی سوٹ کیس میں تھا۔ یہ دیکھو... میرا کارڈ۔" اس نے اپنا کارڈ برگس کو دکھایا۔

"میرے خدا... میں تمہیں پیشہ ور قاتل سمجھ رہی تھی۔"

"شکر ہے کہ سوٹ کیس کھلتے ہی مجھے سب یاد آ گیا اور میں تمہیں بتانے کے لیے تمہارے پیچھے آ گیا۔"

"تم یہاں تک کیسے آئے؟"

"اس نے تمہاری راہنمائی کے لیے جو تارچ روشن کر رکھی تھی، اسے دیکھ کر میں بھی آ گیا۔" رک بولا۔ "اب یہ بتاؤ کہ تمہیں کون مروانا چاہ رہا تھا۔"

"تم مجھ سے کچھ نہیں اگلوا سکتے۔" رینڈل نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ "میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"اس پستول کے بارے میں کیا خیال ہے؟" رک نے اس کے ہاتھ سے نکل جانے والا پستول رومال سے پکڑ کر اٹھایا۔ "یہ بغیر نمبر کا ہے اور اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات محفوظ ہیں۔"

یہ سن کر رینڈل کا چہرہ سفید ہو گیا۔ برگس نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارا انجام آ گیا ہے رینڈل۔"

اس کے بعد دو دن تک پکڑ دھکڑ جاری رہی۔ وفاقی ایجنٹوں نے پولیس کی مدد سے کئی منشیات فروشوں کو پکڑ لیا تھا۔ رینڈل نے شروع میں اپنی اکڑ برقرار رکھی لیکن پھر اس نے بار مان لی اور ان لوگوں کے نام بتا دیے جن کے لیے وہ کام کرتا تھا۔ منشیات فروشوں کی یہ چین فلاڈلفیا سے نیویارک تک پھیلی ہوئی تھی۔ کول نے یہ خبر سن کر ہی خودکشی کر لی تھی جبکہ مین اور مین کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کارروائی نہیں کی جا سکی۔ البتہ انہیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ جلد وہ لوگ بھی پکڑ لیے گئے جنہوں نے برگس کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی۔

رک اپنے مجرموں کو لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دو مہینے بعد وہ برگس سے ملنے آیا تو وہ منشیات کے شکار افراد کی بحالی کے گھنے کی ڈائریکٹر بن چکی تھی۔ رک کو یہ جان کر خوشی ہوئی لیکن ساتھ ہی وہ افسردہ بھی ہو گیا۔ برگس بے چین ہو گئی۔

"کیا بات ہے... تم چپ کیوں ہو گئے؟"

"میں تو سوچ کر آیا تھا کہ تمہیں پرپوز کروں گا لیکن اب تم ایک ادارے کی ڈائریکٹر بن گئی ہو تو میرا پرپوزل قبول نہیں کرو گی۔"

"کیوں نہیں کروں گی؟"

"کیا تم یہ سب چھوڑ کر میرے ساتھ نیویارک جانے کو تیار ہو جاؤ گی؟"

"کیوں نہیں۔" برگس نے بلا جھجک کہا۔ "میرا مقصد عہدہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کو منشیات کے عفریت سے بچانا ہے۔ اس ملک میں منشیات ہر جگہ ہے اس لیے میں ہر جگہ کام کر سکتی ہوں۔"

رک نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

انتظار

محمد عفان آزاد

انتظار کے لمحات بڑے کٹھن اور جان لیوا ہوتے ہیں... فقط ایک پل ایک صدی پر محیط معلوم ہوتا ہے... ایک ایسی ہی کہانی جس کے کرداروں کو انتظار کی کیفیات سے گزرنا تھا... انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ گھڑیاں کیسے اور کب اختتام پذیر ہوں گی۔

اس حادثے کا ماجرا جس کی تہ میں مجرمانہ غفلت کی بارہ کہانیاں مدفن تھیں۔

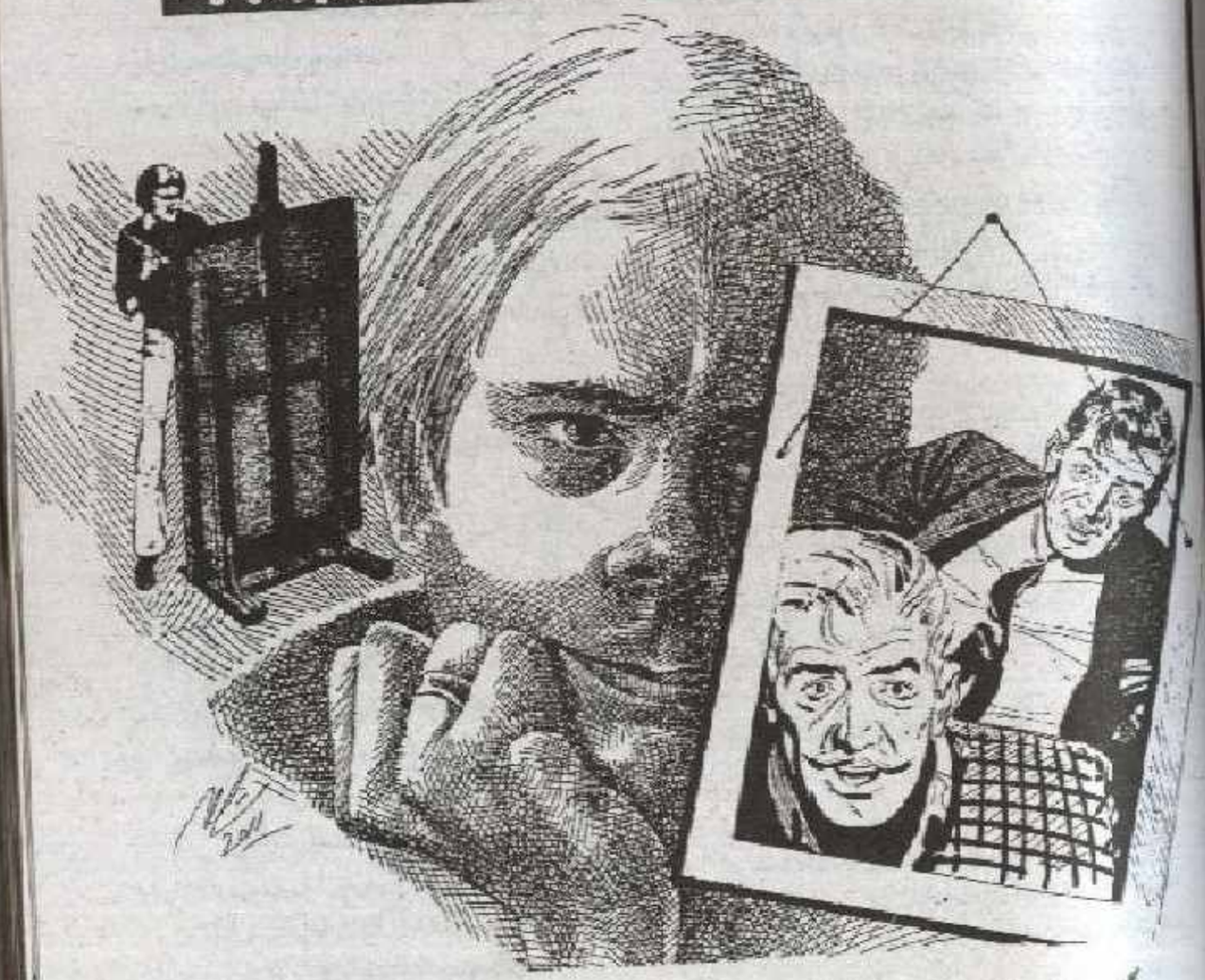

گلیسن نے وہسکی کا گھونٹ لے کے اپنے اطراف میں نظر ڈالی۔ وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ جمی کے بار میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کرسمس نائٹ منانے کے لیے جمع تھے اور نشے میں ڈوبی ہوئی آوازوں سے بے ہنگم انداز میں کرسمس کا دعائیہ گیت گا رہے تھے۔ گلیسن نے اپنا گلاس خالی کر کے بارٹینڈر لڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کا واضح مطلب تھا کہ اسے مزید وہسکی چاہیے۔ ایما نے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے اپنی انگلی اٹھائی جیسے وہ اسے انتظار کرنے کے لیے کہہ رہی ہو۔ گلیسن نے وقت گزاری کے لیے بلند آواز میں کرسمس کا گیت گانا شروع کر دیا... اچانک ہی اس کے عقب سے آواز آئی۔

"تم کچھ بھول رہے ہو!"

گلیسن نے اپنا اسٹول گھمایا اور اس کی جانب رخ

http://digestpk.blogspot.com/

کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا؟“

وہ شخص گلیسن کے ساتھ والے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا اور دیکھنے میں پچپن برس کا لگ رہا تھا۔ سر کے بال سیاہ تھے لیکن کنپٹیوں کے پاس سے سفیدی جھلک رہی تھی۔

”معاف کرنا۔ میری زبان یونہی پھسل جاتی ہے بعد میں سوچتا ہوں کہ کہیں سننے والے کو بُرا نہ لگ جائے۔ دراصل تم جو گیت گا رہے تھے اس میں میری کے بعد کو ماجی آتا ہے لیکن تم نے میری اور جنٹلمین کو ساتھ ملا دیا۔ اگر تمہیں میری مداخلت بُری لگی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔“

”تم دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو مسٹر...؟“

”میرا نام نوئیل ہے۔ چارلس نوئیل۔“

”مجھے سلیور گلیسن کہتے ہیں لیکن تم مجھے سلی کہہ سکتے ہو۔ میرے سبھی دوست مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔“ نوئیل نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس اعزاز کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”تم کیا کام کرتے ہو؟“

”میں جیپ سمن اینڈ ہال کی شمالی امریکا شاخ کا انچارج ہوں۔ اس لیے میرا وقت لندن اور امریکا دونوں جگہ ہی گزرتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے بڑی احتیاط سے ایک کارڈ نکالا اور گلیسن کے حوالے کر دیا۔ اس پر لندن کا پتا لکھا ہوا تھا اور ایک کونے پر اس کا نام چھپا ہوا تھا۔ چارلس نوئیل وی پی نارتھ امریکن آپریشن۔

”میرا خیال ہے کہ مالی اعتبار سے میرے مقابلے میں تمہارا سال بہتر گزرا ہوگا۔ میں بریڈبری کار پنجنگ منیجر ہوں۔“

”ہاں، میں نے تمہاری کمپنی کے اشتہارات دیکھے ہیں جس میں رقم میں اضافہ کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سال سرمایہ کار کمپنیوں کے لیے مشکل تھا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری ذاتی آمدنی ٹھیک ٹھاک رہی ہوگی۔“

”ہاں، میرا کام ٹھیک چل رہا ہے۔“

اسی دوران میں ایما نے گلیسن کے سامنے ایک اور پیگ رکھ دیا۔ نوئیل بولا۔ ”اس کی قیمت میرے بل میں شامل کر دو۔“

”تھینک یو چارلس۔“ گلیسن نے کہا۔ ”کیا تم پہلے بھی یہاں آئے ہو؟“

”نہیں۔ یہ پہلی بار ہے۔ دراصل میں نے حال ہی میں پرائرلیک کے قریب مکان خریدا ہے۔ یہ بار میرے راستے میں پڑتا ہے اس لیے یہاں چلا آیا۔ کیا تم یہاں باقاعدگی سے آتے ہو؟“

”ہاں، کام کے بعد اکثر یہاں آجاتا ہوں۔ عام دنوں میں یہاں کافی خاموشی ہوتی ہے۔“

”کرسمس کے موقع پر تو شور شرابا ہوتا ہی ہے۔“ نوئیل بولا۔ ”کیا بات ہے تم کچھ الگ تھلگ اور بیزار سے نظر آرہے ہو؟“

”دراصل گزشتہ کرسمس پر مجھے ایک بُرا تجربہ ہوا تھا اور مجھے یقین نہیں تھا کہ آئندہ بھی یہ تہوار مناسکوں گا یا نہیں۔“

”ایسا کیا ہو گیا تھا؟“ نوئیل نے پوچھا۔

گلیسن فوراً ہی چوکنا ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔ لہٰذا اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ بس یونہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔“

”ایک منٹ ٹھہرو۔ سلیور گلیسن۔ میں نے یہ نام پہلے بھی سن رکھا ہے۔ وہ ہاں یاد آیا۔ کیا تم وہی ہو؟“

گلیسن سمجھ گیا کہ اسے پہچان لیا گیا ہے لہٰذا جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا اس نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں میں وہی ہوں۔“

”میں نے تمہارے کیس کے بارے میں پڑھا تھا۔ بہت افسوس ہوا کہ تمہیں اس سلسلے میں اتنی پریشانی اٹھانا پڑی۔“

گلیسن نے سکون کا سانس لیا اور بولا۔ ”شکریہ! بس وہ بھی ایک آزمائش تھی۔“

”یقیناً یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہوگا۔ ایک لڑکی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے دیکھنا اور لوگوں کی جانب سے تمہیں اس حادثے کا ذمے دار ٹھہرایا جانا۔ بے حسی کی انتہا ہے۔“

”اس سے بھی زیادہ بُرا ہو سکتا تھا۔“ گلیسن نے کہا۔ ”میرے وکیل نے پولیس کو باز رکھا۔ حالانکہ اس لڑکی کے گھر والوں نے میرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا لیکن میرے وکیل کا کہنا تھا کہ جب تک کوئی چشم دید گواہ نہ ہو، اس وقت تک میں اس الزام سے بری ہوں۔“

اگرچہ اس نے بہت اعتماد سے یہ بات کہی تھی لیکن ساتھ ساتھ اس کا ذہن میگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میگی اسے دھوکا نہیں دے گی گو کہ اب ان کے درمیان تعلقات نہیں رہے تھے لیکن انہوں نے بہت اچھا وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔ اب اگر وہ اپنا بیان بدل لیتی تو اس پر بھی الزام آسکتا تھا۔

”بہت عمدہ۔“ نوئیل نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آج کی شام تمہارے نام۔“

”ہم دونوں کے نام۔“ گلیسن نے اپنا گلاس نوئیل کے گلاس سے ٹکراتے ہوئے کہا۔ ”میں ٹوائلٹ تک جاؤں گا۔“

”واپس آؤ گے تو گلاس بھرا ہوا ملے گا۔“

☆☆☆

واش روم کے بیسن پر کھڑے ہو کر اس نے منہ دھونے کے لیے نل کھولا۔ جونہی پانی کی دھار باہر آئی تو اس کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر گھوم گیا جس سے جان چھڑانے کے لیے اس نے اپنے آپ کو نشے میں ڈبو یا تھا۔ وہ معصوم لڑکی اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی اور التجا تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کار سمیت ڈوب گئی۔ گلیسن نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لعنت ہو۔ اتنے مہینے گزر جانے کے بعد بھی وہ اس خوفناک منظر سے جان نہیں چھڑا سکا تھا۔ اس نے بوکھلاہٹ میں اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنا شروع کر دیے۔

جب وہ واپس آیا تو نوئیل نے اسے ایک اور ڈرنک پکڑا دی اور بولا۔ ”تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔ کیا پولیس کو یقین نہیں کہ اس رات بھی تم نشے میں تھے؟“

”یہ جھوٹ ہے۔ اس رات گھر جانے سے پہلے میں نے صرف ایک گلاس لیا تھا اور اس کے کئی گواہ ہیں۔“

”مجھے پریشانی یہ ہے کہ تم نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے پکڑے نہ جاؤ۔ یہ جلتی پر تیل چھڑکنے کے برابر ہوگا۔“

”تمہارا خیال درست ہے۔ اس طرح سراغ رساں ایرک کو اپنا موقف درست ثابت کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میں گھر جانے سے پہلے ایک سینڈوچ اور کافی لے لوں گا۔ اس طرح نشے کا اثر ختم ہو جائے گا۔“

”ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔“ نوئیل نے تائید کی۔

گلیسن نے گلاس میں موجود باقی وہسکی بھی حلق میں انڈیلی اور گلاس کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ گیا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔ اس نے ایک ہاتھ سے پیٹ دبایا اور جھکتے ہوئے بولا۔ ”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

”تمہارے لیے کھلی فضا میں جانا بہتر ہوگا۔“ نوئیل بولا۔ ”کیا تم چل سکو گے یا تمہیں سہارے کی ضرورت ہے؟“

”نہیں، میں چلا جاؤں گا۔“ گلیسن نے کراہتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم باہر چلو۔ میں بل دے کر آتا ہوں۔“

گلیسن نے بڑی احتیاط سے سنبھل سنبھل کر چلنا شروع کیا۔ لگتا تھا کہ اسے زمین پر قدم جمانا مشکل ہو رہا ہے۔ باہر نکلتے ہی وہ عمارت کے کونے سے ٹکرایا اور تقریباً دُہرا ہو گیا۔ اسے ایک بڑی قے ہوئی اور معدے میں جو کچھ تھا وہ باہر آگیا۔ جب تھمی تھی تو اسے یوں لگا جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ دسمبر کی جان لیوا سردی اس کی ہڈیوں میں برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنی کار تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ہیٹر آن کر کے اس عذاب سے نجات حاصل کر سکے۔ اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو نوئیل پانی کی بوتل لیے کھڑا تھا۔

”اپنا منہ دھو کر اس میں سے تھوڑا سا پانی پی لو۔ اس طرح تم کچھ بہتر محسوس کرو گے۔“

اس کے بعد نوئیل نے اسے سیدھا کیا اور اس کے بازو کے نیچے ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔“

”رہنے دو۔ تمہیں واپسی میں تکلیف ہوگی۔“ گلیسن کسی اجنبی کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔

”تکلیف کیسی؟ میں ٹیکسی کر لوں گا۔ تمہاری کار کون سی ہے؟“

”الیکسا نیڈا!“ گلیسن نے اسے کار کی چابی پکڑاتے ہوئے کہا۔

نوئیل نے کار پارکنگ لاٹ سے باہر نکالی۔ گلیسن پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اب اس کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ اس نے بوتل میں بچے ہوئے پانی سے چند گھونٹ لیے اور اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

”بہت خوب صورت رات ہے۔“ نوئیل نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسی برف باری لندن میں کبھی کبھی ہوتی ہے لیکن جب ہوتی ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔“

”ہاں، واقعی بہت اچھی رات ہے۔“ گلیسن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور گزشتہ مناظر ایک ایک کر کے اس کے ذہن کی اسکرین پر روشن ہونے لگے۔

☆☆☆

اس روز اس نے اپنے اسٹاف کو دو حالی بجے چھٹی دے دی تھی۔ ان میں سے کچھ کو تھا کہ جنہیں ... ہال جانا تھا جبکہ ایک دو لوگ اپنے گھروں کو جانے کے لیے آخری فلائٹ پکڑنا چاہ رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد

http://digestpk.blogspot.com/

میدان صاف ہو گیا تو گلیسن نے اپنا سیل فون نکالا اور وہ نمبر ڈائل کرنے لگا جس کے لیے وہ صبح سے انتظار کر رہا تھا۔

دس منٹ بعد اس کے دروازے پر دستک ہوئی اور میگی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ”میرا خیال تھا کہ تم فون نہیں کرو گے۔ تقریباً میں تو مایوس ہی ہو گئی تھی۔“

اس نے ایک لمبا فر کا کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا جسے وہ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

”میں اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لائی ہوں اور تمہارے لیے کرسمس کا تحفہ بھی۔“

گلیسن نے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا اور اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”میرا تحفہ کہاں ہے؟“

میگی نے اپنا کوٹ اتارا اور بلاؤز کے بٹن کھولتے ہوئے مخمور آواز میں بولی۔ ”میری کرسمس۔“

وہ میگی کے قریب آیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”بہتر ہو گا اگر تم اپنے شوہر کے سامنے اس بے ہودہ لباس میں نہ جاؤ۔“

میگی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”اسے حسرت ہی رہے گی کہ وہ مجھے اس حال میں دیکھے۔“

پانچ بجے کے قریب وہ دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ میگی اپنے ساتھ رم کی بوتل بھی لائی تھیں۔ سات بجے وہ رخصت ہوئی۔ اس کے جانے کے بعد گلیسن نے کمرے کی صفائی کی اور بچی ہوئی رم تھرماس میں رکھ لی۔ اس نے سوچا کہ راستے میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ گھر جانے کے لیے اس نے روٹ 77 کا انتخاب کیا۔ راستے میں جھی کا بار آتا تھا جہاں اس نے معمول کے مطابق رکنے کا ارادہ کیا۔ البتہ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ایک ڈرنک سے زیادہ نہیں لے گا کیونکہ میگی کے ساتھ وہ کافی رم چڑھا چکا تھا۔

کرسمس کی شام سڑکوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ اس نے سلور ٹن کے بجائے بلیک فارم روڈ کا انتخاب کیا۔ اس راستے پر روشنی بھی کم ہوتا تھا اور پولیس کا گشت بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ میگی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے بعد اس پر تھکن طاری ہو چکی تھی پھر اس نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور خوب شراب پی جس کی وجہ سے اس کی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے سامنے کی چیزیں اسے نظر نہیں آ رہیں، وہ بہ مشکل اپنی آنکھیں کھول پا رہا تھا۔ اس کی کار کئی مرتبہ لہرائی، جسے اس نے بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔ اب وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ کسی طرح خیریت سے گھر پہنچ جائے۔

اب وہ جھیل کے کنارے چل رہا تھا کہ اچانک ہی کسی کار کی تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اسٹیئرنگ پر اپنا کنٹرول نہ رکھ سکا اور اچانک ہی وہ کار اس کے سامنے آ گئی۔

یہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ کار چلانے والی لڑکی کا نام کورٹنی پائکس تھا۔ اس کی عمر بیس سال تھی اور وہ آئیووا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی اور چھٹیاں منانے گھر آ رہی تھی۔

کورٹنی نے حادثے سے بچنے کے لیے فوری طور پر گاڑی کا اسٹیئرنگ دائیں جانب گھمایا۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں گاڑیاں ٹکرانے سے بچ گئیں لیکن کورٹنی کی کار سڑک کی ریلنگ توڑتی ہوئی جھیل میں جا گری جس کی سطح پر برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ گلیسن نے فوراً بریک لگایا۔ اپنے آپ کو سیٹ بیلٹ سے آزاد کیا اور کار سے باہر آ کر اس جانب چل پڑا جہاں سے لڑکی کی کار جھیل میں گری تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ گاڑی کا پچھلا حصہ جھیل کی سطح پر تھا اور وہ لڑکی پچھلی سیٹ پر آ گئی تھی۔ جب اس کی نظر گلیسن پر پڑی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے عقبی شیشے پر مکے مارنا شروع کر دیے۔ اس کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے لرز رہے تھے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

”میری مدد کرو، پلیز میری مدد کرو۔“

گلیسن جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ پانی میں چھلانگ لگاتا۔ گاڑی کا دروازہ کھولتا اور لڑکی کو وہاں سے باہر نکال لیتا۔ اس نے اس مقصد کے تحت اپنا قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ ایک خیال ذہن میں آتے ہی رک گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا اس کے تصور سے ہی وہ لرز گیا۔ وہ لڑکی پولیس کو بیان دیتی کہ گلیسن کی بے پروائی کے سبب اسے اپنی گاڑی کو خطرناک حد تک دائیں جانب موڑنا پڑا جس کے نتیجے میں وہ کار سمیت جھیل میں جا گری۔ پولیس اس کا طبی معائنہ کروائی اور وہ نشے کی حالت میں گاڑی چلانے کے جرم میں گرفتار ہو جاتا۔

گلیسن نے ایک بار پھر کورٹنی کی جانب دیکھا۔ پہلے تو وہ مسکرائی لیکن گلیسن کو اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتا دیکھ کر مایوس ہو گئی۔ اس نے زور زور سے شیشے پر ضرب لگانا شروع کر دی لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ڈوبتی ہوئی کار کا شیشہ توڑ کر باہر آ سکے۔ گلیسن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لڑکی کو بچانے کے لیے کیا کرے کہ اس کا نام سامنے نہ آئے۔ یکایک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا کہ وہ کیوں نا پولیس کو اس حادثے کی اطلاع کر دے۔

اس نے چند لمحوں میں ہی سوچ لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے وہ تھرماس اٹھایا جس میں تھوڑی سی رم موجود تھی۔ پھر ایک جانب دوڑ لگا دی۔ بائیں جانب کچھ فاصلے پر جھاڑیاں

تھیں۔ گلیسن نے حلق میں انگلی ڈال کر وہ سب اگل دیا جو اس کے معدے میں تھا اور اس پر برف ڈال دی پھر اس نے برف سے ہی تھرماس صاف کیا۔ اس دوران میں کوئی کار وہاں سے نہیں گزری۔ اس لیے اس کے دیکھ لیے جانے کا بالکل بھی امکان نہیں تھا پھر وہ اپنی گاڑی کی طرف واپس آیا اور پولیس کو فون کرنے لگا۔

”میں بلیک فارم روڈ پر ہوں۔ ابھی ابھی ایک کار میرے پاس سے گزری ہے۔ وہ بُری طرح لہرا رہی تھی، اس سے بچنے کے لیے مجھے بھی کنارے پر آنا پڑا لیکن اس کی وجہ سے ایک دوسری کار جھیل میں جا گری۔ اس میں ایک لڑکی ہے اور مدد کے لیے چلا رہی ہے۔ جلدی یہاں پہنچو۔“

پولیس نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی لیکن وہ لڑکی کو نہیں بچا سکے۔ پولیس نے اس سے کرید کرید کر سوال کیے۔ گلیسن نے اپنی کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کچھ اور تفصیلات کا اضافہ کر دیا۔ مثلاً کار کا رنگ اور کار چلانے والے کا حلیہ بقول اس کے جس کی وہ ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا۔ اس پوچھ گچھ کے بعد پولیس نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ گلیسن کی بیان کردہ کہانی میں بظاہر کوئی جھول نہیں تھا البتہ وقت کا معاملہ پولیس کے لیے الجھن کا سبب بن رہا تھا۔ گلیسن نے دس بج کر تیس منٹ پر فون کیا تھا جبکہ کورٹنی کی گھڑی 10 منٹ پر بند ہو گئی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ گلیسن نے پولیس کو فون کرنے میں پندرہ منٹ تاخیر کیوں کی؟

سراغ رساں ایرک بڑی باریک بینی سے گلیسن کی بیان کردہ کہانی کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ کہانی مقامی ٹی وی اسٹیشن سے بھی نشر ہوئی۔ پولیس کا کہنا تھا کہ ابھی اس کیس کی تفتیش ہو رہی ہے جبکہ گلیسن کے وکیل نے دعویٰ کیا کہ پولیس اس بیان سے مطمئن ہے اور اب اس کیس کو بند کر دینا چاہیے۔ اس طرح گلیسن لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ کچھ اسے موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے کہ اس نے پولیس کو اطلاع دینے میں اتنی تاخیر کیوں کی جبکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اسے بلاوجہ اس مقدمے میں الجھایا گیا ہے۔ اگر وہ پولیس کو اطلاع دینے کے بجائے خاموشی سے آگے بڑھ جاتا تو کسی کو اس کا نام بھی معلوم نہ ہوتا۔

گلیسن کو تھوڑی سی پریشانی اس وقت ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ کورٹنی کا نانا بااثر ووٹ کا ایک بڑا اداکار ہے اور اس کی وجہ سے یہ معاملہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ کورٹنی کے گھر والوں نے مقدمہ دائر کرنے کی کوشش کی لیکن گلیسن کے وکیل نے نکتہ اٹھایا کہ پولیس کی تفتیش مکمل ہونے تک اس کے خلاف مقدمہ درج نہیں ہو سکتا۔ کئی مہینے تک ٹی وی اور اخبارات میں اس کہانی کا چرچا رہا اور اب اس واقعے کو گزرے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ گلیسن نے اس موقع پر گھر میں ہی رہنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی رپورٹر اس واقعے کی یاد تازہ کرنے کے لیے اس تک پہنچ جائے۔ وہ اس منحوس یاد کو اپنے دل اور ذہن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

کار کی رفتار آہستہ ہونے پر گلیسن نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں گزشتہ برس وہ حادثہ پیش آیا تھا۔ تو نیل نے گاڑی پارک کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسی مقام پر وہ حادثہ ہوا تھا نا؟“

”ہاں۔“ گلیسن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا پھر اس نے پانی کی بوتل کھولی اور ایک لمبا گھونٹ لیا۔

”پندرہ منٹ ضائع ہو جانے کی وجہ سے پولیس تمہاری کہانی پر یقین نہیں کر رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تم نے پولیس کو اطلاع دینے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟“

گلیسن کے وکیل نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”ممکن ہے کہ اس لڑکی کی گھڑی پیچھے ہو یا کسی وجہ سے بند ہو گئی ہو۔“ گلیسن نے بھی اسی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے حادثے کی اطلاع دینے میں دیر نہیں لگائی۔ بھلا میں ایسا کیوں کرتا؟“

”ان کا خیال ہے کہ تم نشے کی کیفیت سے باہر آنے کی کوشش کر رہے تھے؟“

”میں نشے میں نہیں تھا۔ اس رات میں نے صرف ایک ڈرنک لی تھی اور بارٹینڈر نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔“

نوئیل نے گلیسن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ بھی تو فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس رات تم نشے کی حالت میں گاڑی چلا رہے تھے اور تمہاری کار سڑک پر بُری طرح لہرا رہی ہو جس کی وجہ سے اس لڑکی کی کار جھیل میں جا گری اور تم کنارے پر کھڑے اسے ڈوبتا ہوا دیکھتے رہے جبکہ وہ بے چاری گاڑی کے شیشے پر ضربیں لگاتی رہی یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں سے خون جاری ہو گیا۔“

”نہیں۔“ گلیسن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”وہ کوئی اور ڈرائیور تھا جس نے لڑکی کی کار کو ٹکر ماری۔ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔“

گلیسن کے اندر سے ایک آواز ابھری۔ ”ہاں، میں نے اسے مارا ہے۔ میں ہی اس کا قاتل ہوں۔“ لیکن زبان سے یہ اعتراف کرنا بہت مشکل تھا، اس کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے لہٰذا اس نے نوئیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

http://digestpk.blogspot.com/

"میں نے تمھیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں اس لڑکی کی موت کا ذمے دار نہیں ہوں۔"

نوئیل کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم بے گناہ ہو۔ دراصل میرے دفتر میں بھی کچھ لوگ پولیس کے موقف کی تائید کر رہے ہیں کیونکہ میں نے انھیں سمجھا دیا تھا کہ وہ غلطی پر ہیں اور تم جو کہہ رہے ہو وہی حقیقت ہے۔"

گلیسن کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے بوتل کا بچا کھچا پانی حلق میں انڈیلا اور بولا۔ "پلیز چارلس مجھے گھر پہنچا دو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔"

☆☆☆

نوئیل نے گلیسن کی کار ڈرائیووے میں کھڑی کی اور نیچے اتر کر گیراج کا دروازہ کھولا پھر اس نے گاڑی گیراج میں لے جا کر کھڑی کر دی۔ گلیسن پسنجر سیٹ پر دراز گہری نیند سو رہا تھا۔ نوئیل نے اس کے کوٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر کچھ لکھا پھر وہ گیراج سے باہر آگیا اور دروازہ بند کر کے باہر کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

سراغ رساں ایرک جب کورٹنی کے گھر پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور گھروں کی بتیاں روشن تھیں۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے دی تھی اس لیے وہ سب اس کے منتظر تھے۔ دروازے پر اس کا استقبال کورٹنی کے نانا کوپر نے کیا۔ گزشتہ بارہ ماہ کے دوران میں وہ کئی بار کیلی فورنیا سے اپنی بیٹی کے گھر آ چکا تھا تاکہ کورٹنی کی موت کا غم ہلکا کرنے میں اس کی مدد کر سکے۔

"تمھیں یہاں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔" کوپر نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنی مخصوص آواز میں کہا جس سے صرف ایرک ہی نہیں بلکہ ملک کے بہت سے لوگ واقف تھے۔ اپنے پچاس سالہ فلمی کیریئر میں کوپر نے کئی اشتہارات کے لیے مختلف آوازیں استعمال کی تھیں۔ اشتہاری کمپنیوں کے کرتا دھرتا سمجھتے تھے کہ وہ ہر قسم کی آواز نکالنے پر قادر ہے اور اس کی یہی خصوصیت اسے دوسروں سے ممتاز بناتی تھی۔ ایرک اس کی فلمیں دیکھ کر جوان ہوا تھا لیکن وہ اب بھی پہلے کی طرح تر و تازہ اور اپنی اصل عمر سے کہیں کم نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال کنپٹیوں کے پاس سے سفید ہو گئے تھے لیکن جلد ابھی تک بے داغ اور شکنوں سے پاک تھی۔

"رتھ اور بریڈ کہاں ہیں؟" ایرک نے کورٹنی کے والدین کے بارے میں پوچھا۔

"وہ لیونگ روم میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

ایرک کو دیکھ کر ان کی نظروں میں امید کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ یہی سمجھے کہ پولیس کو کوئی ایسا ثبوت مل گیا ہے جس کے بعد ان کی بیٹی کی موت کے ذمے دار کو سزا دینا ممکن ہو سکے گا۔

"تقریباً ایک گھنٹے بعد کورٹنی کے کیس کے بارے میں ایک اعلان متوقع ہے۔" ایرک نے ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ آج صبح تم اسے گرفتار کر لو گے۔" رتھ بولی۔ کورٹنی کی موت اور اس کیس کا فیصلہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت تلخ ہو گئی تھی اور اس میں صبر و برداشت کا مادہ بالکل نہیں رہا تھا۔ ایرک کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کسی بھی قتل یا ناگہانی موت کی تحقیقات کے دوران میں اسے لواحقین کی جانب سے ایسے ہی ردعمل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

"ہمارا یہی منصوبہ تھا۔ اس شام کے بارے میں میگی کے اعترافی بیان کے بعد سب کچھ شیشے کی طرح صاف ہو گیا تھا۔"

اس کیس میں میگی کی گواہی بہت اہم تھی کیونکہ گلیسن کا دعویٰ تھا کہ اس شام وہ نشے میں نہیں تھا اور اس دعوے کی تصدیق کے لیے وہ میگی کو استعمال کر رہا تھا جو سارا سال اسی بیان پر قائم رہی اور یہی کہتی رہی کہ اس شام گلیسن اس کے ساتھ تھا اور اس نے شراب نہیں پی تھی۔ گزشتہ ہفتے ہی ایرک کو معلوم ہوا کہ میگی اور اس کے شوہر میں شدید جھگڑا ہوا اور اس کے شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ مدد کے لیے گلیسن کے پاس گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر گلیسن نے اسے سہارا دیا تو وہ شوہر سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لے گی مگر گلیسن آزاد منش انسان تھا اور شادی کے چکر سے دور رہنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے میگی کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ میگی اس کے طرز عمل سے بہت مایوس ہوئی اور اسے برا بھلا کہتی ہوئی واپس آ گئی۔ ایرک کو جب ان سب باتوں کا پتا چلا تو وہ ایک بار پھر میگی سے ملا اور اسے پیشکش کی کہ اگر وہ سچ بتا دے تو اسے جھوٹا بیان دینے کے الزام سے معافی مل سکتی ہے۔

میگی پر تو جنون سوار تھا۔ اس نے غصے کے عالم میں ایرک کو سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ وہ اپنے ساتھ کھانے کے سامان کے علاوہ رم کی ایک بوتل بھی لے کر گئی تھی۔ وہ صرف چکھنے کی روادار تھی جبکہ تقریباً ساری بوتل گلیسن نے ہی اپنے حلق میں اتاری تھی۔ اس بیان کی روشنی میں جائے وقوعہ کا دوبارہ معائنہ کیا گیا اور اس کے بعد گلیسن کو گرفتار کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟ تم نے اب تک اسے گرفتار کیوں نہیں کیا؟" بریڈ نے پوچھا۔

"گلیسن گزشتہ شب جمی کے بار میں گیا تھا۔ عینی شاہدوں نے بتایا ہے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آج صبح بار کے بیرونی دروازے پر ہمیں ایک شربت کی خالی بوتل ملی۔ شربت عام طور پر لوگ گھروں میں رکھتے ہیں اور زہر خورانی کی صورت میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے مریض کو الٹیاں آتی ہیں اور اس کی طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔"

"گویا کسی نے اس کی شراب میں یہ شربت ملا دیا۔" رتھ مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ اس بار میں بھی کوئی اسے پسند نہیں کرتا ہوگا۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ کارنامہ کس نے سرانجام دیا ہے تو مجھے ضرور بتانا۔ میں اس شریف انسان کو چاکلیٹ اور پھول بھیجوں گی۔"

"ہم شاید ہی یہ معلوم کر سکیں۔" ایرک نے مایوسی سے کہا۔ "اس بوتل پر کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے۔ ویسے بھی لوگ اس موسم میں دستانے پہنتے ہیں۔ بارٹینڈر کا کہنا ہے کہ گزشتہ شب گلیسن کسی انگریز سے باتیں کر رہا تھا لیکن ہم اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ جب ہم گلیسن کو گرفتار کرنے گئے تو ایک اور صورت حال سامنے آ گئی۔ وہ اپنے گیراج میں مردہ پایا گیا۔ اس کی موت کاربن مونو آکسائیڈ سے ہوئی کیونکہ اس کے گیراج کا دروازہ بند تھا جسے تولیے رکھ کر سیل کر دیا گیا تھا۔ اس کی گاڑی کا انجن رات بھر چلتا رہا جب تک پیٹرول ختم نہ ہو گیا۔ اس کے پاس ہی پانی کی ایک خالی بوتل پڑی ہوئی تھی۔ لیبارٹری رپورٹ کے مطابق اس پانی میں بھی خواب آور دوا ملی ہوئی تھی۔ ہمیں ایک خط بھی ملا ہے جس میں گلیسن نے اعتراف کیا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی کی موت کا ذمے دار ہے۔"

"نہیں، نہیں... یہ ٹھیک نہیں ہوا۔" رتھ اپنے سر کو جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ "یہ تو بہت آسان موت ہے، اسے بھی مرتے وقت اتنی ہی اذیت ہونی چاہیے تھی جتنی..."

وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ بریڈ اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں تو بریڈ نے ایرک کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے یہاں آنے کی زحمت کی اور ہمیں سب کچھ بتا دیا۔"

"اب یہ کیس ختم ہو گیا ہے۔" ایرک نے کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ میگی کے اعتراف کے باوجود سرکاری وکیل کو پچاس فیصد امید تھی کہ گلیسن پر فرد جرم عائد کی جا سکتی ہے۔ اور اگر وہ اپنا کیس ہوشیاری سے لڑتا تو اس کے بری ہونے کا بھی امکان تھا۔"

"یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟" بریڈ نے پوچھا۔

"اس لیے کہ موقع کا گواہ کوئی نہیں ہے اور عدالت چشم دید گواہوں کے بیان کو ہی معتبر جانتی ہے۔ میگی کی گواہی اس لیے کمزور ہے کہ اس میں انتقامی جذبہ نظر آ رہا ہے۔"

بریڈ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس لحاظ سے تو اس کا مرنا ہی اچھا ہوا۔ اس کا بری ہو جانا ہمارے لیے کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہ ہوتا۔"

"تھوڑی دیر میں تم لوگوں کی حفاظت کے لیے کچھ پولیس آفیسرز یہاں آ جائیں گے اس لیے کہ اعلان ہونے کے بعد پریس اور میڈیا کے لوگ تمہارے تاثرات جاننے کے لیے یہاں یلغار کر دیں گے۔ ان سے نمٹنا تمہارے لیے آسان نہ ہوگا۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" کوپر نے کہا۔ "جب وہ آئیں گے تو میں ان سے بات کر لوں گا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ کیس ختم ہو گیا۔ قانون تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن قدرت کی طرف سے اسے اپنے کیے کی سزا مل گئی۔"

ایرک نے سر ہلاتے ہوئے "اچھا" کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو میں تمہیں دروازے تک چھوڑ آؤں۔" کوپر نے کہا۔

بیرونی دروازے سے باہر آنے کے بعد ایرک نے کوپر سے کہا۔ "تمہیں اپنا کارڈ تو لے لینا چاہیے تھا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کوپر پوچھتے ہوئے بولا۔

"چیپ مین اینڈ ہال۔ انھوں نے ڈکنز کی کئی کتابیں شائع کی ہیں جن میں "اے کرسمس کیرول" بھی شامل ہے۔ اس کارڈ پر جو پتا دیا گیا ہے وہاں ڈکنز بچپن میں رہتا تھا اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ چند سال پہلے تم نے اس کی کہانی پر مبنی ٹیلی وژن ڈرامے میں چارلس نوئیل کا رول پلے کیا تھا اور وہ ڈراما کافی مقبول ہوا تھا۔"

کوپر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری مگر وہ خاموش رہا۔

"بظاہر یہ کیس ختم ہو چکا ہے۔ سرکاری وکیل مطمئن ہے کہ اس کی جان چھوٹ گئی اور میرے افسران وہ سب سننے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے جو میں انھیں بتانا چاہتا ہوں۔ تم نے بڑی ہوشیاری سے اپنا کام دکھایا ہے اور فی الحال میرے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ تم پر ہاتھ ڈال سکوں۔ فی الحال جا رہا ہوں لیکن تم سے بہت جلد ملاقات ہوگی کسی ٹھوس ثبوت کے ساتھ۔ کیونکہ جرم کا سراغ لگانا میرے فرائض میں شامل ہے۔"

یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا اور کوپر چھپی چھپی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب اسے سراغ رساں کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

http://digestpk.blogspot.com/

اسما قادری

قسط :20

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ..... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ..... ایک للکار ہے

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چوہدری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے رعب میں لانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پا کر مکمل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چوہدری کی نفاست پسند بہن کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چوہدری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چوہدری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چوہدری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چوہدری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں۔ ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو کو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی ضیا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ وہ اسے اپنی بیٹی کہہ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہریار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ ضیا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیا جا چکا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی [illegible] سے [illegible] کر دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چوہدری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پا کر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابہ خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندھ [illegible] منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ جس کا سی ڈی ویو اصل میں موسا کا انکشاف ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چوہدری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیرِ عتاب آ جاتی ہیں۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آ جاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ادھر چوہدری افتخار نیپال سے واپس آ کر کشور کی ملازمہ خاص رانی پر بے پناہ تشدد کرتا ہے مگر رانی موقع پا کر چوہدری کے ریوالور سے خود کو ختم کر لیتی ہے۔ شہریار لورپور سے واپسی پر تھانے جاتا ہے جہاں ایک اتائی ڈاکٹر سے تفتیش کے دوران موت کے منہ میں چلے جانے والے بچے کا باپ مشتعل ہو جاتا ہے اور وہ شہریار کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے اپنا موبائل نمبر دے کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کرتا ہے۔ ادھر مشابہ خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کو چکما دیتا ہے جو وہاں اس کی موجودگی سے بے خبر ہیں۔ اس کے بعد ہیلی کاپٹر کی آمد سے اسے کوئی امید ہوتی ہے۔ چوہدری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوٹی کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چوہدری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کر لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور ایسی حالت میں اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کشمیر کا رہنے والا ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے اپنی بیوی بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ ادھر مشابہ خان برف زار کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہریار، ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چوہدری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو یہاں بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک مجبر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع مجبر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہریار فوراً سکردو پہنچ جاتا ہے جبکہ مشابہ خان اور ماہ بانو کو آرمی کی تحویل سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ صحافی افضل قاتلانہ حملے میں مارا جاتا ہے۔ ادھر چوہدری افتخار کے آدمی اسکول کی عمارت اور ٹیچرز کی رہائش گاہ کو آگ لگا دیتے ہیں جہاں رہائش پذیر تین اساتذہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شہریار اس واقعے کی رپورٹ چوہدری کے خلاف درج کرواتا ہے۔ ماہ بانو کراچی میں میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کالج سے باہر چاٹ کھانے نکلتی ہے۔ وہاں ایک خواجہ سرا کو دیکھ کر وہ سہم جاتی ہے۔ کشور اور آفتاب افضل کے ایک دوست بابر کی مدد سے سلام آباد میں اس کی خالہ کے گھر پناہ گزیں ہو جاتے ہیں مگر کشور کو یہاں بھی سکون میسر نہیں آتا۔ خالہ کا داماد بیٹا اسے تنگ کرتا ہے۔ ادھر چوہدری کے وفادار پالتے کو کچھ لوگ یرغمال بنا کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں جس کا الزام چوہدری شہریار پر لگاتا ہے۔ ماہ بانو کو اس کی سہیلی راحیلہ اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بنگلے میں مہا گرو کو دیکھ لیتی ہے اور شہریار کو مطلع کرتی ہے۔ شہریار فوراً کراچی آ جاتا ہے۔ وہاں وہ اپنے ایک دوست کے خالی بنگلے میں ٹھہرتا ہے اور ماہ بانو کے بتائے ہوئے بنگلے کی نگرانی شروع کر دیتا ہے۔ نگرانی کے دوران اسے مہرو نظر آتا ہے۔ وہ اس سے مل کر مہا گرو کا پتا لگاتا ہے۔ ادھر چوہدری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ شہریار، ماہ بانو اپنا حلیہ بدل کر مہا گرو کا پیچھا کرتے ہیں اور اس سے کافی حقیقت اگلوا لیتے ہیں۔ ماہ بانو کی سہیلی راحیلہ اسے اپنے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں سے واپسی پر اسے چوہدری کا کارندہ نظر آتا ہے جو اسے اشارے سے اپنے پاس بلاتا ہے مگر ماہ بانو خوف سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ہوش کھونے سے قبل اسے ڈاکٹر طارق کی آواز سنائی دیتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"مہرین... اٹھو مہرین، آنکھیں کھولو۔" اسے یوں لگ رہا تھا کہ کوئی بہت دور سے آوازیں دے رہا ہو۔ فوری طور پر تو وہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ پکارنے والا اسے پکار رہا ہے۔ حالات نے اسے ماہ بانو سے مہرین بن کر رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ پوری طرح اپنے اس دوسرے نام کو قبول نہیں کر سکی تھی۔ بے ہوشی سے ہوش کی دنیا تک سفر کرتے ہوئے اس کا ذہن بہت مشکل سے یاد کر سکا کہ مہرین کے نام کی یہ پکار دراصل خود اس کے لیے ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے بوجھل پلکوں کو کھول کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں نے سب سے پہلے ڈاکٹر طارق کے چہرے کو گرفت میں لیا۔ وہ اس کی بائیں کلائی کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں لیے دائیں ہاتھ سے دھیرے دھیرے اس کا رخسار تھپتھپا رہا تھا۔ ڈاکٹر طارق کے پیچھے ہی راحیلہ کچھ پریشان سی کھڑی تھی۔ اس نے نظریں گھما کر اردگرد دیکھا۔ آشنا در و دیوار نے اسے بتایا کہ وہ راحیلہ کے بنگلے میں اس کے بیڈ روم میں موجود ہے لیکن اس حال میں کیوں موجود ہے؟ اس سوال کا جواب اسے کچھ دیر بعد یاد آیا۔ یاد آتے ہی وہ متوحش سی ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"ریلیکس مہرین!" ڈاکٹر طارق نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"وہ... وہ کہاں ہے؟" وہ یوں ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے ابھی کمرے کی کوئی دیوار شیدے کو اگل دے گی۔ وہ شیدے کو دیکھ کر ہی تو بے ہوش ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ڈاکٹر طارق اور راحیلہ اسے ہاسٹل چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے۔ وہ لوگ ٹیکسی کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑے تھے، جب شیدے نے اپنی گاڑی عین اس کے سامنے لا کر روکی تھی اور پھر اسے اشارے سے بلایا بھی تھا۔ شیدے کے ہاتھ لگ جانے کا مطلب تھا، وہ ایک بار پھر چوہدری کے چنگل میں جا پھنستی۔ بہت عرصے بعد تو گرداب میں پھنسی اس کی زندگی میں یہ دن آئے تھے کہ وہ اپنی من پسند زندگی کا ایک حصہ گزار رہی تھی۔ اس زندگی میں اپنے گھر والوں کی جدائی تو ضرور تھی لیکن اسے اپنے ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"تم کس کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟" ڈاکٹر طارق نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ شیدا... چوہدری افتخار کا کارندہ۔" اس نے اسی ڈرے ڈرے انداز میں جواب دیا۔

"کون چوہدری افتخار؟ ذرا کھل کر تفصیل سے بتاؤ۔"

ڈاکٹر طارق نے اسے ٹوکا تو اسے یک دم جھٹکا سا لگا اور وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"بتاؤ نا مہرین! یہ شیدا اور چوہدری افتخار کون ہیں؟ تمہارے ساتھ آخر ایسا کیا مسئلہ ہے کہ تم اچانک ہی بالکل مختلف طریقے سے بی ہیو کرنے لگتی ہو۔ کیا تمہاری کسی سے کوئی دشمنی ہے جس کی وجہ سے تم راہ چلتے یک لخت خوف زدہ ہو جاتی ہو۔ اس دن کالج کے سامنے تم خواجہ سرا سے ڈر گئی تھیں اور اب ایک راہ گیر سے اتنی خوف زدہ ہوئیں کہ خوف کی شدت سے بے ہوش ہی ہو گئیں۔ تم اپنے اس خوف کی وجہ بتاؤ تو شاید ہم تمہاری کچھ مدد کر سکیں۔" راحیلہ جواب تک خاموش کھڑی تھی، اس کے قریب آ کر بہت اصرار سے پوچھنے لگی۔

"میں اگر تمہیں سب کچھ بتا بھی دوں تو تم لوگ میری مدد نہیں کر سکتے۔ میرا دشمن بہت طاقتور اور بااختیار ہے۔ تم اس کی پہنچ کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ میں کہیں بھی جا کر چھپ جاؤں... چند دن سے زیادہ چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس کے ہرکارے مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے ہیں... مجھے لگتا ہے کہ اب ان لوگوں نے میرا یہاں بھی سراغ لگا لیا ہے۔ وہ شخص جس نے ہمارے قریب گاڑی لا کر روکی تھی، میرے دشمن کا خاص ملازم تھا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگ مجھے اس سے بچا کر یہاں تک کیسے لائے ہو۔"

"لیکن وہ تو صرف کسی کا ایڈریس معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس رکا تھا۔ تم اچانک بے ہوش ہو گئیں تو بھائی نے اس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں گھر تک چھوڑ دے۔ وہ بے چارہ شرافت سے ہمیں یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے رویے سے بالکل بھی ظاہر نہیں ہوا کہ وہ تمہیں جانتا ہے یا تم سے اسے کوئی پرخاش ہے۔" ماہ بانو کی بات سن کر راحیلہ نے اسے بتایا۔

"ہو سکتا ہے وہ ایکٹنگ کر رہا ہو۔ وہ اکیلا تھا اس لیے اس نے بیچ راستے میں کوئی جھگڑا کھڑا کرنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ وہ مدد کے بہانے تم لوگوں کا گھر دیکھ گیا ہے۔ مناسب موقع دیکھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آئے گا اور مجھے لے جانے کی کوشش کرے گا۔" راحیلہ کی بتائی ہوئی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اسی خوف سے بھرے لہجے میں یقین سے بولی۔

"میرے خیال میں مہرین تمہارا اندازہ درست نہیں ہے۔ اس شخص نے واقعی تمہیں نہیں پہچانا تھا۔ تم نے چہرے پر نقاب لگایا ہوا تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ پیلی گاڑی

http://digestpk.blogspot.com/

میں سے نظر پڑنے پر کوئی شخص کسی نقاب پوش لڑکی کو شناخت کر سکتا ہے۔" ڈاکٹر طارق نے ان دونوں کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے ایک ایسی دلیل دی جس پر ماہ بانو کو قائل ہونا پڑا۔ اپنے خوف کے باعث اسے اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ وہ چار دیواری سے باہر نقاب کا استعمال کرنے لگی ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ کوئی اسے شناخت نہ کر سکے۔

"آپ یقیناً ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اصل میں، میں شیدے کو دیکھ کر اتنی بری طرح ڈر گئی تھی کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔" اس نے شرمندگی کے ساتھ اپنی بے وقوفی کا اعتراف کیا۔

"شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یقیناً تمہارے حالات ایسے ہوں گے کہ تم بلا ارادہ اس طرح ری ایکٹ کر گئیں۔ غیر معمولی حالات میں انسان کس طرح کے ردعمل کا اظہار کرے گا، اس کا اندازہ کوئی دوسرا شخص تو کیا، خود وہ شخص بھی نہیں لگا سکتا جو ان حالات سے گزر رہا ہو۔ میرے حساب سے تو تم ایک بہت بہادر اور باہمت لڑکی ہو جو مشکل حالات میں بھی بہت رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہ رہی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اتنی بہادر لڑکی نے اگر ایک چھوٹی سی بزدلی کا مظاہرہ کر دیا ہے تو یہ اتنی قابل گرفت بات نہیں۔" بے حد نرمی سے یہ سب کہتے ہوئے ڈاکٹر طارق آخری جملے کی ادائیگی کے بعد دھیرے سے مسکرایا تو ماہ بانو جھینپ گئی۔

"چلیں محترمہ! آپ کو تو بیٹھے بٹھائے بھائی کی طرف سے بہادری کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ اب آپ ذرا کھل کر اپنے حالات بھی بتا ڈالیں تاکہ ہم یقین کر سکیں کہ سرٹیفکیٹ غلط جاری نہیں ہوا۔" راحیلہ نے شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر ماہ بانو سے اصرار کیا۔

"راحیلہ کے اصرار سے تم خود کو کسی دباؤ میں محسوس نہیں کرنا۔ اگر مناسب سمجھو تو بتا دو ورنہ کوئی بات نہیں۔ البتہ میں نہایت خلوص سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہارے بااختیار دشمن کے مقابلے میں ہم تمہاری کوئی مدد بے شک نہ کر سکیں لیکن مخلص دوستوں سے اپنے مسائل شیئر کر کے نہ صرف تم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرو گی بلکہ ہمارا بھی مان بڑھ جائے گا کہ تم نے ہمیں کسی لائق سمجھا۔" وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھی لیکن ڈاکٹر طارق کی بات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ان سے اپنے حالات کہہ ڈالے۔ آہستہ آہستہ وہ ان واقعات کو بیان کرنے لگی جن کے گرداب میں گھری اس کی زندگی ہر روز اسے ایک نئے امتحان سے دوچار کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر طارق اور راحیلہ بنا کوئی دخل دیے اس کے ہونٹوں سے نکلا ایک ایک لفظ بہت غور سے سنتے رہے۔

☆☆☆

مست روی سے درختوں کے درمیان سے گزرتے اکو پر گہری یاسیت طاری تھی۔ اس کے سانولے اور بے رونق چہرے پر موجود آنکھوں میں ویرانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ سیاہی مائل موٹے موٹے ہونٹ آپس میں اس طرح پیوست تھے کہ گویا کبھی مسکراہٹ نے ان ہونٹوں کو چھوا ہی نہ ہو۔ اسے دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ قوت گویائی سے محروم ہو گا لیکن یہ حقیقت نہیں تھی۔ وہ بھی ایک ہنستا مسکراتا، خوش گپیاں کرنے والا زندگی سے بھرپور جوان ہوا کرتا تھا لیکن رانی کی موت نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ رانی جو اس کی منگیتر تھی اور جس کے ساتھ اس نے اپنی پوری زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے... یوں اچانک اس کی زندگی سے نکال دی گئی کہ اسے خود کو ہزار باور کروانے کے باوجود اس حادثے پر یقین نہیں آتا تھا، حالانکہ اس نے رانی کے لہولہو جسم کو قبر میں اتارے جانے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ روزانہ کئی کئی گھنٹے قبرستان میں اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر گزارتا تھا مگر محبت کرنے والوں کی مخصوص بے یقینی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ ہر عاشق کی طرح وہ یہ یقین کرنے سے گریزاں تھا کہ اس کا محبوب اسے بیچ سفر میں چھوڑ گیا ہے۔ اسے ہر دم یہی لگتا کہ اچانک ہی رانی کہیں سے نمودار ہو گی اور بڑی ادا سے ہنستے ہوئے کہے گی۔

"دیکھا اکو! میں نے تمہیں کیسے بے وقوف بنایا۔ جھلے میں تو صرف تمہیں آزما رہی تھی۔ میں بھلا تمہیں چھوڑ کر کہیں کیسے جا سکتی ہوں؟"

وہ اس سے اسی طرح شوخی سے بات کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ بہت اصرار کر کے اسے ملاقات کے لیے بلاتا تھا تو بھی وہ اسے ستانے سے باز نہیں آتی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر ملاقات کے لیے طے شدہ جگہ پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ رانی کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔ وہ بے قراری سے ٹہلتا، راستے کو گھور گھور کر دیکھتا کہ شاید وہ آتی ہوئی نظر آ جائے اور پھر بہت دیر گزر جانے پر جھنجلاتا ہوا واپسی کے لیے پلٹنے لگتا تو وہ کسی خفیہ مقام سے نکل کر اچانک ہی نکل کر سامنے آ کھڑی ہوتی اور پھر خوب کھلکھلا کر ہنستی۔ اکو اس کی اس حرکت پر مصنوعی غصے سے اسے خوب گھورتا لیکن پھر ہار مان کر خود بھی ہنس پڑتا۔

رانی کی کھلکھلاہٹ میں اس کی ہنسی شامل ہوتی تو لگتا کہ

سارے منظر مسکرانے لگے ہوں لیکن قسمت نے اس کے ساتھ عجیب سی کھیل کھیلا تھا۔ اس کی رانی کسی سے وفاداری نبھاتے نبھاتے خود اس کے ساتھ بے وفائی کر گئی تھی۔ رانی نے اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں لیکن جان اپنی کشور بی بی پر لٹا بیٹھی تھی۔ اگرچہ وہ نہیں جانتا تھا کہ رانی کی موت کن حالات میں ہوئی اور وہ کس کس طرح چودھری کے عتاب کا نشانہ بنی لیکن اس بات کا اسے یقین تھا کہ وہ کشور کا ساتھ دینے کے جرم میں ہی زندگی سے محروم کر دی گئی ہے۔ وہ کشور کی دیوانی تھی۔ کشور کی نرم خوئی اور مہربان طبیعت نے اسے کشور کا اتنا گرویدہ کر رکھا تھا کہ وہ سارا وقت اسی کے نام کی مالا جپتی رہتی تھی۔ وہ... جس نے ہمیشہ کشور کی اترن بڑے ذوق و شوق سے پہنی تھی، اس کے حصے کی موت کو بھی بخوشی گلے لگا بیٹھی تھی۔

اکو ایک کمزور آدمی تھا اور چودھری سے رانی کے قتل کا بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح چودھری کیفر کردار تک پہنچ جائے۔ رانی کے قتل کے الزام میں نہ سہی، اسے کسی اور جرم کی ہی سزا ضرور ملے۔ اسی خواہش کی وجہ سے اس نے آفتاب کے اغوا کی اطلاع نیب تک پہنچائی تھی۔ اس اطلاع کے نتیجے میں آفتاب کو تو بچا لیا گیا لیکن چودھری سزا سے محفوظ رہا۔ قسمت کی خرابی کہ جس رات نیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کو قتل کیا گیا، وہ تیز بخار کے باعث گھر میں نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا اس لیے اسے گاؤں میں برپا ہونے والے ہنگامے کی خبر ہی نہیں ہو سکی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اتنے بڑے ظلم کے خلاف گاؤں بھر میں سے کسی نے گواہی نہیں دی تو بہت افسردہ ہوا اور رہ رہ کر کف افسوس ملتا رہا کہ میں کیوں اس رات اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ اگر اس نے وہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے گواہی دینے سے نہیں روک سکتی تھی لیکن شاید ابھی قدرت چودھری کو ڈھیل دینا چاہتی تھی۔

اس واقعے کے بعد اکو پر چھائی اداسی مزید گہری ہو گئی اور وہ ہر طرف سے تقریباً بیگانہ سا ہو گیا۔ وہ تانگا جس سے اس کی اور گھر والوں کی روزی روٹی کا سلسلہ بندھا تھا، فارغ کھڑا رہنے لگا۔ گھر کا چولہا کس طرح جل رہا ہے اور جل بھی رہا ہے کہ نہیں، اسے پروا نہیں رہی۔ خود اس کا یہ عالم تھا کہ ماں چند لقمے زبردستی منہ میں ڈال دیتی تو حلق سے نیچے اتار لیتا ورنہ پورا پورا دن گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہتا۔ ماں کے مسلسل کھانسنے کی آواز بھی اس کے کانوں سے ٹکرا کر بے اثر پلٹ جاتی تھی لیکن کل رات عجیب ہی معاملہ ہوا۔ وہ اپنی مخصوص کیفیت میں سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھا رانی کے مرنے کا سوگ منا رہا تھا، اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ آج پورے دن اس کے حلق سے ایک لقمہ تک نیچے نہیں اترا ہے کہ اچانک ہی حکیم جی وہاں چلے آئے اور پھر انہوں نے اسے جو بے نقط سنانی شروع کی تو بہت دیر تک خاموش نہیں ہوئے۔

وہ چپ چاپ حکیم جی کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر وہ بے چارے تھکے تھکے مایوسی کے عالم میں وہاں سے چلے گئے لیکن اصل بات یہ تھی کہ ان کا بکنا جھکنا رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اکو کی سمجھ میں کم از کم اتنی بات تو آ گئی تھی کہ اس کی ماں شدید بیمار ہے اور اس کے علاج کے لیے خالص شہد درکار ہے۔ حکیم جی کے جانے کے بعد اس نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ گھر کا نعمت خانہ بالکل خالی پڑا ہے اور رقم کے نام پر ماں کے پاس چند سکے بھی باقی نہیں بچے ہیں۔ ایسے میں خالص شہد کی فراہمی کیونکر ممکن ہو پاتی۔ کسی سے مانگنا اس کی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ چنانچہ رات بھر کی سوچ بچار کے بعد اسے یہی حل سوجھا کہ جنگل کا رخ کیا جائے اور کسی درخت پر لگے شہد کے چھتے کو اتار لیا جائے۔ چھتے سے شہد نکال کر ماں کا علاج بھی ہو جاتا اور بچا کھچا شہد بیچ کر تھوڑی سی رقم بھی مل جاتی۔ مسئلے کے اس فوری حل کے بعد وہ معمول کے مطابق اپنا تانگا چلانا شروع کر دیتا تو حالات آہستہ آہستہ دوبارہ سنبھل جاتے۔

اپنی سوچ پر عمل پیرا ہونے کے لیے وہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا اور سیدھا جنگل کا رخ کیا۔ اتنی صبح وہاں اس کے سوا کوئی دوسرا انسان موجود نہیں تھا۔ جنگل کے مخصوص ماحول میں چرند پرند کی آوازوں کے سوا جو آواز سنائی دیتی تھی، وہ ان سوکھے پتوں کے چرمرانے کی آواز تھی جو اس کے قدموں تلے آ کر روندے جاتے تھے۔ خود اس کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر طرح کی آوازوں سے بے نیاز تھا۔ اس کے کان اگر سنتے تھے تو اس کی کھلکھلاہٹ اور گنگناہٹ سنتے تھے جو اپنی ذرا سی جھلک دکھا کر کسی درخت کے تنے کے پیچھے جا چھپتی تھی۔ وہ ہر جگہ تھی اور کہیں بھی نہیں تھی۔ اکو کبھی نیلے پیڑوں میں اس کا عکس جھلملاتا دیکھتا تو کبھی وہ سبز پیراہن میں پتوں کی آڑ میں چھپ جاتی۔ رانی کے آنکھ مچولی کھیلتے تصور سے دل کو بہلاتا وہ بڑی مشکل سے خود کو یاد دلا سکا کہ جنگل میں اس کی آمد کا مقصد ماں کے لیے شہد کا حصول ہے۔ یاد آنے پر وہ ایک جگہ رک کر اردگرد موجود درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ سال کے اس حصے میں شہد اتنی آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ یہ وہ موسم تھا جب شہد کی مکھیاں اپنا

http://digestpk.blogspot.com/

تیار کردہ شہد پی کر چھتے کو چھوڑ جاتی تھیں۔ جائزہ لینے پر اسے ایک بھی درخت ایسا نظر نہیں آیا جس پر شہد کے چھتے کا امکان ہو۔ تلاش میں ناکام ہو کر وہ ایک بار پھر چل پڑا۔ اس کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ بے خیالی میں وہ پہلے ہی کافی آگے تک آچکا تھا اور اب یہ سوچ کر آگے بڑھ رہا تھا کہ جہاں اتنا فاصلہ طے کیا ہے، وہاں ماں کی خاطر تھوڑی سی کوشش اور کر لینی چاہیے۔ اس سوچ کے پیچھے یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ محبوبہ کے خیالوں میں ڈوب کر جنگل کی ہولناکی نظر نہ آسکی تو پھر ماں کے لیے کیوں اس ہولناکی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا؟ اس کا ذہنی انتشار اسے آگے بڑھاتا رہا ورنہ اس سے قبل وہ کبھی جنگل میں اتنا آگے نہیں آیا تھا۔ گاؤں کے دیگر لوگوں کی طرح وہ جنگل کے ابتدائی حصے تک ہی محدود رہتا تھا۔ اندر تک وہی لوگ جاتے تھے جن کے پاس مناسب اسلحہ اور ساز و سامان ہوتا تھا اور یہ لوگ عام طور سے چودھری کے کارندے ہی ہوتے تھے۔

چلتے چلتے اسے یکدم ہی اپنی ناک کی پھنگ پر شدید درد کا احساس ہوا اور پھر فوراً ہی بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ اس کی نظروں نے آواز کا تعاقب کیا تو زرد رنگ کی شہد کی مکھی اڑتی نظر آئی۔ اسی مکھی نے ہی اس کی ناک پر ڈنک مارنے کی جسارت کی تھی۔ مکھی کی اس جسارت پر غصے یا تکلیف کا اظہار کرنے کے بجائے وہ بے تابی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ بالآخر اس کی نظروں نے ایک بہت بلند درخت کی شاخوں کے آس پاس چند مزید زرد مکھیوں کو بھنبھناہٹ کے ساتھ چکراتے دیکھ لیا۔ شاخوں کے آس پاس چکراتی یہ مکھیاں نشان دہی کر رہی تھیں کہ وہاں کوئی چھتا موجود ہے۔ وہ درخت کے نیچے رک گیا اور اوپر چڑھ کر چھتا اتارنے کی تیاری کرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے نیچے گرے سوکھے پتے اور گھاس پھوس جمع کر کے ایک گٹھر سا بنایا اور اس گٹھر کو رسی کی مدد سے باندھ کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے چہرے کو گردن میں پڑے مفلر نما کپڑے سے اچھی طرح ڈھانپا اور چپلیں اتار کر درخت پر چڑھنے لگا۔ اتنے بلند درخت پر چڑھنا آسان بات نہیں تھی لیکن گاؤں کے دیگر بچوں کی طرح اس کا بچپن بھی اسی طرح کی سرگرمیوں میں گزرا تھا اس لیے اسے بہت زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور وہ تنے پر پنجے جماتا چند منٹوں میں ہی کافی اوپر تک پہنچ گیا۔ اب اسے چھتا نظر آنے لگا تھا اور چھتے سے چمٹی بے شمار مکھیوں کو دیکھ کر یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ چھتا شہد سے بھرا ہوا ہے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے اپنی جیب

ٹٹول کر اس میں سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور ایک تیلی جلا کر گٹھر کو آگ دکھا دی۔ گٹھر فوراً ہی سلگنے لگا اور ذرا دیر میں وہاں دھواں سا بھر گیا۔ دھوئیں کی وجہ سے مکھیاں بے چین ہو گئیں۔ وہ دھواں چھوڑتے اس گٹھر کو بے پناہ احتیاط سے سنبھالے چھتے تک کا باقی فاصلہ طے کرنے لگا۔ دھوئیں سے پریشان دو چار مکھیاں اس کی طرف لپکیں اور اس کے بازوؤں میں اپنے ڈنک اتار دیے۔ اس کے بازوؤں میں ناک کی پھنگ کی طرح مرچیں سی بھر گئیں لیکن اس نے پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا رہا۔ چھتے تک اس کے رسائی حاصل کرنے تک شہد کی مکھیاں دھوئیں کے آگے ہتھیار ڈال کر پسپائی اختیار کر چکی تھیں اور کافی فاصلے پر چکراتی پھر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شہد سے بھرا چھتا اپنے قبضے میں کیا اور شانے سے لٹکتے پلاسٹک کے مضبوط تھیلے میں منتقل کر لیا۔ اس عمل میں اس کی انگلیاں شہد سے لتھڑ گئی تھیں۔ درخت سے چند پتے توڑ کر وہ ان لتھڑی ہوئی انگلیوں کو صاف کرنے لگا۔ اس عمل کے دوران اس نے یونہی اپنی نظروں کو اِدھر اُدھر دوڑایا تو بہت دور نظر آتے ایک منظر کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

وہ لکڑی کا ایک مکان تھا جس سے نکلتے ہوئے تین چار افراد کو وہ فاصلے کے باوجود دیکھ سکتا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑے جیسی چیزیں اٹھا رکھی تھیں۔ اکو حیران رہ گیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور جنگل کے اس حصے میں کیا کر رہے ہیں؟ ایک بار اسے خیال آیا کہ شاید یہ وہ ڈاکو ہیں جن کی دہشت اردگرد کے سارے دیہاتوں میں پھیلی ہوئی ہے لیکن جانے کیوں ان لوگوں کے انداز سے اسے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ڈاکو ہو سکتے ہیں۔ ان کے ڈاکو ہونے کا امکان رد کرنے کے بعد ان افراد کے بارے میں اس کا تجسس مزید گہرا ہونے لگا۔ عام لوگوں کے جنگل کے اس حصے میں ہونے اور باقاعدہ مکان بنا کر رہنے کی وجہ سمجھ سے باہر تھی۔ اگر وہ اتنے بلند درخت پر موجود نہ ہوتا تو اس کو وہ لوگ نظر بھی نہ آپاتے۔ ان کے نظر آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود جس حصے میں موجود تھے، وہاں درخت وغیرہ بہت کم تھے اور جنگل چھدرا محسوس ہو رہا تھا۔

تجسس میں مبتلا اکو واپس گاؤں کی طرف لوٹنا بھول گیا اور درخت سے اتر کر اس سمت چل پڑا جہاں اسے وہ مکان اور آدمی نظر آئے تھے۔ درخت کی بلندی سے نظر آنے والی وہ جگہ اچھے خاصے فاصلے پر تھی۔ اسے یہ فاصلہ طے کرنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ لکڑی کے اس مکان کی پشت تک پہنچ گیا جس سے اس نے چند آدمیوں

کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مکان کا رقبہ ساٹھ ستر گز سے زیادہ نہیں تھا اور اس کی پچھلی طرف دو عدد جالی دار کھڑکیاں موجود تھیں۔ اکو نے ایک کھڑکی کے قریب جا کر مکان کے اندر جھانکا۔ جھانکنے پر اسے اندازہ ہوا کہ مکان اندر سے کمروں وغیرہ میں منقسم نہیں ہے بلکہ ایک ہال سا تھا جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زمین پر بستر بچھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بستروں کے ساتھ ہی ٹین کے چھوٹے سائز کے صندوق بھی رکھے ہوئے تھے جو یقیناً ان بستروں پر سونے والوں کی اشیائے ضرورت رکھنے کے کام آتے ہوں گے۔ ہال نما کمرے کے ایک کونے پر دو بڑے پانی کے مٹکے اور کھانا پکانے اور کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ مکان کا یہ غریبانہ منظر ظاہر کرتا تھا کہ مکان محنت کشوں کے استعمال میں ہے جو دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد اسے صرف شب بسری کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن سوال وہی تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور جنگل میں کس قسم کا کام کر رہے ہیں؟

ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ مکان کی سائڈ سے ہوتا ہوا اگلی جانب پہنچا۔ اگلی جانب مکان کے سامنے اینٹیں رکھ کر چولہے بنائے گئے تھے۔ ان چولہوں کے لیے ایندھن کا کام دینے والی ادھ جلی لکڑیاں بتا رہی تھیں کہ وہاں باقاعدگی سے کھانا پکایا جاتا ہے۔ وہ اس جگہ کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے مدھم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آوازوں سے سمت کا تعین کرتا ہوا وہ مزید آگے بڑھتا چلا گیا۔ آخرکار اس کی نظروں نے حرکت کرتے ہوئے انسانی جسموں کو دیکھ لیا۔ وہ کسان تھے اور بڑی تن دہی سے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ اکو مزید قریب پہنچا تو اسے ان لوگوں کے چہرے بھی دکھائی دینے لگے۔ یہ چہرے اس کے لیے شناسا تھے۔ وہ ان میں سے تقریباً ہر ایک کو ہی جانتا تھا۔ یہ لوگ چودھری کی زمینوں پر کاشت کیا کرتے تھے اور یہاں بھی یہی کام کر رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ چودھری کو اپنی ڈھیر ساری زمین چھوڑ کر جنگل میں کاشت کروانے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟

اس نے آنکھیں سکیڑ کر زمین سے سر اٹھاتے ننھے پودوں کا جائزہ لیا اور پھر اچھل پڑا۔ اگر اس سے اندازے کی غلطی نہیں ہو رہی تھی تو وہ یقینی طور پر پوست کے پودے تھے... یعنی جنگل کے اس حصے میں چودھری اپنے بندوں کے ذریعے خفیہ طور پر پوست کاشت کروا رہا تھا۔ اکو کا خون اس حقیقت کو جاننے کے بعد تیزی سے رگوں میں گردش

کرنے لگا۔ یہ زیرِ کاشت پوست چودھری کی مجرمانہ سرگرمیوں کا ایک بڑا ثبوت تھی۔ اگر وہ کسی طرح قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ذمے داران کو یہاں تک لانے میں کامیاب ہو جاتا تو چودھری کے لیے اپنی گردن چھڑانی مشکل ہو جاتی۔

جوش میں بھرا وہ تیزی سے وہاں سے جانے کے ارادے سے پلٹا تو یکبارگی اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی۔ وہ شاید حوائج ضروریہ کے لیے درختوں کے جھنڈ میں گیا تھا اور اب اپنی شلوار کا ازار بند باندھتا ہوا واپس پلٹ رہا تھا۔ اکو نے اس شخص کو پہچان لیا۔ وہ چودھری کے خاص ملازمین میں سے ایک تھا۔ اس شخص نے بھی اکو کو دیکھ لیا اور ایک پل کے لیے ازار بند باندھنا بھول کر حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اکو اس کی اس حیرت کا فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاگنے پر اس شخص کو بھی ہوش آیا۔

”پکڑو... پکڑو... جانے نہ پائے۔“ شور مچاتا ہوا وہ خود بھی اپنی شلوار سنبھالتا اس کے پیچھے دوڑا۔ اکو کو معلوم تھا کہ اگر وہ ان لوگوں کی گرفت میں آ گیا تو چودھری کو قانون کے شکنجے میں پھنسوانے کی خواہش تو ایک طرف رہی، وہ اپنی جان بھی نہیں بچا سکے گا۔ چنانچہ کئی دنوں کی کم خوراکی کے باعث ہونے والی جسمانی کمزوری کے باوجود وہ پوری قوت سے بھاگتا چلا گیا۔ جس جگہ اسے دیکھا گیا تھا، وہاں تو درخت نہ ہونے کے برابر تھے لیکن خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے اس حصے کا رخ کیا جہاں جنگل گھنا تھا اور وہ بھاگتے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے سکتا تھا۔ حیوانات و نباتات سے بھرے جنگل میں وہ جان بچانے کے لیے کسی وحشت زدہ ہرن کی طرح دوڑتا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں اسے جنگلی جانوروں کا خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس کے تعاقب میں جو لوگ تھے، وہ جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک درندے تھے۔ ان درندوں سے بچنے کے لیے وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ اس کے پاس موجود پلاسٹک کا وہ تھیلا جس میں اس نے شہد کا چھتا رکھا تھا، اس بھاگ دوڑ میں جانے کب اور کہاں گر گیا تھا۔ وہ ماں کی صحت کا سامان کرنے کے لیے جنگل میں آیا تھا اور اب اپنی ہی زندگی داؤ پر لگ گئی تھی۔ زندگی سے اسے پیار نہیں تھا کہ رانی کے بعد اس کے لیے دنیا کی ہر شے سے کشش ختم ہو گئی تھی لیکن وہ رانی کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتا تھا اور اس کے خیال میں قدرت نے اسے ایک بہترین موقع فراہم کر دیا تھا۔ اگر وہ کسی طرح کسی نہ کسی... [illegible]

http://digestpk.blogspot.com/

کاشت کی جانے والی پوست کے بارے میں اطلاع دے کر چودھری کو پھنسوانے کا سامان کرسکتا تھا۔

چودھری کے گرگے اس کے تعاقب میں تھے اور وہ ان سے چھپتا ہوا ہی آگے بڑھتا جارہا تھا۔ اپنی تمام تر پریشان حالی کے باوجود اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ بے سمت نہ ہونے پائے اور اس راستے پر ہی دوڑے جو اسے جنگل سے باہر لے جاسکتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ جنگل کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتا۔ وقت کے ان لمحات میں اس دیوانے کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا اور وہ اپنی تمام تر توانائی کے باوجود بہت تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔ گھنے جنگل سے نکلنے تک اس نے اپنا تعاقب کرنے والوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ چھدرا ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس جگہ اسے آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے اور وہ جانتا تھا کہ اگر اسے دیکھ لیا گیا تو جان بچانا مشکل ہوگی۔ وہ اپنی ٹانگوں کا بہترین استعمال کرکے بے شک متعاقب دشمنوں سے کافی دور نکل آیا تھا لیکن یہ فاصلہ کسی دور مار رائفل سے نکلی گولی کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور چودھری کے بندے خالی ہاتھ تو ہو نہیں سکتے تھے۔ ان حالات میں اس کا آبادی تک پہنچنا بہت مشکل تھا اور پہنچ بھی جاتا تو وہاں چودھری کی راج دھانی میں محفوظ کیسے رہتا؟

درختوں کی آڑ لے کر بھاگتے ہوئے اس کے ذہن سے تیزی سے یہ سارے خیالات گزر رہے تھے۔ اچانک ہی اس کی نظر دور نظر آتے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر پڑی اور یکدم ہی امید کی کرن جاگ اٹھی۔ وہ اس بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا تو فاریسٹ آفیسر کو اعتماد میں لے کر اسے سب کچھ بتا سکتا تھا۔ اس خیال کے آنے پر اس نے اپنے بے دم ہوتے قدموں کی رفتار اور بھی تیز کردی لیکن اب اسے آڑ فراہم کرنے والے درخت بہت کم رہ گئے تھے۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ کھلے میں آجاتا تھا اور یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی۔ پیچھے سے آنے والے متوقع فائر کے ڈر سے وہ یہ درمیانی فاصلہ زگ زیگ انداز میں بھاگتے ہوئے طے کررہا تھا۔ اپنی اس حکمتِ عملی کی افادیت کو اس نے اس وقت خوب محسوس کیا جب فضا میں فائر کی زوردار آواز گونجی اور ایک گولی اس سے کچھ فاصلے پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ دوسرا فائر ہوا تو وہ درخت کی آڑ میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس نے پل بھر رک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے والے وہ دو افراد تھے جن میں سے ایک کے ہاتھ میں دور مار رائفل تھی جبکہ دوسرا نہتا نظر آرہا تھا۔

اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا، البتہ بھاگتے رہنے میں اس بات کا کسی حد تک امکان تھا کہ وہ خود پر چلائی جانے والی گولیوں سے بچ کر بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا، چنانچہ آڑ سے نکل کر ایک بار پھر بنگلے کی سمت بھاگنا شروع کردیا۔ اس بار قسمت نے اس کا زیادہ ساتھ نہیں دیا اور ایک گولی اس کے بازو میں گھس گئی۔ اسے لگا کہ اس کے بازو میں انگارے دہک اٹھے ہوں۔ اس نے تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ سے زخمی بازو کو پکڑ لیا۔ اس کی انگلیاں اپنے ہی خون میں تر بتر ہوگئیں لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور بھاگنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یوں بھی اب بنگلا چند گز کے فاصلے پر ہی رہ گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے یہ فاصلہ طے کرنے تک پیچھے سے مزید کوئی فائر نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی تمام تر توانائیوں کا استعمال کرتے ہوئے بالآخر بنگلے کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں موجود چوکیدار اس کے ابتر حلیے اور بہتے خون کی وجہ سے چونک اٹھا۔

"اے... کون ہے تُو؟" اس نے اکو کی دھول مٹی میں اٹی شکل کو گھور کر پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا لیکن وہ بے چارہ اتنی بری طرح ہانپ رہا تھا کہ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکا۔

"کیا گل ہے؟ تُو کدھر سے بھاگ کر آرہا ہے؟ کون تیرے پیچھے پڑا ہے؟" اس کی ابتر حالت کی وجہ سے اسے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے چوکیدار اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پے در پے سوالات کرتا چلا گیا۔

"صاحب ہیں؟ مجھے صاحب سے ملنا ہے۔" اکو بولنے کے قابل ہوا تو اس نے مطالبہ کیا۔ ساتھ ہی گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تعاقب کنندہ نہ جانے کہاں رہ گئے تھے جو نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید اس کے بنگلے تک پہنچ جانے کی وجہ سے انہوں نے پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

"صاحب سے کیوں ملنا ہے؟ پہلے مینو دسو فیر میں صاحب کو بتاؤں گا۔ ان کی مرضی ہوئی تو تجھ سے مل لیں گے۔" چوکیدار نے قطعی لہجے میں اسے جواب دیا۔

"دیکھ بھرا! مجھے صاحب سے ملنے دے۔ میری زندگی کا کچھ پتا نہیں، دیر ہوگئی تو شاید پھر مجھے موقع ہی نہ ملے۔" اکو نے سہارے کے لیے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی، ساتھ ہی اس کی نظریں مسلسل اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ کب اور کس سمت سے گولی

آکر اسے چاٹ جائے گی۔

"پر میں تجھ پر کیسے اعتبار کروں؟ ہوسکتا ہے تُو صاحب کا کوئی دشمن ہو۔" چوکیدار پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اس کی طرف سے مشکوک ہی رہا۔

"اللہ پاک کی قسم، میری صاحب سے کوئی دشمنی نہیں۔ مجھے تو بس انہیں ایک ضروری گل دسنی ہے۔" مسلسل بہتے خون کی وجہ سے اکو پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی، چنانچہ اسے یہی حل نظر آیا کہ قسم کھا کر چوکیدار کو یقین دلانے کی کوشش کرے۔ اس کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی، اس سے قبل ہی گیٹ کے اندرونی جانب سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چوکیدار اکو کو چھوڑ کر پھرتی سے مڑا اور گیٹ وا کیا۔ ہارن دینے والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر فاریسٹ آفیسر عابد انصاری براجمان تھا۔ اکو دیوار سے ہٹ کر گیٹ کے سامنے اس طرح آکھڑا ہوا کہ عابد انصاری کے لیے گاڑی نکال لے جانے کا راستہ نہ رہا۔

"چوکیدارا یہ آدمی کون ہے؟" عابد انصاری نے اسے کچھ کہنے کے بجائے چوکیدار کی طرف چہرے کا رخ کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس کا لہجہ سنجیدہ ضرور تھا لیکن اس میں سختی یا برہمی کا نام و نشان نہیں تھا۔

"مالوم نہیں صاحب کون ہے؟ کام بھی نہیں بتاتا، بس آپ سے ملنے کی ضد کیے جارہا ہے۔" چوکیدار نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟" عابد انصاری حیرت سے زیرلب بڑبڑایا پھر بولا۔ "اچھا، اسے اندر آنے دو۔ میں اس کی بات سن لیتا ہوں۔" گاڑی وہیں چھوڑ کر وہ نیچے اترآیا اور اکو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا مہربان رویہ دیکھ کر اکو کو کافی حوصلہ ملا اور یقین ہونے لگا کہ وہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔

"تم اس کے لیے جلدی سے مرہم پٹی کا سامان لے آؤ۔ یہ اتنا زخمی ہے کہ تمہیں کسی بحث میں پڑنے کے بجائے سب سے پہلے اس کی مرہم پٹی کرنی چاہیے تھی۔" اکو لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی جانب بڑھا تو اس نے چوکیدار کو حکم دیتے ہوئے قدرے ناراضی کا اظہار کیا لیکن اس کا لہجہ بہرحال اب بھی نرم ہی تھا۔ چوکیدار یہ حکم سن کر تیزی سے اندر کی طرف مڑ گیا جبکہ خود اس نے آگے بڑھ کر اکو کو سہارا دیا۔ اکو کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی اتنے بڑے افسر کو ایسا مہربان دیکھا تھا۔ اے ہی شہریار کی نیک دلی کی بھی بہت لوگ تعریف کیا کرتے تھے لیکن اکو نے اس کی شخصیت میں بھی ہمیشہ ایک رعب و دبدبہ سا محسوس کیا تھا جس کی وجہ سے اس سے بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں ہوپاتی تھی۔ عابد انصاری اسے اپنے ساتھ لے کر برآمدے تک پہنچ گیا۔ وہاں چار کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ اس نے اکو کو ایک کرسی پر بٹھادیا۔

"مجھے آپ کو ووڈی ضروری گل دسنی تھی صاحب! ادھر جنگل میں..." اکو نے بیٹھتے ہی اسے بتانے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ سے اشارہ کرکے کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔

"اپنی مرہم پٹی کروالو پھر بات کرنا۔ پہلے ہی تمہارا کافی زیادہ خون بہہ چکا ہے۔" عابد انصاری نے اس سے کہتے ہوئے فرسٹ ایڈ بکس لے کر آنے والے چوکیدار کو اشارہ کیا تو وہ آگے بڑھ کر اس کے زخمی بازو کو دیکھنے لگا۔

"اندر گولی ہے صاحب! اسے تو اسپتال لے جانا پڑے گا۔" چوکیدار نے اس کے زخم کا جائزہ لینے کے بعد عابد انصاری کو اطلاع دی۔

"اوہ..." اس کے ہونٹ فکرمندی کے اظہار کے لیے سکڑے پھر وہ بولا۔ "ابھی تو تم پٹی باندھ کر اس کا خون روکنے کی کوشش کرو پھر اسے اسپتال بھی لے جاتے ہیں۔" چوکیدار اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگا۔ عابد انصاری کے کہنے پر اس نے اکو کو درد کش دوا بھی کھلا دی پھر فرسٹ ایڈ بکس اٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔

"آپ کے کہنے پر میں نے مرہم پٹی کروالی ہے صاحب... لیکن اسپتال جانے سے پہلے آپ کو میری گل سننی ہوگی۔ جو کچھ مجھے آپ کو بتانا ہے، وہ میری زندگی سے زیادہ اہم ہے۔" چوکیدار کے جاتے ہی عابد انصاری کے حکم کے احترام میں اب تک خاموش بیٹھے اکو نے اس سے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر میں تمہاری بات نہیں ٹالوں گا۔ تم جو کچھ بتانا چاہتے ہو، بتاؤ۔" عابد انصاری نے گویا اس کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اسے ہمہ تن گوش دیکھ کر اکو نے اسے اپنے حالات سے مختصراً آگاہ کرتے ہوئے جنگل جانے اور وہاں جو کچھ نظر آیا، اس کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ وہ چہرے پر سنجیدگی لیے اس کی ہر بات غور سے سنتا رہا۔ اکو خاموش ہوا تو وہ بولا۔

"تم نے اپنی جان پر کھیل کر جو اطلاع مجھ تک پہنچائی ہے، اس کے لیے میں تمہارا بہت مشکور ہوں۔ فاریسٹ آفیسر کی حیثیت سے جنگل میں ہونے والی ہر سرگرمی کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے، میں اکیلا پورے جنگل پر نظر نہیں رکھ سکتا۔

http://digestpk.blogspot.com/

کے تعاون کی ضرورت ہے اور جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے، اس سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میرا اسٹاف میرے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے چودھری کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ بہرحال، میں خاموشی سے جنگل میں جا کر خود جائزہ لوں گا پھر اوپر والوں کو رپورٹ کروں گا۔ تم تسلی رکھو... مجرم کسی صورت بچ نہیں سکیں گے۔"

"ایسا ہو گیا تو یہ ہم غریبوں پر آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا صاحب!" اکو کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ چودھری کو پوست کاشت کروانے کے جرم میں کیا سزا مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے اتنا بھی کافی تھا کہ چودھری جیسا بااختیار شخص کچھ عرصے جیل کی ہوا کھالے۔ اس طرح اس کی مظلوم رانی کی روح کو کچھ تو سکون حاصل ہو جاتا۔

"احسان کی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اپنا فرض ادا کروں گا۔ اب تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ میں تمہیں اسپتال پہنچانے کا بندوبست کر کے ابھی آتا ہوں۔" عابد انصاری نے اسے جواب دیا اور خود تیزی سے چلتا ہوا بنگلے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ اکو نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ نقاہت اور ذہنی فکر کے اثر کی وجہ سے اس پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

"چلو بھئی، تمہارے لیے گاڑی آ گئی ہے۔" اسے اندازہ نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ چوکیدار نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے یہ اطلاع دی تو وہ غنودگی سے باہر آیا۔ چوکیدار اسے سہارا دے کر باہر کی طرف لے گیا۔ گیٹ کے قریب جہاں اس نے عابد انصاری کی گاڑی دیکھی تھی، اب وہاں کوئی دوسری گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ چوکیدار نے اسے گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا۔ آگے ڈرائیونگ سیٹ پر صرف ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کی شکل اس کے لیے آشنا نہیں تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس آدمی نے گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ سے باہر نکال لی۔ پیچھے چوکیدار نے فوراً ہی گیٹ بند کر لیا۔ دھیمی رفتار سے چلتی گاڑی نے مشکل سے تین چار گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ وہ رک گئی اور کوئی بہت تیزی سے پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر اکو کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اکو کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس نے اس ساری کارروائی کو محسوس کر لیا اور صورت حال کو صحیح طرح سمجھنے کے لیے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اسے اپنے برابر میں بیٹھے شخص کی شکل نظر آئی جس پر نظر پڑتے ہی اس کے اعصاب شل ہو گئے۔

☆☆☆

آفتاب کی کرسی پر اس کی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی کشور کے چہرے پر کچھ حیرت سی پھیلی ہوئی تھی تاہم اس حیرت کے باوجود وہ بہت دلچسپی سے اپنے ہاتھ میں موجود کاغذات پر لکھی تحریر کو پڑھنے میں مصروف تھی۔ ہر طرف کتوں کی طرح بو سونگھتے چودھری کے گرگوں سے بچنے کے لیے انہوں نے اب ایک چھوٹے اور قدرے غیر ترقی یافتہ گاؤں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس گاؤں میں ان کے مشاغل کافی محدود ہو گئے تھے۔ یہاں نہ تو موبائل سروس کام کرتی تھی، نہ انٹرنیٹ اور کیبل کی سہولیات تھیں۔ ٹیلی وژن پر صرف پی ٹی وی کی نشریات دکھائی جاتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس نئے ٹھکانے پر ٹیلی وژن رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یوں بھی انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کب تک یہاں چھپے رہنے میں کامیاب رہیں گے اور کب اچانک یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا؟ اس لیے بہت زیادہ ساز و سامان جمع کرنے سے گریز کیا تھا۔ جو سامان خریدا گیا تھا، وہ بھی سیکنڈ ہینڈ تھا۔ کالم نگاری کے عوض آفتاب کو معاوضہ تو خاصا مناسب ملتا تھا لیکن اس معاوضے کا بیشتر حصہ اسکول پر لگا دینے کے باعث اس کے پاس زیادہ رقم جمع نہیں تھی۔ ان حالات میں ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ احتیاط سے کام لیں تاکہ معاشی مسائل کا شکار نہ ہوں۔ کشور کے آرام کے سلسلے میں البتہ آفتاب نے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ گھریلو امور انجام دینے کے لیے گاؤں کی ہی ایک عورت جز وقتی طور پر ملازم رکھ لی تھی۔ وہ عورت سارا کام کاج نمٹا کر دوپہر تک واپس چلی جاتی تھی۔

کشور کے پاس اپنی فراغت کا یہی علاج تھا کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزارے۔ آفتاب جس دن شہر جاتا، اس کے لیے کتابیں لے کر آتا۔ ان کتابوں کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ آفتاب کے لکھے کالم اور روزانہ کا اخبار بھی پابندی سے پڑھتی تھی۔ کالم وہ عموماً چھپنے سے پہلے ہی پڑھ لیا کرتی تھی۔ آج آفتاب صبح سے شہر گیا ہوا تھا۔ جب تک کام کرنے والی عورت گھر میں رہی، کشور اس کے ساتھ مصروف رہی۔ اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آ کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔ اس کام کے دوران ہی اس کے ہاتھ میں وہ صفحات آئے جنہیں وہ یونہی وقت گزاری کے لیے پڑھنے لگی اور پھر اتنی دلچسپی محسوس ہوئی کہ پڑھتی ہی چلی گئی۔ دلچسپی کے ساتھ ساتھ اسے حیرت اس لیے محسوس ہو رہی تھی کہ وہ جو کچھ پڑھ رہی تھی، اسے آفتاب نے ہی لکھا ہے... اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اتنے ذوق و شوق سے کیا پڑھا جا رہا ہے کہ آپ کو ارد گرد کا کوئی ہوش ہی نہیں ہے۔" لکھے ہوئے صفحات میں سے ایک دو صفحات ہی پڑھنا رہ گئے تھے جب وہ آفتاب کی آواز سن کر چونکی۔

"ارے آپ! آپ کیسے اندر آئے؟" اس نے تحریر پر سے نظر ہٹا کر آفتاب سے پوچھا۔

"باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔" آفتاب نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

"اُف!" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "میں شاید کام والی کے جانے کے بعد دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔"

"آپ کو خیال رکھنا چاہیے۔ ہمارے حالات اتنے سازگار نہیں ہیں کہ ہم ایسی بے احتیاطی کے متحمل ہو سکیں۔" آفتاب کی سنجیدگی برقرار تھی۔

"سوری آفتاب! میں آئندہ خیال رکھوں گی۔" کشور نے فوراً اس سے معذرت کر لی۔ اس کے اس انداز پر آفتاب فوراً ہی موم ہو گیا۔

"آپ کو مجھ سے معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو جو کچھ کہا، اس کا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ مجھے آپ کی فکر ہے اور میں آپ کے معاملے میں کوئی کوتاہی، چاہے وہ آپ سے ہی سرزد ہوئی ہو برداشت نہیں کر سکتا۔" یہ سب کہتے ہوئے اس کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ کشور پر اس کے ان جذبات کا گہرا اثر ہوا اور وہ بے ساختہ ہی اس کے سینے سے آ لگی۔ آفتاب کا ہاتھ خودکار انداز میں اس کے وجود سے لپٹ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کشور کا جسم ہولے ہولے لرز رہا ہے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے سینے پر رکھا اس کا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ کچھ گھبرا گیا۔

"یہ کیا؟ آپ رو رہی ہیں۔ شاید آپ کو میری بات بری لگ گئی ہے۔"

"اوں ہوں۔" کشور نے نفی میں سر ہلایا پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ "میری آنکھیں تو اپنی خوش قسمتی کو محسوس کر کے بھر آئی ہیں۔ مجھے زندگی میں بھی کوئی اتنا چاہے گا، میں نے سوچا تک نہیں تھا۔"

"ابھی تو یہ ابتدا ہے، آگے آگے دیکھیے گا ہوتا ہے کیا؟" اس کا جواب سن کر آفتاب کو اطمینان ہوا تو اس کے بالوں کی ایک لٹ کھینچتے ہوئے شوخی سے بولا۔

اس کے انداز پر کشور کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔ "آپ منہ ہاتھ دھو کر آ جائیں، میں تب تک کھانا نکالتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ مجھے بھی اب بھوک لگ رہی ہے۔" اس کی بات سن کر آفتاب فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ فریش ہو کر واپس آیا تو کشور کھانا لگا چکی تھی۔

"آپ نے جن کتابوں کے نام نوٹ کروائے تھے، وہ میں لے آیا ہوں۔ میرے بیگ میں رکھی ہیں، نکال لیجیے گا۔" کھانا کھانے کے دوران اس نے کشور کو بتایا۔

"ٹھیک ہے، میں نکال لوں گی لیکن آپ بتائیں کہ آپ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ جس وقت آپ آئے میں آپ کا لکھا ہوا ہی پڑھ رہی تھی۔ وہ تو کالموں سے ہٹ کر بالکل الگ چیز ہے۔"

"وہ..." آفتاب مسکرایا۔ "آج کل میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ اس ناول کا نام منجدھار ہوگا۔"

"مجھے اسی لیے تو حیرت ہو رہی تھی کہ آپ جیسا بندہ جو سیاسی اور معاشرتی مسائل پر تجزیاتی کالم لکھتا ہو ناول نگاری کی طرف کہاں چلا گیا۔ یہ تو آپ کا میدان نہیں ہے۔"

"میرے کالموں کی طرح میرا ناول بھی سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ہی مبنی ہوگا۔ جو کچھ کالموں میں بہ وجوہ نہیں لکھا جا سکتا یا جسے چھاپنے سے اخبار کے ایڈیٹرز، امکان مصلحتاً گریز کرتے ہیں، وہ فرضی کرداروں کے ساتھ ناول میں آسانی سے لکھا جا سکتا ہے۔ ہمارا کام تو ظلم، ناانصافی، معاشرتی تفریق اور دیگر مسائل کو اجاگر کر کے عوام کو باشعور ہی بنانا ہے نا... اب چاہے اس کے لیے کالم نگاری کا سہارا لیں یا ناول نگاری کا، اصل مقصد تو پورا ہو جاتا ہے۔ ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ میں صرف کالم نگار نہیں ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں، میں نے کئی افسانے لکھے تھے جو مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہے۔ بعد میں، میں صحافت کے ساتھ اتنا زیادہ انوالو ہو گیا کہ افسانہ لکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ پیرآباد میں اسکول کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد رہی سہی فرصت بھی ختم ہو گئی۔ اب عرصے بعد فرصت ملی ہے تو میں نے سوچا کہ چلو یہ کام کر لیتے ہیں۔ اس جگہ نیٹ کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے یوں بھی کرنٹ افیئرز سے فوری طور پر آگاہ نہیں ہو پاتا۔ الیکٹرانک میڈیا کے اس دور میں صرف اخبار پڑھ کر گزارا نہیں ہوتا، خصوصاً صحافت کی دنیا میں پاؤں جما کر رکھنے کے لیے۔ پچھلی بار میری اپنے ایڈیٹر سے فون پر بات ہوئی تھی تو ہمارے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ میں ہفتے میں [illegible] کے بجائے صرف ایک کالم لکھا کروں گا [illegible]

http://digestpk.blogspot.com/

سے ظاہر ہے میری انکم بھی آدھی رہ جائے گی لیکن فکر کی بات نہیں، ہمارا گزارہ ہو جائے گا۔ بعد میں جب میں یہ ناول مکمل کرلوں گا تو کوئی بھی اچھا پبلشر اسے ٹھیک ٹھاک رائلٹی دے کر چھاپنے پر تیار ہو جائے گا۔ مطالعہ کرنے والوں کے حلقے میں میرے نام کی اچھی شہرت ہے اس لیے مجھے ایسی کوئی فکر نہیں کہ میرا ناول چھپ نہیں سکے گا۔ ناول چھپے گا تو جہاں بالقلم کا حق بھی ادا کرے گا اور ہمارے گھر کو آسودگی بھی دے گا۔"

اس نے کشور کی بات کا جو تفصیلی جواب دیا، اس نے کشور کو بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ اس بات کا بھی احساس دلایا کہ آنے والا وقت ان کے لیے معاشی تنگ دستی بھی لا سکتا ہے۔ وہ جن آسائشوں سے بھری حویلی کو ٹھوکر مار کر آئی تھی، اس کے مقابلے میں تو اب بھی کچھ میسر نہیں تھا لیکن ان مادی آسائشوں کے بدلے اسے جو محبت کی دولت ملی تھی، اس نے اسے اتنا مالا مال کر دیا تھا کہ وہ خود کو اس عورت سے بھی زیادہ خوش قسمت تصور کرتی تھی جس کے لیے ایک شہنشاہ نے تاج محل تعمیر کروایا تھا۔ اس کے لیے آفتاب کی سنگت میں یہ چھوٹا سا دو کمروں کا معمولی مکان بھی تاج محل سے بڑھ کر تھا مگر یہ احساس کہ اس کی خاطر آفتاب کو بار بار کوئی نہ کوئی قربانی دینی پڑتی ہے، اسے رنجیدہ کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے، آپ نے کھانا کھانا کیوں چھوڑ دیا؟" اس کی خاموشی کو محسوس کر کے آفتاب نے اسے ٹوکا۔

"کچھ نہیں۔ بس میں یہ سوچنے لگی تھی کہ آپ کا ناول نہ جانے کتنے عرصے میں مکمل ہوگا۔ میں نے آپ کے لکھے جو چند صفحات پڑھے ہیں، ان کو پڑھ کر دل چاہ رہا تھا کہ جلد سے جلد پورا ناول پڑھنے کو مل جائے۔" اس نے خود پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے آفتاب کو جواب دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آفتاب پر اس کی رنجیدگی ظاہر ہو۔ پہلے بھی بعض مواقع پر اس نے اپنی اس طرح کی کیفیات کا اظہار کیا تھا تو آفتاب کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ ہرگز یہ بات پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ اتنی محبت سے جو کچھ اس کے لیے کرتا ہے، وہ اسے کوئی احسان سمجھے یا شرمندہ ہو۔

"اللہ نے چاہا تو ننھے مہمان کی آمد سے قبل میں اپنا یہ ناول ضرور مکمل کرلوں گا۔" آفتاب کے دیے جواب نے کشور کی کیفیت کو یکسر بدل دیا اور وہ ایک ننھے ہمکتے وجود کے خیال سے یوں کھل اٹھی کہ کچھ دیر پہلے دل کو گھیر لینے والی رنجیدگی پل بھر میں اُڑن چھو ہو گئی۔ آفتاب نے اس کے ہونٹوں پر پھیلی خوب صورت مسکراہٹ کو دیکھ کر اپنے دل میں گہرا اطمینان محسوس کیا۔ کشور نے اپنی خاموشی کی وجہ اس سے چھپانے کی کوشش کی تھی، اس کے باوجود وہ اصل بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا اور اسے نوٹ کیے بغیر غیر محسوس طور پر اس کی سوچ کا دھارا ایسے رخ پر موڑ دیا تھا کہ وہ مسکرائے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

ایک مریض کی کیس ہسٹری پڑھتے پڑھتے ڈاکٹر نقوی نے فائل پر سے نظریں ہٹائیں اور سامنے لگے وال کلاک میں وقت دیکھا۔ آٹھ بجنے میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ اسپتال سے اپنی ڈیوٹی آف کر کے گھر کے لیے روانہ ہو جاتا تھا۔ روانگی سے آدھا گھنٹا قبل وہ پرائیویٹ روم میں موجود اپنے مریضوں کا حال معلوم کرنے کے لیے ان روم میں کا ایک راؤنڈ ضرور لگاتا تھا۔ یہ اس کا برسوں کا معمول تھا جس میں کسی بڑی ایمرجنسی کے پیش نہ آنے کی صورت میں کبھی ردوبدل نہیں ہوتا تھا۔ پابندیٔ وقت کی یہ عادت اس نے اپنے کیریئر کے آغاز سے ہی اختیار کر لی تھی جو اب اس کے اسپتال کے سب سے سینئر سرجن بن جانے تک بے حد پختہ ہو چکی تھی۔ اب بھی اس نے گھڑی دیکھ کر یہی اطمینان کیا تھا کہ اس کے پاس راؤنڈ لینے کے لیے دس منٹ باقی ہیں اور وہ اس عرصے میں زیر مطالعہ کیس ہسٹری کو بہ آسانی پڑھ لے گا لیکن اس سے قبل کہ وہ دوبارہ یہ سلسلہ شروع کرتا اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے میز پر اپنے بائیں ہاتھ کے قریب رکھے موبائل کو اٹھانے سے پہلے اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ اسکرین پر اس کی اکلوتی بیٹی عائشہ عرف عاشی کا نام جگمگا رہا تھا۔ عاشی کا نام دیکھ کر اس نے موبائل اٹھایا اور ریسیو کا بٹن پش کیا۔ عاشی اور اس کی بیوی اسپتال کے اوقات میں کبھی بھی سخت ضرورت کے بغیر اسے فون کرنے کی عادی نہیں تھیں اس لیے اپنے کام میں خلل محسوس کرنے کے باوجود اس نے کال ریسیو کر لینا ہی مناسب سمجھا۔

"ڈیڈی..." اس نے ابھی "ہیلو" کہا ہی تھا کہ عاشی نے بڑے کرب بھرے لہجے میں اسے پکارا اور پھر ایک سسکی لی۔

"کیا بات ہے بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟ گھر پر سب خیریت تو ہے نا؟" عاشی کا لہجہ اور پھر سسکی سن کر وہ بے قرار سا ہو گیا اور تیزی سے پوچھنے لگا۔

"شوبی اسکول سے واپس گھر نہیں پہنچا ڈیڈی!" عاشی نے اسے جواب دیا اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کا

جواب سن کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس کی بے حد لاڈلی اور کسی حد تک خود سر بیٹی سے نوجوانی میں ایک غلطی ہوئی تھی اور اس کی غلطی کی سزا انہیں اب بھی وقتاً فوقتاً بھگتنی پڑتی تھی۔ عاشی کی اس غلطی کا نام کامران تھا۔ کامران اس کا کلاس فیلو تھا جس کی محبت میں وہ اس بُری طرح گرفتار ہو گئی تھی کہ اسے ماں باپ کی محبت پر بھی یقین نہیں رہا تھا۔ جب اس نے پہلی بار کامران کو اپنی پسند کی حیثیت سے والدین سے متعارف کروایا تھا تو گو دل میں یہ ٹھان چکی تھی کہ ہر حال میں اپنی پسند کو اپنا کر رہے گی اور اگر والدین میں سے کسی نے مخالفت کی تو اس مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت پڑی تو وہ بھی اٹھا لے گی۔

ڈاکٹر نقوی اور ان کی بیگم دونوں ہی پڑھے لکھے اور باشعور تھے جو بلاوجہ بیٹی کی پسند کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ کامران سے ہونے والی پہلی ملاقات میں اس کے لیے دل میں ناپسندیدگی محسوس کرنے کے باوجود ڈاکٹر نقوی نے عاشی سے اس کا رشتہ کرنے سے فوراً انکار کرنے کے بجائے بہت سوچ بچار سے کام لیا اور ایک ہفتے کامران کے متعلق چھان بین کرتا رہا۔ اس چھان بین کے نتیجے میں اسے کامران کے کردار کے بارے میں تو ایسی کوئی بات سننے کو نہیں ملی جس کو بنیاد بنا کر وہ اسے ریجیکٹ کر سکتا لیکن بہر حال، وہ اسے اپنے اکلوتے داماد کی حیثیت سے کچھ اچھا بھی نہیں لگا۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے کامران کے تین بھائیوں کی تعداد اور جن کی اور وہ جس چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے، وہاں عاشی کی شادی ہونے کی صورت میں اسے کہاں رکھا جاتا؟ اس بات کا جواب ڈاکٹر نقوی کو کم از کم نہیں سوجھا تھا۔ کامران کے خاندان میں تعلیم کا بھی کچھ خاص رجحان نہیں تھا۔ اس کے والدین قطعی ان پڑھ تھے اور بہن بھائی بھی بس یونہی رسمی سی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ خود کامران بھی زیادہ اچھا طالب علم نہیں تھا اور اب تک اوسط درجے سے ہی کامیاب ہوتا رہا تھا۔ اس کے ان کوائف سے ظاہر تھا کہ وہ مستقبل میں بھی کسی نمایاں مقام اور اچھی ملازمت وغیرہ کے حصول میں ناکام رہے گا۔ کامران سے شادی کرنے کی صورت میں عاشی کو اپنے باپ کے گھر کے مقابلے میں بہت مشکل زندگی گزارنی پڑتی لیکن ڈاکٹر نقوی اور اس کی بیوی عاشی کو یہ بات نہیں سمجھا سکے۔ اس پر عشق کا وہی بھوت سوار تھا جو ماں باپ کو بھی ظالم سماج کی قطار میں کھڑا کر دیتا ہے۔ عاشی کی ضد دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نقوی نے ہتھیار ڈال دیے لیکن شادی سے قبل کامران کے سامنے یہ شرط ضرور رکھی کہ وہ عاشی کو علیحدہ گھر میں رکھے گا۔ یہ گھر اس نے ایک نگزری فلیٹ کی صورت میں خود عاشی کے جہیز میں دیا اور کافی حد تک مطمئن ہو گیا کہ بیٹی کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے وہ شادی کے بعد بھی مستقل تحائف کی صورت میں اور کبھی کبھار بہ ذریعہ کیش اس کی مالی معاونت کرتا رہتا تھا۔ کئی ماہ تک عاشی والدین کے سامنے اپنی خوش گوار ازدواجی زندگی کا ڈھونگ کرتی رہی لیکن پھر ایک دن اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔

اس روز وہ اور اس کی بیوی ایک تقریب سے واپسی میں اچانک عاشی سے ملاقات کے لیے اس کے فلیٹ پر پہنچے تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ایسا پہلے بھی دو چار بار ہو چکا تھا جس کے جواب میں عاشی نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کامران کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اس بار بھی تالا دیکھ کر انہوں نے یہی گمان کیا اور آپس میں یہ طے کرتے ہوئے کہ آئندہ عاشی سے فون پر پوچھے بغیر اس کے گھر نہیں آئیں گے، واپس پلٹنے لگے... لیکن اس سے پہلے کہ وہ دونوں لفٹ تک پہنچتے، ایک نوعمر سی لڑکی نے انہیں آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اس نے جو انکشافات کیے انہیں سن کر دونوں میاں بیوی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

لڑکی کے مطابق عاشی اندر ہی موجود تھی اور اس کا شوہر روزانہ کی طرح اسے تالے میں بند کر کے گیا تھا۔ لڑکی نے انہیں یہ بھی بتایا کہ کامران عاشی کو روزانہ زدوکوب کرتا ہے اور وہ بہت تکلیف دہ زندگی گزار رہی ہے۔ یہ سب جان لینے کے بعد ڈاکٹر نقوی ایکشن میں آ گیا اور بالآخر عاشی کی شادی کامران سے خلع کی صورت میں انجام تک پہنچی۔ بعد میں عاشی نے ہی اسے بتایا تھا کہ کامران ایک بے پناہ لاپروا اور پست ذہنیت کا آدمی تھا جو اسے نہ صرف باپ سے رقم مانگنے پر مجبور کرتا تھا بلکہ اس پر شک بھی کرتا تھا۔ وہ خود چند ماہ میں کامران سے اکتا گئی تھی لیکن کیونکہ اپنی ضد سے شادی کی تھی، اس لیے کامران کی مار پیٹ اور گالم گلوچ کے باوجود باپ پر اس کی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ یہ دراصل اس کی ایک اور حماقت تھی لیکن بہر حال اسے کچھ بھی جتائے بغیر ڈاکٹر نقوی نے اسے کامران نامی مصیبت سے نجات دلا دی۔ کامران سے علیحدگی کے وقت عاشی پر یگننٹ تھی۔ بیٹا پیدا ہونے کے بعد مسز نقوی نے بچے کی ذمے داری خود سنبھال لی اور عاشی نے اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

http://digestpk.blogspot.com/

کے فارغ التحصیل ہونے تک اس کا بیٹا بھی اسکول جانے لگا تھا۔ ڈاکٹر نقوی اور اس کی بیوی کا ارادہ تھا کہ عاشی کو سمجھا بجھا کر اس کی دوسری شادی کر دیں گے لیکن کچھ بھی ہونے سے قبل کامران ایک بار پھر منظر پر آ گیا۔ اس نے عاشی کو فون کر کے تنگ کرنا شروع کر دیا اور اسے تجدید تعلق پر راضی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عاشی کے مسلسل انکار پر ایک روز وہ اچانک شعیب کو اس کے اسکول سے لے کر غائب ہو گیا اور چند گھنٹے بعد جب عاشی رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی، خود ہی اسے واپس بھی چھوڑ کر چلا گیا۔

اس حرکت کے بعد وہ وقتاً فوقتاً عاشی کو فون کر کے اسے دھمکی دیتا رہتا تھا کہ اگر وہ اس کی بات ماننے کے لیے راضی نہ ہوئی تو وہ بچے کو اس سے جدا کر دے گا۔ اس دھمکی سے عاشی بہت گھبرا گئی تھی لیکن ڈاکٹر نقوی نے اسے تسلی دی کہ کامران میں اتنا دم نہیں۔ ایک بار وہ بچے کو اسکول سے بے خبری میں لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا، آئندہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس نے اسکول انتظامیہ کو ہدایت کر دی تھی کہ بچے کو اس کے ڈرائیور کے سوا کسی کے حوالے نہ کیا جائے۔ ڈرائیور کو بھی الرٹ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یوں ان احتیاطی تدابیر کے ساتھ ایک سال کا عرصہ بہ خیر و خوبی گزر گیا تھا، اب جو عاشی نے اسے اطلاع دی کہ شعیب اسکول سے واپس نہیں آیا تو اس کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ کامران نے پھر کوئی شرارت کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ عاشی نے اسے اتنی دیر سے اطلاع کیوں دی ہے؟ شعیب اسکول سے دو بجے تک گھر واپس آ جاتا تھا۔

"حوصلہ رکھو بیٹا! میں کچھ کرتا ہوں لیکن تم نے مجھے اطلاع دینے میں اتنی دیر کیوں کی؟ اگر تم پہلے مجھے فون کر دیتیں تو میں اب تک شوبی کو تلاش کروا چکا ہوتا۔" اس نے پہلے بیٹی کو تسلی دی پھر اسے اس کی کوتاہی کا احساس دلایا۔

"آپ کی بیٹی نے ہمارے کہنے پر آپ کو اطلاع نہیں دی ڈاکٹر صاحب!" اسے دوسری طرف سے عاشی کے بجائے مردانہ آواز سنائی دی۔

"کون ہو تم اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟ میں ابھی پولیس کو فون کر کے اطلاع دیتا ہوں۔" وہ اب تک اسی گمان میں مبتلا تھا کہ شوبی کو غائب کرنے کی حرکت کامران نے کی ہے اور یہ اس کا ہی کوئی ساتھی ہے جو اس کے گھر بھی پہنچا ہوا ہے اس لیے زیادہ خائف ہوئے بغیر غصیلے لہجے میں اسے دھمکی دی۔

"ایسا کرنے کی غلطی بھی مت کیجیے گا ڈاکٹر صاحب... ورنہ آپ اپنے نواسے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ آپ کے دیش کی پولیس کتنے کام کی ہے، یہ آپ خود بھی جانتے ہیں۔" اس کی دھمکی کے جواب میں دوسری طرف سے نہایت سنگین لہجے میں جو کچھ کہا گیا، اس نے ڈاکٹر نقوی کو چونکا دیا۔ بولنے والے نے اپنے الفاظ سے اسے یہ جتایا تھا کہ وہ پاکستان کا باشندہ نہیں ہے۔ اس کے لب و لہجے نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ کس ملک کا سپوت ہے لیکن اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک غیر ملکی کو شوبی کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" اس کا لہجہ خود بخود دھیما ہو گیا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس سے مخاطب شخص کوئی معمولی غنڈا یا بدمعاش نہیں ہے جسے وہ اپنے تعلقات کے بل پر زیر کر لے گا۔ وہ شخص جو بھی تھا، کسی بہت مربوط منصوبے کے تحت کام کر رہا تھا جب ہی تو دو پہر سے اب تک کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد اسے شعیب کے اغوا ہونے کی اطلاع دی گئی تھی... وہ بھی یقیناً اس وقت جب اغوا کاروں نے ایسا چاہا تھا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اس سے مخاطب شخص اور شاید اس کے کچھ ساتھی پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کے گھر پر قابض تھے اور انہوں نے عاشی اور اس کی بیوی کو اس بات کا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اس کو اس حادثے کی اطلاع دے پاتیں۔

"ہمیں اسپیشل روم میں موجود پیشنٹ ورما چاہیے۔" اس کے سوال کے جواب میں دوسری طرف سے جو مطالبہ کیا گیا، اسے سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا، وہ واقعی معمولی غنڈے نہیں تھے۔ ایک غیر ملکی ایجنٹ کا مطالبہ کرنے والے یقینی طور پر اس کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ سخت سیکیورٹی میں ہے۔ تمہیں وہ شخص چاہیے تھا تو متعلقہ لوگوں سے مطالبہ کرتے۔ میں تو صرف ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں بھلا اسے تمہارے حوالے کیسے کر سکتا ہوں؟" ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

"تم بہت کچھ کر سکتے ہو اور یقیناً اپنے پیارے نواسے کی زندگی بچانے کے لیے کرو گے بھی۔ کرنا کیا ہے، یہ میں خود تمہیں بتاتا ہوں۔" دوسری طرف سے اسے جواب دیا گیا اور پھر اس کی رضامندی جانے بغیر ہی وہ بتانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے جو کچھ ڈاکٹر نقوی سے کہا، اسے سن کر اس کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ وہ لوگ ایک مربوط منصوبے

پر کاربند ہیں۔

"اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو؟" اس کے دل میں موجود جذبۂ حب الوطنی نے جوش مارنے کی کوشش کی۔

"تو یہ تمہاری اپنی چوائس ہو گی۔ تم کتنے ہی ماہر سرجن سہی مگر یہ تو طے ہے کہ اپنے نواسے کے شریر کے ٹکڑوں کو جوڑ کر اسے دوبارہ زندگی نہیں دے سکتے۔ تمہاری بیٹی اور بیٹی کو البتہ میں اور میرے ساتھی چھوڑ دیں گے، وہ خود شرم کے مارے آتمہتیا کر لیں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" بہت اطمینان کے ساتھ اسے جو جواب دیا گیا اسے سن کر اس کے مسامات سے پسینا پھوٹ پڑا۔ اس کے پیاروں کی زندگی اور عزت دونوں داؤ پر لگی تھیں۔ اس نے خود کو پل بھر میں ٹٹول لیا۔ وہ اس حد تک محب وطن نہیں تھا جو اتنے بڑے بڑے نقصانات سہہ سکتا۔

"او کے! تم جو کہو، وہ میں کرنے کے لیے راضی ہوں۔" اسے فیصلہ سنانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ویسے اس نے خود کو یہ تسلی دے لی تھی کہ ورما کی نگرانی پر موجود سیکیورٹی اہلکار خود ہی اس معاملے سے نمٹ لیں گے۔ اسے جو کچھ کرنے کو کہا جا رہا ہے، وہ ایسا بہرحال نہیں کہ وہ خود کو ورما کے فرار میں براہِ راست شامل سمجھ سکے۔

"ٹھیک ہے تو پھر تم فوراً اپنے آفس سے نکل کر راؤنڈ کے لیے نکل پڑو۔ پہلے ہی تم دو منٹ لیٹ ہو چکے ہو۔" اس کے رضامندی ظاہر کرتے ہی دوسری طرف سے حکم سنایا گیا۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ حسبِ معمول اس کا اسسٹنٹ ڈاکٹر اس کا منتظر تھا۔

"شاید آج میری گھڑی دو منٹ آگے چل رہی ہے۔" ڈاکٹر نقوی کو دیکھ کر اس نے خوش گوار لہجے میں تبصرہ کیا۔

"بالکل نہیں، میں دو منٹ لیٹ ہوں۔ اصل میں گھر سے بیگم کا فون آ گیا تھا۔ انہیں کچھ سامان منگوانا تھا جس کی وہ مجھے لسٹ بنوانے بیٹھ گئی تھیں اور اس بات کو تو ہر شادی شدہ بندہ سمجھ سکتا ہے کہ جب ہوم منسٹری احکامات جاری کر رہی ہو تو اپنے تمام ذاتی اصول و قواعد کو سائڈ پر رکھ کر اس کی سننی پڑتی ہے۔" اس نے بھی اپنے لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے جواب دیا۔ یہ ساری گفتگو ان دونوں نے ایک جگہ کھڑے ہو کر نہیں کی تھی بلکہ اس دوران بالائی منزل پر لے جانے والی لفٹ میں سوار ہو چکے تھے۔ لفٹ سے نکل کر انہوں نے سیدھا ورما کے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے دروازے پر موجود سیکیورٹی اہلکاروں نے ان دونوں کے اندر جانے سے پہلے میٹل ڈیٹیکٹر سے انہیں چیک کیا پھر وہ اندر داخل ہو سکے۔ اندر بھی ڈیوٹی نرس کے علاوہ ایک سادہ لباس والا سیکیورٹی کا بندہ موجود تھا۔ انہیں دیکھ کر نرس الرٹ ہو گئی اور وہ ورما کے چیک اپ کے دوران اس سے جو سوالات کرتے رہے، وہ ان کے جواب دیتی رہی۔

"کچھ امپروومنٹ آئی تو ہے، یہ پہلے سے کافی بہتر لگ رہا ہے۔ میرے خیال میں ری اسکین کروا لیتے ہیں تاکہ صورتِ حال مزید واضح ہو جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے ورما کے چیک اپ سے فارغ ہو کر اپنی رائے دینے کے ساتھ ساتھ اپنے اسسٹنٹ سے بھی پوچھا۔

"جیسا آپ ٹھیک سمجھیں سر!" ڈاکٹر نقوی جیسے سینئر ڈاکٹر کی رائے سے وہ بھلا کیسے اختلاف کر سکتا تھا۔

"آپ اسٹاف کو بلا کر پیشنٹ کو نیچے لیب میں بھجوا دیں۔ صبح میں اسپتال آؤں تو رپورٹس میری ٹیبل پر موجود ہونی چاہئیں۔" اس نے ڈیوٹی نرس کو حکم دیا اور ورما کے کمرے سے نکل کر دوسرے پرائیویٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے روزانہ کے معمول کو دہراتے ہوئے اس نے خود کو اس مہارت سے سنبھال رکھا تھا کہ دیکھنے والوں کے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہے لیکن یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے؟

☆☆☆

"میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے کافی اور چیز سینڈوچز تیار کر دو۔ فارغ بیٹھ کر بوریت ہو رہی ہے۔ کھانے پینے میں کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔" ایک سنگل صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہوئے پانڈے نے عاشی کی طرف دیکھ کر اس انداز میں فرمائش کی جیسے وہ گھر کا ہی کوئی فرد ہو اور اسے یہ بے تکلفانہ فرمائش کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو رہا ہو۔

"میں بنا دیتی ہوں۔" مسز نقوی نے عاشی کے سفید چہرے پر نظر ڈالی اور کہتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

"جوان خوب صورت کنیا کے ہوتے ہوئے ہم بوڑھے جھری دار ہاتھوں کا تیار کیا بھوجن کھائیں، یہ ہمیں گوارا نہیں۔ ہماری فرمائش تو سندری عاشی کو ہی پوری کرنی ہو گی۔" پانڈے نے ادبا شانہ لہجے میں کہتے ہوئے مسز نقوی کو واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عاشی کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے اپنی جانب دیکھتے پا کر عاشی نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور لرزتے قدموں سے کچن کی طرف جانے لگی۔ پانڈے کا ایک

http://digestpk.blogspot.com/

ساتھی نگرانی کے لیے اس کے پیچھے تھا۔ اس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر عاشی کچن میں پہنچ گئی اور پانڈے کی فرمائش کے مطابق کافی اور سینڈوچز تیار کرنے کے لیے کیبنٹس سے سامان نکالنے لگی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے ساری چیزیں کچن کاؤنٹر پر رکھنے کے بعد اس نے کچن ہی میں موجود بڑے سے فریج کی طرف رخ کیا اور اس میں سے چیزیں نکال کر واپس پلٹی۔ اس کی نگرانی کے لیے سر پر مسلط آدمی کی نظریں اس کے ساتھ ساتھ گردش کررہی تھیں۔ عاشی کی معمولی سے معمولی جنبش بھی اس کی نظروں سے محفوظ نہیں تھی۔ اگر وہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا چاہتی تو ہرگز نہیں کرسکتی تھی۔ ویسے عاشی کا ایسا کوئی ارادہ تھا بھی نہیں۔ اپنے بیٹے کی زندگی کے تحفظ کے لیے وہ ایسا کوئی ارادہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب تک اس کی فیملی کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا، اسے سامنے رکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ ان کا جن لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، وہ بہت خطرناک ہیں۔ وہ لوگ تقریباً دو بجے نقوی ہاؤس میں داخل ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب صفائی ستھرائی کرنے والی ملازمہ اپنا کام نمٹا کر جاچکی تھی اور گیٹ پر موجود رہنے والے چوکیدار کے سوا گھر پر کوئی ملازم نہیں تھا۔ یوں بھی انہوں نے اپنے گھر میں ملازموں کا ہجوم جمع نہیں کیا تھا۔ مسز نقوی کچن کا کام ہمیشہ خود کرنا پسند کرتی تھیں۔ ڈرائیور اور اوپر کے کام کرنے والی جز وقتی ملازمہ کے علاوہ ان کے ہاں ہفتے میں دو دن لان کی دیکھ بھال کے لیے ایک مالی آتا تھا۔ آج مالی کے آنے کا بھی دن نہیں تھا۔ ڈرائیور شوبی کو لینے اسکول گیا ہوا تھا۔ چنانچہ آنے والوں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو زیر کرنے کے بعد آسانی سے پورے گھر کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ ان کی ٹائمنگ سے ظاہر تھا کہ وہ مکمل معلومات کے بعد یہاں آئے ہیں۔

مسز نقوی اور عاشی جو کہ اس وقت شعیب کی اسکول سے واپسی کی منتظر ہوا کرتی تھیں، مسلح افراد کو اپنے سر پر موجود دیکھ کر سراسیمہ ہوگئی تھیں اور فوری طور پر انہیں یہی خیال آیا تھا کہ وہ ڈاکو ہیں اور انہیں لوٹنے کے لیے آئے ہیں... لیکن چند منٹ کے اندر ہی ان کے لیڈر نے واضح کردیا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ڈاکٹر نقوی سے اپنا ایک مطالبہ منوانے کے لیے شعیب کو اغوا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے گھر پر بھی قبضہ کرلیا ہے۔ اس نے انہیں یہ بھی بتادیا تھا کہ ان کے گھر کی ٹیلی فون لائن کاٹ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس نے مسز نقوی اور عاشی کے موبائل فونز بھی اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نہایت سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کررہے ہیں۔ ان لوگوں نے مسز نقوی کا تیار کردہ لنچ بڑے مزے سے ہڑپ کرلیا تھا۔ مسز نقوی اور عاشی کو بھی اس لنچ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی لیکن ان کی بھوک پیاس تو شوبی کو اغوا کیے جانے کی خبر سن کر ہی اڑ گئی تھی۔ عاشی نے البتہ ہمت کرکے اتنا مطالبہ ضرور کیا تھا کہ شوبی کے اغوا کو ثابت کرنے کے لیے اس کی ان لوگوں سے بات کروائی جائے۔ جواب میں اس سے کہا گیا کہ وہ صرف دس منٹ انتظار کرلے تو اسے ثبوت پیش کردیا جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد نقوی ہاؤس کی ڈور بیل بجنے کی آواز سنائی دی تو پانڈے نے عاشی سے کہا کہ وہ گیٹ پر جائے اور آنے والا اسے جو پارسل دے، اسے وصول کرکے واپس آجائے۔ عاشی اس کی ہدایت پر گیٹ تک گئی تو اس نے دیکھا کہ ایک مسلح شخص گیٹ کے اندرونی جانب موجود ہے۔ یقینی طور پر وہ شخص آنے والے پارسل کو خود بھی وصول کرسکتا تھا لیکن عاشی کو وہاں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ اسے پوری طرح اندازہ ہوجائے کہ ان کا گھر مکمل طور پر ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔

عاشی ہیلمٹ پہنے موٹر سائیکل سوار سے پارسل وصول کرکے واپس پلٹی تو اسے ایک دیوار کی جڑ میں پڑے چوکیدار کی پشت نظر آئی۔ اس کے سر اور گردن پر بہہ کر جم جانے والا خون نظر آرہا تھا۔ عاشی کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ مرچکا ہے یا صرف بے ہوش ہے۔ وہ کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ پارسل لے کر اندر آگئی اور اسے پانڈے کے حوالے کردیا۔ پانڈے نے اس پارسل کو کھولا تو اس میں سے ایک موبائل فون برآمد ہوا۔ یہ جدید ساخت کا کیمرے والا موبائل تھا۔ پانڈے نے مسز نقوی اور عاشی کو قریب بلایا اور موبائل کے چند بٹن دباتے ہوئے انہیں اس کی اسکرین کی طرف دیکھنے کی ہدایت کی۔ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو سب سے پہلے انہیں شعیب کے اسکول کی عمارت نظر آئی۔ پھر اس عمارت کا گیٹ کھلا اور بچے باہر آنے لگے۔ یہ وہ بچے تھے جن کے گھر سے کوئی انہیں لینے آتا تھا اور گیٹ پر موجود چوکیدار آنے والے کو پہچاننے کے بعد بچے کو گیٹ سے باہر نکلنے کی اجازت دیتا تھا۔ اسکول انتظامیہ نے شہر کے بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھ کر چند ماہ پہلے ہی یہ احتیاط برتنی شروع کی تھی۔ اسکول وین سے واپس گھر جانے والے بچوں کو بھی پوری احتیاط کے ساتھ ان کے گھر تک چھوڑا جاتا تھا۔ موبائل کی اسکرین پر نظر آیا کہ [illegible] بچے اپنے گھروں کی طرف جانے جارہی

http://digestpk.blogspot.com/

کردہ پاس دکھایا تو اس نے اندر سے شوبی کو بلا کر ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔

ڈرائیور شوبی کا بیگ ایک ہاتھ میں اٹھا کر اور دوسرے سے اس کی انگلی تھام کر گاڑی تک آیا اور شوبی کو پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اسکرین پر حرکت کرتی ہوئی گاڑی کی بیک سائڈ نظر آئی۔ اس کے بعد جب گاڑی دوبارہ اسکرین پر ظاہر ہوئی تو اس کا فرنٹ دیو نظر آرہا تھا۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا کہ حرکت کرتی ہوئی گاڑی بُری طرح لہرائی اور پھر رک گئی۔ ڈرائیور صورت حال جاننے کے لیے نیچے اترا تو اگلے ہی لمحے جھٹکا کھا کر نیچے گر پڑا۔ اس کی پیشانی پر بننے والے سوراخ سے خارج ہوتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ کسی قاتل گولی کا نشانہ بنا ہے۔ ڈرائیور کے نیچے گرتے ہی دو نقاب پوش منظر میں شامل ہوئے اور پچھلی سیٹ پر حیران پریشان بیٹھے شوبی کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔ یہ آخری منظر تھا جو مسز نقوی اور عاشی نے موبائل کی اسکرین پر دیکھا تھا اور اس کے بعد انہیں مزید کسی ثبوت کو ماننے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

ویڈیو دیکھنے کے بعد وہ بے چون و چرا۔۔۔ ان لوگوں کا ہر حکم مان رہی تھیں۔ پانڈے کے حکم کے مطابق اس نے ڈاکٹر نقوی کو فون بھی کر دیا تھا۔ اس فون کال سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شعیب کے اغوا کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ ڈاکٹر نقوی سے اپنا مطالبہ منوا سکیں اور ان کا مطالبہ تھا کہ اسپیشل روم میں موجود مریض ورما کو کسی بہانے نیچے گراؤنڈ فلور تک بھیج دیں۔

ڈاکٹر نقوی کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اسپتال کی لیبارٹری گراؤنڈ فلور پر تھی اس لیے ورما کو کسی ٹیسٹ کے بہانے آسانی سے وہاں تک بھیجا جا سکتا تھا۔ نواسے کی سلامتی کی خاطر ڈاکٹر نقوی نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا تھا لیکن ظاہر ہے، معاملہ مریض کو گراؤنڈ فلور تک پہنچانے تک تو محدود نہیں رہتا۔ اس سارے کھٹ راگ کے پیچھے ان لوگوں کا کوئی تو ایسا مقصد تھا جو یقینی طور پر اتنا خاص تھا کہ وہ یوں منظم انداز میں متحرک ہو گئے تھے۔ عاشی کو ان لوگوں کے مقصد سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ بس اتنا چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا صحیح سلامت گھر واپس آجائے اور اسی وجہ سے وہ ان لوگوں کی ہر بات مانتی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی اس نے بے پناہ اعصابی دباؤ کا شکار ہونے کے باوجود بڑی محنت اور توجہ سے کافی اور چیز سینڈوچ تیار کیے اور ٹرالی میں سب چیزیں رکھ کر ریونگ روم تک پہنچ گئی۔ وہاں موجود لوگ اسی پوزیشن میں موجود تھے جس میں وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے ٹرالی پانڈے کے قریب لے جا کر روکی اور خود بھی اپنی سابقہ جگہ پر بیٹھ گئی۔ پانڈے نے ایک نظر ٹرالی پر ڈالی اور اپنے موبائل پر مصروف ہو گیا۔

''ہاں جی تھری! کیا پوزیشن ہے؟'' وہ کسی کو کوڈ نیم سے پکارتے ہوئے اس سے رپورٹ لے رہا تھا۔

''ایک ایک لڑکے کو اپنی نظر میں رکھنا۔ سب کا وہاں سے نکلنا ضروری ہے۔ اگر کوئی نکلنے میں ناکام رہے تو تم جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟'' دوسری طرف کا جواب سن کر نئی ہدایات دیتے ہوئے پانڈے کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

''کیا کہا... ورما صاحب کو نیچے لایا جا رہا ہے؟ تمہارے کمانڈوز ایکشن میں آنے کے لیے بالکل تیار ہیں؟'' بات کرتے کرتے پانڈے کا لہجہ جوشیلا ہو گیا اور اس نے ٹرالی میں سے کافی کا کپ اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا۔

''زبردست!'' گھونٹ بھرتے ہی اس کی زبان سے ستائشی لہجے میں یہ لفظ نکلا لیکن سننے والوں کے لیے سمجھنا مشکل تھا کہ یہ ستائش کافی کے لیے تھی یا دوسری طرف سے ملنے والی کسی خبر کا ردِعمل۔

☆☆☆

ورما کو لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر لے جانے والوں میں اسپتال کے عملے کے علاوہ اس کی سیکیورٹی پر مامور اہلکار بھی شامل تھے۔ یہ اہلکار مسلح تھے اور ان کی نگاہیں تیزی سے گردش کرتی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ورما کی حیثیت کی وجہ سے اس کے ساتھ اسپتال میں بھی ترجیحی سلوک کیا جا رہا تھا اور جن ٹیسٹوں کے لیے ممکن ہوتا تھا، اس سے متعلق مشینری اس کے کمرے میں ہی لے جا کر ٹیسٹ کر لیے جاتے۔ اب تک اسے صرف ایک بار اسکیننگ کے لیے لیب تک لے جایا گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک ضرب لگی تھی جس نے اس کی آنتوں کو کافی متاثر کیا تھا۔ اسی چوٹ کے بارے میں جاننے کے لیے وہ ٹیسٹ کروایا گیا تھا اور اب بھی ڈاکٹر نقوی نے اسی چوٹ کا بہانہ بنا کر اسے ری اسکیننگ کے لیے بھیجا تھا۔

ورما کو لانے والی لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچی تو اس کا اسٹریچر لفٹ سے باہر لانے سے پہلے سیکیورٹی پر مامور دونوں اہلکار باہر نکلے اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ طویل کوریڈور میں دائیں جانب وہ لیبارٹری تھی جہاں ورما کو لے جایا جانا تھا۔ کوریڈور کا یہ حصہ بالکل سنسان پڑا تھا جبکہ بائیں جانب

استقبالیہ کاؤنٹر تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر قطار میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کرسیاں اس مقصد کے لیے رکھی گئی تھیں کہ اسپتال میں آنے والے افراد جو استقبالیہ کاؤنٹر سے کوئی انفارمیشن حاصل کرنا چاہتے ہوں، کاؤنٹر پر رش لگانے کے بجائے وہاں بیٹھ کر انتظار کریں اور اپنی باری آنے پر کاؤنٹر تک جائیں۔ اسپتال میں موجود سیکیورٹی کا عملہ اس بات پر سختی سے عمل کرواتا تھا۔ اس وقت بھی کاؤنٹر پر موجود استقبالیہ کلرک کے دائیں جانب نیلی وردی میں ایک سیکیورٹی گارڈ کھڑا ہوا تھا۔

سادہ لباس میں موجود ورما کی سیکیورٹی پر موجود دونوں اہلکاروں کی نظریں کوریڈور کے بائیں جانب ہی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہاں سے اسپتال کی مرکزی عمارت کا دروازہ بھی صاف نظر آرہا تھا۔ اس دروازے پر بھی دو باوردی سیکیورٹی گارڈز موجود تھے جو آنے جانے والوں کو سرسری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ گارڈز اسپتال میں آنے والوں کی تلاشی وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا کام صرف ان پر نظر رکھنا اور کسی شخص کے مشکوک محسوس ہونے پر اس سے پوچھ گچھ کرنا تھا... یا ان افراد میں سے اگر کوئی کسی قسم کی ڈسٹربنس پیدا کرتا تھا تب یہ سیکیورٹی گارڈز حرکت میں آتے تھے۔ ورما کی سیکیورٹی پر مامور اہلکاروں نے ماحول میں کوئی غیر معمولی پن محسوس نہیں کیا تو اسپتال کے عملے کے افراد کو ورما کا اسٹریچر لفٹ سے باہر لانے کی اجازت دے دی۔ جس وقت اسٹریچر لفٹ سے باہر لایا جا رہا تھا، کرسیوں پر بیٹھے افراد میں سے ایک نوعمر لڑکا اچانک اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ لڑکے کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ یہ اسی نوعیت کی عام سی فائل تھی جسے لوگ عموماً کسی قسم کا ریکارڈ رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لڑکے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے سادہ لباس سیکیورٹی اہلکاروں کو غور سے دیکھا۔ اہلکاروں میں سے ایک کی نظروں نے اس کا یہ دیکھنا محسوس کر لیا اور الرٹ ہو گیا لیکن لڑکے نے ایک نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا اور کاؤنٹر پر پہنچ کر اپنے ہاتھ میں موجود فائل وہاں رکھ دی اور استقبالیہ کلرک سے کچھ پوچھنے لگا۔ اس کی اس بے نیازی نے سیکیورٹی اہلکار کو مطمئن کر دیا لیکن یہی اس کی غلطی تھی۔ استقبالیہ کلرک سے بات کرتے ہوئے لڑکے نے اچانک ہی فائل کھولی اور درمیان میں رکھا ہوا پسٹل باہر نکال لیا۔ اس کے پسٹل نکالتے ہی کرسیوں پر بیٹھے افراد میں سے ایک فرد اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے بندھی بیلٹ سے ریوالور کھینچ کر نکال لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ورما کا اسٹریچر لفٹ سے باہر نکال کر کوریڈور کے دائیں جانب موڑا جا رہا تھا۔ دونوں مسلح لڑکوں کے ہتھیاروں نے بیک وقت شعلے اگل کر سیکیورٹی اہلکاروں کو نشانہ بنایا۔ عین اسی وقت دو ڈھاٹا پوش مرکزی دروازے پر موجود سیکیورٹی گارڈز کو اپنی کلاشنکوفوں سے بھونتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بھاگتے ہوئے کوریڈور کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں ورما کا اسٹریچر موجود تھا۔ ان کی کلاشنکوفوں نے اس بار استقبالیہ کاؤنٹر کے قریب کھڑے سیکیورٹی گارڈ کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ وہاں موجود کلرک کو بھی چاٹ لیا۔ کوریڈور میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور عام افراد میں سے بھی کئی لوگ بے تحاشا چلتی گولیوں کی زد میں آگئے۔ گولیاں چلانے والوں نے البتہ اس بات کا پورا خیال رکھا تھا کہ کوئی گولی ورما کی طرف رخ نہ کر سکے۔ ورما کی سیکیورٹی پر موجود اہلکاروں میں سے ایک اہلکار کو لگنے والی گولی جان لیوا ثابت نہیں ہوئی تھی اور اس نے جوابی فائر کر کے خود کو زخمی کرنے والے نوجوان کو نشانہ بنا لیا تھا۔ اس کی چلائی گئی گولی نوجوان کے پیٹ میں لگی تھی اور وہ کوریڈور کے فرش پر گرا تڑپ رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے اس کا یہ حال دیکھا اور اسے فرار کے قابل نہ پا کر ایک گولی اس کے بھیجے میں اتار دی۔ تڑپتا ہوا نوجوان فوراً ہی ساکت ہو گیا۔ باقی حملہ آوروں نے اس طرف دھیان دیے بغیر اپنی کارروائی جاری رکھی۔ بچ جانے والا سیکیورٹی اہلکار پوری کوشش کر رہا تھا کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکے لیکن وہ اکیلا کب تک ان کے مقابل ٹھہر سکتا تھا۔ سینے پر گولی کھا کر گرتے ہوئے اس کی یہ امید بھی دم توڑ چکی تھی کہ فائرنگ کی آوازیں سن کر باہر کہیں پولیس موبائل میں موجود افراد حرکت میں آگئے تو ان حملہ آوروں کا راستہ روک لیں گے۔ مرتے مرتے اس کے کانوں نے بیرونی حصے سے آتی فائرنگ کی آوازیں سن لی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر یوں لگتا تھا کہ دو مسلح گروپ آپس میں متصادم ہو گئے ہوں... یعنی اسپتال پر کیا جانے والا حملہ بے حد منظم تھا۔

سادہ لباس سیکیورٹی اہلکار کے دم توڑتے ہی ایک حملہ آور بھاگ کر اسٹریچر تک پہنچا۔ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ورما اسٹریچر سے اتر گیا تھا اور اسٹریچر کو کھینچ کر اپنے سامنے کرتے ہوئے ایک دیوار سے پشت لگالی تھی۔ یہ حکمت عملی اس نے خود کو فائرنگ کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے اختیار کی تھی [illegible]

http://digestpk.blogspot.com/

اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب اس کے لیے کیا جا رہا ہے لیکن پھر حملہ آوروں کے انداز سے وہ بھانپ گیا کہ آنے والے اس کے لیے آئے ہیں۔ خود کو دی جانے والی اسپیشل ٹریٹ منٹ کی وجہ سے اس کے زخم تیزی سے مندمل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ بہت زیادہ بھاگ دوڑ کر سکتا، چنانچہ اسٹریچر کی آڑ میں دبک کر بیٹھا رہا۔ سیکیورٹی اہلکاروں کے مارے جانے کے بعد جب ایک کلاشنکوف بردار بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔

''یہاں سے نکلیں سر!'' کلاشنکوف بردار نے اسے پکارنے کے ساتھ ہی سہارا بھی دیا۔ ورما نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا لیکن فوراً ہی اس کے پیٹ میں درد کی لہریں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کلاشنکوف بردار نے اسے اپنے کاندھے پر ڈالا اور دوڑ پڑا۔ وہ تیم شیم اور طاقتور آدمی تھا چنانچہ اسے ورما کو اٹھا کر بھاگنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ منصوبہ سازوں نے اسے یہ ذمے داری سونپی بھی اس لیے تھی۔ وہ اپنے سورسز استعمال کر کے یہ جاننے میں کامیاب تو ہو گئے تھے کہ ورما اب روبہ صحت ہے اور اسے اسپتال سے نکال لے جانے میں اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا لیکن انہوں نے ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ اگر ورما کو نقل و حرکت میں دشواری پیش آئے تو فوری طور پر اس مسئلے کا تدارک کیا جا سکے۔ ان کی یہ دور اندیشی اس وقت کام آ رہی تھی۔ تیم شیم آدمی ورما کو کاندھے پر ڈالے باہر کی طرف بھاگا جا رہا تھا جبکہ اس کے مسلح ساتھی انہیں کور دینے کے لیے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ لوگ دروازے سے باہر نکلے تو پہلے سے اسٹارٹ ایک گاڑی کھلے دروازوں کے ساتھ ان کی منتظر تھی۔ ورما کو اس گاڑی میں منتقل کرتے ہی گاڑی حرکت میں آ گئی اور گولی کی طرح اسپتال کے احاطے سے نکلتی چلی گئی۔

گاڑی کے نکلتے ہی فائرنگ کا سلسلہ بھی زور توڑنے لگا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد پانڈے کے ماتحت بہت تیزی سے وہاں سے فرار ہونے لگے۔ انہوں نے اپنے فرار کا طریقہ کار بھی پہلے سے طے کر رکھا تھا، چنانچہ جب تک پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیاں اسپتال کے سامنے پہنچیں، وہ نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس ساری کارروائی کے دوران جدید اسلحے کے ساتھ ساتھ بہترین گاڑیاں اور جدید مواصلاتی آلات بھی استعمال کیے تھے اور ایک دوسرے سے مسلسل رابطے میں رہے تھے۔ راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے بھی انہوں نے مرکزی شاہراہوں کے بجائے ذیلی سڑکوں اور گلیوں کا استعمال کیا تھا اور اس طرح منتشر ہو گئے تھے کہ کسی کو ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

ورما کو لے جانے والی گاڑی بھی ڈیڑھ دو منٹ کے اندر ہی اسپتال کے سامنے والی شاہراہ کو چھوڑ کر ایک ذیلی سڑک پر مڑی اور پھر وہاں سے ایک گلی میں گھس گئی۔ یہاں ایک گاڑی پہلے سے منتظر کھڑی تھی۔ اسپتال سے فرار کے لیے استعمال کی جانے والی گاڑی کو چھوڑ کر وہ لوگ اس گاڑی میں منتقل ہو گئے۔ شہر میں جابجا نصب کیمروں نے اگر پہلے والی گاڑی کی فلم بنائی بھی تھی تو وہ اس پتلی سی گلی میں اس گاڑی سے نجات حاصل کر چکے تھے اور یہاں بہر حال ایسا کوئی کیمرا موجود ہونے کا امکان نہیں تھا جو اس سارے منظر کو قید کر سکتا۔ ورما کو لے جانے والی یہ دوسری گاڑی گلی چھوڑ کر باہر نکلی تو تیم شیم آدمی نے پانڈے سے رابطہ کیا۔

''مشن کامیاب رہا سر! ورما سر میرے ساتھ ہیں اور ہم پوائنٹ فور کی طرف جا رہے ہیں۔''

''بہت خوب!'' اس اطلاع کو سن کر پانڈے نے خوشی سے بھرپور لہجے میں اسے داد دی اور پھر اگلے ہی لمحے تحکمانہ سرد مہری سے بولا۔ ''ڈاکٹر نقوی کے نواسے کو اس کے گھر پہنچا دو۔ ہم نے اسے وچن دیا تھا کہ اسے اس کا نواسا ضرور ملے گا۔''

''او کے سر!'' حکم کے غلام نے تابع داری سے جواب دیا اور اس حکم پر عمل کروانے کے لیے اپنے ہی جیسے ایک دوسرے غلام سے رابطہ کرنے لگا۔

☆☆☆

''آپ نے ورما کو ٹیسٹ کے لیے نیچے لیبارٹری میں کیوں بھجوایا تھا ڈاکٹر نقوی؟'' تفتیشی افسر نے اندر تک اتر جانے والی نظروں سے ڈاکٹر نقوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اس کے پیٹ پر لگنے والی ضرب سے متاثر ہونے والی آنتوں کی موجودہ کنڈیشن جاننا چاہتا تھا تاکہ ری اسکیننگ کے ذریعے دواؤں کے اثرات کا جائزہ لے سکوں۔'' ڈاکٹر نقوی نے ذرا تفصیل سے جواب دیتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ تھوڑا بھر قبل جو واقعہ پیش آیا تھا، اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ معمول کے مطابق راؤنڈ مکمل کر کے اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا جب اسے گراؤنڈ فلور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں کو سن کر اسے احساس ہوا کہ جس مقصد کے تحت شوبی کو اغوا کر کے اسے استعمال کیا گیا ہے، اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ اپنے اندر طاری ہو جانے والے سناٹے کے باوجود وہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی اس سے اوروں کی طرح قطعی انجان ہے... وہ اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔

سارے اسپتال میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ خوف زدہ بھی تھے اور حیران بھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کئی افراد نے پولیس کے ایمرجنسی نمبرز پر مدد کے لیے کال بھی کر دی تھی۔ چند منٹوں کی فائرنگ میں لوگوں میں بے پناہ خوف و ہراس اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ ڈاکٹر نقوی بھی زرد پڑتے چہرے کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جب اس واقعے کی تحقیقات ہوں گی تو وہ بھی تفتیش کی زد میں آئے گا لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ نواسے کی محبت نے اسے کچھ بھی سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اسے حکم دینے والوں نے اسے اتنی مہلت بھی نہیں دی تھی کہ وہ کچھ غور و خوض کر سکتا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک بڑی مصیبت کو گلے لگا بیٹھا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیوں نے اسپتال کا گھیراؤ کرنے کے بعد باہر جانے کے سارے راستے بند کر دیے اور پابندی عائد کر دی کہ ان کی طرف سے اجازت ملنے سے قبل کوئی شخص اسپتال کی عمارت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ پولیس کی کارروائی شروع ہوئی تو پہلے مرحلے میں زخمیوں کو طبی امداد پہنچانے کے ساتھ مرنے والوں کی گنتی اور ان کی شناخت کا کام ہونے لگا۔ اسپتال کے عملے کو خوف زدہ ہونے کے باوجود حرکت میں آنا پڑا۔ زخمیوں کی زندگی بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والوں میں ڈاکٹر نقوی بھی شامل تھا۔

اس واقعے میں استقبالیہ کلرک اور سیکیورٹی گارڈز کے علاوہ اسپتال کی عمارت میں موجود پانچ عام شہریوں کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ زخمی افراد کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ ڈاکٹر نقوی ان سب کی اموات اور تکالیف کا بوجھ اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے ضمیر کے لیے بھی بوجھ تھا اور اس کی نیک نامی کو بھی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ وہ پوری طرح شک کی زد میں تھا، اس حقیقت کا ادراک اسے تفتیشی افسر کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بخوبی ہو رہا تھا۔

''ایسا کیوں ہوا ڈاکٹر نقوی کہ حملہ آوروں نے ٹھیک اس وقت ایکشن لیا جب ورما کو اسکیننگ کے لیے لیبارٹری کی طرف لے جایا جا رہا تھا؟'' اس کی وضاحت کو خاطر میں لائے بغیر تفتیشی افسر نے چبھتے ہوئے لہجے میں ایک اور سوال کیا۔

''اسے ایک اتفاق کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔'' ڈاکٹر نقوی نے اس سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''اتفاق...'' تفتیشی افسر نے طنز بھرے لہجے میں یہ لفظ ادا کیا اور پھر سرد مہری سے بولا۔

''آپ جانتے ہیں ڈاکٹر نقوی کہ اس ایک اتفاق کی وجہ سے کتنا بڑا مجرم بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے... اور کتنے بے قصور لوگ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں؟'' اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر نقوی نے خاموشی اختیار کر لی۔

''خاموش رہنے سے آپ کی جان نہیں چھوٹے گی ڈاکٹر! آپ کو بتانا ہوگا کہ آپ نے حملہ آوروں کا ساتھ کیوں دیا؟ آپ ان کے ساتھی ہیں یا پھر انہوں نے کسی طریقے سے آپ کو اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا؟'' تفتیشی افسر اسے کسی طور بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ذرا سی دیر کی تحقیق میں ہی اس کے سامنے یہ بات آ گئی تھی کہ ورما کو ڈاکٹر نقوی کے حکم پر نیچے بھجوایا گیا تھا اور اس کے نیچے پہنچتے ہی وہاں کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ ایسے میں اس کی ذات کو شک سے کس طرح بری سمجھا جا سکتا تھا؟ ایک نہایت قابل اور معزز ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ اس وقت سب سے زیادہ مشکوک فرد شمار ہو رہا تھا۔

''آپ مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہیں آفیسر! میں ایک باعزت ڈاکٹر ہوں اور آپ مجھ سے کسی مجرم کا سا سلوک نہیں کر سکتے۔'' تفتیشی افسر سے یہ سب کہتے ہوئے اس نے چاہا تھا کہ اپنا لہجہ تیز رکھے لیکن اندر موجود احساسِ جرم نے اسے اس خواہش میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

''آپ بے قصور ثابت ہو گئے تو میں آپ سے اپنے رویے کی معذرت کر لوں گا لیکن آپ کو فی الحال تو اس بات کی وضاحت کرنی ہوگی کہ عین اس وقت جبکہ آپ نے مجرم کو اسکین کے لیے نیچے بھجوایا، اس کے ساتھیوں نے اسے فرار کروانے کے لیے اتنا منظم حملہ کیوں کیا؟'' تفتیشی افسر کی سوئی اپنی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نقوی کو سمجھ نہیں آیا کہ ایسا کیا کہے جو اس افسر کو مطمئن کر سکے۔ وہ اسے کوئی جواب دیتا، اس سے قبل ہی وہاں موبائل کی رنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ یہ رنگ ٹون اس کے موبائل کی تھی جو اس وقت تفتیشی افسر کے قبضے میں تھا۔ اس نے موبائل اسکرین پر آنے والا نام دیکھا اور [illegible]

[illegible] blogspot.com

کر کے بات کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے موبائل اس کی

طرف بڑھا دیا۔ ڈاکٹر نقوی نے بھی اس کے حکم پر عمل کرنے سے پہلے اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھا۔ یہ اس کی بیوی کی کال تھی۔ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے قبل وہ کئی بار گھر پر رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کی بیوی کا فون آیا بھی تھا تو ایسے وقت جب وہ اپنے گھر کی صورتِ حال جاننے کے لیے بہت بے چین ہونے کے باوجود اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بات کیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس بند کمرے میں موجود تفتیشی افسر اور اس کے پیچھے کھڑے مسلح اہلکار کی نظریں اس پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"ہیلو طاہرہ! کہو کیسے فون کیا ہے؟ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔" اس نے اپنی سی کوشش کی کہ کسی طرح بیوی کو کچھ ایسا بولنے سے روک سکے جو اس کے لیے مشکل کا باعث بن جائے لیکن دوسری طرف وہ اس کی بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

"شوبی گھر واپس آگیا ہے نقوی۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں اطلاع دی تو نواسے کی واپسی کا سن کر دل میں اطمینان محسوس کرنے کے باوجود ڈاکٹر نقوی کو اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔

"شاید خوشی کی شدت نے طاہرہ کی آواز میں آنسوؤں کی نمی پیدا کر دی ہے۔ بہت زیادہ خوشی بھی تو بعض اوقات انسان کو رُلا دیتی ہے۔" اس نے خود ہی ایک جواز تراش لیا اور گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے بولا۔

"یہ تو اچھی خبر ہے طاہرہ! اس سے کہنا سوئے نہیں، میں گھر واپس آتے ہوئے اس کے پسندیدہ ریسٹورنٹ سے پیزا لیتا ہوا آؤں گا۔" اس نے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے ایک بہت ہی حساس معاملے کو ہلکے پھلکے انداز میں ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ٹیلی فونک گفتگو سے شوبی کے اغوا کا معاملہ تفتیشی افسر کے علم میں آسکے۔

"شوبی ہمیشہ کے لیے سو گیا ہے نقوی! اب وہ کبھی آپ کا لایا ہوا پیزا نہیں کھا سکے گا۔" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو طاہرہ؟" ڈاکٹر نقوی حلق کے بل دہاڑا۔ بیوی کی بات کا جو مفہوم سمجھ آرہا تھا، وہ اسے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جذبات کی شدت نے اسے ساری مصلحت پسندی بھی بھلا دی تھی اور وہ تفتیشی افسر کی موجودگی کو فراموش کرکے اصل صورتِ حال جاننے کے لیے بے چین ہو گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ ظالم شوبی کی لاش گھر کے سامنے پھینک کر چلے گئے ہیں۔ عاشی کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ آپ فوراً گھر واپس آجائیں نقوی! میں اکیلی سب کچھ نہیں سنبھال سکتی۔" وہ روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی لیکن ڈاکٹر نقوی تو گویا ہر صدا سننے سے محروم ہو گیا تھا۔ جسے بچانے کے لیے وہ اپنے ضمیر کا سودا کر بیٹھا تھا، وہ انہیں اس حال میں لوٹایا گیا تھا کہ اس کے وجود میں زندگی کی رمق نہیں رہی تھی۔ یہ کیسا ایفائے عہد تھا؟ یہ کیسی سودے بازی تھی؟ یہ کیسا ظلم تھا؟ اپنے ذہن میں ابھرتے ان احتجاجی سوالوں کا جواب ملنے سے قبل ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اور وہ سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھتے ہوئے سامنے کی طرف جھکتا چلا گیا۔

☆☆☆

"بہت خوب پانڈے! تم نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے تمہیں خصوصی انعام دیا جانا چاہیے۔ میں اوپر بات کروں گا۔ تم دیکھنا، تمہارے فارن اکاؤنٹ میں جلد ہی ایک بڑی رقم ٹرانسفر ہو جائے گی۔" تکیوں کے سہارے بستر پر نیم دراز ورما نے شیمپین سے بھرا جام ہونٹوں سے جدا کرتے ہوئے پانڈے کو سراہا۔ اسپتال سے فرار ہو کر ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ورما کا ایک قابل ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا گیا تھا۔ ڈاکٹر انہی کا آدمی تھا اور اکثر اس طرح کی خدمات انجام دیتا رہتا تھا۔ اس نے چیک اپ کے بعد یہ تسلی دے دی تھی کہ ورما کا کوئی بھی زخم اب اتنا خطرناک نہیں رہا ہے اور وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائے گا لیکن کچھ دن اسے مکمل آرام کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے پیشِ نظر ورما اس وقت بستر پر نظر آرہا تھا اور بستر ہی پر دراز اپنی آزادی کا جشن منانے کے لیے شراب نوشی کر رہا تھا۔

"آپ کی مہربانی ہے سر! ورنہ میں نے تو اپنی ڈیوٹی پوری کی ہے۔" عاجزی کا مظاہرہ کرتے پانڈے کا خوشی سے تمتماتا چہرہ بتا رہا تھا کہ ملنے والے انعام کی نوید ہی دراصل اس کی محنت کا اصل ثمر ہے۔

"یہ اچھی بات ہے کہ تم ڈیوٹی کو یاد رکھتے ہو۔ ویسے بھی حالات بتا رہے ہیں کہ آنے والا وقت ہمارے لیے خاصا سخت ثابت ہو سکتا ہے۔ یہاں کی انٹیلی جنس کے ہاتھ میں بہت سی معلومات آگئی ہیں۔ اب ان کے لیے ہمارے سیٹ اپ کو کھوجنا مشکل نہیں ہوگا۔ اب ہمیں مزید ہاتھ پیر بچا کر کام کرنا ہوگا اور کوئی نیا سیٹ اپ تیار کرنا ہوگا۔ اپنے سارے آدمیوں سے کہہ دو کہ پوری طرح چوکنا رہیں۔" سنجیدگی سے بولتے ورما کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں لہراتی نظر

آرہی تھیں۔

"آپ چنتا نہ کریں سر! میں پہلے ہی سب کو ہدایت دے چکا ہوں۔ بھگوان نے بڑی کرپا کی کہ جس روز آپ کو اریسٹ کیا گیا، ہمیں فوراً پتا لگ گیا۔ جگدیش آپ کے بلانے پر ہی آپ کے اپارٹمنٹ پر گیا تھا۔ اسے پولیس موبائلز وغیرہ نظر آئیں تو چونک گیا اور پھر اس نے فوراً ہی معلوم کر لیا کہ پولیس نے آپ کے اپارٹمنٹ پر ریڈ کیا ہے۔ اسی نے مجھے انفارم کیا اور میں نے فوراً اپنے سارے بندوں کو انڈر گراؤنڈ ہو جانے کو کہہ دیا۔ بس ہم ڈولی کو نہیں بچا سکے۔ ہمارے ہوشیار کرنے سے پہلے ہی پولیس اسے اریسٹ کر چکی تھی۔ اس کو چھڑانے کے لیے ہم اب بھی کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ میری ساری توجہ آپ کی طرف تھی۔ بڑی مشکل سے معلوم ہو سکا کہ آپ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پلان کر کے آپ کو اسپتال سے نکلوایا۔" وہ تفصیل سے ورما کو بتانے لگا۔

"ڈاکٹر نقوی کی فیملی میں سے کوئی فرد تم لوگوں کو پہچان تو نہیں لے گا؟ اس کے نواسے کی عمر کیا تھی؟ کہیں یہ نہ ہو کہ اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات رہ گئی ہو جس کی مدد سے ہمارا کوئی سراغ لگایا جا سکے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا سر! ہم لوگ بالکل بدلے ہوئے حلیوں میں ڈاکٹر نقوی کے گھر گئے تھے۔ رہی اس کے نواسے کی بات تو اسے ہم نے واپس ضرور بھیجا ہے لیکن مردہ حالت میں۔ ہم نے ڈاکٹر نقوی کو اس کا نواسا پہنچانے کا وچن دیا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اسے زندہ بھی دیکھ سکے گا۔" پانڈے کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ تھی۔ اس کا جواب سن کر ورما بھی مطمئن ہو گیا اور نہایت طمانیت سے بولا۔

"اگر تم مطمئن ہو تو اچھی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ رہا ڈولی کے گرفتار ہونے کا مسئلہ تو اسے چھوڑ دو۔ ڈولی سے انٹیلی جنس والے اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم کر سکیں گے جتنا وہ ویسے بھی جان گئے ہیں۔ ڈولی اب ہمارے لیے ایک ناکارہ پرزہ ہے۔ اس کا متبادل جلد مل جائے گا۔ جو بیت گیا اسے بھول کر اب نئی پلاننگ کرنی ہوگی اور اس پلاننگ میں شہریار ہماری ہٹ لسٹ میں سب سے اوپر رہے گا۔"

"کون شہریار.....؟ کیا وہی جو سجاد رانا کا کزن ہے اور اسسٹنٹ کمشنر کی پوسٹ پر کام کر رہا ہے؟" پانڈے چونکا۔

"ہاں وہی۔ اس کی وجہ سے پہلے بھی ہم کافی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ تمہارے اللہ آباد کے مدرسے والا سیٹ اپ بھی اسی کی وجہ سے خراب ہوا تھا۔ اگر وہ اتنی ایکٹویٹی نہیں دکھاتا تو تم آرام سے شاہنواز کے روپ میں اپنے مشن پر کام کرتے رہتے۔ اسی کی وجہ سے پیر آباد کے مدرسے پر سے بھی ہمارا کنٹرول ختم ہوا اور اللہ آباد میں لگایا گیا سرمایہ بھی ڈوب گیا۔ مجھے پھنسوانے والا بھی وہی تھا۔" ورما پانڈے کو بتانے لگا کہ کس طرح شہریار اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور اس کی گرفتاری کا سبب بنا۔

"وہ بالکل بدلے ہوئے روپ میں میرے سامنے آیا تھا۔ اگر وہ سجاد رانا کی بیٹی والے معاملے پر بات نہ کرتا تو میں بہت مشکل سے اسے پہچان پاتا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ میں اسے غور سے تو نہیں دیکھ سکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ ماہا بانو نامی وہی لڑکی تھی جس کو پیر آباد کا چودھری ایک عرصے تک تلاش کرتا رہا ہے۔"

"اسے تلاش کیا جا سکتا ہے سر..... اور شہریار تو ہے ہی ہمارے سامنے۔ آپ بس حکم دیں کہ کب اس کا کام تمام کرنا ہے۔" ورما کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر پانڈے نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ورما اس سے بہت سینئر تھا اس لیے اسے اس کی چاپلوسی کرنی پڑ رہی تھی لیکن دل ہی دل میں وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی موقع ملا، اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر اس طرح اوپر والوں کے سامنے پیش کرے گا کہ وہ ورما کے ناکارہ ہونے پر وشواس کر بیٹھیں گے۔

"ہم گولی سے شہریار کا کام تمام نہیں کریں گے۔ اسپتال کے بستر پر لیٹ کر میں نے اس کے بارے میں بہت سوچا تھا اور میں بہت کچھ طے بھی کر چکا ہوں۔ اب بس اس پر عمل ہونا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ۔" ورما کی آنکھوں میں جیسے کوئی شیطانی خواب کروٹیں لے رہا تھا۔

☆☆☆

"آخر یہ ہوا کیسے؟ کیا تم نے ٹھیکیدار پر چیک نہیں رکھا تھا؟" شہریار نے اپنے سامنے نظریں جھکائے بیٹھے عبدالستار سے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

"سوری سر! میں بس اعتبار کر کے مار کھا گیا۔ ٹھیکیدار سے میری برسوں کی علیک سلیک ہے۔ کئی بار میں نے اس سے چھوٹے موٹے کام بھی کروائے، کبھی اس نے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ اسی اعتماد کی وجہ سے ہی میں نے اسے اپنے پروجیکٹ میں شامل کیا تھا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کر گزرے گا۔ وہ تو نور پور کے چودھری صاحب کو ہی کچھ شک گزرا تو انہوں نے میری توجہ اس طرف دلوائی۔ میں نے چیک کیا تو واقعی کافی گھپلا تھا۔ میں شرمندہ ہوں لیکن

http://digestpk.blogspot.com/

یہ معاملہ آپ کے سامنے لائے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔" عبدالمنان کے الفاظ اور تاثرات دونوں سے گہری شرمندگی جھلک رہی تھی۔ نور پور میں اسکول اور اسپتال کی تعمیر کا جو پروجیکٹ جاری تھا، اس کے سلسلے میں ٹھیکیدار کی بدعنوانی سامنے آئی تھی۔ ٹھیکیدار کا انتخاب بھی عبدالمنان نے کیا تھا اور اس سے معاملات بھی وہی طے کرتا تھا، اس لیے اس بدعنوانی کے سامنے آنے کے بعد وہی سب سے زیادہ ذمے دار بھی ٹھہرتا تھا۔

"صرف شرمندہ ہونے سے کام نہیں چل سکتا عبدالمنان! ان پروجیکٹس پر جو رقم خرچ ہو رہی ہے، وہ ہمارے پاس امانت ہے۔ سیٹھ موتی والا مرحوم نے اپنی جائداد اگر ہمارے حوالے کی تھی تو صرف اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اس بات کے اہل ہیں کہ امانت کا حق ادا کر سکتے ہیں اور ان کی رقم اسی طرح خرچ ہوگی جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنے فرض کی ادائیگی میں جو غفلت کی ہے، وہ ایک مرے ہوئے انسان کے اعتماد کو دھوکا دینے کے زمرے میں ہی آتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں سر اور تلافی کی جو بھی صورت نکلے، اس کے لیے تیار ہوں۔" اس کی بات سن کر عبدالمنان کی شرمندگی اور بھی گہری ہوگئی اور وہ پورے خلوص سے بولا۔

"میں تنہا تمہیں ذمے دار نہیں ٹھہرا رہا ہوں۔ غلطی شاید میری بھی ہے۔ میں اس معاملے کو کلی طور پر تمہارے حوالے کرنے کے بجائے اگر خود بھی مسلسل رابطے میں رہتا تو یہ صورت حال پیش نہیں آتی۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا، اب پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ ٹھیکیدار کو گرفتار کیا جائے اور پھر اس سے ہضم کی گئی ساری رقم نکلوائی جائے۔ اس کے بعد چھان پھٹک کر کسی دوسرے آدمی کو یہ ذمے داری سونپی جائے گی۔ اس سارے عمل سے گزرتے ہوئے جو وقت برباد ہوگا، اس کا البتہ کوئی حل نہیں اور اس کے لیے بہرحال ہمیں ہمیشہ شرمندہ رہنا ہوگا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!" عبدالمنان نے اس کی تائید کی پھر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں ڈی ایس پی منظور کو ابھی فون کر دیتا ہوں۔ ٹھیکیدار کی گرفتاری کا کام وہ اپنی نگرانی میں کروا دے گا۔" اس نے سامنے رکھے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ریسیور اٹھانے سے قبل ہی فون بج اٹھا۔ عبدالمنان نے کال ریسیو کی اور لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی سنجیدگی کے ساتھ دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ درمیان میں اس نے کچھ سوالات بھی کیے جنھیں سن کر شہریار نے اندازہ لگایا کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا ہے۔ عبدالمنان نے گفتگو مکمل کر کے فون رکھا تو وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"بری خبر ہے سر! تانگے والے اتو کی جنگل سے لاش ملی ہے۔ لاش کی حالت بہت خراب ہے اور ظاہری طور پر تو یہی لگتا ہے کہ اسے جانوروں نے چیر پھاڑ کر مار ڈالا ہو۔ ایک ہاتھ تو سرے سے غائب ہے۔ شاید کسی طاقتور جانور نے اس کے جسم سے اکھاڑ دیا ہے۔ حتمی نتیجہ بہرحال پوسٹ مارٹم کے بعد ہی نکل سکے گا۔" اس نے دوسری طرف سے ملنے والی رپورٹ اختصار کے ساتھ بیان کی۔

"مجھے اس معاملے میں گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔ اتو کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ اپنی منگیتر رانی کی موت کا ذمے دار چودھری کو سمجھتا تھا اور اس کے خلاف ہمارا ساتھ دینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ان حالات میں یہ بھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے خاموش رکھنے کے لیے ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔ ویسے بھی چودھری نے جنگل کو اپنی جاگیر سمجھ کر اپنے مخالفین کے لیے مقتل گاہ بنا ڈالا ہے۔ کتنی لاشیں ہیں جو اب تک جنگل سے دریافت ہوئی ہیں اور یہ سارے وہ لوگ تھے جن سے چودھری کا کچھ نہ کچھ اختلاف تھا۔"

اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے شہریار کے لہجے میں غصے کی لہر در آئی تھی۔ ٹھیکیدار کی بدعنوانی والے معاملے نے یوں بھی مزاج مکدر کر رکھا تھا، یہ ایک اور بری خبر سن کر خود بخود ہی غصے میں اضافے کا سبب بن گئی۔ ایسے میں اس کے ذاتی موبائل کی رنگ ٹون بجی تو اس نے قدرے بیزاری سے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں کسی نام کے بجائے ایک نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ اس نمبر کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نمبر کی سم اس نے خود ماہ بانو کو خرید کر دی تھی اور احتیاطاً نمبر کو اس کے نام کے ساتھ اپنے موبائل کی فون بک میں ایڈ نہیں کیا تھا۔ ماہ بانو کے نمبر سے کال آتے دیکھ کر وہ چونک گیا اور ایک طرح کی تشویش نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اس کی طرف سے احتیاط برتنے کی ہدایت کی وجہ سے وہ بلاضرورت اسے فون نہیں کرتی تھی، اب جو اس کی طرف سے فون آیا تو وہ قدرتی طور پر پریشان ہوگیا اور پریشانی کے عالم میں اس کی کال ریسیو کی۔

"السلام علیکم سر!" اس کی "ہیلو" کے جواب میں ماہ بانو نے اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام... خیریت؟ کیسے فون کیا؟" اس کے سلام کا جواب دے کر وہ فوراً ہی پوچھنے لگا۔

"جی خیریت ہے۔ بس دل گھبرا رہا تھا اس لیے آپ کو فون کر لیا۔" اس نے دھیمی آواز میں بتایا تو جہاں شہریار کو اس کی طرف سے اطمینان ہوا، وہیں غصہ بھی آنے لگا کہ اس نے اس کی ہدایت کے برخلاف بلاوجہ فون کیوں کیا؟ خوش گوار موڈ کے ساتھ شاید اسے ماہ بانو کی یہ نافرمانی اتنی بری نہیں لگتی لیکن اس وقت تو مزاج پہلے ہی سے برہم تھا چنانچہ وہ بے چاری خود بہ خود ہی لپیٹ میں آگئی اور وہ نہایت روکھے پن سے اجنبی لہجے میں بولا۔

"دیکھو بی بی! میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ بے مقصد باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اہم مسئلہ ہو تو مجھے کال کیا کرو۔ یہ بیکار کی باتیں سننے کے لیے میرے پاس فرصت نہیں۔"

"سوری سر!" اتنی سخت بات سننے کے بعد ظاہر ہے ماہ بانو اس سے مزید کچھ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ فوراً ہی فون بند کر دیا۔ شہریار کے عین سامنے بیٹھے عبدالمنان نے بھی اس کا یہ انداز ملاحظہ کیا تھا۔ دوسری طرف سے فون کرنے والی ہستی کون تھی، یہ تو وہ بھی اندازہ نہیں لگا سکا لیکن یہ ضرور سمجھ گیا کہ آج شہریار صاحب خراب موڈ میں ہیں۔

"مجھے اجازت ہے سر... میں اپنی سیٹ پر جاتا ہوں، وہیں سے ڈی ایس پی کو بھی فون کر دوں گا۔" اس نے منظر سے ہٹ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ شہریار نے سر کے اشارے سے اسے اجازت دے دی۔ عبدالمنان کے باہر جانے کے بعد وہ اپنے رویے کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا تو ماہ بانو کے ساتھ اپنا رویہ ضرورت سے زیادہ سخت محسوس ہوا۔ شاید ٹھیکیدار کی بدعنوانی اور اتو کی موت کی خبریں سن کر وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہوگیا تھا۔ دوسرے وہ جس راہ پر چل رہا تھا، ڈرتا تھا کہ محبت کے پیچ و خم میں پھنس کر وہ راہ کھوٹی نہ کر بیٹھے۔ اندر کا یہ ڈر اسے محتاط روی پر اکساتا تھا چنانچہ وہ کسی صورت خود کو ماہ بانو کے نزدیک نہیں ہونے دیتا تھا۔

"ڈاکٹر ماریا تشریف لائی ہیں سر! آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔" وہ کسی کام میں مصروف ہو کر اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا کہ انٹرکام بج اٹھا اور عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔ عموماً وہ غیر طے شدہ ملاقاتوں سے گریز کرتا تھا لیکن بعض افراد اس پابندی سے مستثنیٰ تھے، خاص طور پر انتظامی امور سے منسلک افراد۔ جن لوگوں کو ٹالنے کی کوشش کی جاتی تھی، وہ ایسے جاگیردار یا عہدے داران ہوتے تھے جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اس سے ربط ضبط بڑھانے کے خواہش مند ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ماریا کا معاملہ ہر طرح کے لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ اگرچہ چودھری کے جبر سے مجبور ہو گئی لیکن اس کے قائم کردہ مرکزِ صحت میں بڑی دل جمعی سے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ایک مخلص اور اچھی ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ قابلِ قدر تھی ہی، سو تھی... شہریار کے لیے تو اس لیے بھی بہت اہمیت رکھتی تھی کہ اس نے اس کے لیے ایک محسن کا کردار ادا کیا تھا۔ اگر ڈاکٹر ماریا ساتھ نہ دیتی تو وہ چودھری کی سازش کا شکار ہو کر اپنی قابلِ اعتراض تصویروں کے اسکینڈل میں پھنس چکا ہوتا۔ ڈاکٹر ماریا اگر اس وقت اس سے ملنے کے لیے خود اس کے آفس تک چل کر آئی تھی تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے تمام مصروفیات ترک کر کے فوراً اسے اندر بلوا لیا۔

"ہیلو سر! کہیں میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟ آپ کی مصروفیت کا سوچ کر یہاں آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر سوچا کہ ایک بار کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔" ڈاکٹر ماریا اندر آئی تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مسکراتے ہوئے بولنا شروع کر دیا۔

"مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی آپ سے ملنے سے انکار کیا ہو... پھر بھلا ہمت کیوں نہیں ہو رہی تھی؟" اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے شہریار نے جواب دیا اور خوش دلی سے مسکرانے لگا۔

"انکار تو واقعی نہیں کیا لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں کبھی بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب کس طرح سے بی ہیو کریں گے۔"

"ارے نہیں بھئی، اب میں اتنا بھی موڈی یا رُوڈ انسان نہیں ہوں کہ ایک معزز خاتون اتنی دور سے مجھ سے ملاقات کے لیے آئیں اور میں انکار کر دوں۔" ڈاکٹر ماریا کے ڈر کی وجہ جان کر وہ دھیرے سے ہنسا اور اسے جواب دیا۔

"یہ تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ آپ میرا شمار معززین میں کرتے ہیں ورنہ جس طرح چودھری افتخار نے مجھے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے، میں خود اپنے آپ سے گھن محسوس کرنے لگی ہوں۔" ڈاکٹر ماریا کے لہجے میں اداسی در آئی۔

"اس جال سے تو آپ خود رہائی حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ورنہ میں نے تو آپ کو کئی بار حوصلہ دیا ہے۔ آپ اگر تھوڑی سی ہمت کریں تو چودھری کے چنگل سے نکل سکتی ہیں۔" شہریار نے اسے اکسایا۔

"اس موضوع پر ہم کئی بار بات کر چکے ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی آپ کی باتوں سے قائل نہیں ہو سکی... بہتر ہے کہ ہم یہ بحث ہی چھوڑ دیں۔" ڈاکٹر ماریا نے

http://digestpk.blogspot.com/

جو جواب دیا، اسے سن کر شہریار نے خاموشی اختیار کرلی۔ کچھ دیر ان کے درمیان یہ خاموشی قائم رہی پھر ڈاکٹر ماریا نے اس خاموشی کو توڑا اور ذرا شوخ لہجے میں بولی۔

"آپ کی ایک غلط فہمی دور کرنی تھی۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں صرف آپ سے ملنے کے لیے پیر آباد سے یہاں آئی ہوں تو جناب یہ غلط ہے۔ اصل میں، میں اپنی ایک فرینڈ کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور جارہی تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی خراب ہوگئی۔ لاہور جانے والی دوسری بس ایک گھنٹے بعد نکلے گی اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ وقت آپ سے ملاقات کر کے گزار لیا جائے۔" اس کا جواب سن کر شہریار کو سمجھ آیا کہ آج وہ معمول کے سادہ حلیے کے مقابلے میں نک سک سے کیوں تیار ہے۔

"ایک اسسٹنٹ کمشنر کو وقت گزاری کے لیے استعمال کرنا تو بڑی بُری بات ہے۔" وہ ماہ و باتو کے بعد کسی دوسری خاتون کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ بُرا ماننے کے بجائے خود بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

"نہیں بھئی، میں ایسی گستاخی ہرگز بھی نہیں کرسکتی کہ آپ کو وقت گزاری کے لیے استعمال کروں۔ میں نے تو صرف یہ سوچا تھا کہ آپ کے ساتھ ایسٹھ یونٹ سے متعلق کچھ ڈسکشن بھی کرلوں گی اور میرا ایک گھنٹا بھی ضائع نہیں ہوگا۔" شہریار کے لہجے کی خوش گواری کے باوجود ان نے وضاحت دینا ضروری سمجھا۔

"وائے ناٹ... لیکن پہلے میں چائے کے لیے کہہ دوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے اٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن کچھ آرڈر کرنے سے قبل ہی عبدالمنان دروازے پر دستک دے کر اندر چلا آیا۔

"دخل اندازی کے لیے معذرت چاہتا ہوں سر... لیکن بات ایسی ہے کہ آپ کو بتانے میں دیر نہیں کی جاسکتی تھی۔" اس نے شہریار کی اپنی طرف اٹھی نظروں کے جواب میں جلدی سے وضاحت پیش کی اور پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "خبر آئی ہے کہ ایم این اے لیاقت رانا کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے۔ فائرنگ کے وقت ان کی فیملی بھی ان کے ساتھ تھی۔ کہا یہی جارہا ہے کہ فائرنگ سے گاڑی میں سوار کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچا لیکن رانا صاحب کی اپنی فیملی سمیت اسپتال میں موجود ہونے کی بھی اطلاع ہے۔" عبدالمنان جانتا تھا کہ لیاقت رانا اس کے سگے ماموں ہیں اس لیے خبر اس تک پہنچانے میں بہت پھرتی دکھائی تھی۔ اس خبر کو سن کر شہریار کا پریشان ہونا ایک لازمی بات تھی۔ وہ فوراً ہی اپنا موبائل اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

عبدالمنان سے اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کے پاس اس کے علاوہ مزید کوئی خبر ہوتی تو وہ سوال کیے بغیر ہی سنا چکا ہوتا۔ اس نے لیاقت رانا، آفرین رانا اور مریم تینوں کے نمبر پے در پے ملا کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن تینوں ہی نمبر بند جارہے تھے۔ اس طرف سے مایوسی کے بعد اس کے پاس یہی حل رہ جاتا تھا کہ آئی جی مختار مراد سے رابطہ کرے۔ اس سے بہتر پورے لاہور شہر میں کوئی اسے صحیح صورت حال سے آگاہ نہیں کرسکتا تھا۔

"اٹس شہریار عادل... آئی جی صاحب سے بات کروائیں۔" دوسری طرف سے مختار مراد کے پی اے نے کال ریسیو کی تھی۔ اس نے مختصر تعارف کے ساتھ اسے حکم دیا تو فون فوراً ہی مختار مراد صاحب کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا۔ ہر پی اے کی طرح ان کا پی اے بھی جانتا تھا کہ صاحب کن افراد کی کال سننے سے انکار نہیں کرتے۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں انکل! ماموں جان کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟" ان کے "ہیلو" کہتے ہی اس نے سوالات کرنے شروع کردیے۔

"پریشان مت ہو بیٹا! الحمدللہ سب ٹھیک ہے۔ گاڑی پر فائرنگ ضرور ہوئی ہے لیکن کوئی بھی فرد اس کی زد میں نہیں آیا ہے۔ ویسے گاڑی کی جو حالت ہے، اسے دیکھ کر تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ کسی معجزے نے ہی ان لوگوں کو زد میں آنے سے بچا لیا ہے ورنہ حملہ آوروں نے کسر بالکل نہیں چھوڑی تھی۔" مختار مراد نے پہلے اسے تسلی دی پھر تفصیلات بتائیں۔

"ماموں جان وغیرہ اسپتال میں کیوں ہیں؟ میں کال کررہا ہوں تو ان لوگوں کے نمبرز بھی بند مل رہے ہیں۔"

"نمبرز لیاقت صاحب نے خود جان بوجھ کر بند کروا دیے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ایسے حالات میں میڈیا والے کس بُری طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ان کے الٹے سیدھے سوالوں سے بچنے کے لیے انہوں نے ایسا کیا ہے۔ رہی ان لوگوں کے اسپتال میں ہونے کی بات تو اصل میں بھابی صاحبہ نے اس حملے کا بہت اثر لیا ہے اور شاک کی سی کیفیت میں ہیں۔ اس لیے انہیں اسپتال لے جانا پڑا۔ تم فکر مت کرو۔ میں یہاں ہوں، سب کچھ دیکھ لوں گا۔" وہ اس کی لیاقت رانا اور ان کی فیملی سے شدید وابستگی سے پوری طرح واقف تھا اس لیے گاہے بگاہے تسلی دینے کا فریضہ انجام دیتا جارہا تھا۔

"تھینک یو ویری مچ انکل۔" اس نے مختار مراد کا شکریہ

ادا کیا اور فون بند کر کے عبدالمنان کی طرف متوجہ ہوا۔ "گاڑی نکلواؤ۔ میں ابھی لاہور کے لیے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔"

"گاڑی ریڈی ہے سر لیکن آپ کا ڈرائیور غائب ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے قبل اپنے کسی ذاتی کام سے نکلا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اگر آپ کہیں تو میں ڈرائیو کرلیتا ہوں۔" عبدالمنان نے جھجکتے ہوئے اسے اطلاع دینے کے ساتھ پیشکش کی تو وہ غصے کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کی اصول پسند طبیعت کے باوجود عملے کے افراد میں سے کوئی نہ کوئی غفلت دکھا ہی دیتا تھا۔ بے شک آج کے شیڈول میں اس کا آفس سے کہیں باہر جانا طے نہیں تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ ڈرائیور اسے مطلع کیے بغیر اپنے ذاتی کام سے نکل کھڑا ہوتا... وہ بھی اتنے طویل دورانیے کے لیے۔ ڈرائیور کی اس غفلت نے اسے مشتاق خان کی یاد دلا دی۔ وہ کتنا ذمے دار اور کام کا آدمی تھا۔ اس نے مختصر عرصے میں ہی شہریار کا دل جیت لیا تھا اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ بلتستان کے پہاڑوں میں قائم شدت پسندوں کے ٹھکانے کو دریافت کر کے اسے نیست و نابود کرنے کا سہرا اسی دلیر آدمی کے سر جاتا تھا لیکن چونکہ وہ خود اس ٹھکانے پر زخمی حالت میں پایا گیا تھا، اس لیے ابھی تک آرمی انٹیلی جنس کی کسٹڈی میں تھا۔ اس کی رہائی کے سلسلے میں شہریار مسلسل کوشش کررہا تھا اور امید تھی کہ وہ جلد رہا کر دیا جائے گا لیکن اس وقت تو بہرحال وہ نہیں تھا اور اس کی کمی محسوس ہورہی تھی۔

"تم یہیں رہ کر یہاں کے معاملات دیکھو۔ گاڑی میں خود ڈرائیو کرلوں گا۔" اس نے عبدالمنان کی پیشکش مسترد کر دی۔ عبدالمنان کو خود بھی یہی امید تھی۔ پہلے بھی شہریار کئی بار اکیلے ہی خود ڈرائیو کر کے لاہور جاچکا تھا۔

"آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتی ہیں۔ لاہور پہنچ کر کسی ایسی جگہ اتر جائیے گا جہاں سے آپ کو اپنی فرینڈ کی شادی میں پہنچنے کے لیے سہولت سے ٹیکسی مل سکے۔" وہ لمحوں میں جانے کا فیصلہ کرنے کے بعد منٹوں میں روانگی کے لیے تیار بھی کھڑا تھا لیکن اس ساری صورت حال میں خاموش تماشائی بنی بیٹھی ڈاکٹر ماریا کو فراموش نہیں کیا تھا۔ اس پیشکش کو سن کر وہ فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو پیون نے ایک بڑا سا بیگ لاکر گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھ دیا۔

"اس بیگ میں میرا سامان ہے۔ ایکچوئلی میں دو تین دن رکنے کے خیال سے لاہور جارہی تھی اس لیے اتنا سامان رکھنا پڑا۔" ڈاکٹر ماریا نے بیگ کے بارے میں بتایا جس پر شہریار نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔

"ریلیکس سر! اس رفتار سے ڈرائیو کریں گے تو کوئی ایکسیڈنٹ بھی ہوسکتا ہے۔" ڈاکٹر ماریا کچھ دیر خاموش رہی پھر اسٹیئرنگ گھماتے اس کے ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت رسان سے بولی تو وہ شرمندہ ہوگیا۔

"سوری... میں جذبات میں اپنے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال رہا تھا۔" گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے اس نے معذرت کی۔

"میں اپنی وجہ سے نہیں کہہ رہی تھی۔ مجھ سے کہیں زیادہ قیمتی آپ کی زندگی ہے۔ میرا کیا ہے، میری جگہ کوئی بھی دوسرا ڈاکٹر لے سکتا ہے لیکن آپ جیسا مخلص، مستعد اور بہادر اے سی اس علاقے کے لوگوں کو دوبارہ شاید ہی مل سکے۔" ڈاکٹر ماریا کا ہاتھ اب بھی تسلی آمیز انداز میں اس کے ہاتھ پر دھرا تھا۔

"آپ نے تو میری تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔" اس کے چہرے کے نقوش میں نرمی سی اتری۔

"میں نے تو صرف حقیقت بیان کی ہے۔ آپ کی زندگی ہم سب کے لیے واقعی اہم اور ضروری ہے جسے کسی صورت ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، آپ کو دوسری طرف سے کوئی بہت بُری خبر سننے کو نہیں ملی۔ اس لیے اس بے احتیاطی کی گنجائش نکلتی نہیں ہے۔" اس کے انداز میں خلوص ہی خلوص بھرا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن شاید میں ایک ہی دن میں کئی بُری خبریں سن کر نیٹس ہوگیا ہوں اس لیے اس طرح بی ہیو کررہا تھا۔" شہریار نے وضاحت دی۔

"کوئی بات نہیں، کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ کافی پیتے ہیں۔ میرے ہاتھ کی بنی کافی پی کر آپ اچھا فیل کریں گے۔" اس نے جھک کر عقبی نشست پر موجود بیگ اٹھایا اور اس میں سے پلاسٹک کی تھیلی میں احتیاط سے رکھا چھوٹا سا تھرماس اور دو پیپر کپ نکالے۔

"لانگ روٹ پر سفر کرتے ہوئے مجھے کافی پینا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنے ساتھ تھرماس میں کافی لے کر چلتی ہوں۔" کپ بھر کر شہریار کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے بتایا۔

http://digestpk.blogspot.com/

نعمت ثابت ہوئی ہے۔ میں خود بھی طلب محسوس کر رہا تھا۔" شہریار نے اس کا بڑھایا ہوا کپ تھاما اور ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

"زبردست... آپ تو بہت اچھی کافی بناتی ہیں۔" پہلا گھونٹ پیتے ہی اس نے بے ساختہ داد دی تو ماریا کے ہونٹوں پر بڑی جان دار سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ کہتے ہیں کہ سفر میں لوگ ایک دوسرے پر کھلتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے پیشوں کو بھول کر ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے لاہور کی طرف عازم سفر تھے۔ ماریا کا دلچسپ انداز گفتگو شہریار پر اثر انداز ہو رہا تھا اور وہ جس ٹینشن کے ساتھ دفتر سے نکلا تھا، وہ آہستہ آہستہ ریلیز ہوتی جا رہی تھی۔ خوش گوار ماحول میں سفر کرتے ہوئے وہ کافی آگے نکل آئے، تب شہریار نے محسوس کیا کہ ماریا نے گفتگو میں حصہ لینا کم کر دیا ہے اور اس کے چہرے پر تکلیف بھرے تاثرات نظر آ رہے ہیں۔

"از ایوری تھنگ آل رائٹ؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر ماریا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بتایا۔

"تو کوئی میڈیسن لے لیں نا۔"

"ہوں... دیکھتی ہوں۔" شہریار کے مشورے پر وہ اپنا ہینڈ بیگ ٹٹولنے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے تلاش کا سلسلہ روک دیا اور مایوسی کے عالم میں نفی میں سر ہلایا۔ یعنی اس کے بیگ میں ایسی کوئی دوا موجود نہیں تھی جو اس کے درد کا درماں بن سکتی۔

"آپ اپنا میڈیکل باکس ساتھ نہیں رکھتیں؟" شہریار حیرت اور جھنجلاہٹ دونوں کا شکار ہوا۔ جواباً ماریا کے چہرے پر شرمندگی نظر آنے لگی اور اس نے زبان سے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

"آگے ایک ہوٹل پڑتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہاں سے کچھ مل جائے۔" شہریار نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا کر ایک امکان پیش کیا۔ انسانی ہمدردی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایک تکلیف میں مبتلا شخص کو مزید شرمندہ کرنے کے بجائے اسے تسلی دی جائے۔ اس بار ماریا نے کوئی بھی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بہت تکلیف میں ہے اور ابھی لاہور بہت دور تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے یقیناً اس کی حالت خراب ہو جاتی۔ وہ فکرمند سا ڈرائیونگ کرتا رہا خوش قسمتی سے اب وہ ہوٹل زیادہ دور نہیں رہا تھا جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ یہ کوئی بہت عمدہ ہوٹل نہیں تھا۔ ہائی وے پر سفر کرنے والے تھوڑی دیر کے لیے یہاں رک کر کھاتے پیتے تھے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ لمبے وقت کے لیے صرف وہی لوگ رکتے تھے جن کے ساتھ گاڑی کی خرابی یا کسی دوسری نوعیت کا مسئلہ پیش آ جاتا تھا۔ شہریار کو امید تھی کہ ہوٹل کے ساتھ بنے پان کے کیبن سے وہ ماریا کے لیے کوئی پین کلر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پان سگریٹ کے کیبن پر سونف سپاری، ٹافیوں اور بسکٹس جیسی چیزوں کے علاوہ عموماً چھوٹی موٹی دوائیں بھی بکنا ایک عام معمول ہے کیونکہ اس انگوٹھا چھاپ بنواڑی سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ کون سا قانون آپ کو اس طرح دوائیں بیچنے کی اجازت دیتا ہے؟

"کون سی ٹیبلٹ لے کر آؤں آپ کے لیے؟" گاڑی ہوٹل کے سامنے روک کر اس نے ماریا سے پوچھا۔ انگوٹھا چھاپ بنواڑی بے شک پورے اعتماد سے مختلف امراض کی دوائیں بیچتا ہو لیکن وہ ایک ڈاکٹر کی موجودگی میں اس کے لیے نسخہ تجویز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ جواباً ماریا نے اسے ایک ایسی ٹیبلٹ کا نام بتایا جو اس کے لیے قطعی نامانوس تھا۔

"یہاں تو عام سی دوائیں ہی مل سکیں گی۔ آپ جو نام لے رہی ہیں وہ دوا ملنا تو مشکل ہے۔" اس نے کچھ بے بسی سے ماریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی عام پین کلر سے یہ درد ٹھیک ہونا ممکن نہیں۔" ماریا نے کراہتے ہوئے بتایا۔

"اوکے... میں کوشش کرتا ہوں۔" اسے امید نہیں تھی لیکن پھر بھی دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلنے لگا۔

"ایکسکیوز می شہریار!" ماریا نے اسے پکارا تو وہ ہینڈل پر جما اپنا ہاتھ ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہاں واش روم کی سہولت تو ہوگی؟" اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ اس سوال پر شہریار کے حلق سے کراہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ خاتون کو اپنے ساتھ سفر کی دعوت دینا مہنگا پڑا تھا۔ وہ جس ہوٹل کے سامنے رکے تھے، وہ بہت معمولی تھا اور اس کا کسی ہوٹل میں خاتون کے ساتھ جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب بھی اسے یہ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ وہ ماریا کو اس ابتر حالت میں لے کر اندر جائے گا تو بھانت بھانت کے لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"میں معلوم کرتا ہوں۔" خود پر بے پناہ ضبط کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ اس کا مزاج اور عادت ابھی تک

لیکن اتنا تو وہ سمجھ ہی سکتا تھا کہ فطری ضروریات کے آگے انسان مجبور ہوتا ہے۔ ہوٹل کے اندر جانے اور آنے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھے۔

"ٹیبلٹ یہاں نہیں ملی۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا ہے کہ بیس منٹ کی ڈرائیو پر ایک آبادی ہے جہاں میڈیکل اسٹور موجود ہے وہاں سے ٹیبلٹ مل جائے گی۔ آنے جانے کا وقت ملا کر چالیس منٹ بنتے ہیں۔ ہوٹل والا اپنے ایک ملازم کو موٹر سائیکل پر بھیج کر دوا منگوانے پر تیار ہے۔ تمہیں یہ وقت ہوٹل میں ہی گزارنا ہوگا۔ آپ گاڑی سے باہر آ جائیں، ہم ہوٹل کے اندر چلتے ہیں۔" واپس آ کر شہریار نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا تو وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی لیکن اس کی دگرگوں حالت سے ظاہر تھا کہ اس کے لیے بغیر سہارے کے چلنا مشکل ہے۔ اس نے خود ہی سہارے کے لیے شہریار کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو وہ پیچھے نہیں ہٹ سکا۔ وہ دونوں اس طرح ہوٹل کی عمارت کی طرف بڑھے کہ ماریا نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے بازو سے بالکل چپک کر چل رہی تھی۔ ایک جوان اور خوب صورت عورت کی اس قدر قربت نے شہریار کو بے چین سا کر دیا اور وہ اپنی کیفیات میں عجیب سی تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ خواتین سے آزادانہ میل جول اس کی کلاس میں ایک عام سی بات تھی لیکن اس وقت وہ خود کو جس قدر وحشت زدہ محسوس کرنے لگا تھا، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ماریا کے جسم سے کوئی برقی رو نکل رہی ہے جو اس کے ایک ایک عضو میں دوڑتی جا رہی ہے۔ کمال یہ تھا کہ اسے اپنی یہ کیفیت بری بھی نہیں لگ رہی تھی اور وہ ماریا کی اس قربت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"مجھے باہر موجود عجیب و غریب افراد کے درمیان آپ کے ساتھ بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں نے تھوڑی دیر کے لیے یہ کمرا بک کروا لیا ہے۔ کمرے میں اٹیچ باتھ ہے۔ آپ اسے استعمال کرنے کے علاوہ ٹیبلٹ آنے تک تھوڑی دیر آرام بھی کر سکتی ہیں۔" انہیں اندر آتا دیکھ کر ہوٹل کا ایک ملازم راہنمائی کے لیے ساتھ ہو لیا تھا۔ اس کی معیت میں ایک کمرے تک پہنچ کر شہریار نے وضاحت پیش کی۔

"تھینک یو وری مچ۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں خود بھی آپ سے یہی درخواست کرنے والی تھی۔ باہر جس کیٹیگری کے لوگ موجود ہیں، مجھے خود بھی وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔" ماریا نے اسے جواب دیا اور پھر اس کا سہارا چھوڑ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جس انداز میں چل رہی تھی، اسے دیکھ کر شہریار کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں وہ گر ہی نہ جائے۔

"دروازہ اندر سے بولٹ مت کیجیے گا۔" اس نے کوئی خدشہ سا محسوس کرتے ہوئے ماریا کو ہدایت کی جس پر اس نے عمل بھی کیا۔ شہریار ایک کرسی پر بیٹھ کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی دیواروں کا رنگ و روغن خاصی خراب حالت میں تھا۔ فرنیچر کے نام پر اس کمرے میں دو کرسیاں، ایک میز اور ایک بیڈ موجود تھا۔ بیڈ پر دھلی ہوئی لیکن خاصی پرانی چادر بچھی ہوئی تھی۔ عام حالات میں شہریار کبھی ایسی کسی جگہ قیام کرنا پسند نہیں کرتا لیکن ماریا کی حالت کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا اور اب کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ عورت، آدمی کو کتنی بے بسی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ باہر کھڑی گاڑی سے اس کمرے تک پہنچنے میں انہیں ایک ڈیڑھ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا لیکن ڈیڑھ منٹ میں ہی اسے اچھی خاصی آزمائش سے گزرنا پڑا تھا اور اب بھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ جسم کا جو جو حصہ ماریا سے مس ہوا ہے، وہاں ایک سرور بھری آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اپنی اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے میز پر پڑا اخبار اٹھا کر دھیان اس کی طرف لگانا چاہا لیکن پھر واش روم سے سنائی دینے والی "دھم" کی زوردار آواز پر بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"آر یو آل رائٹ ماریا؟" واش روم کے دروازے کے قریب جا کر اس نے ماریا کو پکارا۔ جواب میں اندر سے اس کی کراہیں سنائی دیں۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ دروازہ کھول کر صورتِ حال معلوم کرے۔ جھجکتے ہوئے اس نے دروازے کے پٹ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی ماریا فرش پر گری ہوئی تھی اور اس کا لباس خاصا بے ترتیب تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ ماریا ایک ہوشربا جسم کی مالک ہے۔ اس ہوشربا جسم کی مالک عورت کو فی الحال اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ شہریار آگے بڑھا اور اسے اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ ماریا دھیمی آواز میں مسلسل کراہے جا رہی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر بیڈ تک لے گیا اور جھک کر اسے اس پر لٹا کر سیدھا ہونا چاہا لیکن اپنی قمیص کا کالر ماریا کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے سیدھا نہ ہو سکا۔ اس نے شاید گرنے کے خدشے کے باعث اس کا کالر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا تھا اور اب نیم بے ہوشی میں پڑی اس کے لیے آزمائش بنی ہوئی تھی۔ شہریار نے اس کے وجود میں بے بس کر دینے والی کشش کو

http://digestpk.blogspot.com/

بھڑکا رہی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے ضبط کی حدیں ٹوٹنے لگی ہیں اور پورے جسم میں ایک وحشت سی بھر گئی ہے۔ یہ وہ وحشت تھی جو آدمی سے اس کا سیلف کنٹرول چھین لیتی ہے۔ وہ بھی بے قابو ہو گیا اور اپنے اندر بھڑکنے والی آگ کو بجھانے کے لیے ماریا کے آنچل دیتے وجود میں ضم ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

رات کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ یہ رات ماہ بانو کی آنکھوں کے آنسو چرا کر بھیگی بھیگی سی تھی۔ شام سے شروع ہونے والی برسات کا یہ عالم تھا کہ کسی صورت رکنے کو تیار نہیں تھی اور اب بھی کن مُن کن مُن پھوار کا سلسلہ جاری تھا۔ خود ماہ بانو کا بھی یہی حال تھا۔ جب سے شہریار سے فون پر بات ہوئی تھی، اس کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ اسے شہریار سے اتنی بیگانگی اور رکھائی کی امید نہیں تھی۔ وہ تسلیم کرتی تھی کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔ شہریار جیسے مصروف بندے کو اسے اس طرح بلاوجہ فون نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اس سے یہ غلطی بے اختیاری میں ہوئی تھی۔ جب سے اس نے چودھری کے کارندے کو کراچی میں دیکھا تھا، دل پر گھبراہٹ کی طاری تھی۔ اس نے راحیلہ کے سامنے بھی اپنی اس کیفیت کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ اسے بہت دیر تک تسلیاں دیتی رہی تھی لیکن اس پر طاری ہونے والی گھبراہٹ ختم نہیں ہو سکی تھی۔ ایسے میں اس کا دھیان خود بہ خود شہریار کی طرف چلا گیا۔ وہ دنیا کا واحد فرد تھا جس کا حرفِ تسلی اس کے دل کو قرار دے سکتا تھا لیکن اس نے اطمینان سے اس کی پوری بات سننے کے بجائے جس طرح کا ردِعمل ظاہر کیا تھا، اس نے ماہ بانو کے دل کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ دل جنہیں زیادہ عزیز رکھے، ان کی پہنچائی ہوئی معمولی سی ٹھیس پر بھی کسی آبلے کی طرح پھوٹ پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ اپنا گھر، رشتے ناتے، دوست احباب اور آزادی گنوا کر اس کے پاس جو واحد جذباتی سہارا باقی رہ گیا تھا، اس کا نام شہریار تھا۔

اگرچہ شہریار نے اس سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے وہ کی غلط فہمی میں مبتلا ہوتی لیکن اس کی نرم خوئی اور مہربان رویے کی تو عادی تھی، اب جو اس نے بیگانگی برتی تو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ حالانکہ وہ خود بھی اپنے آپ کو شہریار کی طرف سے صفائی پیش کر چکی تھی۔ اس کی مصروفیات، مسائل اور پریشانیوں میں سے کچھ بھی اس کے اس رویے کا سبب ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی وہ اداس تھی اور اس اداسی نے اس کی نیند چھین لی تھی۔ اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ کہیں شہریار کا مزاج بدلنے تو نہیں لگا ہے۔ ورما کے ساتھ اس نے شہریار کو جس سفاکی سے پیش آتے دیکھا تھا، اسے وہ اب تک بھولی نہیں تھی۔ شہریار کا وہ روپ اس کے لیے انجانا تھا تو آج کا رویہ بھی قطعی اجنبی... اور بے شک وہ شہریار کو اپنا بنانے کا خواب نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کا اجنبی بننا بھی منظور نہیں تھا۔ اس کی اجنبیت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔

"اب تو سو جاؤ یار! کب تک اس طرح روتی رہو گی۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل رو رہی ہو اور رونے کی وجہ بھی نہیں بتاتیں۔" اس کی روم میٹ جو کافی دیر پہلے اسے چپ کروانے میں ناکام ہو کر سو چکی تھی، اچانک آنکھ کھلنے پر جاگی تو اسے اسی طرح روتے دیکھ کر قدرے ناراضی سے بولی۔

"سوری... میری وجہ سے تم ڈسٹرب ہو رہی ہو۔" ماہ بانو نے اس سے معذرت کی اور اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر کر اس طرح لیٹ گئی کہ وہ اس کے آنسو نہ دیکھ سکے۔

"یہ لو... یہ گولی کھا لو۔ تمہیں نیند آ جائے گی تو پُرسکون ہو جاؤ گی۔" اسے اپنے پیچھے ہلکی ہلکی کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں اور پھر اس کی روم میٹ پانی کا گلاس اور ایک ٹیبلٹ لے کر اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"ٹرنکولائزر لے لینا ہی اس وقت میرے لیے سب سے بہترین ہے۔ کچھ دیر سو جاؤں گی تو اس کیفیت سے باہر آ جاؤں گی۔" اس نے یہ سوچتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور گولی منہ میں رکھ کر پانی کا پورا گلاس پی گئی۔

"اب آرام سے لیٹ جاؤ۔" اس کی روم میٹ نے اسے مشورہ دیا۔ اس نے خاموشی سے اس مشورے پر عمل کیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ آہستہ آہستہ ٹرنکولائزر نے اثر دکھانا شروع کر دیا اور اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ نیند کی وادی میں اترتے ہوئے اسے قطعی معلوم نہیں تھا کہ جو اس نے اپنے لیے سب سے بہترین سمجھا ہے، وہ بدترین ثابت ہونے والا ہے۔ گرداب میں پھنسے انسان کے لیے تنکا بھی آسان نہیں ہوتا لیکن بے خبری تو انسان کو ہاتھ پیر مارنے کی بھی مہلت نہیں دیتی۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

"میں معذرت خواہ ہوں مسٹر ولیسکو۔ یقین کریں، میں اس وقت بالکل کنگال ہوں۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے کہ آپ کو قرضے کی قسط ادا کر سکوں۔" یہ کہتے ہوئے آرچی ورتن پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے شخص کو اس اُمید کے ساتھ دیکھنے لگا کہ اب وہ کیا کہتا ہے۔

ولیسکو اطمینان سے قرض ناہندہ کی بات سنتا رہا... جب وہ خاموش ہوا تب بھی اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ اگر پرانے دن ہوتے تو ولیسکو اسے گندی سے پکڑتا، پیٹ میں گھٹنا مارتا اور پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ کر جم کر کٹائی لگاتا مگر وہ کیا کرے۔ جس نئے ادارے میں وہ اس وقت کام کر رہا تھا، وہ اسے مار پیٹ کرنے سے روک چکا تھا۔ اس ادارے میں ولیسکو اقساط کی وصولی پر مامور تھا۔ اس ادارے کی پالیسی قرض دینے

مقروض

مختار آزاد

زندگی میں ملنے والی کامیابی اور ناکامی کا انحصار کم و بیش ہمارے فیصلوں پر ہوتا ہے... لیکن کچھ لوگ اپنی ناکامی کا ذمے دار ہمیشہ قسمت کو ٹھہراتے ہیں... انہیں دم آخر تک یہ احساس ہی نہیں ہوتا... کہ ان کی زندگی متواتر غلطیوں کا مجموعہ ہے... اور ان غلطیوں کی یاداش میں ہار ہی ان کا مقدر بنتی ہے... ایک ایسے ہی مفلوک الحال شخص کا ماجرا جس کے گرد قرض داروں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

اس کمزور و تنگ دست کی کسمپرسی..... جس نے حالات بدلنے کے لیے ہمت کر لی تھی

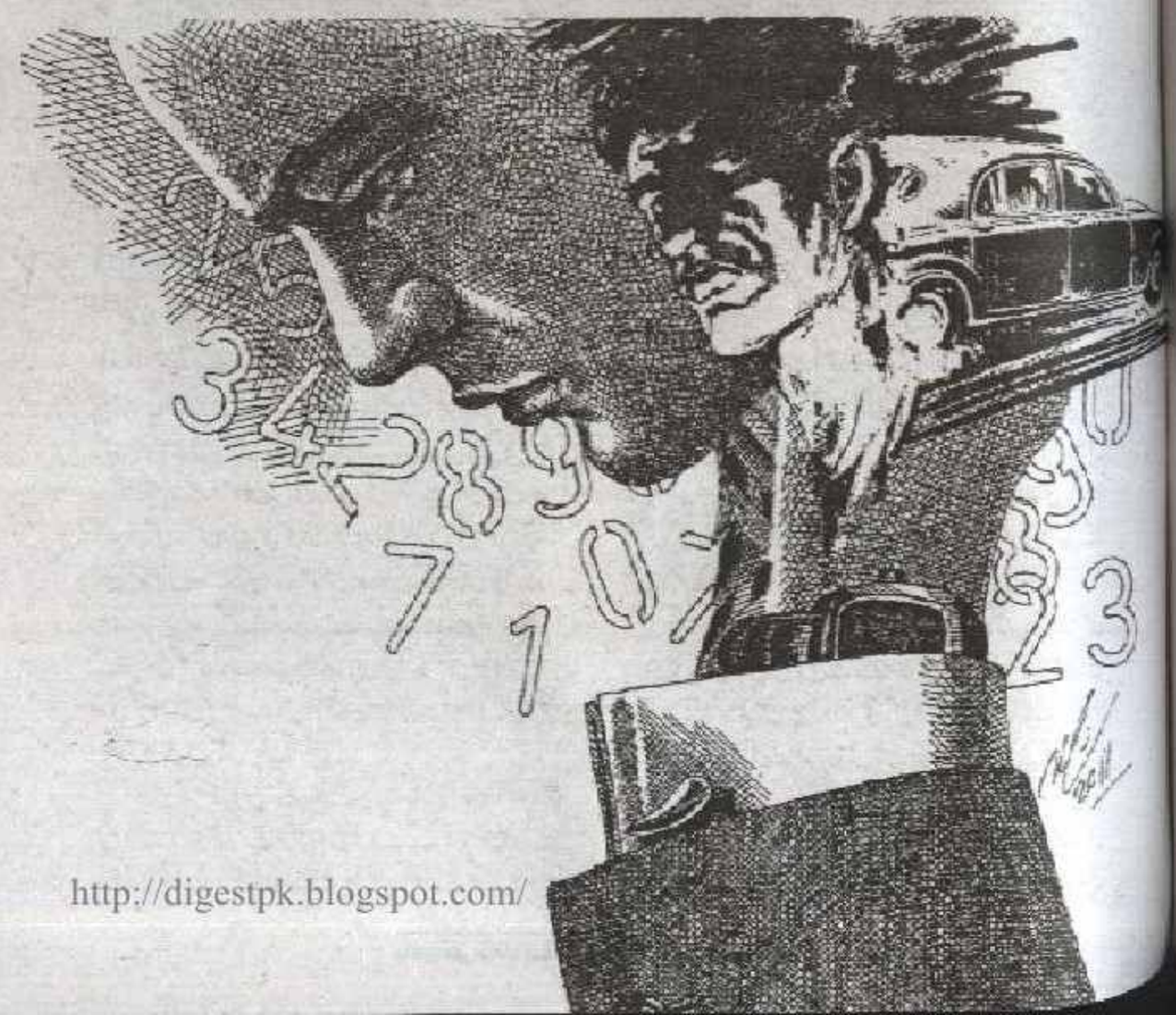

http://digestpk.blogspot.com/

والے دوسرے اداروں سے بہت مختلف تھی۔ یہ ادارہ قرض خواہوں سے نرم گفتاری اور خوش خلقی سے پیش آنے کی تلقین کرتا تھا۔ ادارہ قرض وصول کرنے والے افسران کو شائستہ لب و لہجے میں گفتگو کرنے اور مہذب لباس پہننے کی تلقین کرتا تھا۔ اس لیے ڈیسکو قرض نادہندہ آرچی ورتن کی بات سن کر خاموش رہا اور سوچنے لگا کہ اب وہ کیا کہے اور کیا کرے؟ یہ اور بات تھی کہ ان سب شریفانہ طریقوں کے باوجود وہ ادارہ مافیا کا تھا جو اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے یہ دھندا اپنائے ہوئے تھا۔

”کیا مصیبت ہے۔“ ڈیسکو زیر لب بڑبڑایا۔ ”میں ہمیشہ قرض وصول کرنے والا ہی افسر کیوں بنتا ہوں اور یہ کمبخت سوٹ اور ٹائی۔۔۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے ساتھ ساتھ لباس کو بھی کوسنے دینے لگا۔ فطرتاً وہ جھگڑالو طبیعت کا آدمی تھا۔ ساری زندگی جرم کی دنیا میں بسر کرنے کے بعد اب اس سے یہ شریفانہ کردار کھا ذرا برداشت نہیں ہوتے تھے مگر وہ مجبور تھا اور آج ایک بار پھر وہ شرافت اور اپنے شریفانہ حلیے کو لعن طعن کیے جا رہا تھا۔ ڈیسکو سوچ رہا تھا کہ بظاہر افسر... اور اوپر سے سوٹ ٹائی میں ملبوس ہو کر، وہ سرِ عام کسی قرض نادہندہ کی پٹائی کرتے ہوئے کیسا لگے گا۔ اس نے اسٹور کے خوفزدہ مالک کو دیکھا۔ وہ بدستور خاموش تھا اور منتظر تھا کہ اب جواب میں وصول کرنے والا کیا قدم اٹھاتا ہے۔

ڈیسکو خاموش کھڑا اسے مطمئن نظروں سے دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے کوٹ کے اندر کی جیب سے چاکلیٹ نکالی اور مزے لے لے کر کھانے لگا۔ اُدھر ورتن کا دم خشک ہو رہا تھا کہ نجانے اب یہ کیا کر بیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈیسکو وہ چاکلیٹ کھا گیا۔ جب سے وہ نئے ادارے میں شامل ہوا تھا، تب سے قرض وصولی کی مہم پر جاتے ہوئے وہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں چاکلیٹ بھر لیتا تھا۔ ڈیسکو سمجھتا تھا کہ ادارے کی پالیسی پر عملدرآمد کرنے کے لیے اس کا پُرسکون رہنا لازم ہے۔ سکون... جو اس کی فطرت میں نہیں تھا مگر مجبوری تھی۔ اس لیے چاکلیٹ اسے اس طرح کی صورتِ حال میں پُرسکون رہنے میں مددگار ثابت ہوتی تھی، جس کا اسے اس وقت سامنا تھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے اور وہ ان قرض داروں سے وصول کرنے کے لیے نکلا تھا جن کی قسط منگل کو واجب الادا ہوئی تھی۔ اس کی جیب میں صرف دو چاکلیٹ موجود تھیں جنہیں وہ تھوڑی ہی دیر میں چٹ کر گیا۔

ورتن بدستور اس کے سامنے چپ چاپ سہما ہوا کھڑا تھا۔ اس وقت وہ اسٹور کے داخلی دروازے کے باہر موجود تھے۔ چاکلیٹ کھانے کے بعد منہ میں زبان گھماتے ہوئے ڈیسکو آگے بڑھا۔ اس نے ورتن کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے اسٹور کے اندر دھکیلا اور کیش وصولی کے کاؤنٹر تک دھکیلتا ہوا لے گیا اور اس کے شانوں پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے کاؤنٹر کے پیچھے پڑی کرسی پر بٹھا دیا۔ ورتن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، اسے جس بدترین گھڑی کا خدشہ تھا، وہ آپہنچی ہے۔ وہ پٹنے کے لیے بالکل تیار تھا مگر اسے کرسی پر دھکیل کر ڈیسکو آگے بڑھا اور فریج کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں خالی چاکلیٹ کے دو ریپر تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اسے قریب ہی گتے کا ایک خالی ڈبا نظر آ گیا۔ یہ ڈبا بطور کچرادان استعمال ہو رہا تھا۔ ڈیسکو نے خالی ریپر اس میں ڈالے، ہاتھ جھاڑے اور فریج میں رکھی ہوئی چاکلیٹ کے نام پڑھنے لگا۔ ورتن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈیسکو کیا کر رہا ہے؟ وہ خوفزدہ تھا کہ شاید بات پٹائی تک ہی محدود نہیں رہے گی۔ اسے ڈیسکو کے انداز سے خطرے کی بو آ رہی تھی۔ ڈیسکو نے ہاتھ بڑھایا اور فریج کا دروازہ کھول کر ایک بڑی چاکلیٹ نکالی۔ ریپر اتار کر کچرے کے ڈبے میں پھینکا اور ایک بار پھر سکون سے چاکلیٹ کھانے لگا۔

ڈیسکو کی عمر چالیس سال تھی اور اس کی شخصیت پر مصنوعی پن طاری تھا۔ وہ اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے اندر کا آدمی باہر آنے کو مچل رہا تھا۔ وہ مار کٹائی کرنے کا عادی شخص تھا لیکن اس وقت وہ خود کو تشدد سے باز رکھنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کو اسے اپنے ادارے کی پالیسی پر بھی تو کاربند رہنا تھا۔ اس نے ہاتھ سے بنے کپڑے کا نہایت قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر دھوپ کا مہنگا اور......... پاؤں میں برانڈڈ جوتے پہنے ہوئے تھے جن کی قیمت آٹھ سو ڈالر تھی۔ کلائی میں سونے کی بنی ہوئی بیش قیمت گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر سوٹ سے میچنگ کرتا ہوا ہیٹ تھا۔ گلے میں شاندار ٹائی بندھی ہوئی تھی۔ انگلی میں سفید سونے سے بنی ہوئی، بڑے سے ہیرے کی جڑاؤ انگوٹھی تھی۔ یہ حلیہ ایسے لوگوں جیسا تھا جو صرف حکم دینا جانتے ہیں۔ حکم مانا یا وضاحت سننا ان کی گھٹی میں ہی نہیں ہوتا۔

ڈیسکو کو بنے سنورنے کا بہت زیادہ شوق نہیں تھا مگر اس نے اپنا یہ حلیہ کمپنی کی ہدایت کے مطابق اختیار کیا تھا۔ اس کی کمپنی اپنے ملازمین پر زور دیتی تھی کہ پبلک ڈیلنگ کرنے والے ملازمین نہایت عمدہ لباس میں ہونے چاہئیں۔ کمپنی کے مالکان کا موقف تھا کہ عمدہ لباس میں ملبوس اہلکاروں کو دیکھ کر لوگوں میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ کمپنی نہ صرف مضبوط معاشی حیثیت رکھتی ہے بلکہ وہ اپنے ملازمین کو عمدہ تنخواہ کے علاوہ دیگر

کشش مالی مراعات بھی دیتی ہوگی۔ کمپنی کا خیال تھا کہ ملازمین کے اس طرح بنے سنورنے سے لوگوں میں کمپنی کی ساکھ سے متعلق اچھا تاثر پڑتا ہے۔ نیز وہ سمجھتے ہیں کہ کمپنی معقول اور شریف لوگ ہی چلا رہے ہیں۔ اس کے برعکس ورتن نے نہایت معمولی لباس پہن رکھا تھا جس کے اوپر سفید رنگ کا ایپرن تھا۔ ڈیسکو بدستور اپنا اور ورتن کا موازنہ کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ قسم تو دے نہیں رہا۔ اب گھی ٹیڑھی انگلی سے نکالنے یا پھر اسے قسط ادا نہ کرنے کے جرم میں سبق سکھانے کے لیے اگر وہ اس کی شاندار قسم کی ٹھکائی لگا دے تو اس کا اثر اس کی نوکری پر تو پڑے گا ہی لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ وہ معافی تلافی کر کے نوکری بچا بھی سکتا ہے لیکن معلوم نہیں کہ پٹائی لگانے کا یہ نادر موقع اسے پھر کب ہاتھ آئے گا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اپنے اس شاندار لباس میں وہ کسی عام سے دکھائی دینے والے شخص کی بھرپور پٹائی کرتا ہوا کیسا لگے گا...؟ لوگ اسے دیکھ کر اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اور اگر کسی تماش بین نے پولیس کو خبر کر دی تو۔۔۔ ویسے بھی کسی قرض دہندہ کمپنی کو یہ اختیار تو نہیں ہے کہ وہ اپنے نادہندہ قرض دار کو سرِ عام پٹوائے۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس کی ہتھیلیوں میں خارش ہو رہی تھی کہ وہ ورتن کو قرض نادہندگی کی سزا پٹائی کی صورت میں، اپنے بنائے ہوئے قانون کے تحت دے۔ وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا اور چاکلیٹ چبائے جا رہا تھا۔

بیچارہ ورتن دم سادھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈیسکو اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ ورتن نہایت معقول اور بزدلی کی حد تک شریف آدمی تھا۔ سب لوگ اسے احمق کہتے تھے۔ آج تک وہ اپنے احمقانہ فیصلوں کی وجہ سے ہمیشہ نقصان اٹھاتا رہا تھا... اس کے باوجود وہ کبھی کسی کا مشورہ نہیں مانتا تھا، حتیٰ کہ وہ اپنی بیوی کو بھی اس معاملے میں نظرانداز کر دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ناکامی اور نقصان کا ذمے دار اس کا فیصلہ نہیں بلکہ قسمت ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی ناکامیوں کی ذمے داری اپنی قسمت پر ڈال دیا کرتا تھا۔ ورتن خاموش بیٹھا چپ چاپ اسے دیکھے جا رہا تھا اور دل ہی دل میں سخت خوفزدہ تھا کہ اب نجانے کیا ہونے والا ہے۔ کافی دیر تک اسٹور میں خاموشی چھائی رہی۔ اس دوران میں کوئی گاہک بھی اندر داخل نہیں ہوا۔ آخر ڈیسکو اپنی جگہ سے ہلا اور ورتن کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”ورتن... تم کمپنی کی پالیسی اچھی طرح جانتے ہو۔ قرض کی قسط ہر منگل کو ادا کرنا لازمی ہے۔“ وہ نہایت سرد لہجے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔ ”کمپنی سے تمہارے معاہدے میں ایسی کوئی شق شامل نہیں کہ تمہیں قسط کی ادائیگی میں کسی قسم کی رعایت دی جا سکے۔“

”لیکن۔۔۔“ ورتن نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔

”خاموش رہو۔ جب میں بول رہا ہوں تو تم صرف سنو گے۔“ ڈیسکو نے اسے نہایت درشت لہجے میں ڈانٹ دیا۔ ورتن کسمسا کر رہ گیا۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ قرض کی ادائیگی کے طے شدہ وقت میں تمہیں کوئی رعایت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اب اگر قسط ادا نہ کرنے کے جرم میں، تمہارے اسٹور کے باہر لگے ہوئے کمپنی کے لوگو والا بورڈ اتار لوں تو پھر تمہارے اس اسٹور کو ہماری طرف سے کسی بھی قسم کا تحفظ حاصل نہیں رہے گا۔ اس کے بعد اسٹور میں جو ہوگا، سو ہوگا ہی مگر کمپنی جو تمہارا حشر کرے گی، وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“ یہ کہہ کر وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا اور ورتن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ترش لہجے میں بولا۔ ”میرے خیال میں تم اچھی طرح سمجھ چکے ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کا کیا مطلب ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں۔“ ورتن نے اپنی پیٹھ کرسی کی پشت سے لگائی اور سہمے ہوئے لہجے میں نظریں نیچی کر کے اپنی بات شروع کی۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میری بیوی بیمار تھی اور میں نے آج ہی کئی دنوں کے بعد اسٹور کھولا ہے۔ اب بھی وہ اسپتال میں داخل ہے۔ میں ذہنی طور پر سخت پریشانی کا شکار رہا ہوں۔ اسی الجھن کے سبب میں بھول گیا تھا کہ آج منگل ہے اور مجھے قسط دینی ہے۔ اگر مجھے یاد ہوتا تو میں کہیں سے بھی رقم کا بندوبست کر کے قسط کی رقم تیار رکھتا۔ یہ نوبت ہی نہیں آتی۔ پلیز میری بات کا یقین کرو۔ تم چاہو تو میرا یہ رجسٹر دیکھ سکتے ہو۔ اس سے تمہیں پتا چل جائے گا کہ اسٹور کتنے دن بند رہا ہے۔“ اس نے کیش رجسٹر ڈیسکو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا مگر اس نے رجسٹر پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ چپ چاپ اسے گھورے جا رہا تھا۔

”میں اکیلا اسٹور چلاتا ہوں۔ میری مالی حیثیت اور یہاں سے ہونے والی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ میں کوئی ملازم رکھ سکوں، ورنہ اتنے دنوں تک اسٹور کیوں بند رکھتا۔ پلیز تم میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ورتن کا لہجہ خوشامدی ہو چلا تھا۔ اسے ڈیسکو کی مسلسل خاموشی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ”ایسا کرتے ہیں کہ تم پہلے دوسرے قرض خواہوں سے قسط وصول کر لو۔ اتنی دیر میں، میں بینک جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ بینک سے مجھے کچھ رقم ادھار مل جائے گی۔

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

ورنن نے مسئلے کا حل پیش کیا۔ اس وقت اس کا لہجہ امید بھرا تھا۔ "میرا بینک ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ منیجر فوراً مجھے اتنی رقم ضرور قرض دے دے گا جتنی تمہاری قسط کی ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ میں ہر منگل کی صبح ٹھیک نو بجے یہاں آتا ہوں۔ اب میں تمہاری بات مان لوں اور چلا جاؤں تو پھر شام چھ بجے سے پہلے دوبارہ یہاں واپس نہیں آسکتا۔" ورنن کی بات سن کر ولیسکو نے اپنے جبڑے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے نقوش نہایت عمدگی سے تراشے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے تک چہرے پر ہاتھ پھیرتا رہا اور پھر درشت لہجے میں رعونت سے کہنے لگا۔ "ویسے بھی یہاں واپس پلٹنا میرے لیے آسان کام نہیں ہوگا۔ یہ جگہ میرے واپسی کے راستے میں نہیں ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد دوبارہ واپس آنے کے لیے مجھے بہت لمبا راستہ طے کرنا پڑے گا۔ میں بیوقوف نہیں ہوں کہ تمہاری غلطی کی سزا خود بھگتوں۔۔۔"

"تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن پلیز میری مجبوری بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر میری بیوی بیمار نہ ہوتی تو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ میں کیا کروں۔۔۔ اس کی بیماری کے سبب سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا ہے۔" ولیسکو کے خاموش ہوتے ہی ورنن فوراً کہنے لگا۔ اب اس کے لہجے میں امید تھی۔ اس کا خوف بھی کچھ کم ہو چلا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ وہ اس مسئلے سے بخیر و خوبی نمٹ لے گا۔

"تمہیں یقیناً زحمت اٹھانا پڑی ہے اور جب واپسی پر رقم لینے کے لیے آؤ گے تو تمہیں مشکل بھی ہوگی لیکن میں کیا کروں۔ اتنی پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں کہ قسط کی ادائیگی کا خیال ہی ذہن سے نکل گیا۔ بس غلطی ہوگئی۔ ایک بار معاف کردو۔ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" وہ نظروں ہی نظروں میں ولیسکو سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ "ویسے بھی آج منگل ہے اور میں اسی دن تمہاری قسط ادا کردوں گا۔ بس مجھے چند گھنٹوں کی مہلت درکار ہے۔" اس نے نہایت لجاجت سے ولیسکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ پچھلے نو ماہ سے میں ہر ہفتے باقاعدگی سے قسط ادا کرتا آرہا ہوں۔ بس اس بار غلطی ہوگئی۔ آئندہ شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔" ورنن روہانسا ہو چلا تھا۔

آرچی ورنن متوسط طبقے کا آدمی تھا۔ نو ماہ پہلے اس نے مالیاتی کمپنی سے قرض لے کر یہ اسٹور کھولا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ کمپنی دراصل مافیا کی ہے جس نے لوٹ مار کے پیسے کو قانونی شکل دینے کے لیے یہ کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ وہ باقاعدگی سے اقساط ادا کر رہا تھا لیکن گزشتہ کئی ماہ سے اس کے گھر اور اسٹور پر نحوست کا سایہ چھایا ہوا تھا۔ اس کی بیوی گزشتہ کئی ماہ سے بیمار تھی اور اس دوران میں وہ کئی بار اسپتال میں داخل رہ چکی تھی۔ پچھلے ہفتے اسے ایک بار پھر اسپتال میں داخل ہونا پڑا اور اب بھی وہ اسپتال میں ہی تھی۔ اس وجہ سے ورنن سخت ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔ دوسرا یہ کہ بیوی کی بیماری کے باعث اس پر بہت زیادہ مالی بوجھ آپڑا تھا جس کی وجہ سے اس کی مالی حالت بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔

ولیسکو، ورنن کے مسائل سے بخوبی واقف تھا۔ وہ حقائق سے آگاہ تھا لیکن اس کے لیے سب سے بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ ورنن کے اسٹور کی مالی حالت بھی بہت خراب تھی۔ کئی مہینے پہلے ہی اس کے اسٹور کے قریب ایک بہت بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور نے اپنی ایک شاخ کھولی تھی۔ اس سے پہلے ورنن کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن اس اسٹور کے کھلنے کے بعد لوگوں نے ورنن کے اسٹور کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور میں نہ صرف اشیا کی قیمتیں کم تھیں بلکہ وہ اپنے خریداروں کو مفت پارکنگ کی سہولت فراہم کرنے کے علاوہ خریداری پر اچھی خاصی رعایت بھی دیتے تھے۔ انہوں نے خریداروں کے لیے مختلف انعامی اسکیمیں بھی شروع کی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ اس ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے ورنن کے اسٹور کی حیثیت ارب پتی کے سامنے فقیر کی سی تھی۔ یہاں وہی لوگ آتے تھے جو کسی وجہ سے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں نہیں جانا چاہتے تھے، یا انہیں سامان خریدنے کی جلدی ہوتی تھی۔

ولیسکو کی مالیاتی کمپنی اپنے قرض داروں کے کاروبار اور ان کی مالی حیثیت کے بارے میں ماہانہ بنیادوں پر جائزہ رپورٹ مرتب کرواتی تھی۔ یہ رپورٹ قرض وصول کرنے والے شعبے کو بھی بھیجی جاتی تھی۔ رپورٹ میں پچھلے دو ماہ سے یہ بات کہی جارہی تھی کہ ورنن کا کاروبار متواتر خسارے میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی بیوی کی بیماری تھی اور دوسری بڑی وجہ ڈپارٹمنٹل اسٹور کو بتایا گیا تھا۔ مالیاتی مشیروں نے رپورٹ میں اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر صورت حال یہی رہی تو اس سال کے آخر تک ورنن کا کاروبار ختم ہوجائے گا۔ یہی نہیں، اس کے بینک کھاتے کے مطابق گزشتہ چار ماہ کے دوران میں اس کے اکاؤنٹ سے بھی تقریباً ساری رقم نکال لی گئی تھی۔ ولیسکو جانتا تھا کہ یہ رقم اس نے اپنی بیوی کے علاج پر ہی خرچ کی ہوگی۔ اس وقت اس کے بینک اکاؤنٹ میں صرف اتنی ہی رقم تھی جس سے کہ بینک اکاؤنٹ کھلا رہتا۔ اس لیے ولیسکو کو سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ کہیں کمپنی کا دیا گیا قرض ڈوب نہ جائے۔ اسے یقین تھا کہ ورنن کی جو مالی حالت ہے، اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں، جب وہ مکمل طور پر دیوالیہ

ہوجائے گا۔ اسی لیے اس کی کوشش تھی کہ جیسا بھی ہو، وہ قسط کی رقم ساتھ ہی لے کر جائے گا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی ہاتھ میں آجائے تو یہ بھی بھلی ہے۔ اگرچہ ورنن ٹھیک کہہ رہا تھا کہ اس کا بینک لین دین کا ریکارڈ بہت اچھا ہے لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ بینک منیجر یہ جانتے ہوئے کہ اس کے اکاؤنٹ ہولڈر کی مالی حالت ٹھیک نہیں، اس کے باوجود وہ اسے اوور ڈرافٹ دے دے، یہ حرکت تو کوئی بیوقوف منیجر ہی کرسکتا تھا۔ جب ورنن نے بینک سے قرض لے کر قسط کی ادائیگی کی بات کی تو وہ مسکرا دیا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اس وعدے پر ٹل جاتا اور جب شام کو لوٹتا، تب بھی اسے صبح والا ہی جواب ملتا۔ اسی لیے وہ بضد تھا کہ رقم لے کر ہی یہاں سے واپس جائے گا۔ ولیسکو کا خیال تھا کہ اس سے جتنی رقم وصول کی جاسکتی ہے، وہ کرلی جائے۔ یہی کمپنی کے حق میں بہتر ہے۔ وہ ورنن کی بات سن کر کافی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں شام کو ساڑھے چھ بجے تک یہاں پہنچوں گا۔ تب تک تم قسط کی رقم تیار رکھنا۔" اب ولیسکو مار پٹائی کے بجائے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب جبکہ ورنن خوفزدہ ہو کر شام کو ادائیگی کرنے کا کہہ رہا ہے تو وہ ادائیگی ضرور کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ ورنن چاہے جو کچھ کرے، شام کو اس کی واپسی پر قسط کی رقم تیار رکھے گا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بہت شریف آدمی تھا اور یہ بات جانتا تھا کہ ولیسکو بہت چھٹا ہوا آدمی ہے۔ اس لیے ورنن کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ مار بھی کھائے اور پیسا بھی دے۔ بات ٹھیک بھی تھی۔ ورنن نے بظاہر تو مار سے بچنے کے لیے ہی شام کو قسط کی ادائیگی کا وعدہ کیا تھا۔

"بہت بہت شکریہ تمہارا۔" ادائیگی میں چند گھنٹوں کی ہی مہلت سہی مگر ولیسکو جیسے سخت گیر آدمی سے یہ مہلت ملنا بھی بڑی بات تھی۔ "میں رقم تیار رکھوں گا۔" ورنن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔ ورنن نے اپنے ایپرن کا نچلا حصہ اٹھا کر اپنی آنکھوں میں آجانے والے آنسو صاف کیے۔ ولیسکو نے اسے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھا لیکن اس پر حقارت سے نظر ڈالتے ہوئے اونہہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام ورنن۔۔۔ انجام تم اچھی طرح جانتے ہو۔" اسٹور کے دروازے پر پہنچ کر ولیسکو رکا اور پلٹ کر تیز آواز میں چلایا۔

"شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" ورنن جو ولیسکو کو واپس جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اسے رکتا دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور نہایت نرم لہجے میں لیکن بلند آواز میں جواب دیا مگر ولیسکو جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ چکا تھا۔

جیسے ہی ولیسکو اسٹور سے باہر نکلا، ورنن مسکرا دیا۔ اس کے منصوبے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو چکی تھی۔ اب منصوبے کے مطابق جو کچھ باقی بچا تھا، وہ ایسا ہی تھا جیسے کہ ہاتھی تو نکل گیا، بس اب دُم باقی رہ گئی ہے۔

جیسے ہی اسے ولیسکو کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی، وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے اسٹور کا مرکزی دروازہ بند کیا۔ دکان پر "بند ہے" کا بورڈ لگایا اور اسٹور روم میں آگیا۔ اس نے اپنی بیوی لورا کے میڈیکل بل چکانے کے لیے دو ماہ پہلے ہی اپنا گھر بیچ دیا تھا۔ تب سے وہ اسٹور کے اندر بنے اسی چھوٹے کمرے میں مقیم تھا، جسے وہ بطور گودام استعمال کرتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور فرش پر بچھے گدے پر لیٹ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ کمرا نیم تاریک تھا اور آنکھیں موندنے پر اسے ذہنی سکون کا احساس ہونے لگا۔ اچانک اس کے ذہن میں پچھلے نو ماہ کے دوران میں پیش آنے والے واقعات فلم کی طرح چلنے لگے۔ سارے واقعات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے گزرے واقعات کو تسلسل کے ساتھ سوچنے کی کوشش شروع کردی۔

کوئی دو سال پہلے اس نے یہ اسٹور کھولا تھا۔ شروع شروع میں وہ اسٹور چلانا آسان کام سمجھتا تھا لیکن بہت جلد اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ اتنا آسان کام بھی نہیں تھا، جتنا کہ وہ سمجھ رہا تھا۔ شروع شروع میں کئی بار اس کے اسٹور پر ڈکیتی کی کوششیں ہوئیں۔ کئی بار بدمعاشوں نے اسے تنگ کیا اور اسے ڈرا دھمکا کر بھاری رقوم اینٹھ لیں۔ جس کی وجہ سے اسے کاروبار میں مسلسل خسارہ ہوتا رہا۔ نو ماہ پہلے اس کی ولیسکو اور اس کے دوستوں سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد ولیسکو کئی بار اس کے اسٹور پر آیا۔ رفتہ رفتہ وہ یہ بات جان گیا کہ ورنن کو کن مسائل کا سامنا ہے۔ ولیسکو نے اسے پیشکش کی کہ اگر وہ چار سو بیس ڈالر فی ہفتہ ادا کرے تو وہ اس کے تمام مسائل حل کرسکتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ ضمانت دیتا ہے کہ کاروباری خسارہ سو فیصد ختم ہوجائے گا۔ ولیسکو بظاہر ایک مالیاتی کمپنی "جی ایم" میں بطور قرض وصولی افسر کے طور پر کام کرتا تھا لیکن اصل میں یہ ایسے سفید پوش بدمعاشوں کی کمپنی تھی جو ورنن جیسے شریف لوگوں کو قانونی جال میں پھانس کر، انہیں بڑے سکون سے شریفانہ انداز میں لوٹتے تھے اور اپنا کالا دھن بھی سفید کرلیتے تھے۔

ولیسکو نے ورنن کو پچاس ہزار ڈالر کا قرض لے کر دیا مگر قرض کی یہ رقم صرف کاغذات پر درج تھی۔ حقیقت میں اسے صرف بیس ہزار ڈالر ہی ادا کیے گئے تھے۔ اس قرض کے لیے کیے گئے معاہدے کے تحت ورنن کو چار سو بیس ڈالر فی ہفتہ کی

http://digestpk.blogspot.com/

ادائیگی کرنا تھی، جس میں سے سود کی رقم منہا کر کے باقی قرض کی ادائیگی کے کھاتے میں چلی جاتی تھی۔ یوں کمپنی کو بیس ہزار ڈالر کے عوض چار سو بیس ڈالر فی ہفتہ اس وقت ملتے رہتے، جب تک پچاس ہزار ڈالر اور اس پر عائد آٹھ فیصد سود کی شرح سے رقم پوری نہ ہو جاتی۔ اس کے بدلے کمپنی نے اس کی دکان پر ایک بورڈ لگا دیا تھا جس پر 'بگ ایم کمپنی' کا لوگو بنا ہوا تھا۔ بظاہر تو یہ سیدھا سادہ بورڈ تھا لیکن شہر کے جرائم پیشہ جانتے تھے کہ یہ مافیا کا نشان ہے۔ اس لیے جس اسٹور پر یہ بورڈ لگا ہوتا تھا، اس اسٹور کے مالک سے نہ تو کوئی بدمعاش بھتہ مانگتا اور نہ ہی کوئی چور اس میں چوری کا سوچ سکتا تھا۔

شروع شروع میں تو ورنن کو یہ گھاٹے کا سودا نہیں لگا۔ جب سے اس نے قرض لیا اور کمپنی نے اسٹور پر اپنا بورڈ لگایا، تب سے نہ تو کسی نے چوری کی کوشش کی اور نہ ہی جرائم پیشہ افراد نے یہاں کا رخ کیا۔۔۔ اسے جو نقصان پہلے ہوتا تھا، وہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ کمپنی کی طرف سے دیے گئے بیس ہزار ڈالر سے اس نے اسٹور میں کافی سامان بھر لیا تھا لیکن تین چار ماہ پہلے جب اس کی بیوی اچانک شدید بیمار پڑ گئی تو ایسے میں اسٹور اکثر بند رہنے لگا۔ اب نوبت یہ تھی کہ بیوی کی بیماری پر اٹھنے والے اخراجات کے باعث اس نے اپنا گھر تک فروخت کر دیا اور پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اسٹور کے اس چھوٹے سے گودام میں رہائش پذیر تھا۔ بینک میں جو جمع پونجی تھی، وہ بھی خرچ ہو گئی تھی۔ اس کی بیوی لورا کئی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ وہ اسٹور فروخت کر کے شمالی امریکا کی طرف چلے جاتے ہیں اور اسٹور کی فروخت سے جو رقم ملے گی، اس سے کچھ اور کرنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں لیکن ان دنوں کاروباری حالت ایسی تھی کہ اسٹور لاگت سے بھی کہیں کم قیمت پر فروخت ہوتا۔ اس لیے وہ مناسب وقت کا منتظر تھا لیکن 'بگ ایم کمپنی' کا پھندا اس کے گلے میں کستا جا رہا تھا۔ ان مسائل سے چھٹکارے کے لیے اس نے ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ اب اس منصوبے پر عمل کرنے کا وقت قریب آ چکا تھا۔

لورا کی ورنن سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس سے طلاق لینے پر تلی رہتی تھی۔ لورا کا خیال تھا کہ اس کا شوہر بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ گھاٹے کا سودا کرتا ہے۔ اس سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ بیوی کی بات کو سنتا ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ اس سے چڑی رہتی تھی۔ وہ ہر وقت اس بات سے شاکی رہتی کہ شوہر اس کے مشورے نہیں مانتا جبکہ ورنن کا خیال تھا کہ ہر کام قانون کے دائرے میں ہونا چاہیے۔ جب سے ورنن 'بگ ایم کمپنی' کے چکر میں پھنسا تھا، تب سے لورا اور چڑ گئی تھی۔ وہ شروع سے ہی اس طرح کے چکروں میں الجھنے کی سخت مخالف رہی ہے۔ وہ ورنن سے کہتی تھی کہ ایسے ادارے مافیا کے ہوتے ہیں جن کی دوستی، دشمنی اور ان سے لین دین بھی کسی شریف آدمی کے لیے سود مند نہیں ہوتا ہے مگر وہ بیوی کی سنتا ہی کب تھا؟

اسی دوران میں اچانک لورا شدید بیمار پڑ گئی۔ وہ اسے اسپتال لے گیا جہاں اسے جگر کے ایک بڑے آپریشن سے گزرنا پڑا۔ آپریشن کے بعد وہ ہفتہ بھر آئی سی یو میں داخل رہی۔ اس دوران اس نے نہایت دلجمعی سے بیوی کی دیکھ بھال کی۔ لورا بھی یہ بات جانتی تھی کہ ورنن دل کا برا نہیں، بس سادہ لوح ہے۔ اسی لیے لوگوں کی باتوں میں آ جاتا ہے۔ جب اسے آئی سی یو سے وارڈ میں منتقل کیا گیا تو وہاں اس نے ورنن کا والہانہ انداز دیکھا تو اسے اس بات پر افسوس ہوا کہ وہ اس سے طلاق لینے کے بارے میں کیوں سوچتی تھی۔ لورا کی میڈیکل انشورنس نہیں تھی، اس لیے اسپتال کا بل چکانے کے لیے اس نے اپنا گھر بھی فروخت کر دیا۔ یہ بات بھی لورا کے دل کو لگی۔ گھر بکنے کے بعد سے وہ اسٹور روم میں مقیم تھا، وہ کئی بار شوہر سے کہہ چکی تھی کہ خدا کے لیے یہ کاروبار ختم کرو اور کسی دوسرے علاقے کی جانب چلو۔ وہ شمالی امریکا منتقل ہونا چاہتی تھی لیکن ورنن تیار نہیں تھا۔ لورا پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی تھی اور بدستور اسپتال میں تھی لیکن اس کے باوجود اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ کس طرح ان حالات میں یہ رقم ادا کر سکیں گے۔ ان پریشانیوں کے باعث اسے اچانک ہائی بلڈ پریشر اور دل کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔

اس وقت جب ورنن فرش پر بچھے گدے پر لیٹ کر آنکھیں موندے گزشتہ نو ماہ میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا، لورا اسپتال کے ایک وارڈ میں کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ وہ غنودگی کی گولی کے زیر اثر تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ لورا کی مکمل صحت یابی نیند اور ذہنی سکون سے مشروط ہے۔ ڈاکٹرز کی رائے تھی کہ آپریشن کے بعد بھی تقریباً ایک سال تک لورا کو مکمل آرام، دواؤں اور ہفتے میں دو تین بار طبی معائنے کی ضرورت پڑے گی۔ ورنن لورا سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ اس کے علاج کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا جو اس کے بس میں تھا۔ اس کے آپریشن کو تقریباً چار ماہ ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران میں وہ بدترین معاشی مسائل سے گزرا۔ اس کے پاس اب اس اسٹور کے سوا زندگی بسر کرنے کا کوئی اور سہارا نہیں تھا۔ لے دے کر صرف ایک بچی تھی لیکن وہ بھی دو ہزار میل دور رہتی تھی۔ اس صورت حال میں ایک طرف تنگدستی، دوسری

طرف بیماری اور تیسری طرف ویلیسکو کی بدمعاش کمپنی۔۔۔ ان سب نے ورنن کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ کئی بار وہ اتنا پریشان ہوا کہ خودکشی پر بھی آمادہ ہو گیا مگر یہ سوچ کر اس اقدام سے باز رہا کہ اس کے مرنے کے بعد لورا بے سہارا ہو جائے گی اور وہ بھی بیماری کی حالت میں۔ وہ لورا کو اس کسمپرسی میں چھوڑ کر دنیا سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ جس اسٹور کو وہ چلا رہا تھا، اسے کب کا بیچ چکا ہوتا لیکن ایسا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ اسٹور ہی نہیں، اب اس کا گھر بھی تھا۔ وہ کرایہ دار تھا اور تین ماہ سے اسٹور کا کرایہ بھی نہیں ادا کر سکا تھا۔ وہ جمع پونجی تو لٹا ہی چکا تھا ساتھ ہی وہ بہت سوں کا مقروض بھی تھا۔ اب تو قرض دینے والے دوستوں نے بھی ادائیگی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ وہ سب سے وعدے پر وعدے کیے جا رہا تھا لیکن مسائل تھے کہ ختم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

اس لیے ورنن مسائل کے حل کے لیے نہایت انہماک سے کوششیں کرنے لگا۔ ورنن نے لاکھ کوششیں کیں مگر کوئی تدبیر بارآور ثابت نہ ہوئی بالآخر تنگ آ کر اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ اس نے زمانے بھر کو لوٹنے والی کمپنی کو لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ ورنن جانتا تھا کہ ویلیسکو منگل کے دن وصولیاں کرتا ہے۔ بار، نیوز اسٹینڈ، ریستوران، شاپنگ سینٹرز۔۔۔ اس کے قرض دار ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ ورنن کو یقین تھا کہ شام کو جب وہ اس سے قسط کی وصولی کے لیے پہنچے گا تو اس کے پاس کم سے کم ایک لاکھ ڈالر کی نقدی تو ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس دو لاکھ ڈالر ہوں۔ اب یہ اس کے نصیب پر منحصر تھا کہ ویلیسکو کے پاس کتنی رقم ہوتی ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ویلیسکو کو منگل اور شام کو دوبارہ آنے پر آمادہ کرنے کا تھا۔ وہ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ ورنن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس نے ویلیسکو کے سامنے کیا خوب اداکاری کی تھی۔ اسے شام کا انتظار تھا۔ اسے یقین تھا کہ ویلیسکو سے رقم لوٹنے کے بعد وہ یہ جگہ چھوڑ دے گا اور یوں اس کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

اس نے آہستہ سے کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں، البتہ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا منصوبہ شاندار ہے، بس اس کی ساری الجھنیں سلجھنے ہی والی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں بہت مطمئن تھا۔ اگرچہ اسٹور بند تھا لیکن اسے پتا تھا کہ وہ کھلا بھی رہتا تو دو چار گاہک کے سوا کون یہاں آتا ہے۔ اس لیے اس نے اسٹور میں بیٹھ کر شام ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے آرام کرنے کو ترجیح دی اور وہ اب آرام کر رہا تھا، اس نیم تاریک اور نہایت ہی گھٹیا سے کمرے میں۔ ورنن کو صفائی ستھرائی کی عادت تھی اور وہ بڑی وقت سے یہاں رہنے پر خود آمادہ کر پایا تھا مگر اسے خوشی تھی کہ آج اس کمرے میں اس کو صرف چند گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد تو یہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن جائے گا۔

ورنن کو یقین تھا کہ ساڑھے چھ بجے جب ویلیسکو واپس لوٹے گا، اس وقت تک رات کی سیاہی پھیل چکی ہوگی اور جب اگلے دن کا سورج نکلے گا تو وہ اس سود در سود قسط کی ادائیگی کے چکر سے نجات کے علاوہ جو کچھ گنوا چکا ہے، سب کچھ واپس پا لے گا۔

اس نے ویلیسکو کو لوٹنے کے ساتھ ساتھ قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ورنن رحم دل انسان تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ویلیسکو جیسی بدمعاش کمپنی 'بگ ایم' کے لیے کام کرتا ہے، وہ لوگوں کو لوٹتی ہے اور لٹیروں کو مار دینا انسانیت کی خدمت ہے۔ یہ کام اس وقت اور اہمیت اختیار پا جاتا ہے جب اس نیک کام کا اچھا خاصا معاوضہ بھی خود مقتول کی جیب سے مل جائے۔ ویسے بھی ویلیسکو کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ وہ سر عام لوگوں کو مارنے پیٹنے کے علاوہ کئی قرض داروں کو قتل بھی کر چکا تھا۔ اس لیے ورنن کا خیال تھا کہ بے گناہ انسانوں کے قاتل کو قتل کرنا بذات خود ایک اچھا فعل ہے اس لیے وہ نہایت مطمئن انداز میں اپنے منصوبے پر عملدرآمد کا منتظر تھا۔

"ورنن دروازہ کھولو۔۔۔ میں ہوں ویلیسکو۔" ٹھیک شام کے ساڑھے چھ بجے اسٹور کی گھنٹی بجی۔ ورنن کمرے سے نکلا۔ اس نے گھنٹی اور ویلیسکو کے چلانے کی آواز صاف سن لی تھی۔ "دروازہ کھولو۔ کیا مصیبت ہے۔۔۔" وہ بدستور چلائے جا رہا تھا۔ "تمہیں پتا تھا کہ میں شام کو ٹھیک ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچوں گا پھر بھی دروازہ بند کر کے اندر چوہے کی طرح چھپا بیٹھا ہے۔" جب تک ورنن دروازہ کھولتا، اس وقت تک ویلیسکو بدستور برستا رہا۔

"میں معذرت خواہ ہوں مسٹر ویلیسکو۔" دروازہ کھولتے ہوئے ورنن نے نہایت لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ "اسٹور پر کوئی گاہک تو آتا جاتا نہیں ہے۔ سہ پہر کو نیند آنے لگی تھی۔ میں نے سوچا ذرا سستا لوں لیکن لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔" ورنن نے دروازہ کھولتے ہی اس کے سامنے صفائی پیش کی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" ویلیسکو اکتائے ہوئے لہجے میں فوراً بولا اور اسٹور کے اندر داخل ہو گیا۔ جیسے ہی ویلیسکو اندر داخل ہوا، اس کے پیچھے کھڑے ورنن نے دروازے کا لاک لگا دیا۔ لاک لگنے کی آواز نہایت آہستہ تھی۔ ویلیسکو نے بھی دروازہ بند ہونے کا نوٹس نہیں لیا اور دو قدم آگے بڑھ آیا۔ ورنن اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

http://digestpk.blogspot.com

"[illegible]" بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں... رقم تیار ہے۔" یہ کہتے ہوئے ورنن دل ہی دل میں خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کررہا تھا۔ منصوبہ مکمل ہونے کا وقت قریب آپہنچا تھا۔

"بہت اچھا۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔" ویلیسکو کا لہجہ نرم تھا۔ یہ سن کر وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

"رقم کہاں ہے؟" ویلیسکو کیش کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر رک گیا اور اپنے پیچھے کھڑے ورنن سے سوال کیا۔

"ابھی دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر ورنن آگے بڑھا اور کاؤنٹر کی دراز کھول کر اس میں سے ایک لفافہ نکال کر اسے تھما دیا۔ ویلیسکو نے بے صبری سے لفافہ پکڑا اور اس میں سے نوٹ نکال کر گننے لگا۔

"یہ تو آٹھ سو چالیس ڈالر ہیں۔" رقم گننے کے بعد وہ اسے واپس لفافے میں رکھتے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"ہاں... اگلے منگل کو میری بیوی کا ایک اور آپریشن ہونا ہے۔ اس لیے اس روز اسٹور بند ہوگا۔ اسی وجہ سے میں اگلے ہفتے کی قسط ایڈوانس میں دے رہا ہوں۔" ورنن نے مسرت بھرے لہجے میں کہا تاکہ وہ خوش ہوجائے۔ "ایڈوانس میں قسط دے کر میں نے آپ کا ایک چکر بچالیا ہے۔"

"اوکے... میں سمجھ گیا۔" رقم دیکھ کر ویلیسکو کا لہجہ نرم اور شائستہ ہوگیا۔ یہ اس شخص سے مختلف تھا جس سے ورنن کا صبح پالا پڑا تھا مگر یہ سب کچھ تو ورنن کے منصوبے کا حصہ تھا۔ وہ خوش ہورہا تھا کہ اب تک سب کچھ ویسا ہی ہورہا ہے، جیسا اس نے سوچا تھا۔ "ویسے یہ بڑی غیر معمولی بات ہے لیکن تم فکر نہ کرو کمپنی تمہاری ایڈوانس قسط کی ادائیگی کو منظور کرلے گی۔" اس نے اس لہجے میں ورنن سے یہ بات کہی، جیسے ایڈوانس میں قسط کی ادائیگی ایسا غلط کام ہے جس کو وہ ورنن پر احسان کرتے ہوئے بڑی مشکل سے برداشت کررہا ہے۔

ویلیسکو نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ اس میں سے چھوٹا سا لیپ ٹاپ نکال کر اسے آن کیا۔ ورنن کے کھاتے میں رقم کا اندراج کیا اور نوٹ بیگ میں رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اوہ خدایا آج کا دن کتنا برا ہے۔ باہر سڑک پر ٹریفک اور دھواں، دونوں اتنے زیادہ ہیں کہ سانس لینا دشوار محسوس ہورہا ہے۔" ویلیسکو نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ورنن نے فوراً اس کی تائید کی۔ "کیا خیال ہے تمہیں دودھ والی چاکلیٹ کھلاؤں، تاکہ تمہارا ذہنی تناؤ کچھ کم ہوسکے۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بہت ٹھیک خیال ہے۔" ویلیسکو نے مسکرا کر اجازت دی۔

ورنن جانتا تھا کہ یہ چاکلیٹ کا دیوانہ ہے۔ اس لیے اس نے ایسی بات کہی جسے سن کر ویلیسکو کا چہرہ کھل اٹھا۔ "یہ چاکلیٹ... کمبخت شیطان ہے۔ یہ میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔"

یہ سن کر ورنن خوش ہوگیا۔ اس نے منصوبہ بنایا ہوا تھا کہ اگر وہ بدقسمتی سے دعوت قبول نہیں کرے گا تو یہ متبادل پر عمل کرے گا لیکن ویلیسکو نے اسے زحمت ہی نہ دی۔ فوراً اس کی پیشکش کو قبول کرلیا۔ ورنن آگے بڑھا اور فریج سے چاکلیٹ نکالنے لگا۔ اس نے پہلے ہی اس میں انجکشن کے ذریعے ایک ایسی دوا شامل کردی تھی، جو انسان کے جسم میں داخل ہونے کے چند منٹ کے اندر اندر پورا جسم مفلوج کرڈالتی ہے اور اسی دوران میں موت واقع ہوجاتی تھی۔

"لیجیے۔" اس نے بڑے پیار سے چاکلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"واہ... ایک نہیں دو۔" چاکلیٹ دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر چاکلیٹ جھپٹ لیں۔ اس نے بے صبری سے چاکلیٹ کا ریپر کھولا اور تیزی سے کھانے لگا۔ ابھی اس نے آدھی چاکلیٹ ہی ختم کی تھی کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ اب ورنن کے پاس منصوبے پر عملدرآمد کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویلیسکو کے زمین پر گرتے ہی اس کے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ وہ سرگرم ہوگیا۔ اس نے جلدی سے ویلیسکو کا ہینڈ بیگ کھولا۔ بیگ کے ایک خانے میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے لیپ ٹاپ کھولا اور اس دن کی تاریخ میں درج کی گئی رقم پڑھنے لگا۔ دو لاکھ ڈالر میں صرف بارہ سو ڈالر کم تھے۔ یہ رقم اس سے دُگنی تھی، جتنا کہ ورنن نے سوچا تھا۔ وہ خوش ہورہا تھا کہ منصوبے کے عین مطابق عمل ہورہا ہے۔

ورنن نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ویلیسکو کی نبض ٹٹولی، دل کی دھڑکن دیکھی، اس کی آنکھوں میں جھانکا..... وہ مرچکا تھا۔ تسلی کرنے کے بعد اس نے لمبی سانس لی۔ اب اسے اطمینان ہوچکا تھا کہ اس نے جو کچھ سوچا، وہ پایۂ تکمیل ہوگیا۔ وہ کھڑا ہوا اور لاش کو گھسیٹتا ہوا اسٹور روم میں لے گیا، جہاں پر وہ باکس پڑا ہوا تھا۔ اس نے کھینچا تانی کرکے آخر اسے گدے پر لٹا دیا۔ سب سے پہلے اس نے ویلیسکو کی انگلی سے ہیرا جڑی انگوٹھی اتاری اور اپنے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی اسے پہنا دی جس پر اس کا نام کندہ تھا۔ اس کے بعد اس نے اس کا سوٹ اتارا اور اپنا لباس اسے پہنا دیا۔

ان تمام کاموں سے فارغ ہوا تو وہ تھک چکا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ لورا کے علاج کے لیے اسے دو لاکھ ڈالر کی ضرورت تھی۔ اس اسٹور کی بیمہ پالیسی

"لیجیے..... میرے شوہر نوٹوں کی ٹرالی بھر کرلے آئے..... بس ان کی ایسی ہی چھوٹی چھوٹی معصومانہ حرکتوں کی وجہ سے میں ان سے محبت کرتی ہوں....."

دو لاکھ ڈالر کی تھی۔ خود اس کی زندگی کی بیمہ پالیسی ایک لاکھ ڈالر کی تھی۔ اس طرح اسٹور اور اس کی بیمہ پالیسی کے عوض لورا کو تین لاکھ ڈالر مل جاتے۔ جس سے اس کا علاج ممکن ہوجاتا۔ ویلیسکو سے حاصل ہونے والے دو لاکھ ڈالر کی نقدی، انگوٹھی بھی ایک لاکھ ڈالر کے قریب مالیت کی تھی۔ سونے کی گھڑی بھی کم از کم... بیس ہزار ڈالر کی تھی... یوں منصوبہ کامیاب ہونے کے بعد نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اس کے پاس تین لاکھ ڈالر سے زیادہ کی رقم تھی۔

ورنن کا منصوبہ تھا کہ وہ کیلیفورنیا جا کر اپنی نئی زندگی شروع کرے گا۔ اس نے اپنے ایک مرحوم دوست کا پیدائشی سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا تھا۔ جس کی بنیاد پر وہ ڈرائیونگ لائسنس اور دیگر ضروری کاغذات تیار کروا کر نئے نام سے نئے شہر میں نئی زندگی شروع کرسکتا تھا۔ لورا اسپتال میں داخل تھی۔ اسے بیمہ کے تین لاکھ ڈالر مل جاتے، جس سے وہ اپنے علاج کے اخراجات پورا کرنے کے علاوہ صحت یابی کے بعد اپنی بیٹی کے پاس بھی جاسکتی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ دو سال تک وہ روپوش رہے گا۔ اس کے بعد اپنی بیٹی کے پاس جا کر بیوی سے مل لے گا اور پھر اسے اپنے ساتھ لے آئے گا۔ یوں وہ ایک بار پھر ہنسی خوشی رہنے لگیں گے۔

اس کا منصوبہ تقریباً کامیابی سے ہمکنار ہوچکا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ اپنے لباس پر غور کرنے لگا۔ کچھ دیر پہلے یہ لباس ویلیسکو کے جسم پر تھا مگر اب وہ اسے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ویلیسکو کا ہیٹ بھی اٹھا لیا تھا۔ ورنن سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس جو سب سے قیمتی سوٹ ہے، اس کی قیمت بھی اس ہیٹ سے آدھی ہوگی۔ "یہ مافیا بھی کیا چیز ہے، بدمعاش لوگ۔" وہ بڑبڑایا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور بستر کے اطراف میں پیٹرول پھیلانے لگا۔ اس نے آدھا گیلن پیٹرول فرش پر پھیلا دیا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ جب آتشزدگی کے بعد فائر بریگیڈ کو سوختہ لاش ملے گی تو یہی خیال کیا جائے گا کہ بدنصیب ورنن [illegible]

http://digestpk.blogspot.com/

سو گیا تھا اور یوں سگریٹ کے باعث کمرے میں آگ بھڑک اٹھی۔ لاش کے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہوگی کہ مرنے والا ورنن ہی تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ کوٹ کی جیب تھپتھپا کر اس بات کی تصدیق کی کہ جیب میں ولیسکو کی گاڑی کی چابی تو موجود ہے۔ فرش پر پیٹرول پھیلاتے ہوئے وہ مسکرا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ولیسکو کی موت سے اسے ایک ساتھ کئی فائدے حاصل ہو گئے تھے۔ وہ کمرے کے فرش پر اچھی طرح پیٹرول چھڑک کر اسے ہلکی ہلکی لکیر کی شکل میں گراتا ہوا اسٹور کے مرکزی دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے ماچس نکالی اور تیلی جلا کر اندر پھینک دی۔ پیٹرول نے فوراً آگ پکڑ لی اور لکیر کی شکل میں آگے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس نے فوراً دروازہ بند کیا۔ دروازے کے باہر رکھے ہوئے ولیسکو کے بیگ اور پیٹرول کے خالی گیلن کو اٹھایا اور کار پارکنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ اُدھر اندر آگ تیزی سے بھڑکتی ہوئی اسٹور روم کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

ورنن ولیسکو کی گاڑی کو پہچانتا تھا۔ وہ سیدھا اس کی کار کی طرف بڑھا۔ اس وقت پارکنگ ایریا خالی پڑا ہوا تھا، وہاں کوئی شخص موجود نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے احتیاط کے طور پر ہیٹ کو آگے کی طرف جھکا لیا تاکہ اگر اس کو کوئی دیکھ بھی لے تو پہچان نہ سکے۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور اگلی سیٹ پر گیلن اور بیگ رکھا۔ یہ نئے ماڈل کی کیڈلک کار تھی۔ اس نے اس سے پہلے اس کار کو نہیں چلایا تھا۔ وہ چند لمحے تک آلات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے مرکزی سڑک پر آ گیا۔ وہ ائرپورٹ جا رہا تھا۔ کافی دور آنے کے بعد اس نے ایک کچرادان کے پاس گاڑی روکی۔ گیلن اور ولیسکو کے خالی ہینڈ بیگ کو اس میں پھینکا اور ایک بار پھر ائرپورٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

لاس اینجلس ائرپورٹ امریکا کے معروف ترین ائرپورٹس میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابھی وہ ائرپورٹ سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اسے فضا میں کئی جہاز نظر آئے جو اتر رہے تھے۔

”گڈ بائے ولیسکو۔“ ورنن نے کار کی کھڑکی سے منہ باہر نکالا اور نہایت جوشیلے انداز میں کہا۔ اس وقت سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم تھا اور ٹریفک کے شور میں اس کی آواز دب گئی لیکن اس کا جوش کم نہیں ہوا۔ ”میں کامیاب ہو گیا۔“ وہ گاڑی چلاتے چلاتے تیز آواز میں کہے جا رہا تھا۔ اسے سب لوگ احمق کہتے تھے حتیٰ کہ اس کی بیوی بھی احمق کہتی تھی۔ اسے رہ رہ کر یہ بات یاد آ رہی تھی لیکن وہ دل ہی دل میں افسردہ تھا کہ وہ اپنی کامیابی کو کسی کے ساتھ شریک نہیں کر سکتا۔

وہ اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا۔ اس نے کل ہی اپنی نئی زندگی کے لیے منتخب کردہ نئے نام سے کیلیفورنیا کے لیے سیٹ بک کروائی تھی۔ بس اب اگلا موڑ مڑنے کے بعد وہ ائرپورٹ کی حدود میں داخل ہو جاتا اور ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد اس کی فلائٹ فضا میں ہوتی۔ وہ مرکزی سڑک سے دائیں طرف مڑا تو اچانک ایک گاڑی نے اس کو اوور ٹیک کیا۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو اس حادثے سے بچا سکا۔ وہ گاڑی اس کے تھوڑے فاصلے پر جا کر رک گئی۔ ورنن نے گھبرا کر جلدی سے بریک لگایا لیکن گاڑی رکتے رکتے اگلی کار کے بمپر سے ٹکرا گئی۔ اسی دوران میں اس کے برابر ایک اور سیاہ کار آ کر رک گئی۔ ورنن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا... برابر والی سیاہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا شیشہ نیچے ہوا اور اس میں سے رائفل کی نال باہر نکلی۔ یہ جگہ خاصی اندھیرے میں تھی لیکن خوفزدہ ورنن نے رائفل کی نال دیکھ لی تھی۔

”تم کیا سمجھتے تھے کہ کمپنی کا مال ہڑپ کر لو گے۔ بڑے بدھو ہو تم۔“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے بلند آواز میں کہا۔ اس سے پہلے کہ ورنن کچھ کہتا، سائلنسر لگی نال میں سے شعلہ نکلا اور گولی ورنن کے سر میں پیوست ہو گئی۔

زندگی کے اس آخری لمحے میں وہ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس کا سر اسٹیئرنگ وہیل پر ڈھلک گیا اور ذہن تاریکی میں کھو گیا۔

برابر والی گاڑی کی پچھلی سائڈ کا دروازہ کھلا۔ اس میں سے سیاہ جینز میں ملبوس ایک نوجوان باہر نکلا۔ وہ ورنن والی گاڑی میں داخل ہوا۔ اس نے خون آلود کوٹ اتارا۔ اس کی پھولی ہوئی جیبوں میں وہ رقم تھی جو ولیسکو نے آج وصول کی تھی۔ اس نے رقم کے بنڈل نکال لیے۔ ورنن کی کلائی پر سے گھڑی اور انگلی میں سے ہیرے کی انگوٹھی اتاری اور اس کی لاش کو اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سڑک پر دھکیل دیا۔

”بیوقوف... زندگی بھر احمق ہی رہا۔“ نوجوان گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”اتنا اچھا منصوبہ بنانے کے باوجود یہ نہیں سمجھ سکا کہ کمپنی وصولی کرنے والے پر بھی خفیہ طور پر نظر رکھتی ہے کہ کہیں وہ چکمہ نہ دے جائے۔ آخر کو ہم سب بدمعاش ہیں کوئی احمق تو نہیں۔“

تینوں گاڑیاں آگے بڑھیں اور ریورس کر کے مین روڈ پر آ گئیں۔ عقلمندی کے زعم میں کھیلی گئی کامیاب بازی میں بیوقوف ورنن جان کی بازی ہار چکا تھا۔

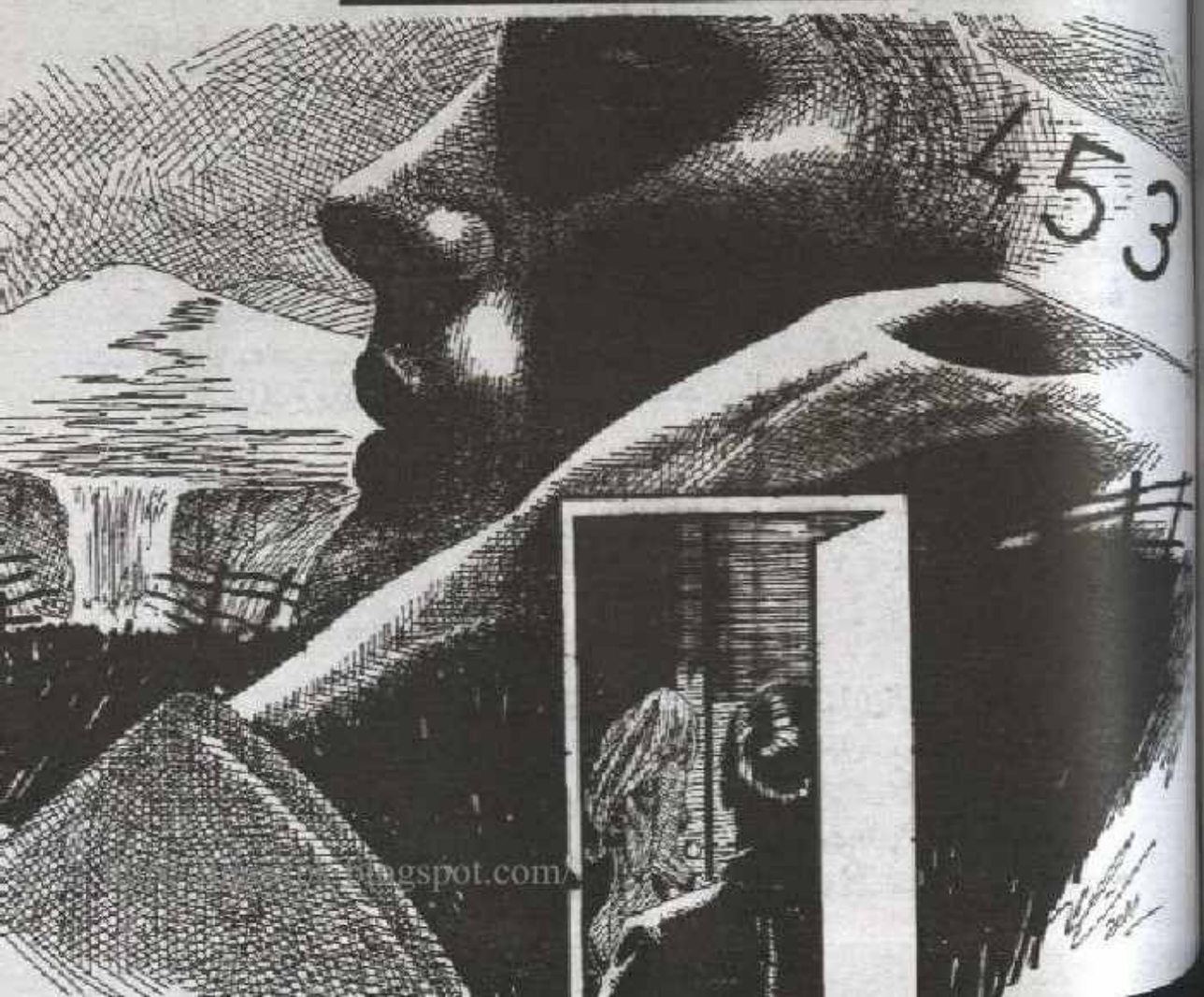

جیک کی سولہ سالہ بچی نے وین میں سوار ہونے سے پہلے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا تو جیک کے چہرے پر پیار بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کیٹ اور اس کی چھوٹی بہن میسی اسکول کی طرف سے فش اش آبشار کی سیر کے لیے جا رہی تھیں۔ کیٹ نے بھی اپنی ماں کی طرح قد کاٹھ نکالا تھا۔ گو کہ ابھی تک اس کے چہرے پر بچپنا تھا لیکن ذہانت اور حاضر جوابی میں وہ کسی سے کم نہیں تھی اور جیک کا خیال تھا کہ اس لڑکی کو خوب صورتی ماں سے اور عقل باپ سے ورثے میں ملی ہے۔ اس کی بیوی لوئی برابر میں کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کیٹ سے کہا۔ ”میسی کا خیال رکھنا۔“

وین روانہ ہو گئی تو جیک نے پیار بھری نظر اپنی بیوی پر ڈالی اور بولا۔ ”تم میرے ساتھ چل رہی ہو نا؟“

دیرآید

بابر نعیم

برسوں کا ساتھ دو افراد کے درمیان اعتماد و محبت کے رشتے کو مضبوط بنانے کے لیے کافی ہوتا ہے... لیکن کبھی کبھی یہی اعتماد اتنی آہستگی سے اور اچانک ٹوٹتا ہے کہ اس کی زد میں ہر شے بہتی چلی جاتی ہے۔

ایک اقدام کے نتیجے میں رونما ہونے والی صورتِ حال کا سنگین ماجرا

لوسی کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔ وہ مڑی اور گھر کی جانب جاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ آج مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ لان کی صفائی بھی کرنی ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ چلی گئی تو یہ سارے کام رہ جائیں گے۔“

جیک اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ ”کم آن لوسی! کام تو ہوتے رہیں گے لیکن یہ ٹور تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا۔“

وہ مڑی اور تیز آواز میں بولی۔ ”نہیں..... میں نہیں جاسکتی۔ ویسے بھی مجھے سارا دن جنگل میں مارے مارے پھرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

اس کا لہجہ دیکھ کر جیک پیچھے ہٹ گیا اور ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے، اگر تمہیں میرا ساتھ اتنا ہی ناگوار گزرتا ہے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔“

وہ جیک کو اداس دیکھنا نہیں چاہتی تھی اس لیے نرمی سے بولی۔ ”مجھے افسوس ہے جیک! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل میں بہت تھک گئی ہوں اور گھر پر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

جیک کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ خوش دلی سے بولا۔ ”اوکے ہنی! میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ واپسی پر تمہارے لیے پیزا لیتا آؤں گا۔ بچیاں بھی شوق سے کھاتی ہیں۔“

”اس سے زیادہ وہ انہیں وہ چیز پسند آئے گی جو میں نے بنائی ہے۔“

”ذرا میں بھی تو سنوں تم نے ایسی کیا خاص چیز بنائی ہے؟“ وہ اشتیاق سے بولا۔

”فی الحال یہ ایک سرپرائز ہے۔ جب واپس آؤ گے تو خود ہی دیکھ لینا۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو جیک نے غور سے لوسی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“

وہ تیزی سے گھومی اور چونکتے ہوئے بولی۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”کچھ نہیں، میں نے تم سے صرف ایک بات پوچھی ہے۔ میں صبح سے ہی تمہاری یہ کیفیت دیکھ رہا ہوں۔“

”تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ سرد لہجے میں بولی۔

کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی لیکن جیک اس کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ ہونے کا انتظار کر رہی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

”ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کر لوسی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا جس کا اس نے بے دلی سے جواب دیا پھر ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

”امید ہے کہ تمہارا وقت اچھا گزرے گا۔ اینڈی اور میگی کو میری طرف سے پوچھ لینا۔“

☆☆☆

گاڑی چلاتے ہوئے بھی جیک اسی بارے میں سوچتا رہا۔ ان کی شادی کو اکیس سال ہو چکے تھے اور اس دوران ان کے بیچ کئی بار جھگڑا بھی ہوا جو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس طرح کے جھگڑے تو ہر گھر میں ہوتے رہتے ہیں لیکن اس نے لوسی کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ صبح سے ہی کترائی کترائی پھر رہی تھی بلکہ وہ گزشتہ شب سے ہی کسی خیال میں گم تھی۔ اسے یاد آیا کہ رات کو باتیں کرتے ہوئے اسے اور بچیوں کو لوسی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کئی بار اپنے جملے دہرانا پڑ رہے تھے۔

اس نے پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا۔ وہاں تقریباً ایک درجن گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں اور لوگ ان کے گرد کھڑے کافی سے شغل کر رہے تھے۔ جیک نے گاڑی پارک کی، اپنا بیگ کندھے پر لٹکایا اور اینڈی کی طرف بڑھا جو اس کا سب سے عزیز دوست تھا۔ اسے دیکھتے ہی اینڈی، اس کی بیوی اور کچھ دوسرے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اینڈی نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ”اتنی دیر لگا دی؟ سب لوگ تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“

”ہاں، بچیوں کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ میں چاہ رہا تھا کہ ان کے جانے کے بعد گھر سے نکلوں۔“

”لوسی کیوں نہیں آئی؟“ میگی نے پوچھا۔

”اسے گھر کے کئی کام نمٹانے تھے اس لیے نہیں آسکی۔ تم جانتی ہو کہ اس نے ہفتے کا دن انہی کاموں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔“

ان میں سے ایک آدمی آگے بڑھا جو عمر میں ان سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ ”دوستو! اب ہمیں چلنا چاہیے کیونکہ ہمیں جنگل میں کافی دور تک جانا ہوگا اور اگر دیر ہو گئی تو پانچ بجے واپسی مشکل ہو جائے گی۔“

ایک گھنٹے بعد وہ جنگل سے نکل کر ایک کشادہ چراگاہ

میں داخل ہو چکے تھے جہاں کی زمین گیلی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد سب لوگ ٹولیوں میں بٹ گئے۔ جیک اپنے دوست اینڈی اور میگی کے ساتھ چلنے لگا لیکن چند قدم چلنے کے بعد ہی رک گیا۔ جیک نے غور سے اینڈی کی طرف دیکھا۔ اسے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“

”ہنی! کیا ہوا؟“ میگی بھی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

اینڈی ایک ہاتھ سے اپنا ماتھا پکڑتے ہوئے بولا۔ ”مجھے چکر آ رہے ہیں۔ لگتا ہے گر پڑوں گا۔“

جیک نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا اور آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ ساتھ ہی وہ مدد کے لیے بھی چلا رہا تھا۔ ان کے گروپ میں ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے فوراً اینڈی کا معائنہ کیا۔ اینڈی کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اس طرح زمین پر چت لیٹا ہوا تھا جیسے مر گیا ہو۔ گروپ لیڈر نے فوری طور پر سیل فون کے ذریعے نائن ون ون سے رابطہ کیا اور جیک نے اس ذیلی سڑک کی جانب دوڑنا شروع کر دیا جو وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر تھی تاکہ ایمبولینس آنے کی صورت میں اس کی رہنمائی کی جا سکے۔ تھوڑی دیر بعد طبی عملہ وہاں پہنچ گیا اور وہ لوگ اینڈی کو اسپتال لے کر چلے گئے۔ ڈاکٹر اور میگی بھی ان کے ہمراہ گئی تھی جبکہ باقی لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ جیک سب سے پہلے اسپتال پہنچا اور سیدھا ایمرجنسی روم کی طرف بھاگا جہاں گروپ کا ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ جیک کو دیکھ کر اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور بولا۔ ”دورہ بہت شدید تھا۔ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسی وقت مر چکا تھا جب میں نے اس کا معائنہ کیا تھا۔“

جیک نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور بولا۔ ”میگی کہاں ہے؟“

”ہم نے اسے سکون بخش دوا دے دی ہے اور وہ اس وقت سو رہی ہے۔“

جیک تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا قریبی بینچ پر بیٹھ گیا۔ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع ہوا تھا کہ اس کا ذہن اس سنگین حادثے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ گروپ کے دوسرے لوگ بھی اسپتال پہنچ چکے تھے اور ان میں سے کچھ اینڈی کی موت کی خبر سن کر زار و قطار رو رہے تھے لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں اور وہ سکتے کے عالم میں سامنے والی دیوار پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب اس نے ایک بار پھر میگی سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ جیک نے اس کے پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کو بتا دیا کہ وہ اس کے گھر پہنچنے کے بعد ملنے کے لیے آئے گا۔ وہ لوسی کو بھی یہ خبر فون پر نہیں سنانا چاہتا تھا کیونکہ وہ بھی اینڈی کو بہت پسند کرتی تھی اور ٹیلی فون پر اس حادثے کے بارے میں سن کر حواس باختہ ہو جاتی۔ اس لیے جیک نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ گھر پہنچ کر سکون کے ساتھ لوسی کو اس بارے میں بتائے گا۔

اسپتال سے گھر آتے ہوئے اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اسے ابھی تک اینڈی کی موت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ سڑک پر معمول سے زیادہ ٹریفک تھا اور اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ پھر کار ریڈیو پر ایک خبر سن کر وہ چونک گیا۔ چند میل کے فاصلے پر واقع ایک پل پر حادثہ پیش آ گیا تھا جس کی وجہ سے آگے راستہ بند تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک یوٹرن آیا جہاں سے اس نے گاڑی واپس موڑی اور سوچنے لگا کہ گھر پہنچنے کے لیے کون سا متبادل راستہ اختیار کیا جائے۔ اس نے ایک ایسے راستے کو ترجیح دی جس پر ٹریفک کم ہوتا تھا۔ گو کہ یہ کچھ طویل تھا لیکن ٹریفک میں پھنسنے کی صورت میں اس کا جو وقت ضائع ہوتا، اس کے مقابلے میں یہ چند منٹ اسے قبول تھے۔ ڈیکی روڈ پر بھی اچھا خاصا ٹریفک تھا، شاید اس لیے کہ یہ سڑک سیدھی گریٹ ہڈسن مال کی طرف جاتی تھی۔ گاڑی سگنل پر رکی تو اس کی نگاہ ایک جیپ پر گئی۔ اس کا ماڈل اور رنگ وہی تھا جیسی جیپ لوسی کے پاس تھی۔ اسے ہائی وے پر مڑنا تھا جبکہ اس جیپ کو مال کی جانب مڑنا تھا اور اس کا ڈرائیور سگنل کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

جیک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اس عورت کی شکل نہ دیکھ سکا۔ وہ یقیناً لوسی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ یہ شاپنگ مال ان کے گھر سے کافی فاصلے پر تھا اور انہوں نے کبھی یہاں سے شاپنگ نہیں کی تھی..... اور ویسے بھی لوسی کو گھر میں بہت سے کام تھے اس لیے اس کے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے برابر والی سیٹ پر رکھے بیگ سے اپنی طاقتور دوربین نکال کر آنکھوں سے لگائی تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ بلاشبہ لوسی ہی تھی۔ ”اوہ، میرے خدا! یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سوچتا، لوسی کی جانب کا سگنل کھل گیا اور اس نے اپنی گاڑی مال کی جانب [illegible] میں یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ جیسے ہی اس کی طرف کا سگنل کھلا، اس

http://digestpk.blogspot.com/

نے اپنی کار تیزی سے آگے بڑھائی اور لوسی کی جیپ کا تعاقب کرنے لگا۔ جب اس کی کار مال میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ زیادہ تر گاڑیوں کا رخ وال مارٹ سپر اسٹور کی جانب ہے۔ اس نے گردن اچکا کر لوسی کی جیپ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر تھی اور وال مارٹ سے آگے نکل چکی تھی۔ اس نے اپنی کار کی رفتار اور بڑھا دی۔ اب اس کے اور لوسی کی جیپ کے درمیان صرف دو کاریں تھیں۔ جیک سمجھ گیا کہ وہ سام کلب کی جانب جا رہی ہے۔ وہ حیران تھا کہ لوسی کو یہاں آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی جو اس کے گھر سے کم و بیش بیس میل کے فاصلے پر تھا اور لوسی نے محض اس لیے اس کے ساتھ شکار پر جانے سے انکار کر دیا تھا کہ اسے گھر پر کئی کام کرنا تھے۔

سام کلب جانے کے لیے دائیں جانب مڑنا تھا لیکن لوسی نے اپنی جیپ بائیں جانب موڑ لی اور اب اس کا رخ ریورویو موٹیل کی عقبی پارکنگ لاٹ کی جانب تھا۔ جیک بھی اس کا پیچھا کرتا رہا۔ پارکنگ لاٹ میں نصف درجن گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ لوسی نے جیپ کی رفتار کم کی اور ایک گہرے سبز رنگ کی جیگوار کے ساتھ کھڑی کر دی۔ جیک کے ذہن میں اس کے مالک کی شکل گھوم گئی لیکن اس کی یہاں موجودگی خارج از امکان تھی۔ ”کوئی اور ہوگا۔“ اس نے سوچا، اس شہر میں گہرے سبز رنگ کی صرف ایک ہی جیگوار تو نہیں۔ جیک نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دوپہر کا وقت تھا اور موٹیل میں لوگوں کی آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ جیک کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور اب اس میں بے چینی بھی شامل ہو گئی تھی۔ یہ لوسی نہیں ہو سکتی جو اس کی محبت تھی ـــــ جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

لوسی اپنی گاڑی سے باہر آئی۔ شانوں پر بیگ لٹکایا۔ ریبن گلاسز میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہی تھی۔ اس نے بلیک جینز اور بہت خوب صورت بلیو رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں جلدی جلدی قدم آگے بڑھانا شروع کر دیے اور موٹیل میں چلی گئی۔ کمرا نمبر 453 پر پہنچ کر وہ رکی اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ جیک نے اتنے زور سے دوربین کو دبوچا کہ اس کی انگلیاں سفید پڑ گئیں۔ ایک لمبے قد کے آدمی نے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے لوسی کے لیے راستہ چھوڑ دیا اور جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی، دروازہ بھی بند ہو گیا۔

جیک نے دوربین ـــــ رکھ دی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی ہو۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے زور زور سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ وہ گاڑی سے باہر آ گیا۔ اس کی سانس اور تیز ہو گئی۔ اس سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ کیا اسے دل کا دورہ پڑا ہے؟ کیا وہ مرنے والا ہے؟ اس کمرے سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر جہاں اس کی بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ......

اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ جب اس کی سانس اعتدال پر آئی تو وہ دبے قدموں کمرا نمبر 453 کی طرف بڑھ گیا۔ کوریڈور میں سناٹا تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ چند لمحوں بعد لوسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ نوجوان لڑکی کی طرح قہقہے لگا رہی تھی۔ جیک کی نظروں کے سامنے کمرے کے اندر کا منظر گھومنے لگا۔ اس کے بدن میں چنگاریاں سلگنے لگیں۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کا دل چاہا کہ دروازہ توڑ کر اندر چلا جائے اور لوسی کو اس کی آوارگی کا مزہ چکھا دے لیکن پھر اسے اپنے بچوں کا خیال آ گیا۔ وہ بہت پیاری اور معصوم بچیاں تھیں۔ وہ کوئی پُرتشدد کارروائی کر کے اپنے خاندان کو تماشا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ بچیاں ماں اور باپ دونوں کی شفقت سے محروم ہو جاتیں۔ اسی لیے اس نے دروازے پر دستک دینے اور انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ لوسی کو اس حالت میں دیکھ کر وہ اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکے گا۔ اسے کوئی ایسی ترکیب کرنا ہوگی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ فی الحال اسے اپنی بچیوں کی خاطر خاموشی اختیار کرنا تھی۔

جیک اس کمرے سے آنے والی آوازوں سے بہت دور چلا گیا۔ جیگوار کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اپنی چابی سے اس کی باڈی پر کچھ نشانات ڈال دے لیکن اس کے بجائے وہ لوسی کی جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے پاس اس گاڑی کی اضافی چابی تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چند منٹ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کمرا نمبر 453 کی طرف دیکھتا رہا لیکن اس کا دروازہ بدستور بند تھا۔ اس نے پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالی اور آہستہ آہستہ چلاتا ہوا بیرونی سڑک پر آ گیا۔ اب اس کا رخ وال مارٹ سپر اسٹور کی پارکنگ کی طرف تھا۔ اس نے لوسی کی گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی جس کے اطراف میں کاروں کا ہجوم تھا اور کسی کو بھی لوسی کی گاڑی بہ آسانی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اس کام سے فارغ

ہو کر وہ پیدل چلتا ہوا اپنی کار تک پہنچ گیا۔ ایک بار پھر اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ کمرا نمبر 453 کے دروازے پر جا کر کچھ سننے کی کوشش کرے لیکن وہ اپنے آپ کو مزید اذیت نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے دل پر پتھر رکھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

عام طور پر دن کے وقت وہ اور لوسی اپنی گاڑیاں پورچ میں ہی کھڑی کرتے تھے لیکن اس دن جیک نے اپنی کار گیراج میں بند کر دی۔ وہ بجھے دل اور مردہ قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوا اور اپنا بیگ اسٹڈی میں رکھ دیا۔ یہ بہت بڑا کمرا تھا جس میں چاروں طرف بک شیلف بنے ہوئے تھے جن میں انگریزی، عربی، فرانسیسی اور جرمن زبان میں سیکڑوں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور ٹیکنالوجی کے موضوعات پر تھیں جبکہ چند ایک کا تعلق فکشن سے بھی تھا۔ ان میں دس کتابیں اس کی اپنی تحریر کردہ تھیں۔ اس کی میز پر ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔ ملازمہ کو بھی اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جیک خود ہی کتابوں اور فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کر لیتا تھا۔ ایک خالی دیوار پر خاندانی تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک تصویر میں جیک باکسنگ کے دستانے پہنے کھڑا تھا۔ وہ کسی زمانے میں باکسنگ کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور اب بھی اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے باقاعدگی سے ورزش اور باکسنگ کی مشق کیا کرتا تھا۔ جیک چلتا ہوا لوسی کی تصویر کے پاس گیا۔ یہ کیٹ کی پیدائش سے پہلے کھینچی گئی تھی۔ جیک کو یہ تصویر بہت پسند تھی لیکن اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دے لیکن اس نے بڑی مشکل سے اپنی خواہش پر قابو پایا۔

وہ واپس اپنی میز کی طرف آیا اور اینڈی کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف میگی کی کوئی دوست بول رہی تھی۔ اس نے میگی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے بتایا کہ وہ ڈنر کے بعد یہاں آ سکتا ہے۔ اس نے لیونگ روم میں جا کر اپنے لیے ایک پیگ بنایا اور دوبارہ اسٹڈی میں آ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا تاکہ باہر کا منظر دیکھ سکے۔ وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھا لوسی کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ صبح سے اب تک جو کچھ اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا، وہ سب باتیں ایک ایک کر کے اس کے دماغ میں آ رہی تھیں۔ لوسی کی بے چینی اور گھبراہٹ کا سبب بھی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ جس طرح وہ کمرا نمبر 453 پر پہنچ کر جھجکی تھی، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے یہ حرکت پہلی بار سرزد ہوئی ہے...... یا یہ سلسلہ پہلے سے چل رہا تھا؟ وہ اپنی گزشتہ ازدواجی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے اس پورے عرصے میں ایسی کوئی محرومی نظر نہیں آئی جو لوسی کی بے راہ روی کا سبب بن سکتی۔ وہ اچھی خاصی خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ لوسی کو سیر و تفریح کرنے کا شوق تھا اور وہ کئی بار اس کے ساتھ بیرون ملک جا چکی تھی۔ وہ بچے سے اچھا لباس پہنتی اور سماجی تقریبات میں اپنی خوب صورتی اور اسٹائل کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ ان کی زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی جو کئی لوگوں کے لیے باعث رشک تھی۔

جیک نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ لوسی یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہے جبکہ گزشتہ اکیس سالوں میں خود اس کی جانب سے محبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی حالانکہ اسے دوسری عورتوں سے تعلقات استوار کرنے کے بے شمار مواقع ملے۔ وہ ایک معروف شخصیت تھا اور سماجی حلقوں میں اس کی خاص پہچان تھی۔ کئی خوب صورت اور اسمارٹ عورتیں اس کی جانب بڑھیں لیکن لوسی کی محبت کا اثر اتنا گہرا تھا کہ اس نے کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ غیر عورتوں کے ساتھ راتیں گزارنے کا عادی نہیں تھا اور اس نے فرصت کا ہر لمحہ لوسی اور بچوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ پھر غلطی کہاں ہوئی؟ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے لوسی کو اس سے بے وفائی کرنے کے لیے مجبور کیا؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے جس شخص کا انتخاب کیا، وہ انتہائی ناقابل اعتبار اور دھوکے باز تھا۔ جس نے کبھی مستقل مزاجی سے کوئی کام نہیں کیا تھا اور جو لوگوں کو اپنی امارت اور شان و شوکت کی فرضی داستانیں سنا سنا کر متاثر کیا کرتا تھا اور اس میں ایک کلرک کی جاب کرنے کی بھی اہلیت نہ تھی۔ مزید یہ کہ اس کی خوب صورت اور بلند ذوق کی حامل بیوی اس کے جال میں کیسے پھنس گئی تھی؟

ساڑھے چار بجے کے قریب گہرے سبز رنگ کی جیگوار اس کے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ جیک نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اب اسے سب کچھ صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔ مرد نے لوسی کو اپنی طرف کھینچا اور دونوں آپس میں بغل گیر ہو گئے پھر لوسی نے خود کو آہستہ سے علیحدہ کیا اور کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی لیکن اب بھی وہ دروازے میں جھکی ہوئی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ یقیناً دوسری ملاقات کا پروگرام بن رہا ہوگا۔ جیک تیزی سے اٹھا اور تیز تیز چلتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ [illegible]

http://digestpk.blogspot.com

قریب گیا اور بولا۔ "لوسی!"
وہ اس طرح اچھل جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے توقع نہیں تھی کہ جیک اس وقت گھر پر ہوگا۔ وہ گھگیاتے ہوئے بولی۔ "تم اتنی جلدی کیسے آگئے؟"
اس نے لوسی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری گاڑی کہاں ہے؟"
"چوری ہوگئی۔"
اسی اثنا میں وہ شخص بھی اپنی جیگوار سے باہر آگیا۔ اس کے چہرے سے ہی مکاری ٹپک رہی تھی۔ اس نے جیک کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہائے جیک!"
جیک نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا اور لوسی سے بولا۔ "گاڑی کہاں سے چوری ہوئی؟"
"فیئرویو...... مجھے وہاں سے کچھ خریداری کرنا تھی۔"
"تم تو کہہ رہی تھیں کہ گھر پر بہت کام کرنے ہیں اس لیے باہر جانا ممکن نہیں۔"
"مجھے کچھ چیزوں کی ضرورت تھی اس لیے فیئرویو جانا پڑ گیا۔ میں گاڑی پارکنگ میں کھڑی کرکے شاپنگ کے لیے چلی گئی لیکن جب واپس آئی تو گاڑی غائب تھی۔"
"تم نے اس کی رپورٹ درج کروائی؟"
اس دوران میں وہ کسی حد تک سنبھل چکی تھی اور اس نے اپنے کشیدہ اعصاب پر قابو پالیا تھا۔ "ہاں، میں نے رپورٹ تو لکھوا دی...... لیکن تم اتنی جلدی کیسے گھر آگئے؟"
"اندر آؤ...... بتاتا ہوں۔"
"کیا بچوں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوگیا؟"
"نہیں، تم اندر آؤ۔" وہ رکھائی سے بولا۔
"اچھا، چلتی ہوں لیکن تم کم از کم اسٹیو کا شکریہ تو ادا کر دو۔ جس وقت میں کار تلاش کر رہی تھی تو یہ اتفاق سے وہاں آگیا پھر میں اس کے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن گئی۔ اس دوران میں یہ میرا انتظار کرتا رہا اور اب گھر چھوڑنے بھی آیا ہے، ورنہ میں ابھی تک وہیں کھڑی ٹیکسی کا انتظار کر رہی ہوتی۔"
جیک نے بے دلی سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "شکریہ اسٹیو۔"
اس کے جانے کے بعد وہ دونوں اندر آگئے۔ لوسی اس کے سامنے آتے ہوئے بولی۔ "تم اتنے بداخلاق کب سے ہوگئے؟"
"کیا مطلب؟"
"تم نے اسٹیو کے ساتھ ناقابل بیان حد تک بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ہے۔"
"وہ اس سے بھی زیادہ برے سلوک کا مستحق تھا۔" جیک نے جل کر کہا۔ اسے لوسی پر غصہ آرہا تھا۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔
"تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ میں نے پہلے کبھی تمہیں ایسا کرتے نہیں دیکھا۔" لوسی بھڑک اٹھی۔ "تم نے بتایا نہیں کہ اتنی جلدی کیوں آگئے...... جبکہ تمہاری واپسی چھ بجے تک ہونی تھی؟"
"اینڈی مر گیا ہے۔" جیک کو اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔
"کیا؟" وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "کیا کہا تم نے؟ اینڈی مر گیا ہے؟ او میرے خدا! کیسے؟"
"وہاں پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد ہی اسے دل کا دورہ پڑا۔ وہ میرے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی اسے سہارا دیا اور زمین پر لٹا دیا۔ غالباً اس سے پہلے ہی اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر بیری بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے اپنے طور پر بہت کوشش کی لیکن اینڈی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔"
"اوہ جیک! اس کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ بے چاری میگی...... اس کے پاس کوئی ہے؟"
"ہاں، لوئس اور کچھ دوسرے دوست وہاں موجود ہیں۔ بچیاں آجائیں پھر ہم سب اس سے ملنے جائیں گے۔"
لوسی واش روم میں چلی گئی اور جیک نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے کچن کا رخ کیا۔ وہ لوسی سے دور رہنا چاہ رہا تھا۔ اس نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اور اب بھی ضبط سے کام لیتے ہوئے اس فعل سے باز رہنے کی کوشش کر رہا تھا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لوسی کو اتنا مارے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسٹیو کو بھول جائے۔
چھ بجے کے قریب کیٹ اور میگی بھی گھر واپس آگئیں۔ وہ کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھیں لیکن جب جیک نے انہیں بتایا کہ آنٹی میگی کے پاس جانا کتنا ضروری ہے تو وہ فوراً ہی شاور لینے چلی گئیں۔ کھانے کے دوران بھی لوسی چور نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتی رہی۔ شاید جاننا چاہ رہی تھی کہ جیک کو کچھ شک تو نہیں ہوگیا۔ کہیں اس نے اسٹیو کے ساتھ اسے بغل گیر ہوتے تو نہیں دیکھ لیا لیکن جیک اسے نظر انداز کرکے بچیوں سے ان کی آؤٹنگ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔
اینڈی کے گھر جاتے ہوئے گاڑی چلانے کے دوران وہ یہی سوچتا رہا کہ اسٹیو سے کس طرح نمٹا جائے۔ اس کے

دماغ میں ایک منصوبہ ابھر رہا تھا۔ میگی سے ملنے کے بعد وہ اور غم زدہ ہوگیا تھا۔ اس کے پاس اپنے عزیز دوست کی بیوہ کو تسلی دینے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ اگر لوسی کی بے وفائی کا زخم نہ لگا ہوتا تو شاید وہ بہتر انداز میں میگی کی دل جوئی کر سکتا۔
وہ رات ان دونوں نے کروٹیں لیتے گزاری۔ عام طور پر ایسی حالت میں لوسی ہی اس کی دل جوئی کا سامان کیا کرتی تھی لیکن آج رات وہ نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اسے ہاتھ بھی لگائے۔ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ "نیند نہیں آرہی؟"
"ہاں، مجھے میگی کا خیال آرہا ہے۔" وہ بولی۔
"میں تمہیں نیند کی گولی لا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کے لیے برابر والے کمرے سے گولی اور پانی کا گلاس لے آیا۔
تھوڑی دیر بعد ہی لوسی گہری نیند سو گئی۔ وہ چپکے سے اٹھا اور اس نے الماری سے کپڑوں کا نیا جوڑا نکالا اور انہیں لے کر اپنی اسٹڈی میں آگیا۔ کچن کے برابر میں ہی ایک اضافی واش روم تھا۔ وہ شاور کے نیچے دیر تک بیٹھا اپنے جسم کو گرم پانی سے گیلا کرتا رہا۔ اس کا دل بھر آیا۔ ایک طرف اینڈی کی موت کا غم، دوسری جانب لوسی کی بے وفائی کا صدمہ۔ لوسی ایسی نہیں ہو سکتی، اسے ضرور اسٹیو نے ورغلایا ہوگا۔ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا اور عورتیں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اس کے جال میں پھنس جاتی تھیں۔ اسے اس جرم کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اس کے ذہن میں ایک فول پروف منصوبہ آخری شکل اختیار کر چکا تھا۔ وہ خود کو بچا کر یہ کام کرنا چاہتا تھا کیونکہ بچیوں کو اس کی ضرورت تھی اور وہ کوئی احمقانہ کام کرکے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا نہیں چاہتا تھا۔
شاور لینے کے بعد وہ خود کو کافی تروتازہ اور ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اس نے اسٹڈی میں آکر لباس تبدیل کیا، جاگرز پہنے اور دستانوں کی جوڑی پتلون کی جیب میں رکھ لی۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے اور اسے اس حلیے میں گھر سے باہر کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ وہ جاگنگ کے لیے نکلا ہے۔ پھر اس نے گھر کی چابیاں جیب میں رکھیں اور پچھلے دروازے سے باہر آگیا۔ اس نے اس پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا جو جنگل کی طرف جاتی تھی۔ وہ اسی راستے پر جوگنگ کیا کرتا تھا۔ ابتدا میں اس نے اپنی رفتار آہستہ رکھی پھر تیز دوڑنا شروع کر دیا اور اس چٹان کے کنارے تک پہنچ گیا جس کے عقب میں دریا بہہ رہا تھا۔ یہ تجویز بارہا پیش کی گئی تھی کہ اس کنارے پر ایک باڑھ لگا دی جائے تاکہ لوگ وہاں کھڑے ہو کر دریا کی شوریدہ لہروں کا نظارہ کر سکیں لیکن ٹرسٹیوں نے اس تجویز پر

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور عرب بھر میں
ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کرکے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس
(فون نمبر 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

توجہ نہیں دی تھی۔ جیک چلتا ہوا چٹان کے کنارے اور نیچے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ جگہ دریا سے 100 فٹ اونچی اور پگڈنڈی سے پندرہ گز کے فاصلے پر تھی۔ جیک جانتا تھا کہ اسٹیو اسی راستے پر جوگنگ کرتا ہے۔ وہ اس کے انتظار میں ایک ایک پل گن رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید اتوار ہونے کی وجہ سے اسٹیو معمول کے مطابق صبح پانچ بجے جوگنگ کے لیے نہ آئے کیونکہ اکثر لوگ چھٹی والے دن دیر تک سوتے تھے۔ پانچ بج چکے تھے لیکن اسٹیو کا کہیں پتا نہ تھا۔ پندرہ منٹ تک انتظار کرنے کے بعد اس نے اس جانب چلنا شروع کر دیا جہاں سے اسٹیو کو آنا تھا۔ اس نے مزید پندرہ بیس منٹ انتظار کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اس سے زیادہ دیر وہاں رکنا ٹھیک نہیں تھا کیونکہ چھ بجے کے بعد لوگوں کی آمدورفت شروع ہو جاتی اور وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

پانچ بج کر پچیس منٹ پر اسٹیو اپنے گھر سے باہر نکلا۔ اس نے ہاف پینٹ اور جاگرز پہن رکھے تھے۔ گھر سے باہر آ کر اس نے کھلی فضا میں اپنے دونوں بازو پھیلائے اور ہلکی پھلکی ورزش کرنے لگا۔ جیک بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد اسٹیو نے بھی اسی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ جونہی وہ قریب پہنچا، جیک اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا اور اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اچھا ہوا تم مل گئے۔ میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

اسٹیو اس سے پانچ گز کے فاصلے پر رک گیا۔ وہ خاصا محتاط اور چوکنا نظر آ رہا تھا۔ جیک کو دیکھ کر اس کے جسم میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "کس سلسلے میں؟"

"کل کے واقعے پر۔ میں نے کچھ زیادہ ہی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ مجھے افسوس ہے۔"

"اوہ..... لیکن میں نے اس کا بالکل بھی نوٹس نہیں لیا۔"

"دراصل میں اینڈی کی وجہ سے پریشان تھا۔ شاید تم اسے جانتے ہو۔ وہ میرا بہترین دوست تھا۔ کل اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس صدمے نے مجھے بے حال کر رکھا تھا اور شاید اسی لیے میں تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکا۔"

"اینڈی کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔" اسٹیو نے بڑے خلوص سے کہا۔

جیک نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "مجھے معاف کر دو۔"

اسٹیو مسکرایا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس میں معافی کی کیا بات ہے؟ میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں۔"

جیک نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ کر ایک زوردار گھونسا اس کے پیٹ پر مارا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ وہ گرنے ہی والا تھا کہ جیک نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور گھسیٹتا ہوا چٹان کے اس کنارے تک لے گیا جہاں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس نے اسٹیو کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور پگڈنڈی پر نظر دوڑائی۔ وہاں دور دور تک کسی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس نے اپنی جیب سے دستانے نکالے اور انہیں ہاتھوں پر چڑھانے کے بعد اسٹیو پر جھکا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن اوپر اٹھائی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولا۔ "کل تم ریور ویو موٹیل کے کمرا نمبر 453 میں لوسی کے ساتھ تھے۔ کیا یہ تمہاری پہلی ملاقات تھی؟"

"جیک..... مم..... میں۔" اسٹیو کی آواز لڑکھڑانے لگی۔

"مجھے جواب چاہیے ورنہ تمہارا گلا دبا دوں گا۔"

"ہاں..... ہاں..... یہ پہلی ملاقات تھی۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"دوسری بار کب ملنے کا پروگرام ہے؟"

"جیک پلیز۔" اسٹیو کے لہجے میں التجا تھی۔

"مجھے بتاؤ..... ورنہ جان سے مار دوں گا۔" جیک غرایا۔

اسٹیو کے پاس اس کے سوال کا جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "بدھ کو۔"

"اوہ" جیک نے کچھ سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔ بدھ کے روز اس کی ایک پارٹی کے ساتھ میٹنگ تھی جس کے لیے اسے کئی گھنٹے گھر سے باہر رہنا پڑتا۔ اسٹیو اور لوسی کے لیے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تم اب اس سے نہیں مل سکو گے بلکہ اب کوئی بھی عورت تمہاری زندگی میں نہیں آئے گی۔"

اسٹیو نے اس کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کی تو جیک نے اپنی گرفت سخت کر لی۔ پھر اس نے اسٹیو کو زور سے اپنی جانب کھینچا۔ اسٹیو یہ جھٹکا برداشت نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ جیک کو اس کی گردن ٹوٹنے کی آواز آئی تو اس نے اپنا بازو باہر نکالا اور اسٹیو کے جسم کے ان حصوں کو صاف کرنے لگا جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات ملنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس نے اٹھ کر ایک بار پھر پگڈنڈی کا جائزہ لیا۔ وہاں دور دور تک کوئی

نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ واپس آیا اور اسٹیو کے مردہ جسم کو کھینچتا ہوا چٹان کے کنارے تک لے گیا اور اسے دریا میں دھکیل دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر زمین کا بغور جائزہ لیا۔ وہاں کسی جدوجہد کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ واپس مڑا اور اسی جانب دوڑنے لگا جہاں سے اسٹیو آیا تھا۔

راستے میں اسے ایک جوڑا ملا جنہیں وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ اب اس راستے پر لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی اور صبح کی سیر کے لیے نکلنے والے بھی جاگنگ کرتے نظر آ رہے تھے۔ جیک سات بجے کے قریب گھر پہنچا۔ اس نے ایک بار پھر کچن سے ملحقہ باتھ روم میں جا کر شاور لیا۔ لباس تبدیل کیا اور ناشتے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اتوار کے دن اپنا ناشتا خود ہی بنایا کرتا تھا۔ اینڈی کی موت کے بعد اسے پہلی بار بھوک کا احساس ہوا تھا۔

اپنے رقیب سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ قدرے سکون محسوس کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پانی میں رہنے کے بعد اسٹیو کی لاش اس قابل نہیں رہے گی کہ اس کی موت کے اسباب کا پتا چلایا جا سکے۔ البتہ پولیس ان لوگوں سے ضرور پوچھ گچھ کرے گی جنہوں نے اسٹیو کو جاگنگ کرتے چٹان کی طرف جاتا دیکھا ہوگا۔ اگر اس سے پوچھا گیا تو وہ بتا دے گا کہ اس نے اسٹیو کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب جاگنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر اس نے پولیس کے ممکنہ سوالوں اور ان کے جوابات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

"کیا تم نے اسے واپس آتے ہوئے بھی دیکھا تھا؟"

"نہیں..... لیکن بعض اوقات لوگ دوسرے راستے سے بھی گھوم کر آتے ہیں۔ وہ خود بھی ایسا کئی بار کر چکا ہے۔"

"کیا تم نے اس کے علاوہ بھی کسی کو دیکھا تھا؟"

"ہاں، واپس آتے وقت میری ملاقات ایک کپل سے ہوئی تھی۔"

"کیا تم ہمیشہ ہی اتوار والے دن صبح سویرے جاگنگ کرتے ہو؟"

"نہیں، میں عام طور پر اتوار کو جاگنگ نہیں کرتا لیکن ایک روز پہلے میرے عزیز دوست کا انتقال ہو گیا تھا اور اسی لیے میں ساری رات نہیں سو سکا، تب میں نے سوچا کہ جاگنگ ہی کر لوں۔"

جیک نے ناشتے میں دلیا اور اورنج جوس لینے پر اکتفا کیا۔ وہ اس واقعے کے دیگر پہلوؤں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈیٹیک سارجنٹ یا کسی پولیس والے تحقیقاتی ٹیم کو بتا سکتے تھے کہ اسٹیو ایک عورت کے ساتھ کار چوری کی رپورٹ درج کروانے آیا تھا جو اس کی بیوی نہیں تھی۔ جیک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسٹیو گاڑی میں ہی بیٹھا رہا تھا یا لوسی کے ساتھ پولیس اسٹیشن کے اندر بھی گیا تھا۔ اخبارات میں اسٹیو کی تصویر شائع ہونے کے بعد موٹیل کی استقبالیہ کلرک بھی بتا سکتی تھی کہ ہفتے کے روز اس نے کمرا نمبر 453 بک کروایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسٹیو نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے رجسٹر میں فرضی نام درج کروایا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ لوگوں نے لوسی کو اسٹیو کی کار میں جاتے دیکھا ہو۔ ان شواہد کی روشنی میں پولیس اس کمرے میں اسٹیو اور لوسی کے فنگر پرنٹس تلاش کر سکتی تھی لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ کمرے کی صفائی کے دوران وہ نشانات مٹ گئے ہوں یا وہ کمرا بعد میں کسی دوسرے کو دے دیا گیا ہو لیکن کچھ نشانات دیرپا ہوتے ہیں اور آسانی سے ضائع نہیں ہوتے۔ ان کی وجہ سے موٹیل کے اس کمرے میں اسٹیو اور لوسی کی موجودگی ظاہر ہو سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ لوسی کی انگلیوں کے نشانات کہیں بھی ریکارڈ میں نہیں ہیں لیکن اگر پولیس نے کار چوری کی رپورٹ لکھوانے کے دوران لوسی اور اسٹیو کو ساتھ دیکھا ہو گا تو......

اسے اپنے بارے میں اتنی فکر نہیں تھی۔ وہ اسپتال سے سیدھا گھر آیا تھا۔ راستے میں ریڈیو پر خبروں سے معلوم ہوا کہ کسی ایکسیڈنٹ کی وجہ سے پل بند کر دیا گیا ہے تو وہ دوسرے راستے سے گھر پہنچ گیا۔ لیکن وہ ڈمبی روڈ سے نہیں آیا تھا۔ پولیس کو یہ بات بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے اور نہ وہ لوگ اتنی گہرائی میں جائیں گے۔ اس کی تو نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اسٹیو شروع سے ہی مہم جو اور ایڈونچر کا دلدادہ تھا۔ اسے خطروں سے کھیلنے کا شوق تھا۔ چند سال پہلے اس نے دریا پار کرنے کے شوق میں بلندی سے چھلانگ لگا دی تھی لیکن منہ زور لہروں کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس کا سر ایک چٹان سے جا ٹکرایا۔ پولیس نے بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی تھی اور اسے کئی روز تک اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔ اسی طرح ایک بار چٹان پر چڑھنے کے شوق میں وہ اپنا ایک بازو تڑوا بیٹھا تھا۔ اس بار بھی یہی سمجھا جائے گا کہ وہ دریا کا نظارہ کرنے کے شوق میں کنارے پر آ کر کچھ زیادہ ہی جھک گیا اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ یہ فون پولیس اسٹیشن سے آیا تھا۔ لوسی کی گاڑی وال مارٹ سپر اسٹور کے پارکنگ لاٹ سے مل گئی تھی جسے کھینچ کر پولیس اسٹیشن لایا گیا تھا۔ لوسی کو گاڑی کے کاغذات

urdupdf.blogspot.com

سمیت پیر کی صبح بلایا تھا تاکہ گاڑی اس کے حوالے کی جا سکے۔ جیک نے آفیسر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ لوگ مقررہ وقت پر پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔ گیارہ بجے تک لوسی اور بچیاں بھی اٹھ گئیں۔ ابھی وہ لوگ ناشتا کر ہی رہے تھے کہ ایک بار پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جیک نے ہی ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سننے کے بعد وہ تقریباً چیخنے کے انداز میں بولا۔ ”چارلی.....کیا تمہیں یقین ہے۔ اچھا.....ٹھیک ہے۔ اطلاع دینے کا شکریہ۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔“

یہ فون کال اس کے منصوبے میں شامل نہیں تھی لیکن ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ جیک کے ریسیور رکھتے ہی لوسی نے پوچھا۔ ”کس کا فون تھا؟“

”چارلی کا۔“ جیک نے لوسی کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اسٹیو مر گیا ہے۔“

لوسی کا چہرہ زرد اور آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیسے.....کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھا؟“

”بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اس کی موت دریا میں ڈوبنے سے ہوئی ہے۔ چارلی نے اپنے گھر کے پچھلے صحن سے دیکھا کہ اس کا جسم ایک درخت پر جھول رہا تھا۔ اس نے قریب جاکر اس کی لاش درخت سے اتاری۔ پولیس وہاں پہنچ گئی ہے۔ اس کی گردن اور ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ آبشار دیکھنے کے شوق میں چٹان کے کونے تک پہنچ گیا تھا اور اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ اسے ہمیشہ سے ہی اس طرح کے کرتب دکھانے کا شوق تھا۔“

لوسی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے یہ خبر سن کر شدید صدمہ پہنچا ہے۔

”کیا بات ہے.....تم لوگوں نے ہاتھ کیوں روک لیا؟ ناشتا تو ڈھنگ سے کرو۔“ جیک نے سلائس کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ایک دوست دنیا سے چلا گیا اور تمہیں ناشتے کی پڑی ہے۔“ لوسی نے ناگواری سے کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ وہ ہمارا دوست نہیں تھا۔ کم از کم میرا تو بالکل نہیں اور دوسری بات یہ کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ میں یا تم اس کے غم میں کتنے دن بھوکے رہ سکتے ہیں؟“ جیک نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

لوسی غصے سے بولی۔ ”تمہیں بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا اور نہ ہی ہمارا اس سے کوئی خاص تعلق تھا جو ہم اس کا غم منائیں۔“

”مجھے یقین نہیں کہ وہ کوئی برا شخص تھا۔“ لوسی نے ایک بار پھر اس کی طرف داری کی۔ ”ممکن ہے کہ اس میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح کچھ خامیاں ہوں۔“

”نہیں.....وہ مجسم برائی تھا، جبھی تو شریف عورتیں اس کے سائے سے بھی دور بھاگتی تھیں۔ تمہارے موٹے دماغ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟“

لوسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ خاموش بیٹھی اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جیک نے ایک بار پھر غور سے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”مجھے پولیس کو فون کر دینا چاہیے۔“

”کیوں؟“ لوسی چونکتے ہوئے بولی۔

”میں نے آج صبح اسٹیو کو دیکھا تھا۔“

”کہاں؟“

”جوگنگ ٹریک پر۔“

”کیا تم جوگنگ کے لیے گئے تھے؟“

”ہاں.....اینڈی کو یاد کر کے میں رات بھر جاگتا رہا۔ پھر سوچا کہ جاگنگ کر کے کچھ فریش ہو جاؤں۔ راستے میں اسٹیو سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہیلو ہائے کیا اور بس۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے پولیس کو یہ سب بتا دینا چاہیے۔ اس طرح انہیں واقعات کا تجزیہ کرنے میں مدد مل سکے گی۔“

وہ فون کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ لوسی کی نظریں اس کے چہرے پر ہیں۔ جب وہ واپس آیا تو تب بھی لوسی اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ پھر وہ خاموشی سے اٹھی اور عقبی دروازے سے باہر نکل گئی۔

ایک ہفتے بعد مقامی اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ میڈیکل ایگزامنر نے اسٹیو کی موت کو حادثہ قرار دے دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد بورڈ آف ٹرسٹیز کا خصوصی اجلاس ہوا جس میں فوری طور پر چٹان کے کنارے ایک مضبوط جنگلا یا فصیل لگانے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ وہاں سے کھڑے ہو کر آبشار کا نظارہ کرنے والے ایسے حادثات سے محفوظ رہیں۔

جیک نے اس واقعے کے بعد کچھ عرصے انتظار کرنا مناسب سمجھا ورنہ وہ تو بہت پہلے ہی لوسی کو اسٹیو کے پاس بھیجنے اور اس سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اب اسے اپنے پلان پر عمل کرنے کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا تھا۔

ترقی کی منازل کو عبور کر لینا ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے... لیکن کچھ لوگ اسے اپنے لیے زندگی کے جیسے لازم و ملزوم سمجھ لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس پر صرف اور صرف انہی کا حق ہے... اور وہ اپنے اس حق سے کسی صورت دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے... ایک ایسے ہی خودغرض شخص کا قصہ... جو دوسروں کو گرا کے خود کھڑے ہونے کے اصول پر کاربند تھا۔

ان انسانوں کی تصویر کشی جن کے چہرے فریبانہ نقاب میں پوشیدہ تھے۔

چانس

آصف ملک

سولومن رائس کی صورت دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے اسے دل کا دورہ پڑ چکا ہو یا پڑنے والا ہو۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ پورٹ آرٹ گیلری کا شمار ملک کی چند بڑی آرٹ گیلریز میں ہوتا تھا اور یہاں دنیا کے نامور ترین مصوروں کے بیش قیمت ترین فن پارے موجود تھے۔ کمرا نمبر بارہ ایسی ہی بیش قیمت تصاویر کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں کل تین درجن قیمتی پینٹنگز تھیں جن میں سے ہر ایک کی مالیت کم سے کم ایک ملین ڈالرز تھی۔ ان میں مشہور زمانہ مصور وان گوگ کی حال ہی میں دریافت ہونے والی ایک تصویر ”روٹی“ بھی تھی اور اس دریافت کا سہرا سولومن کے سر جاتا تھا جو پورٹ آرٹ گیلری کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے یہ تصویر میونخ میں ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری میں دریافت کی تھی اور اسے بہت کم داموں حاصل

http://digestpk.blogspot

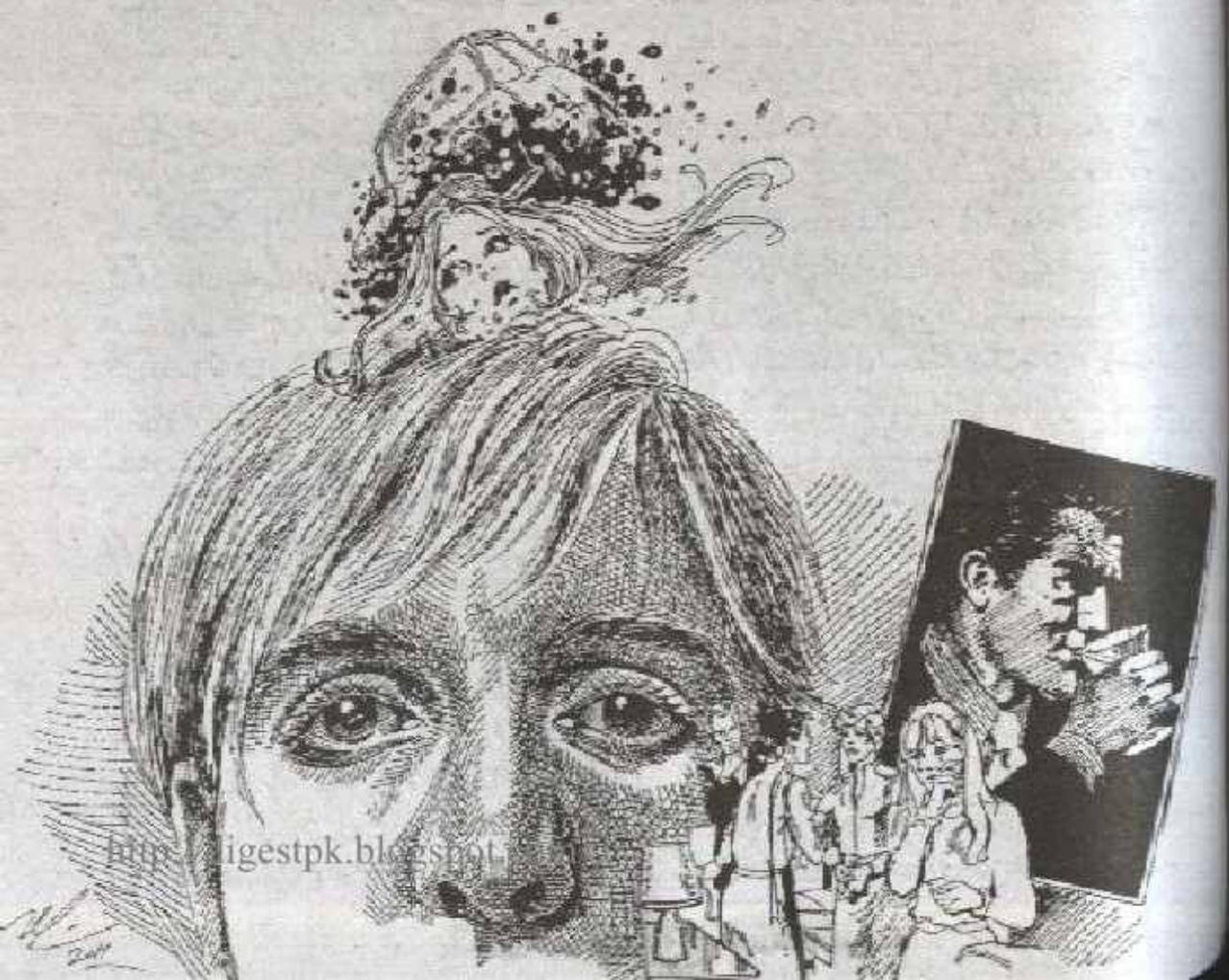

کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس پروان گوگ کے دستخط نہیں تھے اور شاید اسی وجہ سے یہ تصویر کم قیمت میں مل گئی تھی۔

سولومن نے اس تصویر کے لیے چار عالمی ماہرین کا ایک بورڈ بٹھایا تھا اور اس بورڈ نے متفقہ طور پر تصویر کو وان گوگ کا شاہ کار قرار دیا تھا۔ تصویر میں ایک بچہ کچرے سے روٹی چن کر نکال رہا ہے... سولومن نے اسی سے اسے "روٹی" کا نام دیا تھا۔ ماہرین کی رائے کے بعد اس کی قیمت کا تعین کیا گیا تو یہ کوئی ڈیڑھ ملین ڈالرز کا شاہ کار قرار پائی۔ گیلری نے اسے دو ملین ڈالرز میں انشورڈ کرایا اور اس کے دو مہینے بعد ہی یہ آرٹ گیلری میں اپنے مخصوص فریم سے غائب ہوگئی۔

سولومن کا نائب ڈین مارش جب صبح حسب معمول گیلری پہنچا اور اس نے کمروں کا معائنہ شروع کیا تو کمرا نمبر بائیس کھولتے ہی اسے گڑبڑ کا احساس ہوگیا کیونکہ تصویر کا فریم والا شیشہ نکل کر فرش پر پڑا تھا اور فریم سے تصویر غائب تھی۔ ڈین نے فوری طور پر سولومن کو اطلاع کی اور گیلری کے رات کے محافظوں کے سربراہ ہیری کو طلب کرلیا۔ ہیری تصویر کے بارے میں جان کر دم بہ خود رہ گیا۔ رات نو بجے سے صبح نو بجے تک وہ اس گیلری میں موجود ہر چیز کی حفاظت کا ذمے دار تھا۔ اس کے ساتھ تین عدد محافظ اور ہوتے تھے۔

سولومن دس بجے آتا تھا یعنی ڈین کی آمد کے ایک گھنٹے بعد۔ لیکن جیسے ہی اسے تصویر کے غائب ہونے کی اطلاع ملی، وہ بیس منٹ کے اندر وہاں آگیا۔ خالی فریم دیکھ کر اس کی حالت بُری ہوگئی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے نائیٹروگلیسرین کی گولی زبان تلے رکھی اور ہیری پر برس پڑا کہ اس کے ہوتے ہوئے یہاں سے تصویر کس طرح غائب ہوئی۔ ہیری اسے یقین دلا رہا تھا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ نہ تو الارم بجا تھا اور نہ ہی کوئی گیلری میں داخل ہوا تھا۔ تمام تالے لگے ہوئے تھے اور وہ ساری رات چوکس رہے تھے۔

"میرے خدا... دو دن بعد نمائش ہے۔ اب میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" سولومن نے سر پکڑ لیا۔

ڈین کو دلی مسرت ہو رہی تھی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو اسے سولومن سے نفرت تھی۔ سولومن اس کے نزدیک انسانیت سے عاری اور گھٹیا قسم کا انسان تھا جسے صرف اس بات کی فکر رہتی تھی کہ اس کی ساکھ پر کوئی حرف نہ آئے۔ وہ انسانوں سے زیادہ بے جان تصویروں کو اہمیت دیتا تھا۔ اگر اسے اطلاع ملتی کہ اس کی اکلوتی لڑکی غائب ہے، تب بھی اس کی یہ حالت نہ ہوتی جو اس تصویر کے غائب ہونے کا سن کر ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ سولومن گزشتہ پندرہ سال سے اس گیلری کا ڈائریکٹر چلا آرہا تھا اور اس کا ریٹائر ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسی طرح گیلری کے مالکان بھی اس کے کام سے مطمئن تھے بلکہ اس نے "روٹی" حاصل کرکے جو کارنامہ انجام دیا، اس کے بعد تو اس کی قدر اور بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ اس لیے مالکان کی جانب سے بھی اسے ریٹائر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ڈین بھی گزشتہ پندرہ سال سے گیلری سے منسلک تھا اور مختصر عرصے میں وہ سولومن کے نائب کے عہدے تک آچکا تھا۔ ظاہر ہے، اس کے بعد ڈین کا نمبر تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ سولومن جلد از جلد گیلری یا دنیا سے ریٹائر ہو جائے تاکہ وہ اس کی جگہ ڈائریکٹر بن سکے۔ لیکن سولومن کافی الحال دونوں جگہوں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ساٹھ سال کی عمر میں بھی وہ ٹھیک ٹھاک تھا اور اسے دل کی معمولی سی تکلیف کے سوا اور کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اس سلسلے میں بہت محتاط تھا اور دوا ہمہ وقت اس کی جیب میں موجود رہتی تھی۔ اس کی عمومی صحت بہت اچھی تھی۔ یہ دل کی تکلیف بھی اس نے خود پالی تھی۔ ایک شخص اگر ہر وقت دوسروں کی ٹوہ میں رہے، کسی کو خود سے آگے بڑھتا ہوا نہ دیکھ سکے اور اس کا دماغ زیادہ تر سازشوں میں ملوث رہے تو اسے دل کا مسئلہ تو ہوتا ہے۔

سولومن آرٹ کی دنیا میں ایک شیطان کی طرح مشہور تھا۔ اس نے آغاز ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری سے کیا اور بلند وبالا جوڑ توڑ کرکے اوپر آگیا۔ اس نے پہلے سے موجود لوگوں کو اکھاڑ پھینکا۔ وہ آرٹ کے معاملے میں باصلاحیت تھا لیکن آرٹ گیلری وان مین شو نہیں ہوتا۔ اس لیے جلد اس آرٹ گیلری کا جہاز تہ نشین ہوگیا اور سولومن اس سے پہلے ہی وہاں سے نکل کر ایک نسبتاً بڑی آرٹ گیلری میں ملازم ہوگیا۔ یہاں اس نے بیچ بیچ آرٹ کے بارے میں کچھ کام کیا اور چند ایسے فن پارے اس گیلری میں لانے میں کامیاب ہوا جن کی وجہ سے اس گیلری کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ یہاں سے سولومن نے نام کمایا اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ پورٹ آرٹ گیلری میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس نے اپنی تمام ملازمتوں کے دوران کسی نہ کسی فرد کو نقصان پہنچایا اور اس کی جگہ خود اوپر آنے میں کامیاب ہوا۔ یہاں بھی اس نے یہی کیا۔

جب ڈین یہاں منیجر بن کر آیا تو اس وقت گیلری کا ڈائریکٹر جارجی تھا۔ وہ اس وقت سے یہاں کام کر رہا تھا جب یہ گیلری قائم ہوئی تھی اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں اس

کا بھی بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ پھر سولومن اس کا نائب بن گیا اور اس نے جارجی کے خلاف سازشیں شروع کردیں۔ اس کا مقصد جارجی کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لینا تھا۔ پھر ایک سودے میں گیلری کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ جارجی نے سابق سوویت یونین کے ایک آرٹ میوزیم سے کچھ اشیا کا تبادلہ کیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ میوزیم سے آنے والی تصاویر جعلی ہیں اور ان کی کوئی قیمت نہیں۔ کوئی چھ لاکھ ڈالرز کے نقصان نے مالکان کو مجبور کردیا کہ وہ جارجی کو ملازمت سے برطرف کر دیں۔ پھر اسے کہیں اور ملازمت نہیں ملی اور وہ منظرِ عام سے غائب ہوگیا۔ ڈین کو معلوم نہیں تھا لیکن اس نے سنا تھا کہ اس سودے میں اصل ہاتھ سولومن کا تھا لیکن جب حقائق سامنے آئے تو اس نے سارا ملبا جارجی پر ڈال دیا۔ اس وجہ سے بھی ڈین اس سے نفرت کرنے لگا تھا لیکن اصل مسئلہ وہی تھا کہ وہ اس کی جگہ لینا چاہتا تھا۔

ڈین کو امید تھی کہ تصویر کی گم شدگی کے سلسلے میں سولومن کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ممکن ہے وہ ریٹائرمنٹ لے لے۔ یہ سوچ کر اسے خوشی ہو رہی تھی لیکن وہ اپنی خوشی ظاہر نہیں کرسکتا تھا اس لیے سنجیدہ صورت بنا کر کھڑا تھا۔ کمرے میں ناچتے سولومن نے دوسری بار اس سے پوچھا۔ "اب کیا کرنا چاہیے؟"

"سب سے پہلے تو ہمیں کیمرے کی ریکارڈنگ دیکھنی چاہیے۔" ڈین نے مشورہ دیا۔

"بالکل۔" سولومن اچھل پڑا۔ ایک منٹ بعد وہ اسی طور پر واقع سی سی کیمروں کے کنٹرول روم میں تھے۔ یہاں کیمروں سے حاصل شدہ ویڈیو محفوظ کی جاتی تھی اور اس کمرے کی چابی صرف سولومن کے پاس تھی۔ ہیری بھی اس کمرے میں نہیں آسکتا تھا۔ سولومن نے کمرا بائیس کے داخلی دروازے کے اوپر لگے کیمرے کی ریکارڈنگ نکالی۔ یہ کیمرا تقریباً پورے کمرے کا احاطہ کرتا تھا۔ خاص طور سے وسطی حصہ تو بالکل واضح تھا اور تصویر اسی میں تھی۔ سولومن نے ویڈیو ریوائنڈ کرکے چلانا شروع کردی۔ اس نے رفتار تیز رکھی تھی لیکن پھر بھی اس میں بہت وقت لگ رہا تھا۔

"ایک ایک گھنٹا پیچھے کرکے دیکھنا شروع کردیں۔" ڈین نے تجویز دی۔ سولومن نے پریشانی سے سر ہلایا۔

"میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔"

اس نے ویڈیو ایک ایک گھنٹے پیچھے کرنا شروع کردی۔ رات بارہ بجے تک کچھ نہیں ہوا تھا پھر وہ نو بجے تک پہنچے، تب بھی تصویر اپنے فریم سے غائب تھی۔ اس موقع پر سب سے زیادہ خوشی ہیری کو ہوئی کہ اس کی ڈیوٹی شروع ہونے تک تصویر فریم میں موجود نہیں تھی۔ یعنی وہ اس کی گم شدگی کا ذمے دار نہیں تھا۔ سولومن ویڈیو کو مزید پیچھے لے جا رہا تھا۔ تو بجے بھی تصویر فریم میں نہیں تھی۔ ڈین حیران ہوا کیونکہ نو بجے سولومن گیلری سے جاتا تھا۔ پھر آٹھ بجے بھی تصویر دکھائی نہیں دی۔ ڈین نے کہا۔

"میرے خدا! یہ کس وقت غائب ہوئی ہے؟"

لیکن سات بجے کے وقت تصویر فریم میں نظر آئی۔ یعنی وہ اس کے بعد نکالی گئی تھی۔ اب سولومن نے ویڈیو کو فورا نیکس کی رفتار سے چلانا شروع کردیا۔ سات بج کر پندرہ منٹ پر کوئی کمرا نمبر بائیس میں آیا تھا کیونکہ اس کے فوراً بعد کیمرے کے لینس پر کوئی چیز آکر ٹک گئی اور منظر چھپ گیا۔ یہ منظر کوئی دس منٹ چھپا رہا اور وہ چیز ہٹ گئی۔ اب فریم تصویر سے خالی تھا۔ سولومن نے سر تھام لیا۔ کوئی ان کے سامنے کام کر گیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل نکالا اور گیلری کے ایک شراکت دار ولیم گرومین کو کال کی۔ اس نے نحیف سی آواز میں اسے تصویر کے غائب ہونے کا بتایا۔

"اب ہم کیا پولیس کو اطلاع کریں؟" اس نے گرومین سے پوچھا۔

"کیا یہ مناسب ہوگا؟" گرومین نے سوال کیا۔

"پرسوں نمائش ہے اور ساری دنیا سے ماہرین اس تصویر کو دیکھنے آرہے ہیں۔"

ڈین نزدیک کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے موبائل نے بیل دی تو اس نے ذرا دور ہو کر کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔"

"تمہارا احمق باس فون کو کیوں اگنیج کیے ہوئے ہے؟" ایک مردانہ آواز نے ناگواری سے کہا۔

"کون ہو تم؟" ڈین نے غصے سے پوچھا۔

"وہ جس کے پاس "روٹی" ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "وقت ضائع مت کرو... اپنے باس سے بات کراؤ۔"

ڈین نے اسے ہولڈ کرنے کو کہا اور اشارے سے سولومن کو فون کے بارے میں بتایا۔ اسے حیرت ہوئی تاہم اس نے موبائل لے لیا۔ گرومین سے اس کی بات ہوچکی تھی۔ گرومین نے اسے اگلی ہدایت تک پولیس سے رابطہ نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے موبائل پر ہاتھ رکھ کر ڈین سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

http://digestpk.blogspot.com/

''روبی'' اس کے پاس ہے۔''

یہ سنتے ہی سولومن نے پھرتی سے موبائل کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو! کون ہو تم... تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟''

ڈین پاس ہی کھڑا تھا لیکن سولومن نے اسپیکر آن کر دیا اور اب دوسرے آدمی کی آواز صاف آ رہی تھی۔ ''تم سچ مچ احمق ہو۔ میں تمہیں کیوں بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ ہاں ''روبی'' میرے پاس ہی ہے۔''

''میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔'' سولومن بُرا مانے بغیر بولا۔ عام حالات میں کوئی اسے یہ الفاظ کہتا تو وہ مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا لیکن اس وقت وہ اس شخص کی گالیاں بھی سن سکتا تھا کیونکہ اس کے قبضے میں سولومن کی جان تھی۔ ''تم نے وہ تصویر گیلری سے چرائی ہے؟''

''تم اسے چرانا نہیں کہہ سکتے۔'' اس شخص نے چالاکی سے کہا۔ ''میں نے اسے حفاظتی تحویل میں لیا ہے۔''

''حفاظتی تحویل!'' سولومن حیرت سے بولا۔ ''وہ یہاں بالکل محفوظ تھی... لیکن تم نے اسے کیوں نکالا ہے؟''

''میں نے اسے محفوظ کرنے کے لیے وہاں سے نکالا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی بے ادب اس مقدس تصویر کی بے حرمتی نہ کر دے۔''

''نہیں... نہیں، یہاں کوئی فن کی بے حرمتی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' سولومن نے جلدی سے کہا۔ ''پرسوں اسے دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ آ رہے ہیں۔''

''مجھے انہی سے تو خطرہ ہے... اس لیے میں نے تصویر کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔''

''سنو... پلیز... خدا کے لیے۔'' سولومن نے گھگیا کر کہا۔ ''اسے واپس کر دو۔''

''نہیں، پہلے تم مجھے یقین دلاؤ کہ اس تصویر کو حفاظت سے رکھا جائے گا، تب میں اسے واپس کروں گا۔'' اس آدمی نے کسی بچے کی طرح ضدی لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟''

''اگر تم مجھے ایک ملین ڈالرز دے دو گے تو مجھے یقین آ جائے گا۔''

''ایک ملین ڈالرز!'' سولومن نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔

''اگر نہیں دے تو یہ تصویر تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔'' وہ شخص بولا اور کال منقطع کر دی۔ سولومن نے موبائل ڈین کو پکڑا دیا اور لرزتے ہاتھوں سے شیشی نکال کر ایک گولی اور کھائی۔ ایک گھنٹے بعد گیلری کے مالکان میں سے ایک یعنی ولیم گرومین وہاں پہنچ گیا۔ اس نے صورتِ حال جاننے کے بعد اپنے بقیہ شراکت داروں کو کال کر کے بتایا اور ان سے رائے لینے لگا کہ اس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ وہ بات چیت کو خفیہ رکھنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ڈین اس ساری صورتِ حال سے صرف محظوظ ہو رہا تھا کیونکہ تصویر کی چوری کی ذمے داری کسی طرح اس پر نہیں آتی تھی۔ گیلری کی تمام اہم چابیاں سولومن کی تحویل میں ہوتی تھیں اور ان میں کمرا نمبر بائیس کی چابی بھی شامل تھی۔ فریم سیل تھے اور انہیں خاص طریقے سے ہی کھولا جا سکتا تھا اس لیے چوری کرنے والے نے شیشہ کاٹ کر تصویر نکالی تھی۔ ڈین حیران تھا کہ اتنے حفاظتی انتظامات کے باوجود چور کس طرح اندر آیا اور تصویر نکال کر لے گیا۔ گیلری سات بجے بند کر دی جاتی تھی اور اس کے بعد کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ کچھ دیر میں گیلری کے باقی دو مالکان کلارا فیمن اور مائیکل رش بھی آ گئے۔ یہ تینوں ہی ارب پتی تھے اور ان کے بڑے اثاثوں میں یہ آرٹ گیلری بھی شامل تھی کیونکہ اس میں موجود اثاثوں کی کل مالیت اربوں ڈالرز میں بنتی تھی۔ بند کمرے میں ہونے والی میٹنگ میں صرف سولومن کو شرکت کا موقع ملا۔ ڈین کو اس میٹنگ سے دور رکھا گیا تھا اس لیے وہ ہیری کے پاس آ گیا۔

اس دوران میں ہیری اور اس کے آدمی ولن کے سیکیورٹی انچارج سورن بیگل اور گارڈز کے ساتھ مل کر گیلری کا معائنہ کر رہے تھے کہ چور کہاں سے اندر آیا۔ گیلری میں آمد و رفت کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جہاں سے اندر آنے اور جانے والے کی مکمل چیکنگ کی جاتی تھی۔ یہاں انفرا ریڈ کیمرے لگے تھے جو لباس کے اندر بھی اسکیننگ کر لیتے تھے ورنہ اگر کوئی اپنے لباس میں کچھ چھپا کر لے جانا چاہتا تو وہ پکڑا جاتا۔ ویسے بھی گزشتہ شام سات بجے تک دروازے بند کرنے کے بعد نہ تو کوئی اندر آیا تھا اور نہ ہی کوئی باہر گیا تھا۔

کچھ دیر بعد معائنے کے دوران ایک گارڈ نے چھت سے آنے والے ایک ہوائی پائپ کے باہر والے سرے پر لگی جالی کو کٹا پایا۔ اس جالی کو کاٹ کر کوئی بھی دبلی جسامت کا فرد اندر آ سکتا تھا۔ یہ پائپ گیلری کے اندرونی حصوں میں تازہ ہوا مہیا کرتا تھا اور اس کا قطر پندرہ انچ تھا۔ اس سے اندر آنے کے کئی راستے تھے اور صرف ایک تختہ ہٹا کر بھی گیلری کے کسی حصے تک رسائی حاصل کی جا سکتی تھی... اور حیرت کی بات تھی کہ ایک تختہ کمرا نمبر بائیس میں بھی کھلتا تھا اور آج تک کسی نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ چور یقیناً اسی راستے سے اندر آیا تھا

اور اس نے نہایت آرام سے کیمرے پر کچھ ڈال کر تصویر چوری کی اور اسی راستے سے واپس چلا گیا۔ ڈین نے یہ معاملہ گیلری مالکان کے سامنے رکھا۔

''یہ انتظامیہ کی نااہلی ہے۔'' گرومین نے غصے سے کہا۔ ''تم لوگوں کو حفاظتی انتظامات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

''میں نے اس بارے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔'' سولومن نے جلدی سے کہا۔ ''سال میں دو بار ایک سیکیورٹی فرم ہمارے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیتی ہے اور اس نے بھی ہمیں کوئی ریڈ لائن نہیں دی۔''

''تب یہ فرم کی نااہلی ہے۔'' کلارا بولی۔ ''اسے کس نے گیلری کے حفاظتی انتظامات کا نگران بنایا ہے؟''

''میں نے۔'' سولومن نے اعتراف کیا۔ ''لیکن سیف آرٹ کا شمار آرٹ گیلریز کو حفاظتی انتظامات مہیا کرنے والی بہترین فرم میں ہوتا ہے۔''

''یہ بحث بعد میں بھی کی جا سکتی ہے۔'' مائیکل نے رسانیت سے کہا۔ ''ابھی معاملہ تصویر کی واپسی کا ہے۔''

''اس نے ایک ملین ڈالرز طلب کیے ہیں۔''

''اس کی تم سے بات ہوئی تھی؟'' کلارا نے سولومن سے پوچھا۔

''جی میڈم! مجھ سے بات ہوئی تھی۔''

''کیا کسی اور نے بھی یہ گفتگو سنی تھی؟'' کلارا کے لہجے میں شک آ گیا۔ سولومن کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن اس نے ضبط کر کے کہا۔

''جی میڈم! ڈین نے بھی یہ گفتگو سنی تھی۔''

''ڈین بھی ملازم ہے... ابھی تک تصویر غائب کرنے والے نے ہم میں سے کسی سے بات نہیں کی۔'' کلارا کا اشارہ مالکان کی طرف تھا۔

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' سولومن بولا۔ ''کال ڈین کے موبائل پر ہی آئی تھی۔''

تمام لوگوں کی شک بھری نگاہیں ڈین پر مرکوز ہو گئیں۔

''ہاں، میرے موبائل پر آئی تھی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''لیکن فون کرنے والے نے پہلے مسٹر سولومن کے موبائل پر کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت یہ مسٹر گرومین سے بات کر رہے تھے پھر اس نے میرے موبائل پر کال کی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں کے معاملات سے باخبر ہے اور سب جانتا ہے۔'' مائیکل نے کہا۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' کلارا طنزیہ انداز میں بولی۔ ''اس نے کس نمبر سے کال کی تھی؟''

''کوئی پبلک بوتھ ہے۔'' ڈین نے اپنا موبائل ملاحظے کے لیے پیش کیا۔ ''اس میں نمبر نہیں آتا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تصویر چرانے والا نہایت چالاک آدمی ہے۔'' مائیکل نے نتیجہ نکالا۔ اس پر کلارا نے اسے گھورا۔

''ظاہر ہے جو شخص گیلری کے کمزور حفاظتی انتظامات کو بھانپ کر نہایت ہوشیاری سے دن دہاڑے ایک قیمتی تصویر چرا کر لے جائے، اس کی ذہانت میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟''

''نہیں۔'' مائیکل کھسیا گیا۔ ''لیکن اب کیا کریں؟''

''پولیس کو معاملہ دینے کا مطلب ہے بدنامی، جگ ہنسائی اور گیلری کی تباہی۔'' گرومین نے کہا۔

''لیکن اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔''

ڈین نے مشورہ دیا۔ ''ایک بار اس شخص سے مزید بات کر لی جائے، اس کے بعد فیصلہ کیا جائے تو بہتر نہیں ہوگا؟''

''لیکن اس شخص سے کیسے بات کی جائے؟''

''وہ فون کرے گا۔ اس نے ایک ملین ڈالرز کا مطالبہ کیا ہے تو فون بھی کرے گا۔''

اس تجویز پر مختصر سی بحث کے بعد اسے مان لیا گیا۔ ڈین کو خوشی ہوئی اور سولومن نے اسے کھا جانے والی نظروں سے... دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''لیکن اس سے رابطہ کیسے ممکن ہے؟''

''جیسے اس نے پہلے کیا تھا۔ اب ممکن ہے کہ وہ مسٹر سولومن کے موبائل پر رابطہ کرے۔''

لیکن اس نے سولومن کے بجائے کلارا کے موبائل پر کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی اور جیسے ہی اسے اندازہ ہوا کہ کال تصویر چرانے والے کی ہے، اس نے اسپیکر آن کر دیا۔ اسی شخص کی آواز آئی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم سب ایک جگہ ہو۔ میری مراد گیلری کے مالکان سے ہے اور تم تک میرا مطالبہ بھی پہنچ چکا ہوگا۔''

''یہ کرمنل کیس ہے۔'' کلارا بولی۔ ''اس کی پولیس کو اطلاع دینا لازمی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے اور اگر تم چاہو تو شوق سے پولیس کو اطلاع کر سکتی ہو... مگر اس کے بعد تصویر کو بھول جانا۔''

''ایک منٹ!'' کلارا بولی۔ ''اتنی جلدی کسی نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا مطالبہ بہت زیادہ ہے۔''

''اس تصویر کی نقد مالیت تو شاید دو ملین ڈالرز ہوگی لیکن کیا تم اس ساکھ کی مالیت کا اندازہ لگا سکتی ہو جو اس تصویر کی وجہ سے تمہاری گیلری [illegible]

http://digestpk.blogspot.com

سکتے ہو؟"

"تم اسے کسی کو فروخت نہیں کر سکتے۔" گرومین نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "کوئی اس کے بدلے تمہیں سو ڈالرز بھی نہیں دے گا۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "مذاق مت کرو۔ یہ ایسا شاہکار ہے کہ لوگ صرف اپنی تجوری میں رکھنے کے عوض بھی مجھے ایک ملین ڈالرز دے سکتے ہیں... لیکن اگر یہ رقم تم دے دو تو میرا کام بن جائے گا اور لوگ بھی ایک فن پارے سے محروم نہیں ہوں گے۔"

"اگر تم اسے کسی کو بیچو گے، تب بھی وہ اسے نہیں رکھ سکے گا اور کبھی نہ کبھی پکڑا جائے گا۔" مائیکل نے کہا۔

"نہیں! میں اسے بیچوں گا نہیں۔ وہ تو تم نے کہا تو میں نے بھی اسے بیچنے کی بات کر دی۔ ویسے میں اسے تمہیں ہی دوں گا ورنہ....."

"ورنہ کیا؟" سولومن بولا۔

"ورنہ میں اسے آگ لگا دوں گا۔" اس نے جملہ مکمل کیا۔

"نہیں....." سولومن نے چیخ کر کہا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "تم لوگوں کے پاس سوچنے کے لیے صرف آدھا گھنٹا ہے۔ میں آدھے گھنٹے بعد کال کروں گا۔ اور میں ایک بار پھر بتا دوں، پولیس کو کال کرنے کا مطلب اس تصویر سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو لینا ہوگا۔"

فون بند کر کے کلارا نے سب کی طرف دیکھا۔ "اب کیا کرنا چاہیے؟"

"اگر ہم اس شخص کا مطالبہ مان لیتے ہیں تو اسے ایک ملین ڈالرز دینا ہوں گے۔" گرومین نے کہا۔

"اور اگر نہیں مانتے تو تصویر سے ہاتھ دھو لیں گے۔" مائیکل نے کہا۔ "مالی نقصان کے ساتھ گیلری کی ساکھ کو الگ نقصان پہنچے گا۔"

"لیکن اس طرح مجرموں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔" کلارا نے کہا۔

ان میں آپس میں بحث چھڑ گئی۔ کلارا تاوان دینے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اصول کے خلاف ہے جبکہ مائیکل اور گرومین تاوان دینے کے حق میں تھے۔ ان کے نزدیک تصویر کی اہمیت تھی۔ اس سے نہ صرف ان کے مالی مفادات تھے بلکہ صرف تصویر کی وجہ سے پرسوں ہونے والی ایگزی بیشن بھی منسوخ ہو سکتی تھی۔ اس سے ہونے والا نقصان ہمہ گیر تھا۔ آدھا گھنٹا ہونے والا تھا اس لیے انہوں نے ووٹنگ کا طریقہ اپنایا۔ اس میں کلارا کو ایک کے مقابلے میں دو ووٹ سے شکست ہوئی اور طے پایا کہ تاوان ادا کر کے تصویر حاصل کی جائے۔ آدھے گھنٹے بعد کال گرومین کے موبائل پر آئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر دیا اور طنزیہ انداز میں بولا۔

"لگتا ہے تم ہم سب سے اچھی طرح واقف ہو؟"

"ہاں، تم نے درست کہا۔" وہ ہنسا۔ "اب کام کی بات کی جائے؟ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے... تصویر چاہتے ہو یا اس کی راکھ؟"

اس پر سولومن کچھ پریشان ہو گیا۔ گرومین نے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم تمہیں تاوان دینے کے لیے تیار ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تصویر تمہارے پاس ہے اور تم اسے واپس کر دو گے؟"

"کوئی ضمانت نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "میں سامنے آنے کا خطرہ بالکل نہیں لے سکتا۔"

"تب تم تک رقم کیسے پہنچائی جائے؟"

"پہلے تم رقم تیار کر لو۔" اس نے جواب دیا۔ "رقم کسی درمیانے بیگ میں اور موسو ڈالرز کے پرانے نوٹوں کی صورت میں ہو... جن پر کوئی نشان نہ ہو۔"

"اس کے لیے ہمیں کچھ وقت درکار ہوگا۔" گرومین نے کہا۔

"تمہارے پاس آج تک کا وقت ہے اور اتنی رقم تو تمہاری تجوریوں میں ہوگی۔ اس میں بلیک منی بھی ہے جس پر کبھی ٹیکس نہیں دیا۔ تم چاہو تو اس سے ادا کر سکتے ہو۔"

اس پر وہ تینوں ہی خاموش ہو گئے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس شخص نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کیا ہوا... چپ کیوں ہو گئے؟"

"تمہیں رقم مل جائے گی۔" کلارا نے خفگی سے کہا۔ "ہمارے معاملات پر بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں رات پھر کسی وقت کسی کو بھی فون کر کے معلوم کر لوں گا کہ رقم تیار ہے یا نہیں... پھر صبح بتاؤں گا کہ رقم کہاں اور کیسے پہنچانی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" گرومین نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے باقی دو کی طرف دیکھا۔

"کیا خیال ہے، خفیہ طریقے سے پولیس کو اس معاملے کی اطلاع نہ کر دی جائے؟"

"نہیں... نہیں۔" سولومن نے جلدی سے کہا۔ "وہ تصویر کو آگ لگا دے گا۔"

اس پر تینوں مالکان نے اسے نہایت سرد نظروں سے دیکھا۔ ڈین کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب سولومن کی خیر نہیں ہے اور وہ نوکری سے نکالا جائے گا تو یقیناً اس کی جگہ ڈین ہی ڈائریکٹر بنے گا۔ کلارا نے رکھائی سے کہا۔

"تمہارا اس معاملے سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ معاملہ نمٹ جائے، اس کے بعد تمہارے بارے میں بھی فیصلہ کرتے ہیں۔" گرومین نے کہا تو سولومن کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر ڈین کو اور خوشی ہوئی۔ وہ بہ مشکل اپنے تاثرات پر قابو پانے میں کامیاب رہا تھا۔

وہ باہر نکلے تو سولومن کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ڈین نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تو اس نے ڈین کا ہاتھ جھٹک دیا اور غرایا۔ "دور رہو مجھ سے... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے عزائم کیا ہیں۔"

ڈین نے ہاتھ جھٹکے جانے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور مسکرا دیا۔ "اگر تم جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ آخر تم خود بھی تو اسی طرح اس عہدے پر آئے تھے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں کی ہے۔ اگر تم یہاں فائر کیے گئے تو اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہوگا۔"

سولومن کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر پلٹ کر اپنے دفتر میں چلا گیا۔ اس روز دوپہر میں ان کی کنسلٹنٹ سیکیورٹی فرم کے نمائندے آئے اور انہوں نے مالکان کو ایک نیا فول پروف سیکیورٹی پلان دیا جس پر فوری عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ کالی جانے والی گرل دوبارہ فٹ کر دی گئی تھی اور اب ڈکٹ میں مزید ٹریپ لگائے جانے تھے۔ نئے سیکیورٹی کیمرے اور کچھ اور آلات بھی نصب ہونے تھے جن کے بعد آرٹ گیلری کی حفاظت کا معیار مزید بہتر ہو جاتا۔ ڈین کے ذمے یہ کام کروانا تھا اور جب اسے یہ ذمے داری سونپی گئی تو اسے لگا کہ ڈائریکٹر شپ اس سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گئی ہے۔

تاوان اور تصویر کی واپسی کا معاملہ مالکان نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اب ڈین کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اگلے دن وہ آرٹ گیلری پہنچا تو سولومن نے اسے بلا لیا۔ وہ سخت اشتعال میں تھا اور مارے غصے کے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ اس نے ڈین سے کہا۔

"یہ جو بھی ذلیل انسان ہے، اس نے مجھے تباہ کرنے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کون؟" اس نے انجان بن کر کہا۔

سولومن نے اسے زہریلی نظروں سے دیکھا۔ "اتنے انجان مت بنو... میں اس خبیث کی بات کر رہا ہوں جس نے تصویر چرائی ہے۔ پتا ہے اس نے کیا مطالبہ کیا ہے؟"

"نہیں۔" ڈین نے سچ کہا لیکن وہ جاننے کے لیے بے چین ہو گیا تھا کہ تصویر چرانے والے نے کیا مطالبہ کیا ہے۔

"اس نے کہا ہے کہ تاوان کی رقم میں لے کر جاؤں گا۔" سولومن گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "اب بتاؤ، میں رقم لے کر جاؤں گا تو کیا مجھ پر شک نہیں کیا جائے گا؟"

"بالکل کیا جائے گا۔" ڈین نے اعتراف کیا۔ "تو تم انکار کیوں نہیں کر دیتے؟"

"میں نے یہی کیا لیکن اس کی یہی شرط ہے ورنہ وہ تصویر نہیں دے گا۔ اس کتے کے بچے نے مجھے قربانی کا بکرا بنا دیا ہے۔"

"تم خود بھی تو دوسروں کے ساتھ یہی کرتے آئے ہو، اب خود کی باری آئی ہے تو بلبلا رہے ہو۔" ڈین نے دل میں کہا اور منہ سے بولا۔ "تب تو مجبوری ہے، تمہیں جانا ہی ہوگا۔"

"ظاہر ہے۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ جلد یہاں سے میری چھٹی ہو جائے گی۔"

"خدا وہ دن جلد لائے۔" ڈین نے دل میں کہا اور منہ سے بولا۔ "تم فکر مت کرو... اگر تمہیں یہاں سے نکال دیا گیا تو تمہاری جگہ سنبھالنے کے لیے میں ہوں نا۔"

سولومن نے اسے کاٹ دار نظروں سے دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولا۔ "اتنی خوش فہمی رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، ابھی تم اس عہدے کے قابل نہیں ہو۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے تمہیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔"

"مثلاً کسی کے خلاف سازش؟" ڈین نے معصومیت سے پوچھا۔ "لیکن میں کس کے خلاف سازش کروں کیونکہ تم تو ویسے ہی نکالے جا رہے ہو۔"

سولومن نے جواب دینا چاہا لیکن غصے کی شدت نے اس کی دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیا تھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے جیب سے شیشی نکالی اور گولی زبان تلے رکھ لی۔ ڈین مسکراتا ہوا اس کے کمرے سے نکل گیا لیکن دوا اپنے کمرے میں نہیں گیا بلکہ ہال میں منڈلاتا رہا۔ کچھ دیر بعد سولومن اپنے کمرے سے نکلا اور گرومین کے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں سے دو دس منٹ بعد ایک برائے سے بریف کیس سمیت برآمد ہوا۔ اس بار اس نے باہر کا رخ کیا تھا۔ وہ یقیناً تاوان کی

http://digestpk.blogspot.com/

رقم لے کر جا رہا تھا۔ ڈین کو نہیں معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا اور تصویر کس طرح واپس آئے گی۔ ممکن ہے تاوان کی ادائیگی کے باوجود تصویر واپس نہ ملے۔ اب وہ منتظر تھا کہ کب سولومن واپس آتا ہے اور یہ معاملہ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ سولومن کی واپسی کوئی دو گھنٹے بعد ہوئی اور وہ واپس آتے ہی سیدھا گرومین کے دفتر میں چلا گیا جہاں کلارا اور مائیکل بھی موجود تھے۔

پورٹ آرٹ گیلری کے تینوں مالکان صبح چھ بجے سے موجود تھے۔ تصویر چرانے والے نے کلارا کو فون کر کے تصدیق کی کہ انہوں نے رقم تیار کر لی ہے پھر اس نے کہا کہ وہ تینوں اور سولومن صبح چھ بجے گیلری میں موجود رہیں۔ وہ کسی وقت بھی فون کر کے ان کو بتائے گا کہ رقم کہاں، کیسے اور کس کے ذریعے بھیجنی ہے۔ اس لیے وہ سب صبح سے یہاں موجود تھے۔ ساڑھے نو بجے اس کا فون گرومین کو آیا۔ ”رقم تیار ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کیا رقم کے ساتھ حلفیہ بیان بھی بھیجوں؟“ گرومین پھٹ پڑا۔

”زیادہ طیش مت دکھاؤ۔“ اس نے خبردار کیا۔ ”ابھی تصویر میرے پاس ہے اور مجھے غصہ آ گیا تو میں رقم کی پروا کیے بغیر اسے تباہ کر دوں گا۔“

”اوہ نہیں...“ مائیکل پریشان ہو کر بولا۔ ”پلیز! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم سب ٹینشن میں ہیں اور ایسے میں آدمی کے منہ سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اب تم رقم والا بریف کیس سولومن کو دو اور اسے کہو کہ رقم لے کر باہر جائے اور جھیل کی طرف جانے والے راستے پر آ جائے۔ باقی ہدایات میں اسے دوں گا۔“

فون بند کر کے گرومین نے سولومن کو طلب کیا اور بریف کیس تھما کر اسے تصویر چرانے والے کی ہدایات دیں۔ ”اب وہ تم سے خود رابطہ کرے گا۔“

”بائی دی وے اس نے اس کام کے لیے تمہیں ہی کیوں منتخب کیا ہے؟“ کلارا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں میڈم۔“ سولومن بجھے ہوئے انداز میں بولا اور ان سب کو باری باری دیکھا۔ ”میں نے آپ سب کے کہنے پر یہ کام قبول کیا ہے جو میری ذمے داری نہیں ہے۔ اگر اس نے کوئی دھوکا کیا تو اس کا ذمے دار میں نہیں ہوں گا۔“

”خوب... تصویر چوری ہوتی ہے تو تم ذمے دار نہیں ہو۔“ کلارا نے طنز کیا۔ ”اور اب رقم دینے کے باوجود تصویر نہیں ملتی ہے، تب بھی تم اس کے ذمے دار نہیں ہو۔“

”ٹھیک ہے، تصویر چوری ہونے کی ذمے داری مجھ پر آتی ہے لیکن اس رقم کی ذمے داری مجھ پر نہیں آئے گی۔“ اس نے کہا۔

”ابھی تو تم رقم لے کر جاؤ۔“ مائیکل نے کہا۔ ”اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔“

سولومن ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اب کیا ہوتا تھا۔ وہ بریف کیس لے کر باہر آیا اور اپنی کار میں جھیل کی طرف جانے والی سڑک کا رخ کیا۔ چونکہ صبح کا وقت تھا اس لیے جھیل کی طرف جانے والے راستے پر بے انتہا رش تھا۔ اس نے آس پاس موجود گاڑیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آیا۔ آتا بھی کیسے؟ وہ کوئی جاسوس تو تھا نہیں، ایک آرٹ گیلری کا ڈائریکٹر تھا۔ تصویر چرانے والا یقیناً آس پاس موجود تھا۔ معاملہ ایک ملین ڈالرز کی رقم کا تھا اور وہ اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ گیلری مالکان نے خفیہ طور پر پولیس سے رابطہ کر لیا ہو اور وہ بھی آس پاس موجود ہو۔

جیسے ہی سولومن جھیل جانے والی سڑک پر آیا، اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”شاباش! تم لوگوں نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔“

”شکریہ۔“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”تمہیں رقم مل جائے گی اور گیلری والوں کو ان کی تصویر... لیکن میں تو مارا گیا۔“

”ایسا تو ہوتا ہے۔“

”میں نے سوچا تھا کہ ایک دو سال میں عزت سے ریٹائر ہو جاؤں گا لیکن تم نے میرے خواب چکنا چور کر دیے۔ اب مجھے فائر کیا جائے گا۔“

”ممکن ہے ایسا نہ ہو۔“ اس شخص نے کہا۔ ”ابھی تم کہاں ہو؟“

”میں ساتویں میل تک آ گیا ہوں۔“

”گڈ! اب تم ایسا کرو کہ دائیں طرف دیکھتے رہو۔ سڑک کے ساتھ پبلک فون بوتھ ہیں، ان میں سے ایک پر تمہیں آؤٹ آف آرڈر کی تختی نظر آئے گی لیکن الفاظ سیاہ کے بجائے سرخ رنگ سے لکھے ہوں گے۔“

سولومن دائیں طرف سڑک کے کنارے دیکھتا رہا۔ ایک میل سے پہلے ہی اسے مطلوبہ فون بوتھ نظر آ گیا۔ ”ہاں... نظر آ گیا۔“

”گڈ! اب اس کے ساتھ گاڑی روک کر نیچے اتر جاؤ۔“

”بریف کیس سمیت؟“

”نہیں، بریف کیس فرنٹ سیٹ پر چھوڑ دو اور کھڑکی کا شیشہ بھی کھلا رکھنا۔“

”پھر میں کہاں جاؤں؟“

”تم سڑک سے اتر کر کم سے کم سو گز دور چلے جاؤ... جلدی۔“

سولومن نے گاڑی فون بوتھ کے ساتھ روک دی اور خود اتر کر دور چلا گیا۔ فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ ”مڑ کر مت دیکھنا... ورنہ تصویر نہ ملنے کے ذمے دار تم ہو گے۔“

”فکر مت کرو، وہ تصویر مجھے بھی بہت عزیز ہے کیونکہ اسے میں نے دریافت کیا ہے۔“

”بس اتنا کافی ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اب رک جاؤ اور گھڑی دیکھ کر ایک منٹ بعد واپس آ جانا۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔“ اس نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

سولومن گھڑی کی طرف دیکھتا رہا اور ایک منٹ پورا ہوتے ہی سڑک کی طرف لپکا۔ اس کی گاڑی سے بریف کیس غائب تھا اور سڑک پر بے شمار گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اس نے آس پاس دیکھا اور پھر شانے اچکا کر گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کے لیے روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ کچھ دور گیا ہوگا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس بار کلارا تھی۔ اس نے سولومن کی آواز سنتے ہی کہا۔

”تم کہاں ہو؟“

”میں واپس آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، واپس جاؤ اور جس فون بوتھ کے پاس رکے تھے، اس میں تصویر موجود ہے۔“

یہ سن کر سولومن ... سے گاڑی لہرا گئی کہ وہ بیش قیمت تصویر اس فون بوتھ میں پڑی تھی۔ ”میرے خدا...“ اس کے منہ سے نکلا اور اس کے بعد عجلت میں گاڑی واپس موڑنے اور ون وے کے خلاف جانے کی وجہ سے کئی بار... حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ گاڑیاں اس کے پاس سے تیز ہارن بجاتی گزر رہی تھیں لیکن اسے اپنی قطعی پروا نہیں تھی۔ وہ واپس فون بوتھ تک پہنچا اور اتر کر بھاگتا ہوا اس میں داخل ہوا۔ بوتھ کے فرش پر... ایک لفافہ رول شدہ صورت میں پڑا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اسے کھولا تو اندر روغنی کاغذ اور پھر پلاسٹک شیٹ میں حفاظت سے لپٹا وان گوگ کا شاہکار موجود تھا۔ اسے دوبارہ دیکھ کر سولومن کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں اور اسے گاڑی کا سہارا لینا پڑا۔ جب اس کے دل کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو وہ باہر آیا اور تصویر کو حفاظت سے پچھلے حصے میں رکھ کر گیلری کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے گرومین کو کال کی۔

”تصویر مل گئی ہے... میں لے کر آ رہا ہوں۔“

”تصویر اصل ہی ہے نا؟“ گرومین نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں، تصویر وہی ہے۔“ سولومن نے اعتماد سے کہا۔ ”اسے میں نے دریافت کیا ہے اور میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد وہ گیلری میں تھا اور جیسے ہی وہ تصویر لے کر دفتر میں داخل ہوا، ان تینوں نے اسے گھیر لیا۔ اس سے تصویر لے کر اسے میز پر پھیلایا اور محدب عدسے سے اس کا معائنہ کرنے لگے۔ اگرچہ وہ آرٹ کے ماہر نہیں تھے لیکن اتنے عرصے سے اس کاروبار سے منسلک ہونے کی وجہ سے انہیں بھی کم سے کم اصل اور نقل کی پہچان ہو گئی تھی۔ کلارا نے سر ہلایا۔

”تصویر اصل ہے۔“

”چرانے والے نے اسے اچھی طرح محفوظ کیا ہے، کہیں سے معمولی سی خراب نہیں ہوئی ہے۔“

تینوں خوش تھے۔ اگرچہ ان کے ایک ملین ڈالرز نکل گئے تھے لیکن انہیں تصویر مل گئی تھی اور یہ سب انہوں نے اس شاہکار کو حاصل کرنے اور اپنی گیلری کی ساکھ بچانے کے لیے کیا... کیونکہ ایک بار یہ معاملہ سامنے آ جاتا تو عجیب و غریب قسم کی قیاس آرائیاں بھی ہونے لگتیں۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے خود انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا ہے یا پھر تصویر ہی جعلی تھی اور دنیا بھر سے آرٹ کے ماہرین اسے دیکھنے آ رہے تھے جنہیں دھوکا دینا ناممکن تھا اس لیے بہتر یہ سمجھا گیا کہ تصویر غائب کر دی جائے اور چوری کا شور مچایا جائے۔ اگر تصویر نہ ملتی تو ایسا ہی ہوتا اور اس کے نتیجے میں گیلری کی ساکھ جو برسوں میں بنی تھی، تباہ ہو کر رہ جاتی۔

سولومن منتظر تھا کہ کوئی اس کی طرف بھی توجہ دے گا لیکن تصویر ملتے ہی انہوں نے اسے یوں نظر انداز کر دیا تھا جیسے اس کا کوئی وجود نہیں ہو۔ آخر اس نے خود کہا۔ ”اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ کلارا نے رکھائی سے کہا۔ ”تم اب جا سکتے ہو، تمہارے بارے میں فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔“

کلارا کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آ گیا۔ اسے آرٹ کی

http://digestpk.blogspot.com/

دنیا کا اچھی طرح علم تھا، یہاں انسان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ خود بھی ان بے جان فن پاروں کے سامنے گوشت پوست کے انسان کو کچھ نہیں سمجھتا تھا لیکن آج جب اسے یوں نظر انداز کیا گیا تو اسے احساس ہوا۔ یہ اور بات تھی کہ احساس کرنا بے کار تھا کیونکہ وہ اپنے مالکان کی توکیا، اپنی فطرت بھی نہیں بدل سکتا تھا۔

ڈین باہر ہال میں موجود تھا۔ یہ ایک عمومی فن پاروں پر مشتمل ہال تھا جس کے اطراف میں انتظامیہ کے دفاتر تھے۔ ڈین نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ "کیا رہا باس؟"

"کچھ نہیں۔" سولومن تھکے ہوئے انداز میں بولا۔ "تصویر واپس آگئی ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے کیونکہ تصویر نہیں آتی تو اب تک پولیس آچکی ہوتی اور کچھ ہاتھوں میں یقیناً ہتھکڑیاں پڑ چکی ہوتیں۔"

سولومن نے اس کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں موجودہ صورتِ حال سے سبق سیکھنا چاہیے۔"

ڈین ہنسا۔ "ایک آرٹ گیلری میں کام کرنے کے لیے جو سبق درکار ہوتے ہیں، وہ میں پہلے ہی سیکھ چکا ہوں۔ باقی تم جس سبق کی بات کر رہے ہو، وہ اس دنیا میں نہیں چلتا۔"

سولومن نے سوچا اور سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

سولومن اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ڈین کو اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ نظر آئی۔ معاملہ نمٹ گیا تھا۔ شام تک گیلری میں سیکیورٹی کا نیا سسٹم بھی نصب ہو جاتا۔ کل یہاں کمرا نمبر بائیس کی ایگزی بیشن تھی۔ اس کے لیے بہت کم ٹکٹ اور پاس جاری کیے گئے تھے۔ صبح سات بجے سے دوپہر دو بجے تک عام لوگوں کے لیے مخصوص تھا اور اس کے بعد صرف ماہرین کو یہاں آنے کی اجازت دی جاتی۔ ٹکٹ بہت مہنگا تھا، اس کے باوجود تینوں دن کے ٹکٹ صرف ایک گھنٹے میں فروخت ہو گئے تھے۔ صرف وان گوگ کی تصویر غائب ہونے سے معاملہ گڑبڑ ہوا تھا لیکن ان لوگوں نے تصویر چرانے والے کو منہ مانگی رقم دے کر تصویر واپس لے لی تھی۔ وہ اپنا نقصان بھی جلد پورا کر لیتے۔

شام کے وقت ڈین چھٹی کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے باہر شور سنائی دیا۔ وہ باہر نکلا تو کلارا، سولومن کے دفتر میں جھانک رہی تھی۔ ڈین اس کی طرف لپکا۔ "میڈم! کیا ہوا؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ بے چارہ گزر گیا ہے۔" الفاظ کے برعکس کلارا کے لہجے میں کوئی افسوس نہیں تھا۔ ڈین نے اندر دیکھا۔ ایک سیکیورٹی گارڈ سولومن کی قمیص کا کالر کھول کر اس کے سینے کی مالش کر رہا تھا۔ اس نے ڈین کی طرف دیکھا۔

"ہارٹ اٹیک لگ رہا ہے، دل اور نبض دونوں رک گئے ہیں۔"

ڈین نے آگے آکر دیکھا۔ واقعی اس کا دل رک گیا تھا اور جسم سرد پڑ گیا تھا۔ اسے مرے ہوئے یقیناً کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ کلارا اور گارڈ مین اندر آئے۔ گارڈ مین نے ڈین کو حکم دیا۔

"اسے اٹھا کر نیچے پہنچا دو..... ورنہ ابھی طبی عملہ دفنانا ہی اس فلور پر آجائے گا۔"

ڈین اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ یہ بہت قیمتی فلور تھا اور یہاں ویسے بھی ہر کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی مگر طبی عملے کو اس کے کام سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں کے رویے سے لگ رہا تھا کہ انہیں اپنی آرٹ گیلری کے ڈائریکٹر کے مرنے کا کوئی دکھ نہیں اور اس وقت بھی انہیں یہاں موجود فن پاروں کی حفاظت کی فکر لگی ہوئی تھی۔ گارڈز نے حکم کے مطابق سولومن کی لاش نیچے ایک چھوٹے دفتر میں منتقل کر دی۔ اس دوران میں ایمبولینس آگئی تھی۔ ڈاکٹر نے سولومن کا معائنہ کیا اور بولا۔

"اسے مرے ہوئے یقیناً دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ کیا کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا؟"

ظاہر ہے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ طبی عملہ سولومن کی لاش لے گیا۔ ڈین کا خیال تھا کہ اگلے دن کی ایگزی بیشن پر اس کا کچھ اثر پڑے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ معمول کے مطابق ایگزی بیشن ہوئی اور انتظامیہ نے تعزیتی نوٹس تک نہیں لگایا۔ ڈین کے دل پر تھوڑا اثر ہوا لیکن بالآخر وہ بھی اسی دنیا کا باسی تھا اور وہ جلد سب بھول کر اپنی ذمے داریوں میں لگ گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ تینوں مالکان کو زیادہ سے زیادہ خوش کرے تاکہ اس کا ڈائریکٹر کی حیثیت سے تقرر پکا ہو جائے۔ اس لیے وہ ایگزی بیشن کے لیے پوری جان مار رہا تھا۔ وہ صبح چھ بجے آتا اور رات سب کچھ اپنی نگرانی میں بند کرا کے دس بجے تک جاتا۔ اس نے ایک طرح سے سولومن کی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ تیسرے دن ایگزی بیشن کا انتہائی کامیاب اختتام ہوا۔ اس روز شکاگو کا میئر بھی آرٹ گیلری آیا تھا۔ اسی دن سولومن کی تدفین تھی۔ تدفین میں سولومن کے قریبی عزیزوں اور چند دوستوں کے علاوہ کسی نے شرکت نہیں کی۔ آرٹ کی دنیا میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا اس لیے کسی نے شرکت بھی نہیں کی تھی۔

تینوں مالکان نے ایگزی بیشن کے بعد ڈین کو بلا کر اس

کی خدمات کو سراہا اور جب وہ جانے لگا تو کلارا نے اس سے کہا۔ "کل کا دن تمہارے لیے ایک سرپرائز لائے گا۔"

ڈین گھر جاتے ہوئے اس سرپرائز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اسے سولومن کی جگہ آرٹ گیلری کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا ہے۔ وہ خوابوں میں گھرا گھر پہنچا۔ کل وہ ڈائریکٹر بن جائے گا تو اس کی تنخواہ دگنی ہو جائے گی اور پھر وہ اس سے بھی اچھا مکان لے سکے گا۔ اس کا رتبہ بڑھ جائے گا۔ بڑی بڑی تقریبات میں اسے مدعو کیا جائے گا۔ دولت مند اس سے مشورے لیا کریں گے اور وہ آرٹ کی اپر کلاس میں شامل ہو جائے گا۔ اگلے روز وہ دفتر پہنچا تو نیچے ریسیپشن پر ہی اسے ہیری نے مطلع کر دیا۔ "مسٹر ڈین... نئے ڈائریکٹر اوپر کمرا نمبر بائیس میں تمہارے منتظر ہیں۔"

ہیری کی شفٹ بدل گئی تھی اور اب وہ مارننگ شفٹ کا گارڈز انچارج تھا۔ ڈین کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "تمہارا....." وہ کہتے کہتے رکا۔ "میرا مطلب ہے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

ہیری اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا اس لیے جب وہ بولا تو اس کا لہجہ سرد تھا۔ "یہ بھی تمہیں وہی بتائے گا۔"

ڈین ایک جھٹکے سے اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے کمرا نمبر بائیس تک پہنچا تو وہاں ایک جانی پہچانی شخصیت اس کی منتظر تھی۔ وہ وان گوگ کی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈین کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ مڑا اور اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "کیا حال ہیں میرے پرانے دوست؟"

"جارجی... تم؟" ڈین دم بہ خود رہ گیا پھر سنبھل کر بولا۔ "انہوں نے تمہیں گیلری کا ڈائریکٹر بنا دیا ہے؟"

"ہاں، میرا ارادہ تو نہیں تھا لیکن جب انہوں نے زیادہ ہی اصرار کیا تو میں مان گیا۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "انہوں نے پرانے واقعات پر معافی بھی مانگی ہے۔"

"تم آگئے... سولومن کا حشر دیکھنے کے باوجود؟" ڈین نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہاں کیونکہ مجھے پھر سے آغاز کرنے کا موقع مل رہا ہے تو میں اس کا فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں؟ جب میں یہاں سے نکالا تو مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ یہاں انسان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ اگر قدر ہے تو صرف اس کاغذ اور اس پر سجے رنگوں کی۔" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ کبھی مجھے موقع ملا تو میں اس سے فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔"

"تمہیں تو موقع مل گیا۔" ڈین نے سرد آہ بھری۔ "مگر میرا چانس مار گیا۔"

"ہاں لیکن تم ابھی جوان ہو اور تمہارے پاس بہت وقت ہے... اور سچی بات یہ ہے کہ تمہارے پاس اس تجربے کی کمی ہے جو ایک آرٹ گیلری کے ڈائریکٹر میں ہونا چاہیے۔ مجھے اندازہ ہے کہ سولومن نے تمہیں کچھ نہیں بتایا ہوگا لیکن تم مجھے ایسا نہیں پاؤ گے۔"

"یعنی تم مجھے اپنے گُر سکھاؤ گے۔"

جارجی مسکرایا۔ "کیوں نہیں... میں ضرور سکھاؤں گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کبھی موقع ملا تو تم میری چھٹی کرانے سے دریغ نہیں کرو گے۔"

ڈین چپ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ جس شخص کی وجہ سے جارجی اس آرٹ گیلری سے رخصت ہوا تھا، اسی کی وجہ سے وہ واپس بھی آگیا... تو قدرت نے اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی موقع ضرور رکھا ہوگا۔ اس نے سر ہلایا۔

"او کے باس... اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"کچھ نہیں، تم اپنی ذمے داریاں نبھاتے رہو اور تم مجھے برا باس نہیں پاؤ گے۔"

ڈین سر جھکا کر کمرا نمبر بائیس سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جارجی نے وان گوگ کی تصویر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا کیونکہ اسی تصویر کی وجہ سے اس کے حالات پھر سے بدلے تھے۔ ملازمت سے نکالے جانے سے اس کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ اس لیے اس نے وان گوگ کی اس تصویر کو چرانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے اس نے بہت دماغ سوزی کی اور بالآخر گیلری کے حفاظتی انتظامات میں نقص تلاش کر لیا۔ اس نے خود اندر گھس کر تصویر چوری کی۔ اسے یہاں کے تمام معمولات کا علم تھا۔ اس نے کیمرا ناکارہ کیا اور شیشہ کاٹ کر آرام سے تصویر نکال لی۔ اگرچہ وہاں اس سے بھی زیادہ قیمتی تصاویر تھیں لیکن اس نے جان بوجھ کر اس کا انتخاب کیا کیونکہ اسے سولومن نے دریافت کیا تھا اور اس کی تباہی کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ اسے اس کی توقع سے بڑھ کر ملا تھا۔ اسے ایک ملین ڈالرز تو ملے ہی تھے، ساتھ میں اسے دوبارہ پورٹ آرٹ گیلری کی ڈائریکٹر شپ بھی مل گئی تھی۔ یہاں تنخواہ بہت اچھی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ ریٹائرمنٹ سے پہلے تصویر چرانے کا کام پھر کرے گا تاکہ وہ ریٹائر ہو تو اس کے پاس معقول رقم موجود ہو۔ اس نے ایک نظر کمرا نمبر بائیس پر ڈالی اور دل ہی دل میں مسکرایا۔ ان لوگوں نے ایک چور کو پکڑنے کا محافظ بنا دیا تھا۔

http://digestpk.blogspot.com/

جب انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے لگتا ہے ... امیدیں مرجھانے لگتی ہیں تو ابلیس انسان کے نفس سے سازباز کر لیتا ہے ... نفس میں حرص و ہوس ... خواہش ... ضرورت کو جگا دیتا ہے ... خواہشات جتنی توانا اور ناممکن ہوں گی ... ابلیس انہیں اسی قدر آسان اور ممکن بنا کر دکھائے گا ... یوں انسان شیطانی چنگل میں پھنس کر ساری اعلیٰ قدروں سے دور ہوتا چلا جائے گا۔

ایک نفس پرور..... ابلیس صفت کی داستان جو خدائی فوج داری پر اتر آیا تھا

ابلیسِ دوراں

منظر امام

پہلا رنگ

جب بھی اس کا دل گھبراتا وہ اپنی بیوی سحرش کی طرف آ جاتا..... سحرش اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ ایک سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی شادی کو صرف دو سال ہوئے تھے اور دو سال بعد ہی سحرش کا انتقال ہو گیا۔

موت تو ایک اٹل حقیقت ہے لیکن کبھی کبھی کچھ لوگوں کی موت کو ہم قبول نہیں کر پاتے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ ایسے ہنستے گاتے ہوئے لوگ بھی مر سکتے ہیں اور موت انہیں اپنے ساتھ نہ جانے کہاں لے جاتی ہے۔

ان کی محبت کی شادی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہلی نگاہ میں پسند کر لیا پھر ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ دونوں ایک دوسرے سے واقف ہوتے چلے گئے۔ دونوں پڑھے لکھے اور مہذب تھے۔ ان کا گھریلو پس منظر بھی تعلیم یافتہ تھا۔

سحرش کے والد ایک ریٹائرڈ سرکاری آفیسر تھے۔ سحرش سے بڑے دو بھائی تھے۔ دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور اپنے اپنے طور پر زندگی گزار رہے تھے۔

ظفر اکیلا تھا اور والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بہن تھی جو شادی کے بعد کینیڈا جا کر آباد ہو گئی تھی۔ خود ظفر ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر رہا تھا۔

وہ ایک دوسرے کے لیے بہت مناسب تھے۔ سحرش کے گھر والوں نے بھی ظفر کو پسند کر لیا اور کچھ دن بعد ہی ان کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد ظفر کو احساس ہوا کہ محبت بھری زندگی کیا ہوتی ہے۔ سحرش نے اسے اتنا پیار اور سکون دیا کہ دنیا اسے خوبصورت لگنے لگی۔ ظفر..... تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سحرش یوں اچانک اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے گی۔

اس کی موت کے بہت دنوں تک وہ اسے اپنے ذہن سے فراموش نہیں کر سکا۔ وہ ہر وقت جیسے اس کے ساتھ رہتی تھی۔ پیار بھری باتیں کرتی ہوئی۔ اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہوئی۔

ظفر ہر دوسرے تیسرے دن اس کی قبر پر جاتا۔ وہ جب بھی اداسی محسوس کرتا تو قبرستان پہنچ جاتا۔ عام طور پر وہ شام کے وقت قبرستان آتا۔ قبرستان کی ازلی خاموشی اس کی یادوں کو اور مہمیز کر دیا کرتی۔

وہ محسوس کرتا جیسے اس قبرستان میں اس کے اور سحرش کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ جیسے وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ہو۔ اس سے کچھ کہہ رہی ہو کہ وہ کیوں یہاں آتا ہے۔ اس کی یادیں تو گھر میں بھی ہیں۔

اس شام اس نے سحرش کی قبر پر ایک ایسی چیز دیکھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ سحرش کے کتبے پر کراس کا ایک نشان بنا ہوا تھا۔ نہ جانے کس نے یہ نشان بنایا تھا اور کیوں بنایا تھا؟

اب ایسا بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ حکومت کی طرف سے قبروں کی گنتی کا معاملہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ نشان دوسری قبروں پر بھی ہونا چاہیے تھا۔ صرف سحرش کی قبر پر کیوں تھا.....؟ لیکن نہیں، کچھ فاصلے پر دو قبریں اور بھی تھیں ان پر بھی ویسے ہی نشان بنے ہوئے تھے۔ ظفر ان قبروں کے پاس گیا۔ دونوں کتبوں پر وہی نشانات تھے۔

اچانک اس نے ایک اور بات محسوس کی کہ یہ نشانات صرف عورتوں کی قبروں پر تھے اور مردوں کی قبروں پر نہیں تھے۔ تجسس سے مجبور ہو کر اس نے پورے قبرستان کا

اس طرح کے نشانات بارہ قبروں پر تھے اور سب کی سب قبریں عورتوں یا لڑکیوں کی تھیں۔ ان سب چیزوں میں ایک بات اور مشترک تھی کہ ان مرنے والیوں کے کتبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی اموات اسی سال ہوئی ہیں یعنی کسی کی بھی موت کو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا۔

جو کچھ بھی تھا۔ وہ بہت حیران کن اور پریشان کرنے والا تھا۔ یہ نشان کس مقصد سے لگائے گئے ہوں گے۔ اس نے دور کھڑے ہوئے گورکن کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پانی کی بالٹی لیے ہوئے اس کے پاس آ گیا۔

''جی صاحب! کس قبر پر پانی ڈالنا ہے؟''

''پانی بھی ڈلوانا ہے اور تم سے ایک بات بھی پوچھنی ہے۔''

''ہاں کہو صاحب! کیا پوچھنا ہے؟''

''ان قبروں پر یہ نشانات کس نے لگائے ہیں؟'' اس نے نشانات کی طرف اشارہ کیا۔ گورکن خود بھی حیران دکھائی

''پتا نہیں صاحب! مجھے تو نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے کوئی رات میں لگا گیا ہو۔''

''کیوں، کیا رات میں تمہاری ڈیوٹی نہیں ہوتی؟''

''ہوتی ہے صاحب... مجھے اور کہاں جانا ہوتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن میں تو اپنی کوٹھری میں ہوتا ہوں۔ اب مجھے کیا معلوم کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔''

''یہ لو پچاس روپے۔'' ظفر نے پچاس کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اور نظر رکھنا۔ میں ہر دوسرے یا تیسرے

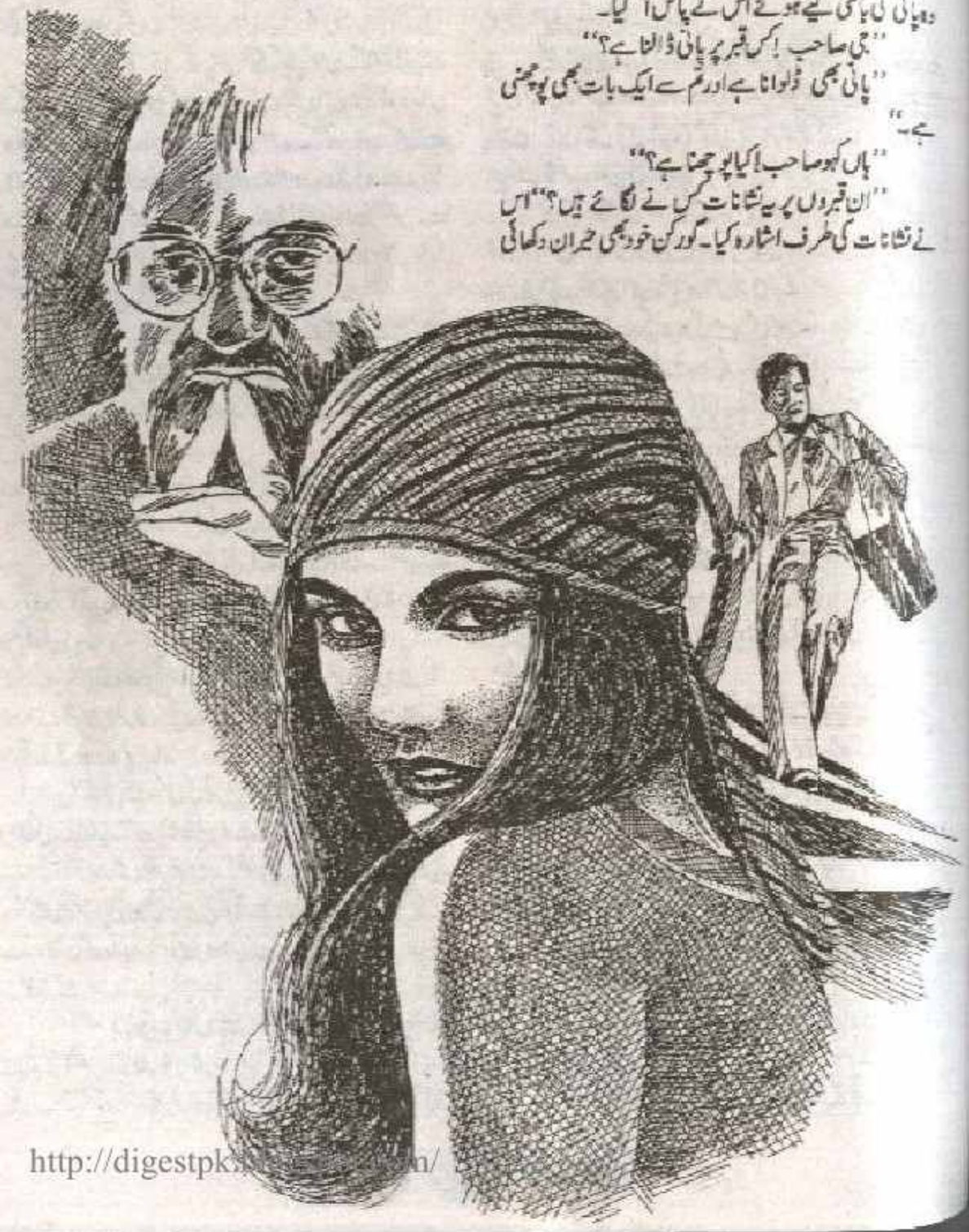

http://digestpk

دن یہاں آتا رہتا ہوں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے بتا دینا۔"

"ضرور صاحب! بالکل بتا دوں گا۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔"

ظفر نے اپنی بیوی کی قبر کو رخصتی سلام کیا اور قبرستان سے باہر آ گیا۔ اس کی گاڑی سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی اور گاڑی کے پاس کوئی تھا۔

اندھیرا پھیل گیا تھا۔ یہاں روشنی کا بھی انتظام نہیں تھا۔ ظفر کو وہ کوئی لڑکی ہی دکھائی دی جو اس کی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی تھی۔

ظفر اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ لڑکی ہی تھی۔ اندھیرے میں اس کے خدوخال دکھائی تو نہیں دے رہے تھے لیکن اس کے قد اور جسم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی جوان اور خوبصورت لڑکی ہے۔

"کیا یہ گاڑی آپ کی ہے؟" اس نے ظفر سے پوچھا۔ اس کی آواز بہت دل کش تھی۔

"جی ہاں۔" ظفر نے جواب دیا۔

"کیا آپ مجھے شہر تک لفٹ دے سکیں گے؟" اس نے پوچھا۔ "میں یہاں ٹیکسی سے آئی تھی۔ اس کم بخت سے کہا بھی تھا کہ وہ کچھ دیر انتظار کرے لیکن شاید وہ ڈر کر بھاگ گیا۔"

"آپ کس طرف جائیں گی؟" ظفر نے پوچھا۔

"سولجر بازار۔" لڑکی نے بتایا۔

"چلیں، میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔" ظفر نے کہا۔ "آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"بہت بہت شکریہ۔" لڑکی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"اس طرف کیسے آنا ہوا؟" ظفر نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے، کسی کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آئی تھی۔" لڑکی نے بتایا۔ "میرا نام علیزہ ہے۔" اس نے اضافہ کیا۔

"اور میں ظفر ہوں۔" ظفر نے اپنا تعارف کروا دیا۔

"میں اکثر اپنی بیوی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آتا ہوں۔"

"اوہ..... افسوس ہوا یہ سن کر۔ کب انتقال ہوا ان کا؟"

"صرف ایک سال پہلے اور شادی کے صرف دو سال بعد۔" ظفر نے بتایا پھر اضافہ کیا۔ "ہم نے لو میرج کی تھی۔"

"اوہ..... پھر تو اور بھی افسوس ہوا۔" علیزہ نے کہا۔

"خدا آپ کو صبر دے۔"

اس دوران میں گاڑی شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ سگنل بند تھا۔ ظفر نے گاڑی روک دی۔ ایک پولیس والا اس کی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ اس نے ظفر سے درخواست کی۔ "پلیز! اپنی گاڑی لائن سے پیچھے کریں۔ آپ بہت آگے آ گئے ہیں۔"

"سوری۔" ظفر نے ریورس گیئر لگایا اور اسی وقت اس کے ذہن کو ایک شدید قسم کا جھٹکا لگا۔ وہ لڑکی گاڑی میں نہیں تھی۔ اس نے بوکھلا کر پولیس والے کی طرف دیکھا جو کسی اور طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

ظفر سن ہو کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لڑکی کہاں غائب ہو گئی۔ اسے وہ فلمیں اور کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں اسی طرح کوئی پُراسرار لڑکی ملتی ہے اور اچانک غائب ہو جاتی ہے۔

تو کیا وہ لڑکی.....! نہیں۔ اس کا وجود تو بالکل ٹھوس تھا۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ گیئر تبدیل کرتے ہوئے ایک دو بار اس کا ہاتھ اس لڑکی کے جسم سے بھی ٹکرایا تھا۔ تو پھر وہ غائب کیسے ہو گئی؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جس وقت پولیس والے کی طرف دیکھ رہا تھا، اسی وقت وہ پیچھے سے اتر گئی ہو لیکن کیوں..... اس نے ایسا کیوں کیا تھا.....؟

اس قسم کے نہ جانے کتنے سوالات تھے جن کے جواب اس کے پاس نہیں تھے۔

☆☆☆

اس بوڑھے کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ بہت غور سے اس آدمی کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے بیٹھا ہوا گڑگڑا رہا تھا۔ گڑگڑانے والا اپنے حلیے اور لباس سے ذی حیثیت دکھائی دیتا تھا۔

اس کی انگلیوں میں قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں تھیں اور اس کا لباس بھی بہت شاندار تھا۔ وہ اس بوڑھے سے کہہ رہا تھا۔ "بس ایک بار اور اس کے بعد میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" بوڑھے نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہارا نروس سسٹم تباہ ہو چکا ہے۔ تمہاری پوری میڈیکل رپورٹ میرے پاس ہے۔ تمہارا دل بھی کمزور ہو چکا ہے۔ اس لیے میں تمہارا قاتل نہیں بنوں گا۔"

"میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں اپنی ذمے داری پر کر رہا ہوں۔" اس آدمی نے کہا۔ "آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔" بوڑھا سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں صرف ایک خوراک دے رہا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم میرا مشورہ مان لو گے۔"

"میں نے کبھی انکار کیا ہے؟" اس آدمی نے کہا۔ "لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں سلگ رہا ہوں۔"

"تو پھر انتظار کرو۔ میں ابھی آیا۔" بوڑھا اٹھ کر چلا گیا۔ اس کی عمر ساٹھ اور پینسٹھ کے درمیان ہو گی لیکن اس کی جسمانی ساخت بہت مضبوط تھی۔ اس کی چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک صحت مند انسان ہے۔

انتظار کرنے والا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا پھر ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس آدمی کی آنکھیں اسے دیکھ کر چمک اٹھیں۔ لڑکی بُرا سا منہ بنائے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اچھا ہوا تم آ گئیں۔" اس آدمی نے کہا۔ "کچھ دیر بعد مجھے تمہاری ہی ضرورت پڑنے والی تھی۔"

"جانور بننے جا رہے ہو۔" لڑکی بھڑکی۔ "وحشی، درندے، آخر کیوں کرتے ہو یہ سب۔"

"یہ تم خود جانتی ہو۔" اس آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں۔" لڑکی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت بوڑھا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی تھی جس میں کوئی محلول بھرا ہوا تھا۔ لڑکی اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب وہ بے حد خوفزدہ سی دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ لو۔" بوڑھے نے وہ شیشی اس آدمی کی طرف بڑھائی۔ "یہ ایک بار کے استعمال کے لیے ہے لیکن تمہیں دو کام کرنا ہوں گے۔"

"میں حاضر ہوں جناب۔" اس آدمی نے شیشی لیتے ہوئے کہا۔

"تم ان کے ساتھ جاؤ گی۔" بوڑھے نے اس لڑکی کو مخاطب کیا۔

"سر! آپ..... وہ۔" لڑکی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز بھرا کر رہ گئی۔

"شٹ اپ۔" بوڑھا غصے سے دہاڑا۔ اس کی آواز سے پورا کمرا جھنجھنا کر رہ گیا۔ لڑکی کسی فاختہ کی طرح سہم کر رہ گئی تھی اور وہ بُری طرح کانپنے لگی۔

"جی اچھا۔" اس نے کہا۔

اس آدمی نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور اس لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بوڑھے نے کمرے کی میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد ایک ملازم سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ چینل والے کہاں ہیں؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں جناب۔"

"ہوں۔" بوڑھے نے ہنکارا بھرا۔ "ان سے کہہ دو میں آ رہا ہوں۔"

ملازم باہر چلا گیا۔ بوڑھے نے ایک میز کی دراز کھولی، اس میں سے جالی کی بنی ہوئی سفید ٹوپی نکال کر پہنی۔ ہاتھ میں ایک تسبیح لی اور لاؤنج میں پہنچ گیا۔

چینل کے نمائندے لاؤنج میں تھے۔ ایک اینکر پرسن، ایک لائٹ مین اور ایک کیمرا مین۔ وہ سب اسے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔

"تشریف رکھیں، مجھے گناہ گار نہ کریں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص اپنا ٹھکانا جہنم میں سمجھ لے جو اس انتظار میں رہتا ہو کہ دوسرے اسے دیکھ کر کھڑے ہو جائیں۔"

"سبحان اللہ جناب۔" اینکر نے کہا۔ "آپ جیسے لوگوں کا وجود ہمارے لیے نعمت ہے۔"

"فرمائیں، آج کیسے زحمت کی آپ لوگوں نے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"سر! آج آپ سے اس موضوع پر رائے لینی تھی کہ ہمارے ملک میں برداشت کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے؟" اینکر پرسن نے کہا۔

بوڑھا خاموش رہا۔ اینکر پرسن کے اشارے پر لائٹ سیٹ کر دی گئی۔ کیمرا مین نے اپنا کیمرا سنبھال لیا۔ اینکر پرسن نے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ناظرین، السلام علیکم! آج ہم ایک اہم ترین موضوع پر مشہور مفکر، دانش ور، مذہبی اسکالر جناب داور حنا صاحب کی رائے لینے آئے ہیں۔ ناظرین! داور حنا ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ انسان ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اب سے بیس سال پہلے انہوں نے یہودی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ پانچ سال پہلے مدرسے میں قرآن، فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کرتے رہے پھر آپ نے ایک پاکستانی خاتون سے شادی کر لی اور پاکستان آ گئے۔ داور حنا صاحب نے حکومتِ پاکستان کے لیے کئی پروجیکٹس بھی اخذ کیے اور ان کے مشوروں کو پورے ملک میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج ہم ان سے معاشرے میں بڑھتے ہوئے تشدد کے رجحان پر بات کرنے آئے ہیں۔"

داور حنا نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ "دیکھیں ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ لوگ انصاف ملنے

http://digestpk.blogspot.com/

[illegible] ہیں۔ [illegible] جہاں عدل و انصاف
نہ ہو وہاں اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ حکومتیں شاید ظلم کی بنیاد پر تو قائم رہ جائیں لیکن ناانصافی کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتیں۔" پھر انہوں نے اپنی تقریر میں قرآن اور احادیث کے حوالے دینے شروع کردیے۔ اینکر پرسن ان کی شیریں بیانی اور علم سے مرعوب ہوتا جارہا تھا۔

☆☆☆

وہ چھوٹی سی کار تھی۔ دو نشست والی اس کار کی بناوٹ دوسری گاڑیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کار ایک ویران سی سڑک پر کھڑی تھی۔

اس کار کے دونوں طرف کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں۔ ایک چینل والا کسی طرح بھٹکتا ہوا کیمرا اٹھائے اس طرف آنکلا تھا۔

کار میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خود اعتمادی کی مسکراہٹ تھی۔ اس دوران میں چینل والا اس کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

"جناب! کیا آپ کو اپنے تجربے کی کامیابی کا یقین ہے؟"

"سو فی صد۔" نوجوان نے جواب دیا۔ اس کا نام رمیز تھا۔

"رمیز صاحب! یہ بتائیں کیا اس گاڑی میں کسی بھی قسم کے ایندھن کی ضرورت نہیں پڑے گی؟"

"بالکل نہیں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس میں پیٹرول ہے نہ ڈیزل اور نہ کسی قسم کی گیس ہے۔" رمیز نے بتایا "اور یہ سولر سسٹم سے بھی نہیں چلے گی۔"

"تو پھر کیا فارمولا ہے؟"

"واہ صاحب......" رمیز ہنس دیا۔ "اس پروجیکٹ پر میں نے دو سال محنت کی ہے۔ اس کا فارمولا میں آپ کو یوں ہی بتا دوں۔" آس پاس کھڑے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہنس دیے۔ یہ سب رمیز کے ساتھی تھے۔ جو اس کے اس تجربے کو دیکھنے کے لیے یہاں جمع ہوئے تھے۔

ساتھیوں نے تالیاں بجانی شروع کردیں۔ رمیز نے چابی گھما کر انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی دوڑتی چلی گئی۔ اس کی رفتار بھی اچھی خاصی تھی۔

ویران سڑک پر وہ گاڑی دور تک چلی گئی پھر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ اب جب اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

پانچ منٹ بعد گاڑی دوبارہ دکھائی دی اور تیزی سے قریب آتی گئی پھر وہ ان لوگوں کے پاس آکر رک گئی۔ زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔ رمیز گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ "کامیابی مبارک ہو رمیز۔"

"بہت بہت شکریہ۔" رمیز اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔

اس کے ساتھیوں نے اسے کندھوں پر اٹھالیا۔ لوگ آگے بڑھ کر مبارک باد دے رہے تھے۔ چینل والا لوگوں کے تاثرات معلوم کر رہا تھا پھر اس نے رمیز کو جا پکڑا۔ "رمیز صاحب! آئندہ آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"دیکھیں جناب، میں نے یہ محنت اپنے ملک میں موجود توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے کی ہے۔" رمیز نے بتایا "میری یہ ایجاد قوم اور ملک کے لیے ہے۔ میں وزیراعظم صاحب سے مل کر اس کا فارمولا ان کی خدمت میں پیش کردوں گا تاکہ وسیع پیمانے پر ایسی گاڑیوں کی پیداوار شروع ہو اور ہم پیٹرول کے بحران سے بچ جائیں۔" لڑکے اور لڑکیوں نے زوردار تالیاں بجائیں۔

رمیز نے آج اپنے خوابوں کی تکمیل حاصل کرلی تھی۔ برسوں پہلے اس نے ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ بچپن ہی سے اسے ایجادات کا شوق تھا۔ صرف سات یا آٹھ برس کی عمر میں اس نے بیٹری کی مدد سے ایک ٹرانسسٹر بنالیا تھا اور اس سے ریڈیو کے پروگرام سنا کرتا۔ اس کا شوق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی جارہا تھا۔

اس کے والدین نے بھی اس کا پوری طرح ساتھ دیا۔ وہ خود بھی بہت تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ رمیز آگے چل کر بہت بڑا انجینئر بن جائے گا۔

ملک کی ایک بڑی انجینئرنگ یونیورسٹی سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے ذہین قسم کے لڑکے اور لڑکیوں کا ایک گروپ بنالیا تھا۔ یہ سب مختلف قسم کے پروجیکٹس کے بارے میں سوچتے اور اس پر کام کرتے رہتے تھے۔

ایسی کسی کار کا تصور سب سے پہلے رمیز ہی کے ذہن میں آیا تھا۔ اس نے اپنے گروپ سے بات کی تو سب نے اس کے اس خیال کو رد کردیا...... "نہیں بھائی ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا؟"

"اس لیے کہ کسی بھی آبجیکٹ کو حرکت کرنے کے لیے انرجی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ انرجی ایندھن فراہم کرتی ہے اور جب ایندھن ہی نہیں ہوگا تو انرجی کہاں سے آئے گی؟"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ انرجی کے بغیر گاڑی چلنے لگے گی۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ انرجی ہم گیس یا پیٹرول ..... سے حاصل نہیں کریں گے۔"

"تو پھر کیسے حاصل کریں گے؟"

"ہے ایک فارمولا۔" رمیز مسکرادیا "میں وہ ابھی ظاہر نہیں کروں گا لیکن اس پروجیکٹ کے لیے مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہوگی جو فی الحال میرے پاس نہیں ہے۔"

"اور وہ رقم کتنی ہوگی؟"

"کم از کم پانچ لاکھ۔" رمیز نے بتایا۔ "میں نے پورا حساب لگالیا ہے۔ ابتدائی طور پر پانچ لاکھ۔ اس کے بعد جب گاڑی کی زیادہ پروڈکشن کا معاملہ سامنے آئے گا تو پھر اخراجات آدھے ہوجائیں گے۔"

"اوکے۔" ماریا نے اپنی گردن ہلائی۔ "پانچ لاکھ میں دے رہی ہوں۔ تم اپنا کام شروع کرو۔"

سب نے تالیاں بجائیں۔

سب جانتے تھے کہ ماریا اور رمیز ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ماریا ایک دولت مند گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ کا شمار ممتاز صنعت کاروں میں ہوتا تھا۔ پانچ لاکھ کی رقم ماریا کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی پھر کام شروع ہوگیا۔

یونیورسٹی کے پروفیسرز نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی تھی پھر اس پروجیکٹ پر کام شروع ہوگیا...... اور دو سال کی مسلسل محنت کے بعد وہ کار سامنے آگئی جو پوری دنیا میں ہلچل مچانے والی تھی۔

رمیز جب گھر پہنچا تو اس کے والدین اس کے انتظار ہی میں تھے۔ انہیں بھی اس کی کامیابی کی خبر مل چکی تھی۔ "بیٹا، اب تم اس کار...... کو رجسٹر کروالو۔" اس کے باپ نے مشورہ دیا۔

"نو ڈیڈ! میں اسے اپنے استعمال میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اسے اپنی قوم کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔" رمیز نے کہا۔ "میں نے اس سلسلے میں وزیراعظم سے ملاقات کا پروگرام بنایا ہے۔ میں اپنا یہ فارمولا اپنی قوم کے حوالے کردوں گا۔"

"یہ بہت اچھا جذبہ ہے بیٹا۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔"

"ہاں، کچھ دیر پہلے دو آدمی تم سے ملنے آئے تھے۔" رمیز کی ماں نے بتایا۔ "وہ اپنا کارڈ دے کر گئے ہیں۔"

"اچھا...... کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہہ رہے تھے کہ تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔ یہ رہا ان کا کارڈ۔" ماں نے ایک وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

کارڈ پر کسی مسٹر ڈانڈیا کا نام تھا۔ عجیب سا نام تھا یوسف ڈانڈیا اور پتا شہر کی ایک مشہور بلڈنگ کی دوسری منزل کا تھا۔

"پتا نہیں، میں تو اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔" رمیز نے کہا۔ "انہیں ضرورت ہوگی تو پھر آجائیں گے۔"

وہ دونوں اسی رات پھر رمیز سے ملنے آگئے۔ ان دونوں نے اپنے نام جواد اور جمشید بتائے تھے۔ دونوں رمیز کو کچھ پُراسرار سے دکھائی دیے۔

"رمیز صاحب! آپ کو مسٹر یوسف ڈانڈیا صاحب سے ایک میٹنگ کرنی ہے۔" جواد نام کے آدمی نے کہا۔ "اور یہ میٹنگ آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔"

"ہم ان کا کارڈ بھی آپ کو دے کر گئے تھے۔" جمشید نے کہا۔

"لیکن میں تو کسی یوسف ڈانڈیا صاحب کو نہیں جانتا۔"

"لیکن وہ آپ کو جانتے ہیں۔" جواد مسکرا کر بولا۔ "اور آپ کو اپنے فائدے کے لیے ان سے ملنا ہے۔"

"میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آئیں؟"

"بس اتنا سمجھ لیں کہ آپ خطرے میں ہیں۔" جمشید نے کہا۔ "کسی وقت بھی آپ کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔"

"میری جان کو خطرہ...... وہ کیوں؟"

"یہ ساری باتیں آپ کو ڈانڈیا صاحب سے ملنے کے بعد پتا چلیں گی۔ آپ ہر حال میں کل صبح ان سے مل لیں ورنہ آپ کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔"

☆☆☆

ظفر آج پھر قبرستان کی طرف جارہا تھا۔ دو دن تک وہ ان واقعات میں الجھا رہا تھا۔ سحرش اور دوسری قبروں کے کتبوں پر کراس کے نشان پھر ایک لڑکی کا ملنا جس نے اپنا نام علیزا بتایا تھا اور جو اچانک ایک سگنل پر غائب ہوگئی تھی۔ یہ ایک الجھی ہوئی صورتِ حال تھی۔

اس نے اپنی گاڑی قبرستان کے گیٹ کے سامنے کھڑی کی اور [illegible]

http://kitaabghar.pk.blogspot.com

اچانک ایک درخت کی آڑ سے کوئی نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔

ظفر ٹھٹک کر رہ گیا یہ وہی لڑکی تھی، جو اُس دن ملی تھی۔ وہ تیزی سے اسی کی طرف آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ظفر اس سے کچھ کہتا، کسی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''سوری! مجھے معلوم ہے کہ تم اس وقت غصے میں بھرے ہوئے ہو کیونکہ اس دن میں سگنل پر تمہیں بتائے بغیر اتر گئی تھی۔''

''دیکھیں محترمہ میرا آپ سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ میں آپ سے ناراض ہوں البتہ مجھے آپ کی اس حرکت پر حیرت ضرور ہوئی تھی اور وہ آج بھی ہے۔''

''دیکھو، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' علیزے نے کہا۔

''ہاں کہو۔''

''تم اپنی بیوی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جا رہے ہو اور وہاں تم جو کچھ بھی دیکھو اس پر شور مت کرنا اور نہ ہی کسی ردِعمل کا اظہار کرنا۔''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔''

''یہ میں تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہی ہوں۔''

''ویسے تم ہو کون اور ان باتوں سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''یہ میں ابھی نہیں بتا سکتی، شاید آنے والا وقت میرے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دے۔'' علیزے نے کہا۔ ''تم اب جاؤ لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر ضرور دھیان دینا، خدا حافظ۔'' وہ تیز قدموں سے ایک طرف بڑھ گئی۔ ظفر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس لڑکی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لڑکی کے اوجھل ہو جانے کے بعد وہ قبرستان میں داخل ہو گیا۔

اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا اور اذیت ناک بھی۔ لڑکی نے کہا تھا کہ وہ جو کچھ بھی دیکھے اس پر کسی ردِعمل کا اظہار نہ کرے۔

سحرش کی قبر کھدی ہوئی تھی۔

درمیان سے پوری قبر چاک تھی۔ ظفر بوکھلا کر رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھدی ہوئی قبر میں جھانک کر دیکھا، وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا سوائے اندھیرے اور مٹی کے۔

آخر کیوں..... یہ کیا سلسلہ تھا؟

اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، کچھ فاصلے پر ایک اور قبر بھی اسی طرح کھدی ہوئی تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ اس نے اس قبر پر بھی کراس کا نشان دیکھا تھا۔

ظفر نے قبروں کے درمیان دوڑنا شروع کر دیا۔ تین چار اور کراس والی قبریں اس کے علم میں تھیں اور وہ سب کھدی ہوئی تھیں، یعنی کراس کے نشانات اسی لیے لگائے گئے تھے کہ وہ قبریں کھودی جائیں لیکن کیوں..... آخر کس نے ایسی حرکت کی تھی؟

اس نے گورکن کو تلاش کرنا شروع کر دیا، وہ ایک گوشے میں پھاوڑا ہاتھ میں اٹھائے ہوئے مل گیا۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' ظفر نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔ ''قبریں کیوں کھودی گئی ہیں اور کس نے کیا ہے یہ سب؟''

''میں تو خود پریشان ہوں صاحب۔'' گورکن نے کہا۔ ''یہ سب رات کے وقت ہوا ہے، جن جن قبروں پر نشانات لگے تھے ناسب کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ دھیان رکھنا؟''

''میں نے دھیان رکھا تھا صاحب۔ اس کے بعد پھر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ کل رات کو ہوا ہے۔ میں نے تو پولیس میں رپورٹ بھی لکھوا دی ہے۔''

''پھر کیا کہا پولیس والوں نے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ خود ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے صاحب! لوگ مرنے والوں کا بھی خیال نہیں کرتے۔''

''چلو میری بیوی کی قبر کو دوبارہ بھر دو۔'' ظفر نے کہا۔

''وہی میں بھی سوچ رہا تھا صاحب! یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا۔'' ظفر کو ایک گھنٹے تک قبرستان میں رہنا پڑا۔ گورکن اس دوران میں اپنا کام کرتا رہا۔

اس دوران میں اس کا دھیان اس لڑکی کی طرف بھی لگا رہا، وہ اس کے لیے ایک معما بن گئی تھی۔ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ قبرستان میں جو کچھ دیکھے اس پر کسی ردِعمل کا اظہار نہ کرے؟

کیا اسے معلوم تھا کہ سحرش کی قبر کھودی گئی ہے..... اگر معلوم تھا تو اس واردات سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ سوال ہی سوال تھے لیکن جواب ندارد۔

گورکن نے قبر بھر دی تو اس نے گورکن کو پیسے دیے اور قبرستان سے باہر آ گیا۔ وہ لڑکی پہلے کی طرح اس کی گاڑی کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ ظفر تیزی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

''آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کون ہو تم۔ میری بیوی کی قبر کھودی گئی ہے اور تم یہ سب جانتی ہو، بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے؟''

''میں نے کہا نا کہ تم کسی ردِعمل کا اظہار مت کرنا۔''

''جہنم میں گیا ردِعمل تم نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے؟ کیا ہو رہا ہے یہ سب؟''

''پریشان مت ہو۔ میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں، جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ میں شہر پہنچ کر بتا دوں گی۔''

''اور راستے کے کسی سگنل پر غائب ہو جاؤ گی۔''

''نہیں، اس بار ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ مسکرا دی۔ ''میں تمہارے ساتھ رہوں گی اور ہم کسی ایسی جگہ بیٹھ جائیں گے جہاں ہمیں کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہ ہو کیونکہ میں جو کچھ جانتی ہوں، وہ اب بتا دینا چاہتی ہوں اور اس کے لیے تم مناسب آدمی ہو کیونکہ تم خود بھی اس صدمے سے گزر چکے ہو۔''

''کیسا صدمہ؟''

''اپنی بیوی کی قبر کو کھدا ہوا دیکھنا۔ کیا یہ تمہارے لیے صدمہ نہیں ہے؟''

''کیا تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو؟'' ظفر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔''

''تو پھر تم میرے اپارٹمنٹ میں چلو، وہاں ہم اطمینان سے بات کر سکیں گے۔'' ظفر اور لڑکی کے درمیان راستے میں کوئی بات نہیں ہوئی..... ظفر نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن لڑکی نے اسے خاموش کرا دیا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے، میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ، جو کچھ پوچھنا ہو وہیں پوچھ لینا۔''

پون گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ظفر کے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ آ گئی۔ یہ ایک شاندار طرز کی عمارت تھی، یہاں کے رہائشیوں کے لیے پارکنگ بیس منٹ میں بنی ہوئی تھی۔

''تم یہیں رکو۔'' ظفر نے لابی کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔'' لیکن جب وہ گاڑی پارک کر کے آیا تو اس لڑکی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک ذہین طالب علم تھا۔ شمعون نام تھا اس کا۔ نسلاً یہودی تھا۔ اس کے والدین جنگِ عظیم کے زمانے میں جرمنی سے فرار ہو کر روس چلے گئے تھے۔ روس جاتے ہوئے انہوں نے اپنی مذہبی شناخت ختم کر دی تھی۔ وہ عیسائی ہو گئے تھے کیونکہ روس سے یہودیوں کو فلسطین کی طرف بھیجا جا رہا تھا اور وہ فلسطین نہیں جانا چاہتے تھے۔

شمعون روس ہی میں پیدا ہوا تھا۔ جنگِ عظیم کے دس سال بعد اس کی ذہانت بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ والدین کو اس پر فخر تھا۔

شمعون کو میڈیکل سائنس سے دلچسپی تھی۔ اب چونکہ حالات بہت بدل چکے تھے اس لیے میڈیکل سائنس اور میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم کے لیے شمعون کو برلن بھیج دیا گیا۔ یہاں اس نے اپنی ذہانت کے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔

برلن روانگی سے پہلے اس کے باپ نے اس سے کہا تھا۔ ''دیکھو بیٹا! تمہیں یہ علم ہوگا کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے عیسائی ہو گئے ہیں ورنہ ہم نسلاً یہودی ہیں۔ ہماری رگوں میں ہمارے یہودی آباؤ اجداد کا خون دوڑ رہا ہے۔ تم یہ بات کبھی مت بھولنا کہ ہماری ساری وفاداریاں اپنے وطن کے لیے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اس کے مفاد کا خیال رکھنا ہے۔ تم ایک سائنس داں بننے جا رہے ہو۔ کوشش کرو کہ تمہارا یہ علم اسرائیل کے کام آئے۔'' شمعون کو اس وقت ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی لیے اس کی تعلیم ہی سب کچھ تھی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر برلن چلا آیا۔

برلن ہی میں ایک دن دو آدمی اس سے ملنے کے لیے آ گئے۔ ''نوجوان! ہم ڈیوڈ اسٹار کی پکار لے کر تمہارے پاس آئے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''تم نسلاً یہودی ہو۔ یہ تو تمہیں تمہارے باپ نے بتا ہی دیا ہوگا۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

''تو بس اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے وطن کے لیے کام آؤ۔ یاد رکھو، یہودی دنیا میں چاہے کہیں بھی رہتے ہوں، ان کا وطن صرف ایک ہے اور وہ ہے اسرائیل۔''

''میں حاضر ہوں لیکن میں کس طرح آپ کے کام آ سکتا ہوں؟ کیا اس کے لیے مجھے اسرائیل جانا پڑے گا؟''

''نہیں، اسرائیل نہیں ہیں اور جانا ہوگا لیکن اس سے پہلے تمہیں چند مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔''

''کیسے مرحلے؟''

''ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے، تمہیں وہاں سے کچھ سیکھنا ہوگا۔ اس کے بعد آگے کی باتیں بتائی جائیں گی۔'' شمعون کے لیے اصل معنوں میں زندگی اب شروع ہوئی تھی۔ وہ مراحل آ گئے تھے جس کے لیے اس کے باپ نے اسے تیار کیا تھا اور اتنی تعلیم دلوائی تھی۔

دوسرے دن وہی دونوں اسے اپنے ساتھ ایک عمارت میں لے گئے، یہ ایک مختلف سی عمارت تھی۔ اس ایک

http://digestpk.blogspot.com/

منزلہ عمارت میں اسے کئی لوگ دکھائی دیے، یہ اپنی وضع قطع سے مسلمان لگ رہے تھے۔

شمعون کو ایک بھاری بھرکم گنجے آدمی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ....."خوش آمدید۔" اس نے کہا۔ "تم اپنے وطن کی خدمت کا جذبہ لے کر یہاں تک آگئے ہو لیکن تمہیں یہ حلف اٹھانا ہوگا کہ تم یہاں جو کچھ دیکھو گے اور جو کچھ سنو گے، اس کا ذکر تم کسی سے نہیں کرو گے۔"

"ٹھیک ہے، میں حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔" شمعون سے ڈیوڈ اسٹار پر حلف لیا گیا اس کے بعد اس کے فنگر پرنٹس لیے گئے۔ بے شمار تصویریں اتروائی گئیں پھر اس کا ایک بیان ریکارڈ کیا گیا جس میں اس نے کہا تھا "میں یہودی ماں باپ کی یہودی اولاد ہوں اور میری ساری وفاداریاں، ساری محبتیں اپنے اصلی وطن اسرائیل کے لیے ہیں۔ میں اپنا علم اپنی مہارت اور ذہانت اپنے ملک کے نام کر رہا ہوں۔"

حلف کے بعد اسے مبارک باد دی گئی پھر اسے ایک ہال میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بہت سے مسلمان قرآن شریف پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کی آوازوں سے پورا کمرا گونج رہا تھا۔

"یہ لوگ تو قرآن پڑھ رہے ہیں..... یہ مسلمان ہیں؟" شمعون نے پوچھا۔

"نہیں یہ مسلمان نہیں ہیں، یہ سب یہودی ہیں ہماری طرح، انہیں قرآن کی تعلیم اس لیے دی جا رہی ہے کہ یہ مسلمانوں کے اندر جا کر اپنا کام کر سکیں کیونکہ مسلمانوں کو شاید باہر کی قوتیں فتح نہ کر سکیں لیکن انہیں اندر سے ضرور کھوکھلا کیا جا سکتا ہے۔"

"سمجھ گیا تو اب میرا دوسرا کام یہ ہوگا کہ میں قرآن کی تعلیم حاصل کروں؟"

"ہاں لیکن دل میں یہ عزم رکھتے ہوئے کہ تم ایک یہودی ہو اور اس کے سوا تم کچھ نہیں ہو۔"

شمعون کو اس عمارت میں بہت سی چیزیں سکھائی گئیں۔ قرآن کی تلاوت، نماز کے طریقے، وظیفے، روزے اس کے بعد اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس کے ساتھیوں نے اس پر حیرت کا اظہار بھی کیا... لیکن کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ ایک مقامی اخبار میں اس کے مسلمان ہونے کی خبر بھی شائع کی گئی تھی۔

اس نے برلن کی ایک مسجد کے پیش امام کے ہاتھوں اسلام قبول کیا تھا۔ اس کا نام داور رکھا گیا۔ حنا اس کا خاندانی نام تھا اس لیے داور کے ساتھ حنا لگا دیا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد اسے حدیث و فقہ کی تعلیم کے لیے ایک مدرسے روانہ کر دیا گیا۔ اس نے پانچ سال وہاں گزارے..... پانچ سال کے بعد اسے پھر کچھ خاص لوگوں کے سامنے پیش ہونا پڑا۔

"نوجوان اب تمہاری عملی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ سمجھو کہ تم نے یہ سارے مرحلے اسی لیے طے کیے تھے۔ تمہیں اہم ترین ذمے داریاں سونپی جا رہی ہیں اور ہمیں امید ہے کہ تم ہمیشہ اپنی ذمے داریاں پوری کرتے رہو گے۔"

"ہاں، ہمیشہ کیونکہ میں اسی مقصد کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ اسی لیے تعلیم حاصل کی ہے اور اسی لیے مسلمان ہوا ہوں۔"

"شمعون تم اب اپنا پرانا نام بھول جاؤ گے تم داور ہو..... داور حنا اور اب تمہیں کسی مسلمان پاکستانی عورت سے شادی کرنی ہے، یہ بھی ہمارے مشن کا حصہ ہے۔"

"جی جناب تربیت کے دوران مجھے یہ بھی بتا دیا گیا تھا۔"

"کیا تم کسی مسلمان لڑکی کو جانتے ہو؟"

"جی ہاں تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں ایک فیملی سے میرے تعلقات رہے ہیں۔ اس کی ایک لڑکی میری دوست بھی رہی ہے۔"

"یہ اور اچھی بات ہے اب تم اس لڑکی سے راہ و رسم بڑھاؤ اور اس سے شادی کرو اس کے بعد تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ تمہیں اور کیا کرنا ہے۔"

اس مسلمان لڑکی کا نام سائرہ تھا جس کا باپ پروفیسر انوار برلن یونیورسٹی میں فزکس کا پروفیسر تھا۔ سائرہ اور شمعون ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔

سائرہ کو شمعون کی ذہانت پر حیرت ہوتی تھی۔ اس کی معلومات اور اس کا علم صرف اپنے مضمون تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ وہ بے شمار موضوعات پر باتیں کر سکتا تھا۔

سائرہ اور اس کے گھر والوں کو یہ معلوم تھا کہ شمعون ایک یہودی نوجوان ہے اس کے باوجود وہ اسے پسند کرتے تھے کیونکہ وہ ایک روشن خیال قسم کا یہودی تھا۔

ان لوگوں کو یہ سن کر خوشگوار حیرت ہوئی تھی کہ شمعون نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اب اس کا نام داور حنا ہے۔ داور کو بھی سائرہ اچھی لگتی تھی۔

اس نے سائرہ سے دوستی کر لی تو یہ سب اپنے لیے بھی کر رہا تھا اور اپنی تنظیم کے لیے بھی جس کے بارے میں اس نے سائرہ یا اس کے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

کچھ عرصے کی دوستی کے بعد اس نے تنظیم کے کہنے پر سائرہ کے لیے اپنا رشتہ بھیج دیا اور یہ رشتہ فوراً ہی منظور بھی کر لیا گیا اور شادی کے بعد وہ دو سال جرمنی میں رہے۔ اس کے بعد اسے آخری مرحلے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا گیا تھا۔

"شمعون، اب تم پاکستان جاؤ گے۔" اس سے کہا گیا۔

"پاکستان.....؟"

"ہاں، وہاں کی شہریت مل جائے گی تمہیں کیونکہ تم اب ایک جانے پہچانے انسان ہو۔ تم ایک مستند سائنس داں بھی ہو اور ایک اسلامی اسکالر بھی ہو۔ تم نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ تم وہاں کے معزز شہری کہلاؤ گے۔ اس معاشرے میں تمہارا خاص مقام ہوگا۔"

☆☆☆

داور حنا نے پاکستان آکر بہت ہوشیاری سے حالات کا جائزہ لیا..... اس کی شہرت اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی تھی۔ علمی اور مذہبی حلقوں میں اس کے نظریات کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ پاکستان میں اس کے پاس دولت اور افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن اسے بڑی ہوشیاری کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھنا تھا۔

وہ اپنی بیوی کے ساتھ پاکستان آیا تھا۔ یہاں آکر اس نے کرائے کا ایک مکان حاصل کر لیا پھر اپنی ایک کتاب شائع کروائی۔ منصوبے کے مطابق اس کی کتاب کی پندرہ لاکھ کاپیاں فروخت ہوئی تھیں۔

یہ ساری کاپیاں اسی کے ایجنٹوں نے خریدی تھیں۔ اس طرح یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کے پاس کتابوں کی فروخت سے بہت پیسے جمع ہو چکے ہیں پھر اس نے ایک عالی شان مکان خریدا، گاڑی خریدی اور لیکچرز دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ علمی اور مذہبی موضوعات پر اس کے لیکچرز نے ہلچل مچا دی تھی۔

روز بروز اس کی دولت اور طاقت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کا مکان سیاست دانوں، دانش وروں اور مذہبی اسکالرز کا گڑھ بن گیا۔ ہر طبقۂ فکر کے لوگ اس کے پاس آتے اور اس سے اظہارِ خیال کرتے۔

اس کی یہی پالیسی تھی۔ اس نے آتے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ پاکستان کے مسلمان ان گنت فرقوں اور مسالک میں تقسیم ہیں اور ان کے درمیان جتنی دوریاں بڑھیں گی اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔

سادہ لوح

ایک صاحب جب بھی احباب کی محفل میں پہنچتے، سارے لوگ انہیں دیکھتے ہی اپنی اپنی ناک پر رومال رکھ لیتے۔ کئی بار یہی ہوا تو انہیں تشویش ہوئی۔ ایک دوست سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ تمہارے موزے بہت بدبودار ہیں، انہیں بدل کر نئے موزے پہننا شروع کر دو۔

اگلے روز وہ صاحب نئے موزے پہن کر دوستوں کی محفل میں گئے اور دوستوں نے حسبِ معمول ناک پر رومال رکھ لیے۔ ان صاحب کو بہت غصہ آیا۔ تقریر کے انداز میں دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ "مجھے معلوم ہے، تم لوگ اپنی ناکوں پر رومال کیوں رکھتے ہو مگر اب میں نے نئے موزے پہن لیے ہیں۔ پرانے موزے اتار دیے ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو یہ دیکھو۔" انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور اسے لہراتے ہوئے بولے۔ "یہ دیکھو، یہ ہے وہ پرانے موزے۔ خدارا، اب تو اپنی ناکوں سے رومال ہٹا لو۔"

یہ اس کے وار کا ایک پہلو تھا۔ وہ لڑ رہا تھا اور کئی پہلو اس کے سامنے تھے۔

اس کی بیوی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ داور حنا نے پاکستان آکر بہت اہمیت حاصل کر لی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ داور حنا کے کئی چہرے ہیں اور کوئی اسے پہچان نہیں سکتا۔ اس وقت وہ تنہا تھا اور اپنی گاڑی خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی شاندار گاڑی شہری علاقوں کو پیچھے چھوڑ کر مضافات میں پہنچ چکی تھی۔

مرکزی سڑک سے ایک راستہ کچے کی طرف جاتا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی اسی راستے پر ڈال دی۔ اس پورے علاقے میں ایک خاص قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

یہ بو مرغیوں کی تھی۔ اس راستے کے دونوں طرف پولٹری فارمز بنے ہوئے تھے۔ اس کی گاڑی ایک فارم کے گیٹ پر رک گئی۔

گاڑی کو دیکھ کر فوراً ہی گیٹ کھول دیا گیا۔ وہ گاڑی کو اندر لے آیا۔ یہاں بھی ہر طرف مرغیوں کی بو تھی۔ سامنے جالیوں کے اندر بے شمار مرغیاں تھیں۔ کچھ لوگ اسے دیکھ کر جلدی سے قریب آگئے۔

اس نے سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک آدمی کی طرف دیکھا [illegible]

http://digestpk.blogspot.com

"بالکل ٹھیک ہے سر۔" اس نے جواب دیا۔ "ہم نے سیٹ اپ مکمل کرلیا ہے۔"

کئی کمروں کے بعد وہ ایک ہال میں پہنچ گئے۔

یہ ہال کوئی... تجربہ گاہ دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف الماریاں اور جار تھے جن میں مختلف رنگوں کے محلول ابل رہے تھے۔

اس نے اسی آدمی سے کہا۔ "وہ بندہ کہاں ہے؟"

"اندر کمرے میں ہے جناب۔" اس نے بتایا۔

"اور وہ گڑیا.....؟"

"وہ ہمارے پاس ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے میز پر رکھا ہوا ایک جار اٹھایا۔ جس میں کسی قسم کا مشروب بھرا ہوا تھا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے ایک گلاس میں مشروب بھر دیا۔

"وہ گڑیا لاؤ۔" اس نے حکم دیا۔

دوسرے کمرے سے ایک گڑیا اس کے پاس پہنچادی گئی۔ وہ گڑیا پوری عورت تھی..... خوبصورت عورت۔ اس کے بدن میں حرارت بھی تھی اور انسانی..... لمس بھی۔

"جاؤ" اس آدمی کو یہ شربت پلاؤ۔ اس کے بعد یہ گڑیا اس کے سامنے ڈال دینا۔" اس نے دوسرا حکم دیا۔ وہ آدمی گڑیا اور مشروب لے کر... دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

داور حنا ان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد ان دونوں کی واپسی ہوئی۔

"کیا رزلٹ دیا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہوئی جناب۔" اس نے بتایا۔ "صرف پانچ منٹ کے لیے اس کے بدن میں حرارت پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔"

"اوہ۔" اس نے..... گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس پروجیکٹ پر مجھے اور کام کرنا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اسے پاگل ہوجانا چاہیے تھا۔ خیر..... مجھے پھر سے کوشش کرنی ہوگی۔"

☆☆☆

سائرہ کو اپنے شوہر پر فخر بھی تھا لیکن کبھی کبھی وہ اس سے خوف بھی محسوس کرنے لگتی۔ خاص طور پر اس وقت جب سائرہ اپنی بچی کو اسلامی تہذیب کے بارے میں بتانے لگتی۔ اس وقت داور حنا کے چہرے کی رنگت بدل جاتی۔ وہ غصے سے کہتا۔ "سائرہ! یہ تم اس معصوم کے ذہن میں ابھی سے کیا باتیں ٹھونس رہی ہو؟"

"ٹھونس نہیں رہی بلکہ اسے اسلامی تعلیمات سے آگاہ کر رہی ہوں۔"

"یہی تو غلط ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ پھر یہ بچی بڑی ہو کر اسی راستے پر چلے گی جو راستہ تم نے اسے سکھایا ہوگا۔ یہ اپنی عقل اور شعور سے کام نہیں لے گی۔ یہ ایک مسلمان لڑکی تو ہوگی لیکن صرف اندھی تقلید والی۔ اس کے خیالات اسلام تک محدود ہو کر رہ جائیں گے۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے؟"

"لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خود فیصلہ کرے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ تم اسے صرف نام کی مسلمان نہ بناؤ بلکہ مکمل ایمان اور یقین کے ساتھ مسلمان بناؤ۔"

"لیکن یہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی ہے۔ اس کو تو مسلمان ہونا ہی ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ مجھے دیکھو، کیا میں مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا لیکن میں نے ریسرچ کی اور تلاش میں لگا رہا اور بالآخر مسلمان ہوگیا۔ اسی طرح اسے بھی تلاش کرنے دو اور اس پر اپنے نظریات مسلط نہ کرو۔"

"ایک بات تو بتائیں۔ آپ جس راستے پر چل رہے ہیں اسے آپ غلط سمجھتے ہیں؟"

"نہیں۔" داور حنا ذرا سی دیر کے لیے گڑبڑا گیا۔ "یہ راستہ بالکل صحیح ہے۔"

"تو پھر بچی کے لیے ایسا کیوں نہیں سوچ رہے؟ اسے راستہ بنا کر دے دیں تاکہ وہ ریسرچ کے جھنجٹ سے بچ جائے۔"

"یہ تم نہیں سمجھو گی۔ میں وہی کر رہا ہوں جو میرے والدین نے مجھے سکھایا ہے۔" داور نے کہا۔ "انہوں نے بھی مجھے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے میں آج اس مقام پر دکھائی دے رہا ہوں۔" سائرہ کی سمجھ میں داور کی باتیں نہیں آتی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے بچی کو تعلیم دینے کا سلسلہ ختم نہیں کیا..... یہ اور بات تھی کہ اب وہ داور کے سامنے بہت احتیاط برتتی تھی۔

اسے اب داور سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کبھی کبھی کچھ ایسے لوگ بھی داور سے ملنے آتے جو کسی طرح بھی پڑھے لکھے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجرمانہ ذہنیت والے ہیں۔

ایک بار اس نے داور سے ان لوگوں کے بارے میں دریافت بھی کرلیا۔

"تمہارا اندازہ صحیح ہے سائرہ۔ واقعی وہ معاشرے کے بُرے لوگ ہیں۔"

"تو پھر ایسے لوگ آپ کے پاس کیوں آتے ہیں؟"

"ہدایت لینے..... میں انہیں سچائی اور اچھائی کے راستوں پر چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی میری بات مان لی تو میرا مقصد پورا ہوجائے گا۔"

دوسری بات یہ کہ داور حنا کبھی کبھی دو چار دن کے لیے کہیں غائب ہوجاتا تھا۔ ایسے موقع پر وہ اکیلا ہی ہوتا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوپاتا کہ وہ کہاں ہے اور جب وہ واپس آتا اور سائرہ اس سے دریافت کرتی تو وہ سختی سے منع کردیتا۔

"سائرہ! تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ ہمارے ساتھ درجنوں مسائل ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ تمہیں ہر بات بتائی جائے؟"

اس وقت سائرہ کو محسوس ہوتا جیسے کوئی اجنبی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا ہے۔ یہ وہ آدمی نہیں ہے جس سے اس نے محبت کی تھی۔ جو ایک ذہین طالب علم تھا۔ جس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ جو پورے ملک میں ایک مذہبی اسکالر کے طور پر مشہور ہے شاید یہ کوئی اور ہے۔

داور حنا اب آہستہ آہستہ بدلتا جارہا تھا۔ اس کی مصروفیات انتہائی پُراسرار ہوتی جارہی تھیں۔

اس نے اپنے گھر میں ایک تہ خانہ بنا رکھا تھا جس میں جانے کی اجازت کسی کو بھی نہیں تھی۔ خود سائرہ بھی تہ خانے میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔

تہ خانے کے دروازے پر ایک بڑا سا لاک لگا ہوتا جس کی چابی صرف داور کے پاس ہی ہوتی تھی۔ اس تہ خانے میں کیا تھا یہ سائرہ کو ایک عرصے تک معلوم نہیں ہوسکا تھا۔

بالآخر ایک دن اسے تہ خانے کا راز معلوم ہوگیا۔

داور حنا تہ خانے میں تھا اور اتفاق سے اس کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس طرف سے گزرتے ہوئے سائرہ کو اس کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے مخاطب ہو کر زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن تعجب کی بات تھی کہ سائرہ کو کسی اور کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید داور اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا یا پھر کوئی ایسا تھا جو اب تک خاموش تھا۔

سائرہ سے برداشت نہیں ہوسکا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ تہ خانے میں اترتی چلی گئی اور وہاں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے لیے انتہائی حیرت انگیز اور صدمے کا سبب تھا۔

اس کا شوہر، معروف اسلامی اسکالر، مدرسے کا پڑھا ہوا ڈیوڈ اسٹار کے سامنے جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ جیسے اس کے سامنے اپنی عقیدت اور بندگی کا اظہار کر رہا ہو۔

سائرہ کو تہ خانے میں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا پھر انتہائی سرد لہجے میں کہا۔ "اوہ..... تو آج تم نے یہ دیکھ لیا۔"

"ہاں..... دیکھ لیا میں نے۔" سائرہ غصے سے بولی۔ "ایک ایسے شخص کو دیکھ لیا ہے جس کے چہرے سے اچانک نقاب اتر گیا ہے۔"

"سائرہ! کبھی نہ کبھی تو اس راز کو سامنے آنا ہی تھا۔ آج آ گیا اور ہاں..... یہ سن لو کہ میں یہودی تھا، یہودی ہوں اور یہودی رہوں گا۔"

"اور اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ کیا ہے؟"

"ڈھونگ۔" داور حنا مسکرا دیا۔ "اور یہ بھی جان لو کہ میرے نزدیک اپنے مقصد سے بڑھ کر اور کوئی اہم نہیں ہے۔ سوری سائرہ! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ کاش تم اس بھید سے واقف نہ ہوتیں لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

وہ آہستہ آہستہ سائرہ کی طرف بڑھنے لگا۔

سائرہ کو اس کے ارادے خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف جانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔

داور نے اسے بہت بے رحمی سے دبوچ لیا تھا۔

دوسرے دن لوگوں کو پتا چلا کہ مشہور اسکالر داور حنا کی بیوی پر اچانک پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اور اس دورے کے دوران اس نے خودکشی کرلی۔

یہ اور بات ہے کہ قبرستان کی طرف جاتے ہوئے داور حنا کی آنکھیں کچھ دیر کے لیے آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

☆☆☆

وہ ایک عام سا انسان تھا۔

اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ دیکھنے والے اس کی طرف متوجہ ہوتے۔

چھریرا سا جسم، سوئی سوئی آنکھیں اور ڈھیلی چال ڈھال۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس شخص کو جب کوئی کام دیا جاتا ہے تو اس میں چیتے جیسی پھرتی اور خون خواری آجاتی ہے۔

نام شنور درتھا اس کا۔ کرائے کا ایک بے رحم قاتل۔ اس کے جاننے والوں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ

http://digestpk.blogspot.com/

اس کے حلیے پر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ "یار — اپنا ڈھیلا پن چھوڑ، کوئی کام کر، ورنہ پڑے پڑے زنگ لگ جائے گا۔"

اس کے پڑوسی اور دوست احباب کو یہ معلوم تھا کہ شہزور کے پاس دو دکانیں ہیں — جو اس نے کرائے پر اٹھا رکھی ہیں اور کرائے کے پیسوں سے ہی وہ اپنی گزر اوقات کرتا ہے۔

وہ عام طور پر اپنے فلیٹ ہی میں پڑا رہتا تھا۔ اس لیے اب اسے ایسا کاہل انسان سمجھنے لگے تھے جو اپنی زندگی سے مطمئن ہو گیا ہو۔

کوئی اس سے کہتا۔ "یار، تیرا نام تو شہزور ہے لیکن خود تیری یہ حالت ہے کہ کوئی اگر ایک ہاتھ بھی مار دے تو اٹھ کر پانی بھی نہ مانگے۔" شہزور ایسی باتیں سن کر صرف مسکرا دیتا۔

وہ بڑی کامیابی سے اپنے دونوں روپ نبھائے جا رہا تھا۔ ایک طرف ایک عام سا مست انسان تو دوسری طرف ایک ایسا خطرناک اور بے رحم قاتل کہ جس کا نام سنتے ہی دشمنوں پر دہشت سوار ہو جاتی تھی۔

شہزور کی پلاننگ بھی شاندار ہوتی تھی۔

اسے جب بھی ایسا کوئی کام ملتا تو وہ کئی دن تک منصوبے بناتا رہتا۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا اور اتنے سائنسی اور منطقی انداز سے اپنے شکار کو اس کے انجام تک پہنچاتا کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں ملتا تھا۔

پولیس کے اعلیٰ حکام اور خفیہ اداروں کو یہ علم تھا کہ شہزور کون ہے؟ کیا کرتا ہے لیکن وہ اس کے منصوبے کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتے۔ ان کے پاس اس کے خلاف کوئی ... ثبوت نہیں ہوتا تھا۔

اس کو کنٹریکٹ بھی چند خاص لوگوں کے ذریعے ملتے تھے۔ وہ خاص لوگ جن کے لیے وہ کام کر چکا تھا۔

ایک بار ایک ایسا آدمی اس سے ملنے آ گیا جو شہزور کے لیے اجنبی تھا۔ وہ براہِ راست اس کے فلیٹ پر آیا تھا۔

"شہزور! ہمیں تم سے ایک خاص کام لینا ہے۔"

"کس قسم کا کام بھائی۔ میں تو ایک عام سا آدمی ہوں۔" شہزور نے کہا۔

"یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تم کیا ہو۔ تمہارے لیے دس لاکھ کی آفر ہے۔" دس لاکھ اس کو آج تک نہیں ملے تھے۔ لوگ زیادہ سے زیادہ چار پانچ لاکھ میں نمٹانے کی کوشش کرتے تھے پھر بھی اس نے بہت محتاط ہو کر کہا۔ "میں نہیں جانتا بھائی کہ تم مجھے کس بات کی آفر دے رہے ہو۔"

"تم سے ایک خاص کام لینے کی۔" اجنبی نے بتایا۔

"مجھے مسٹر گرین نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

"اوہ۔" مسٹر گرین کا نام سن کر شہزور ڈھیلا پڑ گیا۔ گرین اس کا پرانا کلائنٹ تھا۔ وہ اس کے لیے دو چار کام پہلے بھی کر چکا تھا۔

"تو بھائی پہلے ہی بتا دیتے۔" شہزور نے کہا۔ "کام کیا ہے؟"

"کام تمہیں ڈائنڈیا صاحب بتائیں گے۔" اس آدمی نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اس میں پتا لکھا ہے۔ شام تک یہاں آ جاؤ۔"

شہزور نے کارڈ دیکھ کر جیب میں رکھ لیا۔

وہاں ڈائنڈیا کے ساتھ ایک اور آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ڈائنڈیا نے اس کا تعارف کسی خفیہ ایجنسی کے سربراہ کی حیثیت سے کروایا تھا۔

"مسٹر شہزور! ہمارے پاس تمہارا مکمل ریکارڈ موجود ہے۔" اس آدمی نے کہا۔ "اس لیے تم یہ مت کہنا کہ یہ تمہاری لائن نہیں ہے یا تم یہ کام نہیں کر سکتے۔"

"کام بتاؤ، کیا ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ وہی جو تم کرتے آئے ہو۔" اس آدمی نے کہا۔ "لیکن اس بار ذرا مختلف انداز سے ہوگا۔ تمہیں یہ کام باہر جا کر کرنا ہوگا۔"

"باہر جا کر؟" شہزور چونک گیا۔

"ہاں، ملک سے باہر۔" اس نے کہا۔ "یہ سمجھ لو کہ تم اس بار یہ کام اپنے ملک اور وطن کے لیے کرو گے۔ کام وہی ہے لیکن ذرا وسیع پیمانے پر۔"

"بہتر ہے کہ مجھے سمجھا دیا جائے۔"

"کیوں نہیں۔" وہ آدمی سوچ میں پڑ گیا۔ دفتر کے ملازم نے شربت کا گلاس لا کر شہزور کے سامنے رکھ دیا۔

"پہلے تو یہ بتائیں کہ یہ دفتر کس قسم کا ہے؟" شہزور نے پوچھا۔

"ہم صلاحیتوں کو بہتر کرتے ہیں۔" ڈائنڈیا نے بتایا۔ "چاہے وہ کسی بھی قسم کی صلاحیت ہو۔ ہمارا کام پروموٹ کرنا ہے۔ حتیٰ کہ ہم تم جیسے لوگوں کو بھی تربیت فراہم کرتے ہیں۔" شہزور نے شربت کے گھونٹ لینے شروع کر دیے۔

"دیکھو، تمہیں فرانس جانا ہے۔" اس آدمی نے بتانا شروع کیا۔ ڈائنڈیا بہت غور سے شہزور کا جائزہ لیتا رہا۔ "تم جعلی کارڈ اور پاسپورٹ کے ذریعے یہاں سے بھیجے جاؤ گے۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟" شہزور کی کنپٹیاں جیسے سلگنے لگیں — آواز میں ہلکی سی لرزش آ گئی تھی۔

"تمہیں پیرس جا کر امریکن سفارت خانے پر ایک کرنا ہوگا۔" اس آدمی نے بتایا۔ "تمہاری کوشش یہ ہوگی کہ تم آس پاس کے جتنے آدمیوں کو گرا سکتے ہو گرا دو۔"

اسی وقت ایک خوبصورت لڑکی آ کر شہزور کے سامنے بیٹھ گئی۔ شہزور رفتہ رفتہ پاگل ہو رہا تھا پھر بھی اسے یہ ہوش تھا کہ یہ آدمی ایک خطرناک منصوبہ بنا رہا ہے۔

وہ لڑکی مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شہزور کو اب کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے اس لڑکی کے۔ وہ دفتر، ڈائنڈیا اور وہ آدمی، جیسے سب اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اب صرف وہ تھا اور ایک لڑکی تھی اور اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون آگ بن چکا تھا۔

اس آدمی کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "اس اٹیک کے بعد تمہیں ظاہر کرنا ہوگا کہ تمہارا تعلق پاکستان سے ہے۔" لڑکی شہزور کے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ آدمی... کہہ رہا تھا۔ "شہزور! وہاں تمہاری مدد کے لیے اور بھی لوگ ہوں گے۔" لیکن شہزور کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا۔ ایک لڑکی اس کے قریب تھی اور ایک آدمی اسے نہ جانے کیسی ہدایات دے رہا تھا۔

اس کے دل و دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا لیکن وہ آدمی... بولے چلا جا رہا تھا۔ اچانک شہزور نے ایک زوردار انگڑائی لی اور اس کے منہ سے خون کے فوارے نکلنے لگے۔ وہ کچھ دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

لڑکی چیخ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے لاش کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہوا؟" اس آدمی نے ڈائنڈیا سے پوچھا۔

"میں سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہے۔" ڈائنڈیا نے کہا۔ "اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہزور شراب پینے کے بعد اگر فوری طور پر خوراک نہ ملے تو دماغ کی رگیں پھٹ جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ یہ ضبط کرتے کرتے مر گیا۔"

"یہ بات باس کو بتا دو۔"

"یہ تو بتانا ہی ہوگا۔" ڈائنڈیا نے نمبر ڈائل کیا۔

☆☆☆

اس کا تعلق فرانس سے تھا۔ یزدانی نام تھا اس کا۔ فرانس کے شعبے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس نے ملک کی اقتصادی صورتِ حال بہتر بنانے کے لیے کئی شعبوں میں کام شروع کروا دیا تھا جس کے نتائج بہت بہتر سامنے آنے لگے تھے۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات داور حنا سے ہو گئی جس کی شہرت اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔ ایک بے مثال اسکالر اور ایک بڑا سائنس داں۔

داور حنا نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔ "یزدانی ..... اس ملک کو تم ہی جیسے ماہرین کی ضرورت ہے۔" داور حنا نے کہا۔ "تم جیسے لوگ ہی اس ملک کی قسمت بدل سکتے ہیں۔"

"آپ کی مہربانی ہے داور صاحب کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں۔" یزدانی نے کہا۔ "آپ تو خود ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔ اقتصادیات پر بھی آپ کی نگاہ بہت گہری ہے۔"

"یزدانی ..... تمہارے پاس وقت ہو تو کل شام کی چائے میرے ساتھ پیو۔ میرے ذہن میں کچھ منصوبے ہیں جن پر ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں نہیں، یہ تو میری خوش نصیبی ہوگی۔" یزدانی نے کہا۔ "میں کل شام کو حاضر ہو جاؤں گا۔"

یزدانی اپنے وعدے کے مطابق دوسری شام کو داور حنا کے پاس پہنچ گیا..... داور سے اس کی ملاقات ڈرائنگ روم میں ہوئی تھی۔ دونوں کچھ دیر تک ملک کی معاشی صورتِ حال پر باتیں کرتے رہے پھر داور نے کہا۔ "یزدانی! تمہیں دس منٹ اکیلے بیٹھنا ہوگا۔ میں عصر کی نماز پڑھ کر آتا ہوں۔"

"ضرور۔" یزدانی نے کہا۔

داور حنا اندر چلا گیا لیکن یزدانی اکیلا نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

وہ ایک خوبصورت اور بھرپور لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر یزدانی کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔

"میرا نام صوفیہ ہے۔" لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔ "میں داور صاحب کی سیکریٹری ہوں۔"

"سیکریٹری؟" یزدانی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔ داور صاحب جو کتاب لکھ رہے ہیں، میں اس کی پروفنگ دیکھتی ہوں۔ اس طرح آپ مجھے ان کا سیکریٹری سمجھ سکتے ہیں۔"

"جی ہاں، سمجھ گیا۔" یزدانی مسکرایا۔

http://digestpk.blogspot.com/

موضوع پر کتاب ہے؟"

"عالم انسان کو درپیش مسائل۔" صوفیہ نے بتایا۔

"بہت اچھا موضوع ہے اور ان جیسے لوگ ہی اس سے انصاف بھی کرسکتے ہیں۔"

اتنی دیر میں ملازم ایک ٹرے میں دو گلاس شربت لے آیا..... صوفیہ نے ایک گلاس اٹھا کر یزدانی کی طرف بڑھا دیا۔ یزدانی نے شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔

داور کو آنے میں دیر لگ رہی تھی اور یزدانی یہ چاہتا تھا کہ وہ ابھی کچھ دیر اور نہ آئے۔ صوفیہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ اسے ترغیب دے رہے تھے۔ اس کی رگوں میں خون کی روانی تیز ہوتی جارہی تھی۔ ایسی کیفیت اس نے کم ہی محسوس کی ہوگی۔

اس کی زندگی میں عورتوں کی کمی نہیں رہی تھی لیکن یہ صوفیہ..... جو نشے بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اگر کچھ دیر اور یہیں بیٹھا رہا تو وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔ اسے چلے جانا چاہیے لیکن صوفیہ کو وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ وہ تو اچانک اس کے قریب بہت قریب آگئی تھی۔

اس کی نرم اور خوش گوار سانسیں یزدانی کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس پر عجیب سی بے خودی طاری ہوتی جارہی تھی۔ اس وقت اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

نہ داور کی، نہ اپنی پوزیشن کی اور نہ ماحول کی۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ ایک مرد ہے۔ صدیوں کا پیاسا مرد اور اس کے سامنے ایک عورت ہے، صدیوں کی پیاسی عورت۔

صدیوں کی پیاسی اس عورت نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ یزدانی کا ہاتھ گرم ہورہا تھا۔ وہ موم کی طرح پگھلا جارہا تھا۔ صوفیہ نے اسے اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ اسے ایک کمرے میں لے آئی۔

پھر اس نے جو کچھ محسوس کیا، وہ اس کی زندگی کا سب سے سنسنی خیز، دل کش اور لذت آمیز تجربہ تھا۔ وہ پاگل ہورہا تھا اور بہرے..... خود کو تو وہ محسوس کر رہا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر وہ اس کمرے میں رہا..... شاید دس منٹ، ایک گھنٹا یا ایک برس پھر صوفیہ ہی اسے واپس ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

داور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ صوفیہ اس کے سامنے گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ یزدانی ابھی تک خود پر پوری طرح سے قابو نہیں پاسکا تھا۔

کچھ دیر بعد صوفیہ نے کہا۔ "میں اب چلتی ہوں۔ داور صاحب آرہے ہوں گے۔"

"تم سے پھر ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"ہاں، جب جی چاہے۔" صوفیہ مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔

داور بھی پانچ منٹ بعد ہاتھ میں تسبیح لیے کمرے میں داخل ہوگیا۔ "معاف کرنا بھائی، عصر کے بعد مجھے وظیفے پڑھنے پڑتے ہیں، اس لیے دیر ہوگئی۔ تم تو بور ہورہے ہوگے؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" یزدانی جلدی سے بولا۔ "میں اب اجازت چاہوں گا۔"

"ارے، ابھی تو تم سے باتیں بھی نہیں ہوئیں۔"

"آپ حکم دیں پھر حاضر ہوجاؤں گا۔"

"بھائی، یہ کسی بادشاہ کا محل نہیں ہے جہاں آنے کے لیے کسی تکلف کی ضرورت ہو۔" داور نے کہا۔ "تم جب جی چاہے آسکتے ہو۔" یزدانی پھر واپس آگیا۔

اس نے جو تجربہ حاصل کیا تھا، وہ اس کے حواس پر مسلط ہوکر رہ گیا تھا اور اگلی بار جب وہ داور حنا سے ملنے گیا تو وہ نہ صرف اس تجربے بلکہ داور حنا کا بھی غلام ہوچکا تھا۔ اس کے سامنے اسی تجربے کے حوالے سے کئی عدد تصویریں رکھ دی گئی تھیں جن میں وہ صوفیہ کے ساتھ موجود تھا۔

جب یہ تصویریں اسے داور نے دکھائیں تو اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرے چھانے لگے۔ اس کا حلق خشک ہوگیا۔ "داور صاحب! یہ..... یہ سب کیا ہے؟"

"اس کا جواب تو تمہیں دینا ہے کہ یہ سب کیا ہے؟"

داور خشک لہجے میں بولا۔ "تم دونوں کی یہ تصویریں ایک اخباری فوٹو گرافر نے اتاری ہیں۔"

"اخباری فوٹو گرافر نے.....؟"

"ہاں، وہ میری تصویریں لینے آیا تھا اور وہ تمہیں پہچانتا تھا۔ اس نے میری سیکریٹری کو تمہارے ساتھ کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ ان کم بختوں کو تو ایسے موقعوں کی تلاش رہتی ہے۔ اس نے کسی طرح تم دونوں کی یہ تصویریں اتار لیں۔" یزدانی کو احساس ہورہا تھا کہ داور جھوٹ بول رہا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ کوئی اخباری نمائندہ وہاں نہیں ہوگا۔ یہ سب اس شخص کی سازش ہے لیکن وہ داور کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

اس دوران میں ملازم پھر ویسے ہی شربت کے گلاس لے آیا..... "یہ لو شربت پی لو۔" داور نے ایک گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"داور صاحب! اس شام بھی پی کر میں اپنے ہوش میں نہیں رہا تھا۔" یزدانی نے کہا۔

"معلوم ہے مجھے۔" داور مسکرا دیا۔ "اب یہ بتاؤ کیا اس سے پہلے تم نے کبھی ایسا تجربہ کیا تھا؟"

"کبھی نہیں داور صاحب..... کبھی نہیں۔"

"تو بس یہ شربت پی جاؤ۔ صوفیہ بھی آرہی ہوگی۔" اس کے بعد یزدانی اس شربت کا غلام بن کر رہ گیا۔ اس شربت نے اسے ایسی لذت سے آشنا کیا تھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے اب اس کی بھی پروا نہیں رہی تھی کہ داور اسے کس طرح استعمال کر رہا ہے۔

اس نے اپنے محکمے کا ہر راز داور تک پہنچا دیا۔ اسے اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا کہ داور کون ہے اور وہ ایسی معلومات کیوں حاصل کر رہا ہے؟

☆☆☆

رمیز کو دو آدمیوں کے سامنے پیش کردیا گیا۔ اس کی ایجاد کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی تھی۔ کئی اخبارات نے اس کے انٹرویو شائع کیے تھے۔ چینل کے کیمروں کے سامنے اس نے مظاہرہ کرکے دکھایا تھا۔

ایندھن کے بغیر چلنے والی گاڑی ایک ایسا خواب تھی جو پوری دنیا کی توانائی کے بحران کو ختم کرسکتی تھی۔ خاص طور پر اس کے اپنے ملک کو اس سے کتنا فائدہ ہوسکتا تھا۔

ماریا اور رمیز دونوں مل کر بہت خوبصورت خواب دیکھ رہے تھے۔ ایک دن ماریا نے اس سے کہا۔ "رمیز! تمہیں میرے ڈیڈی سے میٹنگ کرنی ہوگی۔"

"وہ کیوں..... خیریت؟"

"ڈیڈی تمہیں جانتے ہیں۔ وہ تمہاری اس کامیابی سے بہت خوش ہیں۔" ماریا نے بتایا۔ "وہ تمہارے اس پروجیکٹ پر سرمایہ لگانے کو تیار ہیں۔ پچاس کروڑ، ساٹھ کروڑ یا جتنا تم چاہو۔"

"اوہو، یہ تو بہت بڑی آفر ہے۔"

"تمہاری ایجاد بھی تو بہت بڑی ہے۔ پوری دنیا میں ہلچل مچ گئی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں یہ پروجیکٹ اپنی قوم کے نام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارے ڈیڈ کے ساتھ کام کیا تو پھر فارمولا انہی کا ہوجائے گا۔"

"بے وقوف ہو تم۔ گاڑیوں کی پروڈکشن بھی تو اپنے ہی ملک میں ہوگی نا۔ تم کسی غیر ملک کے حوالے تو نہیں کررہے۔"

"ہاں، یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔"

"تو فوراً ان سے میٹنگ کرلو۔"

"لیکن اس سے پہلے میں اس یوسف ڈانڈیا سے ملنا چاہتا ہوں۔ دیکھوں تو وہ کون ہے..... کیا ہے؟" اس طرح وہ یوسف ڈانڈیا سے ملنے پہنچ گیا۔

اس کمرے میں دو آدمی تھے۔ ایک یوسف ڈانڈیا اور دوسرا ایسا آدمی تھا..... شناسا سا معلوم ہورہا تھا لیکن رمیز کو یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے اس آدمی کو کہاں دیکھا ہے۔

"مسٹر رمیز! یہ ہیں ہمارے پیٹرولیم کے وزیر۔" یوسف ڈانڈیا نے دوسرے کا تعارف کروایا۔ رمیز کو بھی یاد آگیا کہ اس نے اس شخص کی تصویر دیکھی تھی۔ اپنی باتوں اور انٹرویو کے حوالے سے وہ ایک دردمند دل رکھنے والا انسان معلوم ہوتا تھا۔

"مسٹر رمیز! ہمیں تمہاری صلاحیتوں پر فخر ہے۔" وزیر نے کہا۔ "اس قوم کو تم جیسے نوجوانوں کی ہی ضرورت ہے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"ہم نے تمہارے شاندار مستقبل کے لیے ایک پلاننگ کی ہے۔" یوسف ڈانڈیا نے بتایا۔ "ظاہر ہے کہ تم اور بھی بہت کچھ کرنا چاہتے ہوگے۔ آگے بڑھنے کی خواہش ہوگی؟"

"یہ کون نہیں چاہے گا جناب۔"

"تو ہم تمہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے برلن یونیورسٹی میں اسکالرشپ کی آفر کررہے ہیں۔" یوسف ڈانڈیا نے کہا۔

رمیز سکتے میں رہ گیا۔

بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور وہ بھی اسکالرشپ پر..... اس کے لیے بہت دل کش خواب تھا۔ وہ وہاں جا کر بہت کچھ کرسکتا تھا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اس آفر کا بہت بہت شکریہ جناب لیکن میں اپنے ہی ملک..... میں رہ کر کچھ کرنا چاہتا ہوں اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں بھی تعلیم کا معیار کسی سے کم نہیں ہے۔"

"واہ..... کیا اچھی بات کی ہے تم نے۔" وزیر نے کہا۔ "ویسے تمہارا جو فارمولا ہے، وہ تم نے پرنٹ تو کروالیا ہوگا؟"

"نہیں جناب! پرنٹ کیا کروانا۔ جو کچھ ہے وہ میرے ذہن میں ہے۔" رمیز نے بتایا۔ "جسے میں وزیراعظم اور قومی کمیٹی کے سامنے چینل کے کیمروں کے ذریعے ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔" یوسف ڈانڈیا اور وزیر نے ایک

http://digestpk.blogspot.com/

خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ یوسف ڈانڈیا نے ریسیور اٹھالیا..... ”جی جناب۔“ اس کا لہجہ بہت مؤدب ہوگیا۔ ”اس وقت اسی نوجوان سے ہماری میٹنگ چل رہی ہے۔ رمیز واقعی ایک محبِ وطن نوجوان ہے جناب۔ محبِ وطن تو سمجھتے ہیں نا۔ جی ہاں“ ہمیں اس کے اس جذبے کی قدر کرنی چاہیے۔“

ریسیور رکھ کر اس نے رمیز کی طرف دیکھا۔

”مسٹر رمیز! یہ ملک خوش قسمت بھی ہے اور بدقسمت بھی۔ خوش قسمت اس لیے ہے کہ یہاں تم جیسے نوجوانوں کی کمی نہیں ہے اور بدقسمت اس لیے ہے کہ یہاں ٹیلنٹ کی قدر نہیں کی جاتی۔“

”تو اب میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟“

”کچھ نہیں، تم جا سکتے ہو۔ ہماری دعائیں اور نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔“

”جناب! کیا آپ وزیرِ اعظم صاحب سے میری میٹنگ کروا سکتے ہیں؟“ رمیز نے وزیر سے پوچھا۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ انہیں تو خود تم سے مل کر خوشی ہوگی۔“ رمیز نے دونوں سے مصافحہ کیا اور اجازت لے کر اس بلڈنگ سے باہر آ گیا۔ ابھی تک اس کے پاس ایک پرانی بائیک تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد اس کے پاس درجنوں گاڑیاں ہوں گی۔

اس نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ایک ٹرک انتہائی تیز رفتاری سے اسے کچلتا ہوا....... غائب ہوگیا۔

اس ملک کے ایک محبِ وطن ذہین نوجوان کی کہانی اس طرح ختم کردی گئی۔

☆☆☆

ظفر اس پراسرار لڑکی کو بھلا نہیں سکا تھا۔ وہ دوبار اس کے سامنے آئی تھی اور دونوں ہی بار پُراسرار طور پر غائب ہوگئی تھی۔ ظفر اس کے بعد بھی قبرستان جاتا رہا لیکن اب وہاں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی۔

اب کسی قبر کے کتبے پر کوئی نشان نہیں تھا۔ پولیس میں رپورٹ ہوجانے کے باوجود کچھ پتا نہیں چل سکا تھا پھر اس نے بھی..... یہ معاملہ یوں ہی چھوڑ دیا۔

ایک شام وہ لڑکی خود ہی اس کے فلیٹ میں پہنچ گئی..... دروازہ کھولنے کے بعد جب ظفر نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ لڑکی مسکرا رہی تھی۔

”کیا تم پھر مجھے پریشان کرنے یا بے وقوف بنانے کے لیے آئی ہو؟“ اس نے کہا۔

”نہیں بلکہ میں تمہاری الجھن دور کرنے آئی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ تم نے مجھے کوئی بھٹکی ہوئی روح سمجھ لیا ہو یا کسی پُراسرار مافیا کی کوئی ممبر سمجھ رہے ہو۔“

”تمہارے انداز ہی ایسے ہیں۔“

”اب تو میں آ ہی گئی ہوں۔ کیا تم مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گے؟“

”آؤ اندر آ جاؤ۔“

لڑکی اندر آ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

”میں نے اس دن تم سے کہا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔“

”ہاں یاد ہے مجھے۔“

”میں بہت بے چین ہو کر آئی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”پتا نہیں مجھے یہ سب کہنا چاہیے یا نہیں لیکن کیا کروں۔ دل پر جو بوجھ ہے وہ سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہا۔“

”کیسا بوجھ ہے تمہارے سینے پر؟“ ظفر نے پوچھا۔

”کیا تم یقین کرو گے کہ میں ایک قاتل ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اور اب تک کم از کم چار نوجوانوں کو قتل کر چکی ہوں۔“

”قاتل تو ہو سکتی ہو۔“ ظفر مسکرا دیا۔ ”یہ اور بات ہے کہ تم نے یہ قتل اپنی اداؤں سے کیے ہوں گے۔“

”میں اس وقت تم سے مذاق نہیں کر رہی ہوں۔“ لڑکی جلدی سے بولی۔ ”تم میری کہانی سن لو پھر تمہیں یقین آ جائے گا کہ میں نے جو کہا ہے وہ سچ ہے۔“

”چلو سناؤ۔“

”میں اپنا نام بتا چکی ہوں۔ علیزا ہے۔ میرا نام۔“ اس نے کہا۔ ”پڑھی لکھی ہوں۔ میری ایک خواہش تھی کہ خوب پیسے کماؤں۔ دولت مند بن جاؤں اور یہ خواہش مجھے بھٹکاتی چلی گئی۔ مختصر یہ کہ میں ترقی اور دولت کے لالچ میں اس ملک کے ایک معزز آدمی کے پاس پہنچ گئی۔ میں ابھی اس کا نام نہیں بتاؤں گی۔ بس یہ جان لو کہ اس کی بہت عزت اور بہت شہرت ہے۔ اس نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اس کی شفقت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ میں باپ کے سائے سے محروم ہو چکی تھی۔ بہرحال اس نے مجھے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔“

”کس کام پر؟“ ظفر نے پوچھا۔

”ابتدا میں تو کوئی کام نہیں تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر بعد میں یہ ہوا کہ اس کے یہاں آنے جانے والے مہمانوں کی خاطر تواضع کا کام دیا گیا۔ یہ سمجھ لو کہ میں وزیر مہمان دار تھی۔ اس کے یہاں بڑے بڑے لوگ آتے۔ وزیر، سفیر، سیاست داں، صنعت کار اور نہ جانے کون کون پھر ایک دن یہ ہوا کہ میں وہاں اپنی عزت سے محروم کردی گئی۔“

”اوہ۔“ ظفر نے گہری سانس لی۔ ”ایسی ترقی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔“

”میں نہ جانے کیوں بے بس ہوگئی تھی۔ مجھے اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ایک اور بڑے آدمی نے مجھے پامال کردیا۔ یہ سب میں تمہیں مختصراً بتا رہی ہوں کیونکہ تمہیں میرے ساتھ مل کر لائن آف ایکشن بنانا ہے۔“

”چلو بتاتی جاؤ۔“

”میں وہاں سے فرار نہیں ہوئی۔ اس حادثے کے بعد میں وہیں رہی۔ میں نے یہ قسم کھالی تھی کہ میں اس شخص کے سیاہ کارناموں کو بے نقاب کر کے رہوں گی۔“

”اور اس کے سیاہ کارنامے کیا ہیں؟“

”اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا۔“ علیزا نے نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ”وہ اس ملک کو برباد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”وہ کس طرح؟“

”اس ملک کے ذہین ترین لوگوں کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے۔“ علیزا نے بتایا۔ ”وہ انہیں کسی کام کا نہیں رہنے دیتا۔ چاہے وہ کسی بھی شعبے کا فرد ہو۔ سائنس داں، ماہرِ معاشیات، صنعت کار، انٹیلی جنس کے لوگ، اسکالرز، مفکر، دانش ور، انجینئرز غرض یہ کہ ہر وہ آدمی جو اس ملک کو کچھ دے سکتا ہو یا اپنی ذات سے ملک کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، وہ اس کو ناکارہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ ان کی حالت ہیروئن زدہ کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ پھر کسی کام کے نہیں رہتے۔“

”میرے خدا..... پھر تو وہ بہت بھیانک سازش کر رہا ہے۔“

”بہت بھیانک۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس کا نتیجہ کتنا خطرناک ہونے والا ہے۔ جب ملک کے ذہین ترین لوگ مفلوج ہوجائیں گے پھر اس ملک کو کون چلائے گا اور کیسے چلے گا یہ ملک۔“

”پھر تو واقعی کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

”اس لیے دیکھ لو کہ ہم ہر سطح پر ناکام ہوتے جا رہے ہیں۔“ علیزا نے کہا۔ ”ہماری کوئی پالیسی نہیں ہے۔ ہر شعبے میں سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں ہے کیونکہ پلاننگ کرنے والے تو ایک ایک کر کے مفلوج ہو رہے ہیں۔“

”لیکن یہ سب ہوتا کس طرح ہے؟“ ظفر نے پوچھا۔ ”وہ لوگ کس طرح مفلوج ہوجاتے ہیں؟“

”ایک خاص قسم کے مشروب سے۔“ علیزا نے کہا۔ ”میں تمہیں اب اندر کی بات بتا رہی ہوں۔ وہ مشروب جب کسی شخص کو پلایا جاتا ہے تو اس کے جذبات سو گنا زیادہ ہوجاتے ہیں۔ وہ پاگل ہوجاتا ہے اور اسے اتنی لذت ملتی ہے جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ وہ پھر اس لذت کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔“

”بہت خطرناک صورتِ حال ہے۔“ ظفر نے تبصرہ کیا۔ ”لیکن تم پولیس کے پاس کیوں نہیں گئیں؟“

”کچھ بھی نہیں ہوگا کیونکہ خود پولیس کے اعلیٰ ترین حکام اس کی گرفت میں آ چکے ہیں۔“ علیزا نے بتایا۔ ”کچھ دن پہلے تک میں اس شخص کا ساتھ دے کر اس سازش کا ایک حصہ بنی ہوئی تھی لیکن اب مجھے اس سے نفرت ہوگئی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میرا ضمیر جاگ گیا ہے۔“

”کیا اب کوئی نیا واقعہ ہوا ہے؟“

”ہاں۔“ علیزا نے گہری سانس لی۔ ”ہاں..... ایسا ہی واقعہ ہوا ہے۔“

☆☆☆

وہ زراعت کے شعبے میں انقلاب پیدا کرنے والا تھا۔ زراعت سے اس کی دلچسپی بچپن ہی سے تھی۔ اس کے گھر میں ایک بڑا سا صحن تھا۔ وہ اسکول سے واپس آنے کے بعد اس صحن میں نہ جانے کیسے کیسے پھول اور پودے لگاتا رہتا۔ اس کے والدین اس کے شوق کو دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔

اس کا باپ کبھی کبھی اسے ڈانٹ بھی دیتا۔ ”سراج! کیا بڑے ہو کر تمہیں مالی بننا ہے؟“

”پتا نہیں بابا۔“

”پتا نہیں کے بچے تم اسکول سے آ کر کن کاموں میں لگ جاتے ہو؟“

”بابا! میں اسکول کا کام بھی تو کرلیتا ہوں۔ آپ جا کر معلوم کرلیں۔ میری پوزیشن فرسٹ ہے فرسٹ۔“

سراج کو سمجھنے والے صرف اس کے ہلال تایا تھے جو اس کی حرکتوں کو بہت غور سے دیکھتے اور اس کی باتوں میں دلچسپی لیا کرتے۔ وہ سراج کے باپ کو سمجھاتے بھی رہتے۔

[illegible]

http://digestpk.blogspot.com/

طرف ہے۔ حوصلہ افزائی کروا اس کی۔"

"کس بات کی حوصلہ افزائی؟" اس کا باپ کہتا۔ "وہ تو مالی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"مالی نہیں ایگری کلچرسٹ..... میری یہ بات یاد رکھ لو کہ یہ بڑا ہو کر زراعت کے شعبے میں انقلاب برپا کر دے گا۔ اس عمر میں اس نے پیوند کاری کے ایسے ایسے تجربے کر رکھے ہیں کہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔"

سراج کا شوق روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت شاندار ہو رہا تھا۔

باغبانی کے علاوہ اس کا ایک اور شوق بھی تھا اور وہ تھا باڈی بلڈنگ۔ قد بھی اچھا تھا' صورت شکل بھی اچھی تھی پھر باڈی بلڈنگ کے شوق نے اسے ایک طرح دار نوجوان بنا دیا تھا۔

یونیورسٹی میں بھی اس نے زراعت کے شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ کہا کرتا "دیکھ لینا' میں ایک دن اس ملک کو غلے کے معاملے میں خود کفیل کر دوں گا۔ ایک سال میں دس دس فصلیں حاصل کر کے دکھاؤں گا۔"

"لیکن زمین کی زرخیزی تو ختم ہو جائے گی۔"

"یہی تو کمال ہے کہ وہ بھی برقرار رہے گی۔ ورنہ میرے فارمولے کا فائدہ ہی کیا ہے۔"

اس نے اس موضوع پر ایک سیمینار میں ایک تھیسس بھی پڑھ دیا تھا۔ اس کے تایا بلال اکثر اس کے باپ سے کہتے۔ "دیکھ لیا تم نے۔ میں نے کیا پیش گوئی کی تھی۔ تمہارا بیٹا ایک بڑا زرعی ماہر بننے جا رہا ہے۔"

"واقعی آپ نے بالکل صحیح پہچانا تھا بلال بھائی۔"

"اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ بچہ جو کچھ بھی کر رہا ہو اسے اس کے رجحان کے مطابق وہ کام کرنے دو۔ اس پر اپنا فیصلہ مت لادا کرو پھر دیکھو وہ کتنا آگے جاتا ہے۔" اور سراج بہت آگے جا رہا تھا۔

اس نے جو پرواز لی تھی' اس کی کوئی انتہا نہیں تھی اور اس پرواز کے دوران ایک دن ایک لڑکی اسے مل گئی۔

پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یہ بھی کوئی جذبہ ہوا کرتا ہے یہ بھی کوئی مسرت ہے، کوئی ترنگ ہے۔ اب تک تو وہ پودوں اور پیڑوں میں الجھا رہا تھا' زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں مل سکی تھی لیکن جب وہ لڑکی اس کے سامنے آئی تو اسے اپنے ہونے کا احساس ہونے لگا۔

وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج تھا۔ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ذہین بھی تھی حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس نے اپنا نام روشنی بتایا تھا۔

"آپ واقعی روشنی کی طرح ہیں۔" سراج نے کہا۔

"آپ بھی تو سراج ہیں۔" وہ جواباً بولی۔

یہ ملاقات ایک سائنسی نمائش میں ہوئی تھی۔ اس میں سراج نے بھی حصہ لیا تھا اور کچھ ایسے پودے رکھے تھے جو دو قسموں کے امتزاج سے ظہور میں آئے تھے اور ان سے پھل وافر مقدار میں حاصل کیے جا سکتے تھے۔

سراج کو پہلا انعام ملا تھا۔ اسی دوران میں وہ لڑکی اسے مل گئی تھی۔ وہ نمائش دیکھنے آئی تھی۔ اس نے سراج سے پودوں کے حوالے سے اتنے سوالات کیے کہ خود سراج بھی اس کی معلومات پر دنگ رہ گیا۔

"لگتا ہے آپ خود سائنس داں ہیں۔" سراج نے کہا۔

"میں سائنس داں تو نہیں ہوں لیکن دلچسپی ضرور رکھتی ہوں۔"

"آپ رہتی کہاں ہیں؟" سراج نے کہا۔

"کیا ضروری ہے کہ پہلی ملاقات میں سب کچھ بتا دیا جائے؟" لڑکی شوخ لہجے میں بولی۔

"اوہ' اس کا تو مجھے دھیان ہی نہیں رہا تھا لیکن آپ سے دوبارہ ملاقات بھی تو مشکل ہے۔"

"آپ اس کی پروا نہ کریں میں خود آپ سے مل لوں گی۔" روشنی نے کہا۔ "آپ کوئی گم نام آدمی تو ہیں نہیں۔ آپ کا پتا مجھے آسانی سے مل جائے گا۔"

اور ہوا بھی یہی۔

روشنی ایک بار پھر اسے ملی۔ اس بار دونوں ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے..... تین چار ملاقاتوں کے بعد دونوں کے درمیان اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔

ایک دن سراج نے روشنی سے کہا۔ "روشنی! لگتا ہے اب میرے اچھے دن قریب آنے والے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"اس ملک میں نوجوان سائنس دانوں کو پروموٹ کرنے والا ایک شخص ہے' یوسف ڈانڈیا۔ وہ ہر طرح سے پروموٹ کرتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے۔ اس سے میری میٹنگ ہونے والی ہے۔" دفعتاً روشنی کچھ بے چین سی نظر آنے لگی۔

"کیا بات ہے' کیا تمہیں یہ خبر پسند نہیں آئی؟" سراج نے پوچھا۔

"نہیں۔" روشنی نے جواب دیا۔ "دیکھو سراج! اب میرے اور تمہارے درمیان دوستی اور پیار کا ایسا رشتہ قائم ہو گیا ہے کہ میں کسی بھی قیمت پر تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔"

"روشنی..... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

"اگر ایک مشورہ دوں تو مان لو گے؟"

"کیوں نہیں' تم جو کہو گی میں ماننے کے لیے تیار ہوں۔"

"تو پھر تم یوسف ڈانڈیا کے پاس مت جاؤ۔" روشنی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اس شخص کی شہرت اچھی نہیں ہے۔"

"ارے بس اتنی سی بات؟" سراج ہنس دیا۔ "میری گڑیا! میں کوئی بچہ نہیں ہوں جس کو وہ بہکا دے گا۔ اس سے ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دیکھوں تو سہی وہ کیا کہتا ہے؟"

"تو پھر ایک بات کا وعدہ کرو۔"

"چلو' وہ بھی بتا دو۔"

"اگر تمہیں وہاں کچھ پینے کو دیا جائے تو تم کسی بھی قیمت پر نہیں پیو گے۔"

"روشنی!" سراج نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ تم اس شخص کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ وہ مجھے پینے کے لیے کیا دے گا؟ تم مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟"

"وقت آنے پر سب بتا دوں گی لیکن میری یہ بات یاد رکھنا۔"

سراج یوسف ڈانڈیا کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بیٹھا تھا جس کا تعارف محکمۂ زراعت کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کرایا گیا تھا۔

یوسف ڈانڈیا نے سراج کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔

"آپ لوگ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں تو ابھی ایک طالب علم ہوں اور سیکھ ہی رہا ہوں۔"

"نوجوان! اس لیے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم باہر جا کر سیکھو تاکہ واپس آ کر اپنے ملک کو فائدہ پہنچا سکو۔"

"آپ کی آفر کا بہت شکریہ لیکن میں نے فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" یوسف ڈانڈیا مسکرا دیا۔ "ہم تمہارے لیے نیک خواہشات ہی رکھ سکتے ہیں۔" اس دوران میں اس کے سامنے ایک گلاس لا کر رکھ دیا گیا جس میں کسی قسم کا شربت بھرا ہوا تھا اور اس وقت سراج کو روشنی کی بات یاد آ گئی جس نے ہر حال میں تاکید کی تھی کہ وہ کسی شربت کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

وہ دونوں پھر اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اس کی دیگر دلچسپیوں کے بارے میں، اس کے خاندانی حالات کے بارے میں جبکہ شربت کا وہ گلاس میز پر اسی طرح رکھا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد یوسف ڈانڈیا نے شربت کی طرف سراج کی توجہ دلائی..... "کیا بات ہے مسٹر سراج! آپ شربت کیوں نہیں پی رہے؟"

"تو سر! میرے گلے میں تکلیف ہے۔" سراج نے جلدی سے کہا۔

"تھوڑا سا تو چلے گا۔"

"نہیں سر! کوئی تکلف نہیں ہے۔"

"اوکے۔" یوسف ڈانڈیا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

سراج ہاتھ ملا کر واپس آ گیا اور دوسرے ہی دن ایک نامعلوم گاڑی نے اسے کچل دیا..... مستقبل کے ایک ذہین ایگری کلچرسٹ کی کہانی اس طرح ختم ہو گئی۔

☆☆☆

"تو یہ ہے پوری داستان۔" علیزا نے کہا۔ "وہ دو اطراف سے گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں باہر اسکالرشپ کی آفر دی جاتی ہے۔ دوسرے مرحلے میں اسے شربت پلا دیا جاتا ہے اور اگر یہ سب نہ ہو سکے تو پھر موت اس بے چارے کا مقدر بن جاتی ہے۔ ایک پراسرار موت۔"

"اور وہ روشنی کون ہے؟" ظفر نے پوچھا۔

"وہ لڑکی میں ہوں۔" علیزا نے بتایا۔ "میرا پورا نام روشنی علیزا ہے اور مرنے والا سراج میرا دوست تھا' میرا محبوب تھا اور میرا ہمدرد تھا۔ وہ میرا سب کچھ تھا اور اسے اس طرح مار دیا گیا۔"

"افسوس ہوا یہ سن کر۔" ظفر نے کہا۔ "لیکن تمہیں اس شربت کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے بتایا نا کہ میرا تعلق بھی ان ہی لوگوں سے ہے۔"..... علیزا نے کہا۔ "اسی لیے میں ان کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔"

"اور تمہارا قبرستان آنا جانا..... وہ کیوں ہوتا ہے؟"

"میں اپنے محبوب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتی ہوں۔" علیزا نے بتایا۔ "وہاں جا کر اس سے باتیں کر لیتی ہوں تو مجھے سکون ملتا ہے۔"

http://digestpk.blogspot.com/

"اور تم دو بار اچانک غائب کیوں ہوگئی تھیں؟" ظفر نے پوچھا۔

"اس لیے کہ دونوں بار مجھے ان لوگوں کے گرگے آس پاس بھٹکتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔" علیزا نے بتایا۔ "اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے تم ان کی نگاہوں میں آجاؤ۔"

"اچھا، اب یہ بھی بتا دو کہ قبریں کیوں کھودی گئی تھیں؟"

"یہ سوال تم نے بہت دیر میں کیا۔" علیزا نے کہا۔ "اس حیرت انگیز مشروب کا راز قبروں ہی میں چھپا ہوا ہے۔"

"میں نہیں سمجھا، کھل کر بتاؤ۔"

"صرف عورتوں کی ہڈیاں اس مشروب کو بنانے میں کام..... آتی ہیں۔" علیزا نے بتایا۔ "ایسی عورتیں جن کے انتقال کو زیادہ دن نہ ہوئے ہوں۔ ایک سال سے کم عرصے تک کی ہڈیاں کارآمد ہوتی ہیں۔ انھیں ایک خاص کیمیاوی عمل سے گزار کر سفوف کا روپ دیا جاتا ہے اور وہی سفوف کسی بھی مرد کو ہیجان دلانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔"

"اب سمجھا، اس لیے کراس کا نشان لگایا گیا تھا۔"

"ہاں، تاکہ آسانی سے یاد رہ سکے کہ کس کس قبر کی کھدائی کرنی ہے۔" علیزا نے بتایا۔ "تم نے یہ تو سنا ہوگا کہ مغرب میں آج کل ایسے پرفیوم دستیاب ہیں جو مرد کو عورت کے لیے اور عورت کو مرد کے لیے پاگل کر دیتے ہیں۔ وہ بھی کسی حد تک اسی فارمولے پر بنائے جاتے ہیں۔ اگر مرد کے لیے ہے تو اس میں عورت کا پسینا اور دوسری گندگی شامل کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے ہوتا ہے۔"

"سمجھ گیا۔" ظفر نے گہری سانس لی۔ "یہ کام کوئی عام آدمی تو نہیں کر سکتا۔"

"اور وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے ظفر صاحب۔ وہ بہت بڑا سائنس داں ہے۔"

ظفر بہت دیر تک سوچتا رہا۔ علیزا نے جو کچھ بتایا... اگر سچ تھا تو پھر اس ملک کے خلاف واقعی بہت بڑی سازش ہو رہی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد یہ ملک بانجھ ہو کر رہ جاتا۔ ذہین اور اعلیٰ دماغ کے لوگ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر کسی کام کے نہیں رہتے۔ پورے ملک میں افراتفری پھیل جاتی۔

"علیزا! اب تم یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ اتنے بڑے ریکٹ کا سامنا میں کس طرح کر سکتا ہوں؟"

"پہلے تو یہ سن لو کہ میں تمہاری طرف کیوں متوجہ ہوئی۔" علیزا نے کہا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اکثر تمہیں قبرستان میں ہی دیکھتی تھی۔ تم اپنی بیوی کی قبر پر آتے اور میں اپنے محبوب کی۔"

"لیکن یہ تم نے کیسے سوچا کہ میں تمہارے کام آسکتا ہوں؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔ تم اسے میری کوئی حس سمجھ سکتے ہو۔" علیزا نے کہا۔ "بہرحال میں یہ چاہتی ہوں کہ اب اس سازش کو بے نقاب کر دیا جائے۔ ورنہ یہ ملک تباہ ہو جائے گا۔"

"لیکن کیسے.....؟ تم خود بتا چکی ہو کہ حکومت کے بڑے بڑے ستون اس آدمی کی گرفت میں ہیں پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"تم پہلے اس آدمی سے مل لو۔"

"کیسے..... کیونکہ بقول تمہارے وہ صرف اعلیٰ دماغ کے لوگوں سے ملتا ہے جبکہ میں تو ایک عام سا آدمی ہوں۔"

"تمہاری تعلیم کیا ہے؟"

"ماسٹرز کر رکھا ہے میں نے لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"اب تم غور سے سنتے جاؤ کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔" علیزا نے کہا۔ "تم نے جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر رکھی ہے اور ایک بوٹی سے ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو گئے ہو جو کسی کو بھی ٹرانس کی کیفیت میں لے آتی ہے۔ اس کا ذہن خالی سلیٹ کی طرح ہو جاتا ہے پھر اس پر اپنی مرضی کی جو تحریر چاہو لکھ سکتے ہو۔"

"باپ رے! اگر کوئی ایسی دوا بن گئی تو بہت خطرناک ثابت ہوگی قطعی برین واشنگ۔"

"ہاں اور وہ آدمی آج کل اس پروجیکٹ پر کام کر رہا ہے لیکن اسے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ جب تم یہ شوشا چھوڑو گے تو..... وہ تمہاری طرف متوجہ ہو جائے گا۔"

"لیکن خدا کی بندی مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"بہت سی باتیں میں تمہیں بتا دوں گی کیونکہ میں اس ریسرچ میں اس کے ساتھ رہی ہوں۔" علیزا نے بتایا۔

"چلو مان لیا کہ وہ میری باتوں میں آگیا لیکن اس سے کیا ہوگا؟"

"یہ دوسرا مرحلہ ہے۔" علیزا نے کہا۔ "پہلا مرحلہ اس تک رسائی ہے اور پہلے مرحلے میں تمہیں یوسف ڈانڈیا کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ وہ تمہیں اعلیٰ تعلیم کی آفر دے گا۔ تم وہ آفر قبول کر لو گے۔ اس کے بعد ہی تمہیں اصل آدمی سے ملوایا جائے گا۔"

☆☆☆

بہت ہوشیاری اور پلاننگ کے ذریعے یہ کام ہو رہا تھا۔ ظفر نے اس پروجیکٹ میں اپنے ایک دوست انصاری کو بھی شامل کر لیا تھا۔ علیزا نے بھی اس کی شمولیت پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ انصاری کا تعلق پرنٹ میڈیا سے تھا۔ وہ اپنے اخبار کے ذریعے اس حیرت انگیز دوا کی پبلسٹی کر سکتا تھا۔ اسے جب یہ ساری کہانی سنائی گئی تو وہ بھی سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"خدا کی پناہ — ہمارے ملک میں یہ سب ہو رہا ہے۔ آخر کون لوگ ہیں یہ لوگ ایسی سازشیں کیوں کر رہے ہیں؟"

"پوری دنیا میں صرف ایک لابی ایسی ہے جو ایسی ذہانت بھری سازشیں کر سکتی ہے۔" علیزا نے کہا۔ "اور وہ ہے یہودی لابی۔"

"یعنی تم..... یہ کہنا چاہتی ہو کہ اس ملک میں یہودی لابی سرگرم ہے؟"

"ہاں اور بہت دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ صرف پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے اسلامی ممالک میں یہ لوگ کام کر رہے ہیں۔" علیزا نے بتایا۔ "انہوں نے خاص طور پر مسلک اور فرقے کا چکر چلا رکھا ہے۔ آپ پہچان بھی نہیں سکتے کہ یہ کون ہیں۔ یہ عام مسلمانوں سے کہیں زیادہ باعمل دکھائی دیتے ہیں۔"

"علیزا! اگر تمہاری مدد سے یہ سازش بے نقاب ہوگئی تو یہ پاکستان اور عالم اسلام پر تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا۔" انصاری نے کہا۔ وہ علیزا سے بہت متاثر ہو گیا تھا۔

"خدا کرے کہ میں کسی کام آجاؤں۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی بہت دنوں سے کھٹک رہی تھی کہ ہمارے ملک کا ٹیلنٹ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھا ہے۔ یہ کوئی کارنامہ کیوں نہیں انجام دیتا۔ اب بات سمجھ میں آرہی ہے کہ یہ سب ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے ہیں..... اور اب مجھے یاد آرہا ہے کہ پچھلے کئی برس سے ہمارے ملک کے ذہین نوجوان حادثاتی طور پر ہلاک ہو چکے ہیں۔ نہ جانے کتنے نوجوان مارے جا چکے ہیں۔ ایک وہ تھا جس نے بغیر ایندھن کے گاڑی چلانے کا تجربہ کیا تھا۔ دوسرا وہ تھا جس نے فنانس سدھارنے کی پلاننگ کی تھی اور ایک وہ جس نے زراعت کے شعبے میں انقلاب برپا کیا تھا۔"

"ہاں ان سب کی موت اسی شخص کے اشارے پر ہوئی ہے۔" علیزا نے بتایا۔

"خدا کی پناہ۔ ہمارا ملک کتنا پیچھے چلا گیا ہوگا۔" ظفر نے کہا۔

"تم خوفزدہ تو نہیں ہو؟" انصاری نے پوچھا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ سب سن کر میں اندر سے اور زیادہ پختہ ہو گیا ہوں۔"

"تو بس اسی ہفتے کے درمیان تمہارے دو چار انٹرویوز شائع ہو جائیں گے۔" انصاری نے کہا۔

انٹرویو آنے کی دیر تھی کہ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ علیزا نے اس دوران میں ظفر کو جڑی بوٹیوں کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا وہ اس کی معلومات پر حیرت زدہ رہ گیا۔

"خدا کی پناہ، تمہیں تو جڑی بوٹیوں کے بارے میں بہت سی معلومات ہیں۔" ظفر نے کہا۔

"میں بتا چکی ہوں کہ میں نے اس آدمی کے ساتھ ریسرچ ورک کیا ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے کئی لیکچرز اٹینڈ کیے ہیں اسی لیے میری معلومات بہت زیادہ ہیں۔"

توقع کے مطابق ظفر کو یوسف ڈانڈیا نے میٹنگ کے لیے بلا لیا تھا۔

ظفر کو معلوم تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ علیزا نے اسے ٹرینڈ کر دیا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے سوالوں کے جواب دیتا رہا پھر جب اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ کی آفر کی گئی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں جناب! یہ تو میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔ اس ملک میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں کیوں خوامخواہ اپنا ٹیلنٹ یہاں ضائع کروں۔"

"گڈ!" یوسف ڈانڈیا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "تم واقعی سمجھدار انسان ہو۔ تمہارا فیصلہ بالکل درست ہے۔ تمہارا آخری انٹرویو داور حنا صاحب لیں گے۔ تم ان کو تو جانتے ہو نا؟"

علیزا نے بتایا تو تھا کہ وہ شخص اس ملک کا ایک معزز اور مشہور آدمی ہے لیکن ظفر کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ داور حنا ہوگا اسی لیے وہ اس کا نام سن کر چونک گیا۔ "جی ہاں، انہیں کون نہیں جانتا۔ انہوں نے ہمارے ملک کے لیے جتنی خدمات انجام دی ہیں وہ سب ہمارے سامنے ہیں۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

☆☆☆

داور حنا اس وقت اپنے گھر کے تہ خانے میں موجود تھا۔ اس کے سامنے ایک تخت پر ڈیوڈ اسٹار بنا ہوا تھا۔ صیہونیت کا نشان۔ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر آنکھیں بند کیے ایک بے خودی کے عالم میں بولے جا رہا تھا۔

"مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ میں نے اپنے وطن کے لیے کیا ہے۔ تم گواہ رہنا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ عالم اسلام کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے کسی ذہین کو پیدا نہیں ہونے دیا اگر ہوا بھی تو

http://digestpk.blogspot.com/

صلاحیتیں ختم کروا دیں۔ گویا وہ رہتا کہ علم اور عمل کے میدان میں اسے آگے بڑھنے نہیں دیا ہے۔ ایک ارب پچاس کروڑ کی آبادی کے پاس صرف دس پندرہ نوبل پرائز ہیں جب کہ ہماری چھوٹی سی آبادی کے پاس ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے ہر شعبے میں بے مثال ترقی کی ہے اور اس قوم کو ترقی نہیں کرنے دی۔ ہم نے اس کے اردگرد سود در سود کے جال بچھا رکھے ہیں۔ ہم امداد کے نام پر اس کی رگوں سے خون نچوڑ رہے ہیں اور یہ بے وقوف خوش ہیں۔ گویا وہ رہتا کہ ہم اپنی منزل کی طرف بہت کامیابی اور تیزی سے سفر کر رہے ہیں۔ ہماری یہ منزل پوری دنیا پر صیہونیت کا تسلط ہے، ہم اس سے کم پر بھی راضی نہیں ہوں گے، کبھی نہیں۔"

اسی وقت کمرے میں ہلکی سی آواز کے ساتھ ایک بلب روشن ہو گیا، یہ اس بات کی علامت تھی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ اس لیے اس نے ویڈیو اسٹار کو الوداعی نگاہوں سے دیکھا۔ سر پر جالی والی ٹوپی پہنی، ہاتھ میں تسبیح لی اور تہ خانے سے نکل کر لاؤنج میں آ گیا۔

☆☆☆

"تو اب تم داور حنا سے ملنے جا رہے ہو؟" علیزا نے پوچھا۔

"ہاں سب کچھ ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا تم نے کہا تھا۔" ظفر نے بتایا۔ اس وقت وہ تینوں ہی ظفر کے اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب اور بھی ہے۔" انصاری نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟"

"خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں ابھی تک ایک ایسا ادارہ ہے جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے فوج۔ کیوں نہ ہم یہ سب فوج کو بتا دیں۔ فوج کے اعلیٰ حکام اپنے طور پر کارروائی کر سکتے ہیں۔"

"کارروائی تو ہو جائے گی لیکن ثبوت کہاں سے ملیں گے؟" ظفر نے کہا۔ "میں اس پہلو پر غور کر چکا ہوں۔ فرض کرو اگر کسی ذہین آدمی کو پکڑا جاتا ہے تو اس پر کیا الزام عائد کرو گے؟ یہی نا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال نہیں کر رہا ہے۔ وہ بھی کہے گا کہ صلاحیتیں میری ہیں، ذہن میرا ہے میں استعمال کروں یا نہ کروں۔ اس میں کوئی زبردستی تو نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں بتائے گا کہ وہ کسی خاص قسم کے مشروب کا عادی ہو کر ...... وحشی اور پاگل ہو گیا ہے۔"

"ہاں وہ یہ اعتراف تو کبھی نہیں کرے گا لیکن کچھ ذہین نوجوان مارے بھی تو گئے ہیں۔"

"ان کی موت حادثات میں ہوئی ہے اور آج تک ایکسیڈنٹ کرنے والا ایک شخص بھی پکڑا نہیں گیا ہے تو پھر کیا جواب ہوگا ہمارے پاس؟"

"یوسف ڈائنڈیا وہ تو ایک کیس ہے۔"

"نہیں وہ بھی کوئی کیس نہیں ہے۔" علیزا نے کہا۔ "اس نے ذہین طالب علموں کی حوصلہ افزائی کی ایک این جی او بنا رکھی ہے۔ وہ اپنے خرچ پر انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ کون سا جرم ہوا۔"

"واقعی ہم تو ان کے خلاف کچھ ثابت ہی نہیں کر سکتے۔"

"لہٰذا واحد راستہ یہی ہے کہ کسی طرح سربراہ ہی کو خاموش کر دیا جائے۔" ظفر نے کہا۔ "اس کے بعد یہ تحریک خود ہی دم توڑ دے گی۔"

"لیکن اس کا طریقہ کار کیا ہوگا...... کیسے؟"

"اس کے لیے ظفر کو ہمت کرنی ہوگی۔" علیزا نے کہا۔ "یہ داور صاحب سے ملنے جائے گا۔ معمول کے مطابق اس کے سامنے شربت لا کر رکھ دیا جائے گا۔ تمہیں وہی شربت کسی طرح داور حنا کو پلا دینا ہے۔"

"یہ کیا بچوں والی ترکیب ہے۔"

"بچوں والی ترکیب نہیں ہے بلکہ ایسی ترکیب ہے کہ داور حنا کا سارا خول اتر جائے گا اور اس کی اصل شخصیت سامنے آ جائے گی۔ اس وقت میڈیا اور انٹیلی جنس کے لوگ کام آئیں گے جب وہ اپنے جرائم کا اعتراف کر رہا ہوگا۔"

"صرف اس شربت کو پینے کے بعد؟"

"ہاں اس کے بعد اس کے سامنے ایک کھیل پیش کیا جائے گا۔" علیزا نے کہا۔ "اس کھیل کی نوعیت میں ابھی نہیں بتاؤں گی۔ اس کے بعد ہی وہ اعتراف کرنا شروع کر دے گا۔ اسی وقت ساری ٹیم اس کمرے میں داخل ہو جائے گی اور سارے اعترافات خود سن لے گی۔"

"علیزا! تم تو جادوگرنیوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔"

"جادو ہی سمجھ لو لیکن میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ بالکل درست ہے۔" علیزا نے کہا۔

"لیکن میں کس طرح اسے شربت پینے پر آمادہ کروں گا؟" ظفر نے پوچھا۔

"اب یہ تمہاری ہمت اور بہادری پر ہے۔" علیزا نے کہا۔ "اس کے لیے سب سے بہتر یہی ہوگا کہ تم اپنے پاس ریوالور رکھ لو اور ریوالور دکھا کر اسے زبردستی مجبور کرو چونکہ تم

ایک معزز مہمان بن کر اس گھر میں جاؤ گے اسی لیے تمہاری تلاشی بھی نہیں لی جائے گی۔"

"تم مجھے حیران کر رہی ہو علیزا۔"

"ملک اور قوم کی بھلائی چاہتے ہو تو تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔" علیزا نے کہا پھر نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

☆☆☆

ظفر، داور حنا کی شخصیت سے مرعوب ہو کر رہ گیا۔ ایک باوقار شخص۔ سر پر جالی والی ٹوپی، ہاتھ میں تسبیح۔ بہت خوبصورت داڑھی اور بہت کمال کی گفتگو کرنے والا شخص ایسا نہیں ہو سکتا۔ علیزا کو یقیناً اس کی طرف سے غلط فہمی ہوئی...... ہوگی۔

داور حنا بہت شفقت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے سوال کیا۔ "ایک بات بتاؤ تمہیں اس قسم کی دوا بنانے کا خیال کیسے آیا......؟" ظفر اس سوال کا جواب دینے کے لیے پوری تیاری کر کے آیا تھا۔

"جناب ایسا آئیڈیا میں نے برین واشنگ کی اصطلاح سے لیا ہے وہ بھی ایک عمل ہے۔ بعض جڑی بوٹیاں ایسی ہوتی ہیں جو ذہن کو ماؤف کر دیتی ہیں جیسے بھنگ یا افیون۔ ان کے استعمال سے بھی... ذہن سو تو جاتا ہے لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔"

"بالکل درست۔" داور نے گردن ہلائی۔ "عارضی کیفیت ہوتی ہے اور نشہ اترنے کے بعد ذہن پھر کام کرنے لگتا ہے۔"

"یہ اور بات ہے جناب کہ کسی شخص کو مسلسل استعمال کرایا جائے۔" ظفر نے کہا۔ "لیکن میں نے عرض کیا کہ وہ ایک لمبا مرحلہ ہے اس میں کئی مہینے لگ سکتے ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ اسی لیے تم نے ایسی دوا کے بارے میں سوچا جو فوری طور پر اثر انداز ہو۔"

"جی جناب! چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر۔" اسی وقت ملازم نے شربت کا ایک گلاس لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

ظفر کو یاد آیا کہ علیزا کی کیا ہدایت تھی۔ منصوبے کے مطابق اس کو یہ شربت داور حنا کو پلانا تھا۔ اس نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک داور نے کہا۔ "نہیں مسٹر ظفر! ریوالور نکالنے کی زحمت مت کرو۔ تمہیں یہ

شربت پینا ہے ابھی اور اسی وقت۔" ظفر سناٹے میں رہ گیا۔

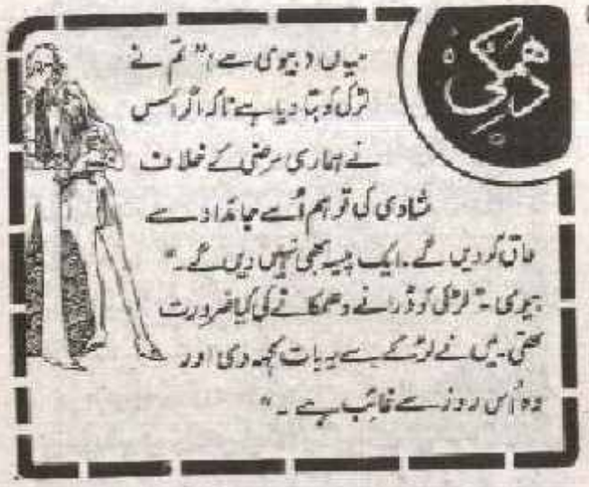

اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بازی اس طرح پلٹ جائے گی۔ کیا علیزا نے غداری کی تھی لیکن...... کیوں؟ یہ سارا منصوبہ تو خود اسی کا تھا اور اسی نے یہ حرکت کر دی تھی۔ "کیا ہوا ہے تمہیں، کیا سوچ رہے ہو؟" داور نے کہا۔ "جلدی سے یہ پورا گلاس خالی کرو ورنہ میرے آدمی تمہارے جسم کو تمہاری روح سے خالی کر دیں گے۔" دو مسلح افراد پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

"میری قسمت نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے مسٹر ظفر اسی لیے کوئی سازش میرے خلاف کامیاب نہیں ہوتی۔" داور نے کہا۔ "اب تم میرے غلام بن کر رہو گے۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ تم جڑی بوٹیوں کے ماہر ہو یا نہیں، میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم جیسے حقیر انسان نے میرے خلاف سازش کی تھی اور اب میں یہ سازش تم پر واپس کر رہا ہوں۔ چلو اٹھاؤ گلاس......" ظفر کے ذہن نے اس وقت کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کیا چاہتی تھی یہ علیزا، وہ اس سے کیوں ملی، کیوں ایسی کہانی سنائی؟ کیوں ایسی سازش تیار کی اور اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ کیوں ہو رہا تھا؟

داور حنا کے اشارے پر ایک آدمی نے ظفر کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔ داور مسکرا رہا۔ بہت زہریلی اور حقارت بھری مسکراہٹ تھی اس کی۔ "چلو کیوں اپنی موت کو آواز دے رہے ہو۔" اس نے کہا۔ ظفر نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

http://digestpk.blogspot.com/

"چلو شاباش۔"

ظفر نے گلاس اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

اس نے زندگی میں بہت دکھ برداشت کیے تھے۔ نام راحیلہ تھا اس کا۔ اسے آگے بڑھنے یا دولت کمانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ دو وقت کی روٹی عزت سے ملتی رہے بس۔ اس کی خواہشات بھی کم تھیں۔

ایک چھوٹا سا گھر ہو اور تھوڑا بہت سامان۔ بس زندگی گزارنے کے لیے اور کیا چاہیے۔

اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے والدین غریب تھے اسی لیے انہوں نے اس کی شادی بھی اپنے ہی حساب سے کی تھی۔ امجد کسی بڑے آدمی کا سیکیورٹی گارڈ تھا بلکہ چیف سیکیورٹی گارڈ۔

وہ خود بھی ایک سیدھا سادہ انسان تھا۔ اس کی خواہشات نے بھی ہاتھ پاؤں نہیں پھیلائے تھے۔ اس نے اپنی بیوی کو مالک کے گھر کے احاطے میں بنے ایک چھوٹے سے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔

وہ اکثر بتاتا۔ ”دیکھو راحیلہ، یہ جو گارڈ کی ڈیوٹی ہوتی ہے نا یہ بہت سخت ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ مالک کو پوری طرح گارڈ پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔“

راحیلہ کو اندازہ تھا کہ اس کے شوہر کی ڈیوٹی کتنی سخت ہے اور اسے ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے۔ اس کے کوارٹر کے ایک کمرے کی کھڑکی گھر کے گیٹ کی طرف کھلتی تھی۔

وہ اکثر دیکھا کرتی کہ کیسے کیسے لوگ صاحب سے ملنے کے لیے آتے ہیں... لمبی لمبی گاڑیاں، بہت سوں پر جھنڈے لگے ہوتے تھے۔ مولوی لوگ، ٹی وی والے، لڑکے، لڑکیاں خدا جانے کیسے کیسے لوگ آتے تھے۔

ایک دن اس نے امجد سے پوچھا۔ ”یہ تو بتاؤ یہ صاحب سے ملنے کے لیے اتنے لوگ کیوں آتے ہیں، کیا لینے آتے ہیں؟“

”وہ صاحب کی باتیں سننے آتے ہیں۔“

”باتیں سننے؟“

”ہاں، صاحب ایسی ایسی باتیں کرتا ہے جس کو ہر آدمی نہیں سمجھ پاتا۔ وہ لوگ وہی باتیں سننے ہیں۔“

”تو صاحب کا کام ہی یہی ہے؟“

”ہاں صاحب کا یہی کام ہے۔ دو چار مرتبہ خود میں نے بھی سنی ہیں ان کی باتیں لیکن میرے پلے تو نہیں پڑیں۔“

”میں صاحب کی بیٹی سے پوچھوں گی۔“

”نہیں، ان سے مت پوچھنا خوامخواہ ناراض ہو جائے گی۔“

”یہ لو..... اس میں ناراضی کی کیا بات ہے۔ وہ تو ویسے ہی اتنی پیاری ہیں۔ مجھ سے ڈھیر ساری باتیں کرتی رہتی ہیں۔“

اس عالی شان گھر کے عقب میں ایک بڑا سا باغیچہ تھا۔ اس میں بے شمار پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں پرانے طرز کا ایک فوارہ بنا ہوا تھا۔ پتھر کی بنچیں بھی تھیں۔

راحیلہ شام کے وقت اسی طرف نکل جاتی۔ اس کے کہیں آنے جانے پر ویسے بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ صاحب کی بیٹی تو کئی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ وہ اندر آ جایا کرے...... لیکن وہ خود احتیاط کرتی۔

صاحب کو اس نے کئی بار دیکھا تھا۔ بہت رعب والا آدمی تھا لیکن چہرے پر نور برستا تھا۔ امجد بتاتا تھا کہ صاحب بہت اللہ والا آدمی ہے۔

”خدا نے اس کو دین بھی دے رکھا ہے اور دنیا بھی ہے اس کے پاس۔“

راحیلہ کو اس کی بیٹی بہت اچھی لگتی تھی۔ ذرا بھی غرور نہیں تھا اس میں لیکن کبھی کبھی وہ بہت اداس دکھائی دیتی۔ راحیلہ سے باتیں کرتے کرتے اچانک ہی چپ ہو جاتی۔

ایک بار اس نے راحیلہ سے کہا۔ ”دیکھو راحیلہ، اگر میں کبھی کسی مصیبت میں پھنس جاؤں تو پھر تم کیا کرو گی؟“

”خدا نہ کرے جی، آپ پر مصیبت کیوں آنے لگی۔“

”انسان ہوں۔ انسان کے ساتھ تو یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم کیا کرو گی؟“

”آپ کی مدد کروں گی جی۔“ راحیلہ نے بتایا۔ وہ بھی کبھی اسی قسم کی باتیں کرتی۔ راحیلہ اس سے کہا کرتی۔ ”بی بی، آپ پریشان کیوں رہتی ہیں حالانکہ سب کچھ تو ہے آپ کے پاس۔ اتنا بڑا گھر، اتنے پیسے، اتنی عزت اور آپ کو کیا چاہیے......؟“

”تم نہیں سمجھو گی راحیلہ، یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان ان سب چیزوں سے خوش ہو۔ ہر آدمی کے ساتھ اس کے دکھ کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے ساتھ بھی کوئی اور دکھ ہو۔“

”سمجھ گئی جی۔“

”کیا سمجھ گئیں؟“

”یہی کہ آپ نے کسی کو پسند کیا ہوگا اور صاحب نے اس کے لیے منع کر دیا ہوگا۔“

”نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ ”بات کچھ اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وقت آنے پر تم سب جان لو۔“ اور شاید اسی دن بی بی جی کو راحیلہ کی مدد کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

وہ دوڑتی ہوئی گیٹ کے پاس پہنچی..... جہاں اس کا شوہر امجد اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس نے اشارے سے امجد کو اپنے پاس بلایا۔ امجد اس کا حال دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ راحیلہ کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

”کیا بات ہے، کیا ہوا ہے تجھے؟“

”امجد لگتا ہے بی بی کسی مصیبت میں ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے ان کے چیخنے کی آوازیں سنی ہیں۔“

”کیا پاگل ہو گئی ہو، کس مصیبت میں ہوں گی وہ؟“

”یہ میں نہیں جانتی، تم آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں ان کی چیخیں سنواتی ہوں۔ فوارے سے آ رہی ہیں۔“

”فوارے سے چیخیں، راحیلہ تیرا دماغ چل گیا ہے۔“

”تم آؤ تو سہی اور ابھی کسی کو بتانا نہیں، پہلے تم خود سن لو اس کے بعد جو سمجھ میں آئے وہ کرنا۔“

”اگر وہ کسی مصیبت میں ہیں تو کم از کم صاحب کو تو بتا دیں۔“

”نہیں نہیں، صاحب کو بھی نہیں بتانا پہلے خود تو سمجھ لیں کہ کیا معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے کوئی دھوکا ہوا ہو۔“

”کبھی کبھی تو بالکل بچوں والی باتیں کرنے لگتی ہے۔ چل میرے ساتھ۔“ راحیلہ اسے مکان کے عقبی حصے میں لے آئی جہاں باغیچہ تھا جس کے درمیان میں فوارہ تھا۔ یہ فوارہ ہر وقت چلتا ہی رہتا تھا۔

”ہاں اب بتا کہاں سے آ رہی ہیں چیخیں؟“

”اس فوارے کے پاس بیٹھ کر سن لے۔“ راحیلہ نے کہا۔ امجد فوارے کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا پھر غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”تو واقعی پاگل ہو گئی ہے۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔“ اچانک چیخیں پھر گونجنے لگیں۔ ”سن، سن آ رہی ہیں نا آوازیں؟“ امجد نے پھر اکڑوں بیٹھ کر اپنے کان لگا دیے۔ اس بار اس کے تاثرات بدل گئے۔

”ہاں رے، تو ٹھیک کہتی ہے۔ یہ بی بی کی آوازیں ہیں لیکن فوارے کے اندر سے کیسے آ رہی ہیں؟“

”دیکھو تو سہی کیا ماجرا ہے۔“

”اس میں تو پانی بھرا ہوا ہے۔“ امجد نے کہا۔ ”ارے یہ کیا..... یہ دیکھ فوارے کے ستون کے ساتھ ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے۔ بہت چھوٹی ہے۔ آوازیں اسی کے اندر سے آ رہی ہیں۔“

”خدا خیر کرے، پتا نہیں بی بی پر کیا گزر رہی ہے۔“ راحیلہ نے کہا۔ ”ان کو ڈر تھا کہ ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اسی لیے وہ اسی قسم کی باتیں کرتی تھیں۔“

”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بی بی کسی جگہ... پھنس گئی ہیں۔“ امجد نے کہا۔ ”چل کر پہلے صاحب کو جا کر بتاتے ہیں پھر سب مل کر بی بی کو تلاش کر لیں گے۔“

☆☆☆

وہ پاگلوں کی طرح دیواروں پر گھونسے برسا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ علیزا کو پکڑنے کے لیے کچھ آگے بڑھتا پھر اپنے آپ پر جبر کر کے خود کو پیچھے لگتا لیکن علیزا پر نظر پڑتے ہی اس کے تیور بدل جاتے وہ پھر اس کی طرف دوڑ لگا دیتا۔

علیزا بری طرح چیخ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی حد سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”بابا بچاؤ مجھے۔ بچاؤ۔“ داور خان ڈیوڈ اسٹار والے چبوترے کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

ظفر علیزا کی طرف جھپٹنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس مشروب نے اس کے بدن میں آگ لگا کر اس کی قوتِ ارادی ختم کر دی تھی۔ اس کی زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا..... لذت کا حصول اور اس لذت کو حاصل کرنے کے لیے وہ ہر قسم کی اخلاقیات کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ علیزا کون ہے۔ اس لڑکی نے اس سازش کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی تھی

http://digestpk.blogspot.com/

غلطی

شوہر (خفگی میں بیوی سے) ”بیگم آج کے دن تم میری چیزوں کی کافی سے زیادہ کوئی نہ کوئی چیز غائب کر دیتی ہو اور پھر مجھ سے جھوٹ بولتی ہو۔ اب کے میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ جلدی بتاؤ وہ میری سونے کی گھڑی کہاں گئی؟“

بیوی: ”سرتاج! واقعی مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے دراصل میں نے اسے بیوی کو زیور بنانے کے لیے دیا ہے۔“

خود بھی اس منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ اس کے باوجود علیزا اب اس کے لیے صرف ایک لڑکی تھی اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ دنیا کی ہر عورت صرف ایک عورت ہے اور ہر مرد صرف ایک مرد کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ جانے کیسی طاقت تھی اس مشروب میں۔

وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا اس کے باوجود اسے خود پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔ البتہ اسے ذہنی جھٹکا اس وقت لگا جب علیزا نے داور حنا کو بابا کہہ کر پکارا۔

"ہاں تو بیٹی ہے میری۔" داور حنا کی آواز گونجی۔ "میں نے اپنے سینے سے لگا کر تیری پرورش کی ہے۔ تجھے اتنا پیار دیا ہے کہ شاید ہی کسی باپ نے اپنی بیٹی کو اتنا پیار دیا ہوگا لیکن افسوس میں تجھے اپنے آباؤ اجداد کے وطن کا وفادار نہیں بنا سکا اور تو یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میرے لیے کسی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ صرف صیہونیت اور ڈیوڈ اسٹار ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔"

ظفر کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ علیزا رو رہی تھی۔ بابا، بابا پکار رہی تھی اور داور حنا بولے چلا جا رہا تھا۔

"گواہ ہے ڈیوڈ اسٹار کہ میں نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا کر اپنی صیہونیت کی حفاظت کی ہے۔ میرے لیے کسی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کی بھی نہیں کیونکہ یہ میرے وطن کی غدار ہے۔" پھر اس نے علیزا کی طرف دیکھا۔ "تو کیا سمجھتی ہے کہ مجھے تیری حرکتوں کا علم نہیں تھا۔ میرے آدمی تیرا پیچھا کرتے رہتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ تو میرے خلاف کیا سازش کر رہی ہے۔ اسی لیے میں نے یہ خدمت اس آدمی کو پلوا دیا تاکہ یہ تجھے پھاڑ کھائے۔ میں نہ تو کسی عورت کا شوہر ہوں اور نہ کسی بیٹی کا باپ میری وفاداری صرف اپنے مقصد سے ہے۔ اسرائیل کو پوری دنیا پر حکومت کرنی ہے۔"

ظفر نے پھر سنبھلنے کی کوشش کی۔ وہ ایک جنگ کی کیفیت میں تھا۔ یہ جنگ اسے اپنے آپ سے کرنی پڑ رہی تھی اور اس جنگ میں اس کی شکست ہوتی جا رہی تھی کیونکہ ایک لڑکی اس کے سامنے تھی اور اس مشروب نے اس کی رگوں میں تیامت برپا کر رکھی تھی۔

"الوداع بیٹی، میں جا رہا ہوں اور اس وقت واپس آؤں گا جب اس شخص کا جوش ٹھنڈا ہو چکا ہوگا اور تجھے اسرائیل اور اپنی یہودیت سے غداری کا سبق مل چکا ہوگا۔" علیزا پھر چیخنے لگی تھی۔

ظفر نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ علیزا کی طرف بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی وقت تہ خانے کا دروازہ کھلا اور بہت سے لوگ اترتے ہوئے دکھائی دیے۔

ان لوگوں میں انصاری بھی تھا۔ آرمی کے لوگ تھے، داور کا محافظ امجد اور اس کی بیوی راحیلہ بھی تھی۔ راحیلہ نے دوڑ کر علیزا کو خود سے بھینچ لیا۔

☆☆☆

ایک طوفان تھا جو اس طرح گزر گیا کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ اس انتہائی خطرناک سازش کی خبر چھپا لی گئی تھی کیونکہ اس سے پورے ملک میں انتشار پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ عوام کا ان پر سے اعتماد ختم ہو جاتا جو ملک کے معززین میں شمار کیے جاتے ہیں۔

داور حنا کو اپنی گرفتاری پر کوئی تشویش نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب چاہے اسے مار بھی دیا جائے اسے کوئی پروا نہیں ہوگی۔

اسے صرف اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی بیٹی اس جیسی نہیں ہو سکی تھی۔ اسے صیہونی سازشوں سے نفرت تھی۔ اسی لیے وہ اپنے باپ کی ٹوہ میں لگی رہتی اور اس نے بے شمار راز معلوم کر لیے تھے۔

جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ اس نے کن کن لوگوں کو وہ مشروب پلا کر انہیں ٹرانس میں لیا ہے تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "میں کسی کا بھی نام نہیں بتاؤں گا۔ دیکھ لے تم لوگ خود اپنے طور پر معلوم کر لو کہ کون کون تمہارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔"

ایک اور سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ اسرائیل اس وقت سے پاکستان میں اپنی جڑیں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب فری مین نامی تنظیم پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ مسلمانوں کی صفوں میں ایسے یہودی شامل کر دیے گئے ہیں جو اپنے نظریات پر کٹر ہیں اور انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ مسلمان نہیں ہیں۔

اپنا بیان دینے کے بعد اس نے اپنی زبان بند کر لی تھی۔

اس کے گھر پر چھاپے کے دوران وہ سفوف کثیر مقدار میں برآمد ہوا تھا جس سے... پاگل کر دینے والا مشروب تیار ہوتا تھا۔

اس سے جب اس کا فارمولا دریافت کیا گیا تو اس نے کہا۔ "مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو اپنے سائنس دانوں سے کہو کہ وہ اس کا تجزیہ کر کے بتا دیں۔" لیکن سائنس داں تجزیہ نہیں کر پائے۔

ظفر کی حالت اب بہتر تھی۔ وہ اس بات پر شرمندہ تھا کہ اس مشروب نے اسے..... پاگل پن کی حدوں تک پہنچا دیا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ وہ مشروب کسی کو بھی پلا دیا جائے تو اس کا یہی حشر ہو سکتا ہے۔ اس میں ایسی سنسنی خیزی اور لذت تھی جو بیان سے باہر تھی۔

اعلیٰ عہدیداران کی موجودگی میں اس سفوف کو ضائع کر دیا گیا۔

داور حنا کی موت حوالات ہی میں ہوئی..... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت زہر کھانے سے ہوئی تھی لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اسے زہر کس طرح فراہم کیا گیا تھا۔

ان سب ہنگاموں کے دوران داور حنا کی بیٹی علیزا غائب ہو چکی تھی۔

اس نے اپنے ملک کو بچانے کے لیے جو کارنامہ انجام دیا تھا، جس طرح کی قربانی دی اور جس طرح خود اپنے باپ کے خلاف ہو گئی تھی وہ جذبہ قابلِ قدر تھا۔

حکام کی نگاہوں میں اس کی بہت عزت تھی لیکن وہ تھی کہاں؟

ظفر بھی اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ خدا جانے وہ کہاں اور کیوں چلی گئی تھی پھر کئی ہفتے گزر گئے، کئی مہینے گزر گئے۔

ظفر کی فرم نے اسے تربیت کے لیے انگلینڈ بھیج دیا تھا۔

وہ وہاں ایک سال تک رہا اس عرصے میں وہ ایک بار بھی علیزا کو فراموش نہیں کر سکا..... ایک سال کے بعد اس کی واپسی ہوئی تو سب سے پہلے وہ تنہا دھوکر اپنی سحرش کی قبر پر گیا۔

پورے ایک سال تک وہ سحرش کی قبر سے دور رہا تھا۔ قبر پر جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے ظفر کے علاوہ دیکھ بھال کرنے والا اور کون تھا۔ اس نے گورکن کو ہدایت کی کہ وہ اس قبر کو صاف کرے اور اس پر پانی ڈالے۔

وہ گورکن کو کام کرتے ہوئے دیکھتا اور سوچتا رہا۔ وقت کتنی تیز رفتاری سے گزر گیا تھا۔ اس کا قبرستان آنا، قبر کے کتبوں پر کراس کا ہونا پھر علیزا کا پراسرار حالت میں ملنا۔ اس کے بعد ایک بھیانک ڈرامے کا آغاز اور اس کا اختتام۔

پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے، وقت اتنے تماشے کیوں دکھاتا ہے؟

گورکن نے کچھ دیر میں اپنا کام ختم کر لیا۔ اس نے گورکن کو پیسے دیے اور قبرستان سے باہر آ گیا..... اس کی گاڑی کے پاس وہی کھڑی تھی۔

وہ علیزا ہی تھی۔

وقت جیسے اچانک پیچھے کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر علیزا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے تم..... مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

"تم کہاں تھیں..... میں تو تمہیں تلاش کر کر کے پاگل ہو گیا تھا۔"

"میں اپنے باپ کے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ کسی کو اپنا منہ نہیں دکھا سکتی تھی۔ لوگ یہی کہتے کہ دیکھو یہی ہے وہ لڑکی جس کا باپ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا۔ بس اسی خوف سے میں روپوش ہو گئی تھی۔"

"پاگل ہو تم، تمہاری تو اتنی تعریفیں کی جا رہی تھیں۔ تمہاری مثالیں دی جاتی تھیں کہ تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو شاید ہی کسی نے کیا ہو لیکن تم ہمیں کہاں؟"

"میں امجد اور اس کی بیوی کے ساتھ رہ رہی تھی۔" علیزا نے بتایا۔ "مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا لیکن میں تمہاری تلاش میں کئی بار تمہارے فلیٹ پر گئی تھی اور قبرستان بھی روز آتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم سے اگر ملاقات ہوئی تو یہیں ہوگی۔"

"اور دیکھ لو کہ مجھ سے ملاقات ہو ہی گئی۔" ظفر نے کہا۔ "اب چلو میرے ساتھ لیکن..."

"لیکن کیا...؟"

"اب کسی سگنل پر اتر کر غائب مت ہو جانا۔"

"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔" علیزا مسکرا دی۔

آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کے درمیان اس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی۔ ظفر نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

http://digestpk.blogspot.com/

بزدل

سلیم فاروقی

حالات و واقعات دراصل وہ سانچے ہیں جو انسانی شخصیت کی تشکیل و تکمیل کو ایک خاص ڈھب میں ڈھالتے ہیں... ورنہ اس سے پہلے اس کی ذات ہواؤں میں اڑتے پتوں کے مانند ادھر سے ادھر ڈولتی رہتی ہے... انسانی زندگی کی بوالعجبیاں جو انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں... ایک نوجوان کی زندگی کے بکھرے اوراق۔ جس کے ہر ورق پر ایک نیا حادثہ رقم تھا... اور پھر آخری حادثے نے سب کچھ تلپٹ کر دیا۔

جاسوسی کے خاص صفحات کی زینت..... ایک تیز رفتار ناقابل فراموش سرورق کی صورت

میں ٹیوشن پڑھ کر واپس آیا تو گھر میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ میری دونوں بہنیں سلمٰی اور عذرا بُری طرح چیخ رہی تھیں۔ میں بھی ان کی چیخ پکار سے گھبرا گیا۔ اس وقت راشد بھائی بھی گھر میں موجود نہیں تھے اور مجھ سے چھوٹا حامد بھی نہیں تھا۔ امی نہ جانے کہاں نکل گئی تھیں۔

"کیا ہوا سلمٰی؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔ "تم چیخ کیوں رہی ہو؟" میں یہ سمجھا کہ ان میں سے کسی کو چوٹ لگ گئی ہے یا پھر گھر میں کوئی چور گھس آیا ہے۔

"شاہد بھائی... وہ... چھپکلی... وہ... ابھی مجھ پر گری ہے۔" سلمٰی نے اپنی چیخیں روک کر کہا۔

"کہاں ہے چھپکلی؟" میں بھی گھبرا گیا۔

"وہ... وہ... دیکھیے... وہ بستر پر ہے۔" عذرا نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

واقعی بستر پر خاصی موٹی چھپکلی بیٹھی تھی۔

"شاہد بھائی! اسے ماردیں ورنہ یہ بستر میں کہیں گھس جائے گی۔" سلمٰی نے کہا۔

"مم... میں... اسے... ماروں؟" میں نے ہکلا کر کہا۔

"میں اسے... بھگانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"بھگانے سے کیا ہوگا؟ وہ کسی لحاف، گدے یا الماری کے پیچھے بھاگ جائے گی۔ میں تو اس کمرے میں سو بھی نہیں سکوں گی۔" سلمٰی نے کہا۔

"تم بھی کس بزدل سے چھپکلی مارنے کی بات کر رہی ہو؟" اچانک راشد بھائی کی آواز آئی۔ "یہ تو ایک مکھی بھی نہیں مار سکتا۔" وہ نہ جانے کب گھر میں آگئے تھے، وہ چھپکلی کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "اسے اگر میں بستر پر ماروں گا تو بستر خراب ہو جائے گا۔ تم مجھے کوئی پرانا کپڑا دو۔ میں اسے پکڑ کے باہر لے جا کر ماروں گا۔"

سلمٰی نے جھٹ انہیں اپنی ایک پرانی قمیص تھما دی۔

راشد بھائی نے وہ قمیص اچانک چھپکلی پر پھینکی اور اسے جھپٹ کر پکڑ لیا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ اب گھر سے باہر جا کر راشد بھائی اس کا کچومر نکال دیں گے۔

"راشد بھائی!" میں نے کہا۔ "آپ اسے ماریں مت، بس باہر جا کر پھینک دیں۔"

راشد بھائی نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولے۔ "اسے ماروں گا نہیں تو یہ پھر گھر میں آجائے گی... اور تم اتنے فکرمند کیوں ہو؟"

وہ چھپکلی کو باہر لے گئے۔ پھر انہوں نے اس کا نہ جانے کیا حشر کیا۔ میں تو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سلمٰی اور عذرا اس کا انجام دیکھنے کے لیے راشد بھائی کے پیچھے پیچھے باہر چلی گئیں۔

میں شروع ہی سے ایسا تھا۔ چھپکلی تو دور کی بات ہے، مجھ

سے تو ایک چیونٹی بھی نہیں ماری جاتی۔ امی، ابو سمیت گھر کے ہر فرد نے مجھے بزدل اور ڈرپوک کا خطاب دے رکھا تھا۔ راشد بھائی تو میرا نام لینے کے بجائے مجھے بزدل ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

گلی محلے کے اکثر لڑکے بھی مجھے بزدل کہہ کر چھیڑتے تھے۔ میں جواب میں کوئی سخت بات کہتا تو وہ مجھے دھکا دے کر گرا دیتے۔

اگر راشد بھائی نہ ہوتے تو شاید میں مار کھاتا رہتا لیکن وہ خاصے جھگڑالو طبیعت کے تھے۔ وہ میری خاطر ان لوگوں سے بھڑ جاتے پھر کسی کا سر پھٹتا، کسی کے دانت ہل جاتے۔

جب دو چار دفعہ ایسا ہوا تو محلے کے لڑکوں نے مجھے چھیڑنا چھوڑ دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ابھی راشد آکر ان سب کی درگت بنا دے گا۔ حامد بھی لڑنے جھگڑنے میں ان سے کم نہیں تھا۔ وہ بھی محلے کے لڑکوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا تھا۔

راشد بھائی اور ابو اکثر مجھے سمجھاتے کہ اگر تم ایسے ہی ڈرتے رہے تو دنیا میں تمہارا جینا دوبھر ہو جائے گا مگر میں اپنی فطرت کو کیسے بدل سکتا تھا۔

امی مار پیٹ اور دنگے فساد سے بچنے کے لیے میں اسکول اور گلی محلے کے لڑکوں سے دور ہی رہتا اور اپنی پڑھائی میں مگن رہتا۔ اسی وجہ سے ہر کلاس میں ہمیشہ میں نے اول پوزیشن لی۔ کچھ لڑکے مجھ سے حسد بھی کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ لڑکے جن کی دوسری یا تیسری پوزیشن آتی تھی۔ انہیں امید ہوتی تھی کہ اس مرتبہ پہلی پوزیشن انہیں ملے گی لیکن ہر دفعہ انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

چودھری اسلم کا بیٹا مظہر خاص طور پر مجھ سے خار کھاتا تھا۔ اس کے والد ٹرانسپورٹر تھے۔ وہ پڑھنے میں تیز تھا اور اسکول کے بعد ٹیوشن سے گھر پر پڑھانے آتا تھا لیکن اس کے باوجود ہمیشہ وہ دو تین نمبروں سے پیچھے رہ جاتا تھا۔

وہ آتے جاتے مجھ پر آوازیں کستا، میرے بارے میں غلط قسم کی باتیں کرتا۔ وہ یہاں تک کہتا تھا کہ شاید تو امتحان میں نقل کر کے پاس ہوتا ہے۔ اس کی یہ بات کسی کو ہضم نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس معاملے میں ہمارا اسکول بہت سخت تھا۔ وہاں نقل کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

http://digestpk.blogspot.com/

راشد بھائی کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مجھ سے دو سال آگے تھے لیکن ایک مرتبہ فیل ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے صرف ایک کلاس آگے رہ گئے تھے۔

اس دن بھی اسکول میں سالانہ امتحان کا نتیجہ سنایا جانے والا تھا۔ پرنسپل صاحب ایسے موقع پر اسکول کے میدان میں بڑا سا شامیانہ لگا کر اسٹیج بنوایا کرتے تھے، پھر اول، دوم اور سوم آنے والے طالب علموں کو انعامات دیے جاتے تھے۔

حسب معمول پہلے چھوٹی کلاسوں کے نتائج کا اعلان کیا گیا۔ یعنی پہلی جماعت سے اعلان شروع ہوا۔

مجھے بے چینی سے اپنے نتیجے کا انتظار تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس مرتبہ شاید میں فرسٹ نہ آسکوں کیونکہ جس دن حساب کا پرچہ تھا، اس دن مجھے شدید بخار تھا۔ آخر خدا خدا کر کے چھوٹی جماعت کے نتائج ختم ہوئے۔

پرنسپل صاحب نے پہلے سوم آنے والے طالب علم کا نام لیا۔ ''اکرام حسن، تیسری پوزیشن لے کر کامیاب ہوئے ہیں۔''

تالیوں کی گونج میں انہوں نے دوم آنے والے طالب علم کا نام پکارا۔ ''چوہدری محمد مظہر، دوسری پوزیشن لے کر کامیاب ہوئے ہیں۔''

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اکرام حسن وہ لڑکا تھا جو ہمیشہ چوتھے یا پانچویں نمبر پر آتا تھا۔ دوسری پوزیشن یا تو مظہر کی ہوتی تھی یا پھر ابرار کی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس مرتبہ ابرار نے خوب جی لگا کر پڑھا ہے اور پہلی پوزیشن لے گیا ہے۔

''اور اب جو طالب علم اول آیا ہے، اس کا نام ہے...'' یہ کہہ کر پرنسپل صاحب نے کچھ توقف کیا۔ پورے پنڈال میں سناٹا تھا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس مرتبہ میں چوتھے یا پانچویں نمبر پر آیا ہوں۔

پرنسپل صاحب نے خاموشی کو توڑا اور بولے۔ ''جس طالب علم نے اول پوزیشن حاصل کی ہے، پورے اسکول کو اس پر فخر ہے۔ اس کا نام ہے... شاہد ضیا!''

مارے خوشی کے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں وفور جذبات میں اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آفتاب سے چمٹ گیا۔ مظہر مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

راشد بھائی حسب توقع اس سال بھی فیل ہو گئے تھے لیکن ان کے چہرے پر ذرہ برابر بھی ملال نہیں تھا۔

پھر پرنسپل صاحب نے اول، دوم اور سوم آنے والے طالب علموں کو انعامات دینا شروع کر دیے۔

مظہر میری ہی قطار میں بیٹھا تھا۔ میں اسٹیج کی طرف جانے لگا تو اس نے اچانک اپنا پاؤں اڑا دیا۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سامنے والی قطار کے ایک لڑکے پر گر پڑا۔

لڑکے بے تحاشا ہنسنے لگے۔ میں نے خجالت مٹانے کو اس لڑکے سے معذرت کی اور اسٹیج پر پہنچ گیا۔ پرنسپل صاحب نے انعام کے طور پر مجھے بہت قیمتی شیفر کا قلم دیا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ مظہر کی یہ تمام کارروائی میرے دونوں بھائی راشد اور حامد دیکھ رہے ہیں۔ حامد اوسط درجے کا طالب علم تھا اس لیے وہ صرف پاس ہوا تھا۔

جب میں نتیجے کا کارڈ اور اپنا انعام لے کر باہر نکلا تو راشد بھائی نے آواز دے کر مجھے روک لیا اور بولے۔ ''شاہد! میرے بھائی ہو کر تم اتنے بزدل ہو کہ تم نے اس کمینے مظہر سے ایک لفظ بھی نہیں کہا؟''

اسی وقت حامد بھی آ گیا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا لیکن میری اور راشد بھائی کی طرح وہ بھی مضبوط قد کاٹھ کا تھا۔

''راشد بھائی! آپ تو جانتے ہیں کہ...''

''میں ہمیشہ کا بزدل اور ڈرپوک ہوں۔'' راشد بھائی نے طنزیہ انداز میں میرا جملہ پورا کر دیا۔ ''اب تم فکر مت کرو۔'' راشد بھائی نے کہا۔ ''تم بھی اب میری ہی کلاس میں آ گئے ہو۔ اب کلاس کے شرارتی لڑکے تمہیں کچھ کہتے ہوئے دس دفعہ سوچیں گے۔''

اچانک انہیں مظہر نظر آ گیا۔ وہ گاڑی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ باپ کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار تھا۔ اس وقت جو بھی ٹیکسی والا اسکول کے نزدیک ہوتا، وہ اسے گھر پہنچا دیتا تھا۔

راشد بھائی نے مظہر کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی چمک نظر آئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''شاہد! تم یہیں ٹھہرو، میں اس کمینے سے ذرا دو دو ہاتھ کر لوں۔ آؤ حامد۔''

''راشد بھائی! چھوڑیں اس بات کو... وہ...''

راشد بھائی نے میرا ہاتھ جھٹکا اور تیزی سے مظہر کی طرف بڑھے۔ حامد ان کے پیچھے تھا اور میں ان دونوں کے پیچھے دوڑا تاکہ انہیں جھگڑے سے روک سکوں۔

راشد بھائی کو دیکھ کر مظہر کا چہرہ فق ہو گیا لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔

راشد بھائی نے کہا۔ ''تم نے شاہد کو گرانے کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''میں نے؟'' مظہر نے انجان بن کر پوچھا۔ ''میں بھلا اسے کیوں گراؤں گا؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے اس سمت دیکھا جہاں سے اس کی ٹیکسی آنے والی تھی۔

''غلط حرکت کرتا ہے پھر جواب بھی کرتا ہے۔'' راشد بھائی دہاڑ کر بولے اور اچانک اس کا گریبان پکڑ کر اسے نزدیکی گلی میں گھسیٹ لیا۔ وہ اسے وہاں سے بھی کھینچتے ہوئے ایک اور گلی میں مڑ گئے۔ اب اس کا ڈرائیور اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''دیکھو راشد!'' مظہر نے کہا۔ ''میرا گریبان چھوڑ دو اور شرافت سے بات کرو۔''

''شرافت کے بچے۔'' یہ کہہ کر راشد بھائی نے ایک جھٹکے میں اس کا گریبان تار تار کر دیا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے... شاہد لاوارث ہے؟''

''راشد... میں...''

راشد بھائی نے اس کی بات سنے بغیر تابڑ توڑ کئی گھونسے اس کے پیٹ اور شانوں پر رسید کر دیے۔ وہ اس کے چہرے کو نشانہ بنانے سے اجتناب برت رہے تھے۔

حامد نے پیچھے سے ایک بھرپور لات اس کی کمر پر مار دی۔

وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ اس کا خون دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ نہ جانے مجھ میں ایسی کون سی نفسیاتی کمزوری تھی کہ میں خون تو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ چاہے وہ کسی جانور کا ہو یا انسان کا۔

مجھے ہوش آیا تو میں اسکول کے نزدیک پارک میں لیٹا تھا اور حامد میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔

مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر راشد بھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اوہو... ہمارے شیر کو بہت جلدی ہوش آ گیا۔''

''راشد بھائی! وہ مظہر کہاں ہے؟''

''وہ تو دُم دبا کر ایسا بھاگا ہے کہ آئندہ تمہاری طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈرے گا۔'' پھر وہ سخت لہجے میں بولے۔ ''اور ہاں... اس واقعے کا علم گھر میں کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔''

ابو میرے فرسٹ آنے پر بے حد خوش تھے، راشد بھائی کے فیل ہونے پر اتنے ہی رنجیدہ بھی تھے۔

رزلٹ کے بعد اسکول میں ایک ہفتے کی چھٹی تھی۔ چھٹی کے بعد جب میں اسکول پہنچا تو کلاس ٹیچر نے راشد بھائی کو پیچھے بٹھایا کیونکہ وہ اب خاصے بڑے ہو گئے تھے اور ان کی وجہ سے پیچھے بیٹھنے والے لڑکوں کو بلیک بورڈ نظر نہیں آتا تھا۔

ہاف ٹائم سے کچھ پہلے کلاس کے دروازے پر ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے بوسکی کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا، کلائی میں انتہائی قیمتی گھڑی تھی اور گلے میں خاصی موٹی چین بھی تھی جو یقیناً سونے کی ہوگی۔

''جی فرمایئے؟'' ہمارے سر نے اس سے پوچھا۔

''راشد کون ہے؟'' اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''میں ہوں راشد!'' راشد بھائی اچانک کھڑے ہو گئے۔

''مظہر کو تم نے مارا تھا؟'' اس نے تضحیک آمیز لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں، میں نے ہی مارا تھا۔'' راشد بھائی نے کہا۔ ''اور اس سے پوچھیں کہ کیوں مارا تھا؟''

''تم ذلیل، کم ذات... ہمارے بیٹے پر ہاتھ اٹھاؤ گے؟'' یہ کہہ کر وہ راشد بھائی کی طرف جھپٹا۔

اچانک ہمارے سر بیچ میں آ گئے اور بولے۔ ''آپ کو راشد سے کوئی شکایت ہے تو پرنسپل صاحب کے پاس جائیں یا شکایت لکھ کر مجھے دے دیں۔''

''دیکھو ماسٹر!'' وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے ہاتھوں سے اس کم ذات کو سزا دوں گا۔''

''یہ بچے اس وقت میری ذمے داری ہیں۔'' سر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس وقت تو آپ راشد کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔''

''اچھا!'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کون روکے گا مجھے؟''

''میں روکوں گا آپ کو۔'' سر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اور اگر آپ پانچ منٹ کے اندر اندر یہاں سے نہیں گئے تو مجبوراً مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔''

''ہم کو پولیس کی دھمکی دیتا ہے؟'' اس نے اچانک سر کا گریبان پکڑنا چاہا لیکن سر نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔

پھر اچانک راشد بھائی بجلی کی سی تیزی سے ڈیسکیں پھلانگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور مظہر کے باپ کے چہرے پر اتنے زور سے گھونسا مارا کہ اس کے سامنے کے دو تین دانت ضرور ہل گئے ہوں گے۔

''رک جاؤ راشد!'' سر نے چیخ کر کہا۔

http://digestpk.blogspot.com/

راشد بھائی پر تو جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ غصے میں

اس سے کہیں چھوٹے تھے۔ انہوں نے اچھل کر اس کی ناک پر زوردار مکہ مار دی۔ پھر وہ اچھل کر ایک بینچ پر کھڑے ہو گئے اور چودھری کے سینے پر اتنی زوردار لات ماری کہ وہ الٹ کر سر کی میز پر گرا۔

اس کی ناک اور ہونٹوں سے بہتا ہوا خون دیکھ کر مجھ پر ایک دفعہ پھر لرزہ طاری ہو گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

اس واقعے کی اطلاع پرنسپل صاحب کو بھی مل چکی تھی۔ انہوں نے فوراً پولیس کو ٹیلی فون کر دیا اور اسکول کا مرکزی دروازہ بند کرا دیا اور دو تین چوکیداروں کی ڈیوٹی لگا دی کہ مار پیٹ کرنے والا وہ شخص یہاں سے باہر نہ نکلنے پائے۔

مجھے تھوڑی دیر بعد ہوش آ گیا۔ اسی وقت پولیس کی موبائل وین بھی پہنچ گئی۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ کسی اسکول کے احاطے یا بلڈنگ میں پرنسپل کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔

چودھری اسلم نے اسکول میں آ کر نہ صرف راشد بھائی کو گالیاں دینے میں پہل کی بلکہ سر کا گریبان پکڑنے کی کوشش بھی کی تھی۔

پرنسپل صاحب کی شکایت... پر چودھری اسلم کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بیٹے کو اسکول سے نکال دیا گیا۔

پھر اسی طرح دن گزرتے رہے۔ اب مجھے کم سے کم یہ اطمینان تھا کہ کلاس میں کوئی لڑکا مجھ سے بدتمیزی نہیں کرتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ راشد اور حامد کا بھائی ہے۔ اسے چھیڑنے کا مطلب اپنی پٹائی کو دعوت دینا ہے۔

یوں میں نے انتہائی اعلیٰ نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ راشد بھائی بھی میٹرک میں پاس ہو گئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ہی ان کی پڑھائی پر زیادہ زور دیتا تھا۔

ان کے لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ کا وہی عالم تھا۔ حامد بھی لڑائی بھڑائی میں راشد بھائی سے کچھ کم نہیں تھا۔

میرے پاس ہونے کی خوشی میں لاہور سے ماموں بھی آئے تھے۔ وہ مجھے بچپن ہی سے پسند کرتے تھے۔

انہوں نے امی سے کہا۔ ”شاہد پڑھنے والا بچہ ہے۔ تم اسے میرے ساتھ لاہور بھیج دو۔ میں وہاں کے بہترین کالج میں اس کا داخلہ کرا دوں گا۔ اس ماحول میں رہ کر تو یہ نہیں پڑھ سکے گا۔“

پھر بہت بحث و مباحثے کے بعد ابو مجھے لاہور بھیجنے پر رضامند ہو گئے۔ یوں میں لاہور آ گیا۔ ماموں نے نہ صرف مجھے لاہور کے ایک بہترین کالج میں داخلہ دلوایا بلکہ میرے لیے ایک ٹیوٹر کا بندوبست بھی کر دیا۔

ماموں کی ایک ہی بیٹی تھی صائمہ۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ خاصی خودسر اور ضدی تھی۔ وہ تھی بھی بہت خوب صورت۔ مجھے اس کی خوب صورتی یا خودسری سے کیا لینا تھا۔ میں تو اپنی پڑھائی میں مگن ہو گیا تھا۔ لڑکیوں میں تو مجھے شروع ہی سے دلچسپی نہیں تھی۔

ان دنوں میرے فرسٹ ایئر کے امتحانات ہو رہے تھے۔ میں بہت مصروف تھا اور راتوں کو دیر تک جاگ کر پڑھائی کرتا تھا۔

ایک دن اچانک صائمہ میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ میرے لیے دودھ کا گلاس اور ایک پلیٹ میں ڈرائی فروٹس لائی تھی۔

”تم اتنی محنت کرتے ہو، کچھ اپنی صحت کی طرف بھی توجہ دو۔ بس ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہو۔ میں تمہارے لیے دودھ لے کر آئی ہوں اور یہ کچھ پستے اور بادام ہیں۔ انہیں کھا لو۔“

”رکھ دو۔“ میں نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

”سونے سے پہلے دودھ پی لوں گا۔“

وہ چند لمحے مجھے کھڑی گھورتی رہی۔ میں اس کی طرف دیکھ تو نہیں رہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ وہ مجھے ہی دیکھ رہی ہے پھر وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

میں رات دیر تک پڑھتا رہا پھر نہ جانے کب سو گیا۔

صبح میری آنکھ صائمہ کے جھنجوڑنے پر کھلی۔ میں نے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ترش لہجے میں کہا۔ ”تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر میری نظر اس ٹرے پر پڑی جو وہ رات لے کر آئی تھی۔ ٹرے میں دودھ اور خشک میوہ جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ میں رات کو وہ دودھ پینا بھول گیا تھا۔

”میں تمہارے لیے دودھ اور یہ چیزیں لے کر آئی تھی، تمہیں اپنی پڑھائی میں اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ انہیں کھا لیتے؟“

”سوری صائمہ! وہ دراصل مجھے نہ جانے کب پڑھتے پڑھتے نیند آ گئی ورنہ...“

”ورنہ کیا؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”کسی کا دل ٹوٹے یا جذبات مجروح ہوں... تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟“

”یہ بات نہیں ہے صائمہ! میں...“

”مجھے میرے دوست صابی کہتے ہیں۔ تم تو میرے

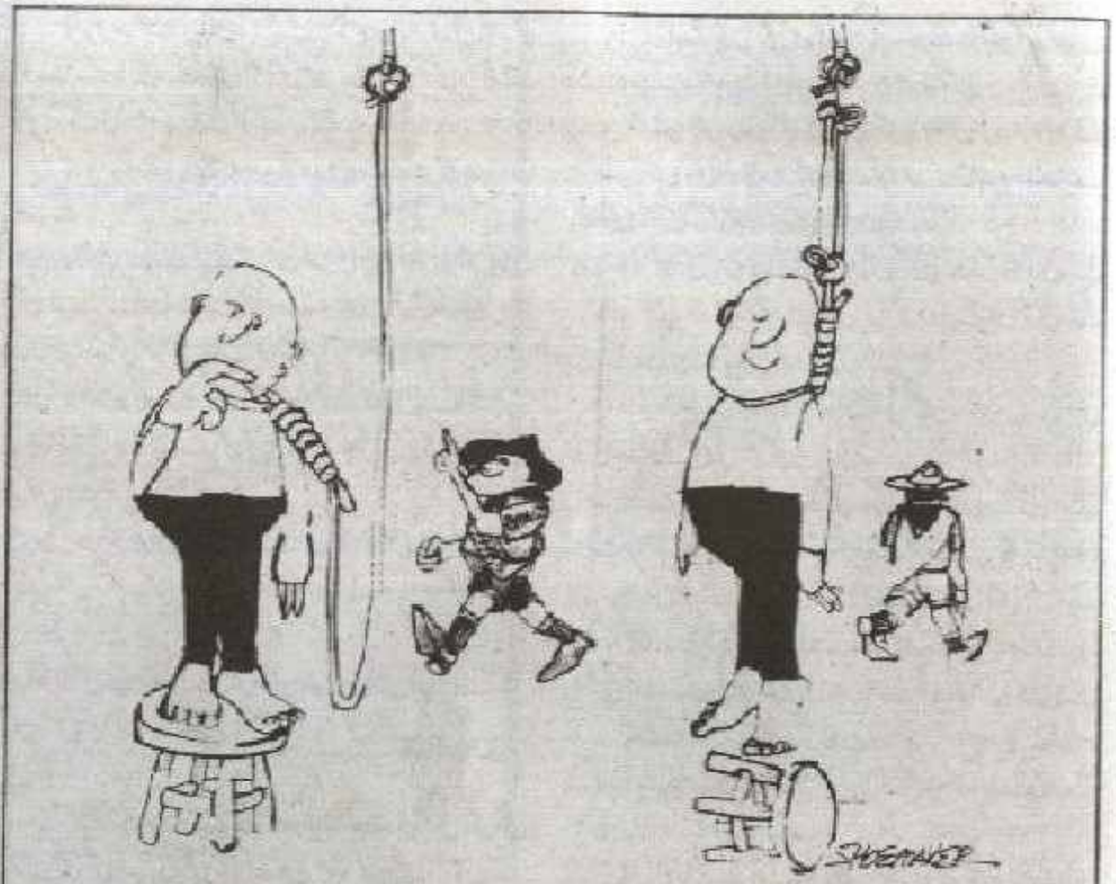

چڑھ جا سولی! رام بھلی کرے گا ——— شانزلے کا انتخاب اعلیٰ سے

لیے دوستوں سے بھی بڑھ کر ہو۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں اس کے الفاظ پر چونک اٹھا۔ میں اب اتنا ناسمجھ یا احمق بھی نہیں تھا کہ صائمہ کی نگاہیں نہ پہچانتا۔ وہ شروع ہی سے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھتی تھی کہ مجھے پسینا آ جاتا۔ آج تو اس نے باتوں باتوں میں کھل کر کہہ دیا تھا۔

”سوری صابی!“ میں نے کہا۔ ”آئندہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔“

سچی بات تو یہ ہے کہ صائمہ ہی وہ پہلی لڑکی تھی جو مجھے اچھی لگی تھی۔ بولتے سے قد اور بھرے بھرے جسم والی وہ خوب صورت لڑکی پہلے ہی میرے دل میں گھر کر گئی تھی لیکن میں ماموں کے احسانوں کے بوجھ تلے اتنا دبا ہوا تھا کہ کھل کر اظہار کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔

دوسرے دن پھر صائمہ دودھ اور خشک میوہ لے کر آ گئی۔ میں اس دن آخری پیپر دے کر آیا تھا اور ایک ناول پڑھ رہا تھا کیونکہ راتوں کو جاگ جاگ کر مجھے جلد سونے کی عادت نہیں رہی تھی۔

وہ ٹرے چھوٹی میز پر رکھ کر میرے بیڈ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”آج تو میں تمہیں اپنے سامنے دودھ پلا کر جاؤں گی۔“

”دودھ تو میں پی لوں گا لیکن یہ پستے اور بادام تمہیں بھی میرے ساتھ کھانا پڑیں گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

میں نے دودھ کا گلاس تو فوراً ہی خالی کر دیا لیکن صائمہ ایک ایک بادام اور پستہ بہت نزاکت سے کھا رہی تھی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں ماموں یا ممانی اسے میرے کمرے میں نہ دیکھ لیں۔ وہ نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔

”جس محنت اور لگن سے تم پڑھائی کر رہے ہو، مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم انجینئر بن جاؤ گے، پھر تو تم بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ شاید تم ہمیں مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟“

”میں خود کو تو بھول سکتا ہوں صابی!“ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہیں نہیں بھول سکتا۔“

”وعدہ؟“ اس نے اپنا خوب صورت ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

”وعدہ!“ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

http://digestpk.blogspot.com/

پھر تو صائمہ روز ہی آنے لگی۔ ماموں اور ممانی جلدی سونے کے عادی تھے۔ وہ گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی اور ہم مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہتے۔

میرا رزلٹ آیا تو حسبِ معمول میرے نمبر بہت شان دار تھے۔

رزلٹ کے بارے میں سن کر امی، ابو اور راشد بھائی بھی لاہور آگئے۔ راشد بھائی نے تو خوب قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ میرا قد بھی تقریباً چھ فٹ تھا، جسم بھی مضبوط تھا لیکن راشد بھائی کا قد تو مجھ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ انہوں نے ہنس کر پوچھا۔ ”شاہد! کیا اب بھی تمہارا وہی حال ہے؟ یہاں تو تم لڑکوں سے خوب پٹتے ہو گے۔“

”راشد بھائی! میں شہر کے جس کالج میں پڑھتا ہوں، وہاں اس قسم کے دنگے فساد نہیں ہوتے۔ وہاں بھی لڑکے پڑھنے والے ہیں اور جو پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتے، وہ خوامخواہ کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے۔“ پھر میں ہنس کر بولا۔ ”اور سنائیں، آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”مجھے میٹرک کرنے کے بعد ملازمت تو ملی نہیں، مل بھی نہیں سکتی تھی کہ آج کل میٹرک کو پوچھتا کون ہے؟ میں نے ٹھیکیداری شروع کر دی ہے۔ اس کام میں محنت تو بہت ہے لیکن آمدنی بھی خوب ہوتی ہے۔ میں نے حامد کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا ہے۔“

راشد بھائی یہ کہہ کر باہر نکل گئے۔ لاہور میں بھی ان کے کچھ دوست رہتے تھے۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو ماموں نے مسکرا کر کہا۔ ”آؤ بیٹا! بیٹھو۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ”بھئی، تمہارے امی اور ابو تمہیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔“

”میں اگر اس وقت لاہور سے گیا تو میری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ میں وہاں سیکنڈ ایئر کا امتحان کہاں دوں گا؟ پھر یہاں کے کالج میں اور وہاں کے کالج میں بہت فرق ہے۔ میں ایک سال تک تو نہیں جا سکتا۔“

”ایک ہی سال کی تو بات ہے۔“ ماموں نے امی سے کہا۔ ”شاہد تمہارا بیٹا ہے۔ میں اسے ہمیشہ کے لیے تو یہاں نہیں روک سکتا۔“

”بھائی جان! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ امی نے کہا۔ ”میں تو چاہتی ہوں کہ آپ شاہد کو ہمیشہ کے لیے اپنا بیٹا بنا لیں اور صائمہ کو ہمیں دے دیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔“

”شاہد تو یوں بھی میرا بیٹا ہے، بہت ہونہار اور فرماں بردار بچہ ہے۔ تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔“

”میں اس دفعہ منگنی کیے بغیر نہیں جاؤں گی۔“ امی نے کہا۔ ”بس یہی سوچ کر میں نے کہا تھا کہ شاہد کو ساتھ لے جاؤں۔ منگنی کے بعد اس کا یہاں رہنا...“

”تم بھی کس زمانے کی باتیں کرتی ہو؟“ ماموں نے کہا۔ ”اب وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ منگنی ہوتے ہی لڑکی نے لڑکے سے پردہ شروع کر دیا۔“

امی شاید پوری تیاری کر کے آئی تھیں۔ انہوں نے اسی دن صائمہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنا دی۔

دو دن بعد وہ لوگ روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ چلتے وقت راشد بھائی نے کہا۔ ”دیکھو شاہد! خوب دل لگا کر پڑھنا تاکہ ہم بھی فخر سے کہہ سکیں کہ ہمارے خاندان میں بھی ایک پڑھا لکھا اور قابل لڑکا موجود ہے۔ اور اب ڈرنا چھوڑ دو ورنہ زندگی تمہارے لیے عذاب ہو جائے گی۔ ہاں، کوئی ایسی ویسی بات ہو تو فوراً مجھے ٹیلی فون کر دینا۔“ انہوں نے مجھے گلے لگایا، پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور جاتے ہوئے پانچ ہزار روپے دے گئے۔

امی اور ابو کے جانے کا مجھے افسوس تو تھا لیکن یہ خوشی بھی تھی کہ اب صائمہ ہمیشہ کے لیے میری ہو گئی ہے۔

ماموں ...... کے ساتھ ساتھ صائمہ کو بھی مجھ سے بہت سی امیدیں تھیں۔ میں اس سال ہمیشہ سے زیادہ محنت کر رہا تھا کیونکہ انجینئرنگ کالج میں داخلے کا دارومدار ہی انٹرمیڈیٹ کے نمبروں پر تھا۔

میرے پاس سیل فون نہیں تھا۔ میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ راشد بھائی کے دیے ہوئے پیسوں سے ایک سیل فون خرید لیا۔ اب میں تقریباً روز ہی امی ابو کے علاوہ گھر کے دیگر افراد سے بھی بات کر لیتا تھا۔

میں رات رات بھر جاگ کر پڑھائی کرتا تھا۔ صائمہ بھی میرے ساتھ جاگتی تھی۔ وہ کبھی مجھے چائے بنا کر دیتی، کبھی کھانے کے لیے کچھ لے آتی۔

سال بھر پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ میری محنت رنگ لائی اور پورے بورڈ میں میری دوسری پوزیشن آگئی۔

اس دن میرے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ مجھ سے زیادہ خوشی صائمہ کو تھی۔ امی ابو بھی لاہور آگئے۔ وہ بھی بہت خوش تھے۔

امی نے مجھ سے کہا۔ ”بیٹا! تمہاری پڑھائی کے اور کتنے سال باقی ہیں؟“

”امی! اب صرف پانچ سال باقی ہیں پھر میں انجینئر بن جاؤں گا۔ انجینئرنگ کی ڈگری ہوتی تو چار ہی سال کی ہے لیکن ہمارے ملک میں اسے کھینچ تان کر پانچ سال کا کر دیا جاتا ہے۔“

”پانچ سال!“ امی سوچ میں پڑ گئیں۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم چار سال تک بھائی جان پر مزید بوجھ بنے رہو گے؟“

”امی! اس کا ایک طریقہ ہے۔“ راشد بھائی نے کہا۔ ”کراچی میں لاہور سے اچھے کالج ہیں۔ شاہد کا داخلہ تو وہاں بھی ہو جائے گا۔“

”مگر یہ کراچی میں رہے گا کہاں؟“ امی نے فکرمندی سے کہا۔

”امی! آپ اس کی فکر نہ کریں۔ باہر سے آنے والے لڑکوں کے لیے کراچی کے ہر بڑے کالج میں ہوسٹل ہوتے ہیں۔ لڑکے وہاں بہت آرام سے رہتے ہیں۔ کھانا پینا بھی اچھا ہوتا ہے اور ہر طرح کی سہولت ہوتی ہے۔ اس کے خرچے کی پروا مت کریں۔ اب اس کی پڑھائی کے سارے اخراجات میں اٹھاؤں گا۔“

”لیکن بھائی صاحب سے کیا کہو گے؟“ امی نے فکرمندی سے پوچھا۔

”ان سے کہہ دیں گے کہ کراچی کا انجینئرنگ کالج اس وقت دنیا بھر میں مانا جاتا ہے۔ شاہد کو وہاں سے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ وہ تو خوشی خوشی راضی ہو جائیں گے۔ اب تو شاہد ان کا ہونے والا داماد ہے۔ ویسے بھی میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ان کا ہاتھ آج کل تنگ ہے۔“

ماموں نے پہلے تو صاف انکار کر دیا لیکن جب ابو نے انہیں سمجھایا کہ یہ شاہد کے مستقبل کا سوال ہے تو وہ راضی ہو گئے۔

میں کراچی جانے پر قطعی راضی نہیں تھا۔ صائمہ کی جدائی کے احساس سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں اس کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اب اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اسی رات صائمہ حسبِ معمول میرے کمرے میں آئی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ وہ شاید روتی رہی تھی۔ اس نے زخمی لہجے میں کہا۔ ”شاہد! تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟“

”صائمہ! دل تو میرا بھی نہیں چاہ رہا ہے کہ یہاں سے جاؤں۔ میں صبح ہی ابو سے صاف صاف انکار کر دوں گا کہ میں کراچی نہیں جاؤں گا۔ انہوں نے زیادہ زور دیا تو میں

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مُقوّی اعصاب بلا تاخیر پہنچا دیں گے

http://ojs-pk.blogspot.com/

مزید پڑھنے ہی سے انکار کردوں گا۔"

"شاہد! خدا کے لیے ایسا غضب مت کرنا۔" صائمہ نے کہا۔ "مجھے فخر ہے کہ میرا ہونے والا شوہر اتنا ذہین اور پڑھا لکھا ہے اور انجینئر بننے والا ہے۔ آج تک ہمارے خاندان میں دور دور تک کسی انجینئر کا وجود نہیں ہے۔"

"لیکن صامی! مجھے تمہاری اتنی عادت ہوگئی ہے کہ میں تمہارے بغیر پڑھ نہیں پاؤں گا۔"

"نہیں شاہد! ایسی بزدلی کی باتیں مت کرو۔" صائمہ نے کہا۔ "تم کراچی بھی جاؤ گے اور اتنی ہی محنت اور لگن سے پڑھو گے بھی۔"

"اچھا، تم کہتی ہو تو..."

"ایسے نہیں۔" صائمہ نے کہا۔ "میری قسم کھا کر کہو کہ تم وہاں دل لگا کر پڑھو گے۔ اور ہاں، وہاں سے مجھے صرف ہفتے میں ایک دفعہ ٹیلی فون کرنا۔ میں نے اپنی دوست ذکیہ کو دیکھا ہے۔ وہ رات رات بھر اپنے منگیتر سے موبائل فون پر باتیں کرتی رہتی ہے لیکن تم ایسا نہیں کرو گے۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس کے نرم و ملائم ہاتھ کے لمس سے میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"دروازہ کھلا ہے شاہد! کوئی بھی اس طرف آ سکتا ہے۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے دوران میں کہا۔

"اس وقت کون آئے گا؟" میں نے اسے مزید اپنی طرف کھینچ لیا۔

پھر اس سے پہلے کہ ہم جذبات کے طوفان میں غرق ہوتے، صائمہ ہی کو ہوش آ گیا اور اس نے آہستگی سے خود کو چھڑا لیا اور اپنی سانسوں کو درست کرتے ہوئے بولی۔ "شاہد! میں تمہاری ہی تو امانت ہوں... اس میں خیانت کیوں کر رہے ہو؟"

مجھے بھی یک بارگی اپنی اس جذباتی اور گھٹیا حرکت کا احساس ہوا اور میں نے کہا۔ "سوری صامی! میں تمہیں دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا... بس اب جاؤ، شب بخیر۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

میں نے کراچی کی این ای ڈی یونیورسٹی میں داخلے کی درخواست بھیج دی۔ جواب میں ان کا داخلہ فارم اور دیگر کاغذات آ گئے۔ مجھے اگلے ہفتے کراچی جانا تھا۔

راشد بھائی نے محلے کے ایک آدمی کے ہاتھ حسب وعدہ پیسے بھجوا دیے۔ کراچی جانے سے پہلے میں اور صائمہ خوب گھومے، خوب دل بھر کے سیر کی۔ راشد بھائی نے مجھے اچھی خاصی رقم بھجوائی تھی۔ میں نے اس میں سے صائمہ کو شاپنگ بھی کرائی۔

اس دن ہم آپس میں ہنستے بولتے مال روڈ پر ٹہل رہے تھے۔ سڑک کے پار ایک آئس کریم والا کھڑا تھا۔ آئس کریم صائمہ کی کمزوری تھی۔ اس نے فوراً آئس کریم کھانے کی فرمائش کر دی۔

"اچھا تم یہیں ٹھہرو، میں آئس کریم لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا اور بہت مشکل سے سڑک پار کی۔ لاہور کا ٹریفک تو خیر زیادہ ہے ہی، مسئلہ سائیکل والوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب گاڑیاں کچھ فاصلے پر ہوتی ہیں اور سڑک پار کرنے کا موقع ہوتا ہے تو ایک یا دو سائیکل سوار نمودار ہو جاتے ہیں۔ انہیں گزرنے کا موقع دیا جائے تو اتنی دیر میں وہ گاڑی سر پر پہنچ جاتی ہے جو کافی دور ہوتی ہے۔

میں آئس کریم لے کر واپس آیا تو مجھے صائمہ وہاں نظر نہیں آئی جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

پھر اچانک کچھ فاصلے پر مجھے صائمہ نظر آئی۔ تین لڑکوں نے اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ وہ اپنے لباس اور حلیوں سے بڑے آدمیوں کے بیٹے لگ رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ایک مرسیڈیز بھی موجود تھی۔ نمبر پلیٹ کے ساتھ ہی ایک پلیٹ اور بھی تھی جس پر نمایاں حروف میں ایم پی اے کے الفاظ چمک رہے تھے۔ گاڑی کے نزدیک پولیس کا ایک کانسٹیبل بھی موجود تھا۔

"ارے جانِ من! اکیلی کیوں کھڑی ہو؟" ان میں سے ایک لڑکا بولا۔ "آؤ ہمارے ساتھ چلو۔"

"یکو اس کی تو تھپڑ مار دوں گی۔" صائمہ نے بپھر کر کہا۔

"تم تو غصے میں اور بھی حسین لگتی ہو۔" دوسرا لڑکا بولا۔

صائمہ کی نظر ابھی تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ تینوں عجیب حلیے میں تھے۔ جینز اور ٹی شرٹ میں ان کے سوکھے سڑے جسم مزید مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ ان میں سے دو نے بال اس حد تک بڑھا رکھے تھے کہ ان کی باقاعدہ پونی باندھ رکھی تھی۔ تیسرے کے بال بھی بڑے تھے لیکن اس کی گردن پر بکھرے ہوئے تھے۔

میرے مقابلے میں تو وہ گویا بچے تھے۔ میں اگر ان کے زور سے ایک ایک ہاتھ بھی مار دیتا تو وہ چکرا کر گر پڑتے۔

میرا خون کھول رہا تھا لیکن میری ازلی بزدلی یہاں بھی آڑے آ رہی تھی۔ اچانک ان میں سے ایک پونی والے نے

صائمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گاڑی کی طرف کھینچنے لگا۔ صائمہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کے چہرے پر تڑاخ سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

اسی وقت اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چیخ کر بولی۔ "شاہد! تم کہاں رہ گئے تھے؟" پھر وہ اس لڑکے سے بولی۔ "اب میرا منگیتر بتائے گا کہ کسی لڑکی کو بے عزت کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

لڑکے نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور لمحے بھر کو اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

دوسرا لڑکا کچھ زیادہ ہی جی دار تھا۔ وہی شاید ایم پی اے کا بیٹا، بھائی تھا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "اچھا تو تو اس سور ما پر اکڑ رہی تھی۔ اسے تو میں تھانے میں بند کرا کے اتنا پٹواؤں گا کہ یہ عشق کرنا ہی بھول جائے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "دفع ہو جا یہاں سے۔ اس لڑکی نے میرے دوست پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اسے تو میں تھانے لے کر ضرور جاؤں گا۔ تجھے شاید معلوم نہیں ہے کہ میں ایم پی اے کا بھائی ہوں۔"

پونی والے نے پھر صائمہ کی کلائی تھامی اور اسے گاڑی کی طرف کھینچا۔ میرا خون کھول رہا تھا لیکن بزدلی کی وجہ سے کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔

میں پولیس والے کی طرف بڑھا اور اس سے کہا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں، وہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔ وہ آوارہ لڑکے میری کزن کے ساتھ کیسا بے ہودہ سلوک کر رہے ہیں؟"

پولیس والے نے بے نیازی سے کہا۔ "میں تو ایسے تماشے روز ہی دیکھتا ہوں جناب عالی! میں کیا کر سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک صوبائی وزیر کا بیٹا ہے۔ ان کا تو روز کا یہی کام ہے۔ انہیں روک کر کیا میں اپنی شامت کو دعوت دوں؟ میری تو نوکری بھی جا سکتی ہے۔"

"آپ کو شرم آنا چاہیے۔ آپ قانون کے محافظ ہیں اور..."

"او باؤ، جا اپنا کام کر۔ تو انہیں روک سکتا ہے تو روک لے۔" اس نے درشت لہجے میں کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

اس دوران میں صائمہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ مجھے آوازیں دے رہی تھی اور ان تینوں کو لاتیں اور گھونسے مار رہی تھی۔ اس کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے دوسرے لڑکوں کا حلیہ بھی بگاڑ دیا تھا۔ وہ اب بھی مجھے آوازیں دے رہی تھی مگر مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک وہاں سفید رنگ کی ایک آلٹو رکی۔ اس میں سے لمبا تڑنگا میرے ہی قد کاٹھ کا ایک خوب رو اور کسرتی بدن کا نوجوان اترا اور چیخ کر بولا۔ "کیا ہو رہا ہے یہ؟"

وہ لوگ میری بزدلی سے شیر ہو گئے تھے اس لیے پونی والے نے تلخ لہجے میں کہا۔ "جا بھئی، تو اپنے کام سے کام رکھ!"

اس نے اچانک پیچھے سے اس کی پونی پکڑی اور اسے زوردار جھٹکا دے کر پیچھے گھسیٹ لیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ "میں اپنے کام ہی سے کام رکھ رہا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے دوسرے لڑکے کے چہرے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ پھر پونی والے کا چہرہ اپنے سامنے کر کے اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی آواز پولیس والے تک بھی پہنچی ہو گی۔

"تم لوگوں کو سوائے آوارہ گردی اور دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں کو تنگ کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے؟" وہ غرا کر بولا۔

پونی والے کی پونی اب بھی اس کی مضبوط گرفت میں تھی۔ وہ منمنا کر بولا۔ "تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں صوبائی وزیر..."

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے نوجوان نے اس کے چہرے پر ایک تھپڑ مزید رسید کر دیا اور بولا۔ "تو شاید مجھے نہیں جانتا ہے۔ اس لڑکی سے معافی مانگ ورنہ میں تیرا حلیہ بگاڑ دوں گا اور گھر والے تیری شکل بھی پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔" اس کے ساتھیوں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک تو کامیاب ہو گیا، دوسرے کو اس نوجوان نے کلائی سے پکڑ کے روک لیا۔

وہ گھگیا کر بولا۔ "میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے تو جانے دو۔"

"تیرا قصور تو میں دیکھ رہا تھا۔ چل ان سے معافی مانگ ورنہ تیرے بھی ہاتھ پیر توڑ کر یہیں پھینک دوں گا۔"

پونی والے نے پولیس والے کو پکارا۔

"اوئے، تو ادھر کھڑا کیا تماشا دیکھ رہا ہے؟" اس نے پولیس والے کو حقارت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان نے اس کی پونی پکڑ کر جھٹکا دیا اور اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "میں نے تجھ سے معافی مانگنے کو کہا ہے تو ان کے سامنے گالیاں بک رہا ہے... معافی مانگ۔"

http://digestpk.blogspot.com

اتنی دیر میں وہ پولیس والا بھی وہاں پہنچ گیا اور بولا۔
"یہ یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے؟"
"تم نے کیا آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے؟" نوجوان نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم کب سے یہاں ڈیوٹی پر ہو؟"
"میری ڈیوٹی کو چھوڑیں۔ آپ..."
"جاؤ، تم اپنا کام کرو۔" نوجوان نے اسے جھڑک دیا اور پوٹی والے سے بولا۔ "معافی مانگ ورنہ اگر میں نے اب تجھے مارا تو تُو مر جائے گا۔" اس نے اس کی پونی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔
پوٹی والے نے کہا۔ "آئی ایم سوری۔"
"انگریز کے بچے۔" نوجوان نے درشت لہجے میں کہا۔ "ہاتھ جوڑ کر کہہ کہ بہن مجھے معاف کر دو۔"
"بہن... مجھے معاف کر دو۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
دوسرے لڑکے پر ایسی دہشت طاری تھی کہ نوجوان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا لیکن اس میں بھاگنے کی جرأت نہیں تھی۔ وہ بھی فوراً ہاتھ جوڑتے ہوئے گھگیایا۔ صائمہ سے بولا۔
"بہن جی، مجھے معاف کر دو۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"
نوجوان نے پونی والے کی پونی چھوڑ دی اور پولیس والے سے کہا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"
"میرا نام محمد یاسین ہے جی۔" وہ جلدی سے بولا۔
نوجوان نے جھک کر اس کی بیلٹ کا نمبر دیکھا اور اپنی جیب سے نوٹ بک نکال کر اسے نوٹ کر لیا پھر وہ صائمہ سے بولا۔ "آیئے، میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔"
"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" صائمہ نے کہا۔ "میں آپ کو مزید زحمت دینا نہیں چاہتی۔"
"ارے، آپ مجھ سے خوف زدہ نہ ہوں۔ میں پولیس کا ایک ذمے دار افسر ہوں۔ میں ایس ایس پی ہوں اور میرا نام محسن ہے۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔"
"آپ زحمت نہ کریں جناب! یہ میرے ساتھ ہیں۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔
محسن نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ "آپ ان کے ساتھ ہیں؟ اور آپ اب تک خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے؟"
"یہ جھوٹ ہے ایس ایس پی صاحب!" صائمہ نے کہا۔ "یہ میرے ساتھ نہیں ہیں۔ چلیے، آپ ہی مجھے کہیں ڈراپ کر دیں۔" یہ کہہ کر وہ محسن کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

میں گھر پہنچا تو صائمہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ مجھے صبح کراچی جانا تھا اس لیے میں پیکنگ میں مصروف ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ صائمہ رات کو مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔ پھر آج تو ہماری الوداعی ملاقات تھی۔
میں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزر گئی لیکن وہ نہیں آئی۔ صبح جب میں روانہ ہو رہا تھا، وہ اس وقت بھی مجھے نظر نہیں آئی۔ میں نے اسٹیشن پہنچ کر اس کے سیل پر کال کی لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ میں نے دوبارہ کال کی تو اس کا سیل فون بند تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ صائمہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہو گئی ہے لیکن مجھے یقین تھا کہ میں اسے منا لوں گا۔
کراچی پہنچ کر میں نے فوری طور پر ایک ہوٹل میں قیام کیا اور داخلے کے سلسلے میں یونیورسٹی چلا گیا۔ مجھے داخلہ تو مل گیا لیکن ایک اور پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا۔ ہوسٹل میں اس وقت کوئی بھی کمرا خالی نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اجنبی شہر میں اب میں کہاں جاؤں؟ میں زیادہ دن ہوٹل میں قیام بھی نہیں کر سکتا تھا۔
مجھے ایک لڑکے نے مشورہ دیا کہ تم کوئی چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لو۔ چند مہینے بعد فائنل ایئر کے لڑکے جائیں گے تو کمرے خالی ہو جائیں گے۔ پھر یہاں بہت آسانی سے کمرا مل جائے گا۔ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں کسی پراپرٹی ایجنٹ سے رجوع کرو۔ یوں کام جلدی ہو جائے گا۔
میں کالج سے باہر نکلا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے مجھے آواز دی۔ "شاہد!"
میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ میرا ایک کلاس فیلو ماجد تھا۔ ہم ایک ہی کالج میں پڑھے تھے۔
جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے این ای ڈی میں داخلہ مل گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور بولا۔ "ظاہر ہے، تم جیسے اسٹوڈنٹ کو داخلہ نہیں ملے گا تو پھر کسے ملے گا؟"
میرے قیام کے مسئلے پر وہ بھی پریشان ہو گیا اور بولا۔
"شاہد! میں یہاں اپنی فیملی کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتا ہوں۔ میرے گھر میں بالکل جگہ نہیں ہے ورنہ..."
"ارے، ان رکی باتوں کو چھوڑ۔" میں نے کہا۔ "بس اس مسئلے کا کوئی حل بتا۔"
ہم لوگ اس وقت ایک ایرانی ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ چائے پیتے ہوئے مسلسل سوچتا رہا پھر چٹکی بجا کر بولا۔ "تیرا مسئلہ حل ہو گیا۔"

"حل ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "لیکن کیسے؟"
"آنٹی صفیہ سے ہمارے گھریلو تعلقات ہیں۔ یہ سمجھ لے کہ وہ امی کی بچپن کی سہیلی ہیں۔ ان کے مکان کا اوپری حصہ خالی ہے۔ انکل سلطان یعنی ان کے شوہر کویت میں ہیں۔ وہ امی سے کہہ رہی تھیں کہ اوپر والے حصے میں اگر کوئی چھوٹی فیملی کرائے پر آ جائے تو مجھے بہت آسانی ہو جائے گی۔"
"لیکن یار! میں تو چھڑا آدمی ہوں۔ مجھے وہ اپنا مکان کیوں دیں گی؟"
"تو اس کی فکر مت کر۔" ماجد نے کہا۔ "صفیہ آنٹی امی کی بات کبھی نہیں ٹالتیں۔ امی تو ویسے بھی تجھے بہت پسند کرتی ہیں۔ چل، تو میرے ساتھ ہی گھر چل۔"
ماجد کی امی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور دیر تک لاہور کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر انہوں نے ماجد کو میرے ساتھ بھیج کر ہوٹل سے میرا سامان منگوا لیا۔
شام کو وہ مجھے صفیہ آنٹی کے گھر لے گئیں۔ صفیہ آنٹی خاصی معقول اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ ماجد کی امی نے ان سے میری اتنی تعریفیں کیں کہ وہ مجھے مکان دینے پر رضامند ہو گئیں اور ماجد کی امی سے بولیں۔ "میں صرف تمہاری وجہ سے اس لڑکے کو یہ مکان دے رہی ہوں ورنہ مجھے کرائے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"
"شاہد سے تمہیں بھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ یہ پڑھنے والا بچہ ہے۔ پورے لاہور بورڈ میں اس نے پوزیشن لی ہے۔ نہ یہ پلے گھگے کا شوقین ہے، نہ زیادہ دوستی کا قائل ہے۔"
صفیہ آنٹی کا مکان نارتھ ناظم آباد میں تھا اور اس کی تعمیر پر خاصا پیسا خرچ کیا گیا تھا۔
اوپر کا حصہ بھی بہت بہترین تھا۔ حالانکہ اوپر صرف ایک کمرا، ایک ٹی وی لاؤنج، برآمدہ اور غسل تھا۔ میرے لیے تو وہ ایک کمرا ہی کافی تھا۔ کرایہ بھی انہوں نے اتنا بتایا تھا کہ میں آسانی سے دے سکتا تھا۔
میں نے راشد بھائی کو ٹیلی فون پر بتا دیا کہ مجھے ہوسٹل میں کمرا نہیں مل سکا ہے اس لیے میں نے ایک مکان کرائے پر لے لیا ہے۔
راشد بھائی نے کہا۔ "شاہد! تم اخراجات کی فکر بالکل مت کرنا۔ بس دل لگا کر پڑھنا۔"
یوں میری زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔ میں صبح سویرے یونیورسٹی چلا جاتا۔ پھر کلاسیں ختم ہونے کے بعد دیر تک لائبریری میں بیٹھتا اور نوٹس بناتا رہتا۔ میں صبح ناشتے کے ایک ہوٹل میں کرتا تھا۔ دوپہر میں کھانا کھانا میں نے چھوڑ دیا تھا۔ واپسی پر میں اپنے ساتھ ہوٹل ہی سے روٹیاں اور سالن لے آتا تھا۔
میں نے سوچا تھا کہ اب راشد بھائی پیسے بھیجیں گے تو سب سے پہلے میں کچن کے لیے کچھ برتن، چائے کی کیتلی اور کچھ دیگر سامان خرید لوں گا۔ صائمہ نے راتوں کو مجھے چائے پلا پلا کر چائے کا عادی بنا دیا تھا۔
حیرت تو مجھے اس بات پر ہوتی تھی کہ جب میں یونیورسٹی سے واپس آتا تو میرا کمرا بالکل صاف ستھرا ہوتا تھا۔ کمرے میں میز، صوفہ اور دو تین کرسیاں بھی صفیہ آنٹی کی تھیں۔ کمرے میں ایک دیوار گیر الماری بھی تھی۔ الماری میں میرے کپڑے سلیقے سے لٹکے ہوتے تھے، باتھ روم بھی انتہائی صاف ستھرا ہوتا تھا۔
میں نے سوچا کہ صفیہ آنٹی یہ صفائی اپنی ماسی سے کراتی ہوں گی۔ اگلے مہینے میں بھی ماسی کو کچھ پیسے دے دوں گا۔ وہ بے چاری اتنا کام کرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف میرے میلے کپڑے دھوتی تھی بلکہ انہیں استری کر کے الماری میں بھی رکھتی تھی۔
کچن بھی صاف ستھرا رہتا تھا۔ یوں بھی باتھ روم اور کچن میں بہت اعلیٰ درجے کے ٹائلز لگے ہوئے تھے۔
میں نے ایک دن یونہی کچن کی ایک الماری کھولی تو حیران رہ گیا۔ اس میں نہ صرف پلیٹیں اور چمچے وغیرہ تھے بلکہ چائے بنانے کی ایک کیتلی بھی موجود تھی۔ دوسری الماری میں خشک دودھ، پتی اور چینی بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ نمک، مرچیں اور کچن میں استعمال ہونے والا دوسرا سامان بھی تھا۔
میرا خیال تھا کہ یہ سامان آنٹی صفیہ کا ہے جو وہ یہاں سے نکالنا بھول گئی ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں کل ان سے اس بارے میں بات کروں گا۔ صبح جس وقت میں جاتا تھا، وہ سو رہی ہوتی تھیں۔ میں نے سوچا، آج میں گھر جلدی آ جاؤں گا۔
میں یونیورسٹی پہنچا تھا کہ وہاں دو طلبہ تنظیموں میں تصادم ہو گیا۔ پھر فائرنگ کے بعد یونیورسٹی بند ہو گئی۔ میں نے واپس گھر کی راہ لی کیونکہ لڑکوں کا خیال تھا کہ یہ ہنگامہ بڑھے گا اور تھوڑی دیر میں شہر میں بھی ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔
میں تو ہمیشہ کا بزدل تھا۔ فائرنگ اور ہنگاموں کا نام سن کر ہی میری جان نکل گئی۔ میں نے بس میں جا کے

http://digestpk.blogspot.com/

بجائے ٹیکسی پکڑ لی اور سیدھا گھر پہنچ گیا۔

میرے حصے کا دروازہ مکان سے بالکل علیحدہ تھا۔ زینے میں مکان کے اندرونی حصے سے بھی ایک دروازہ نکالا گیا تھا جو بند رہتا تھا۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو مجھے کسی لڑکی کے گنگنانے کی آواز آئی۔ میں یہی سمجھا کہ وہ ماسی ہے اور میرے کمرے کی صفائی کر رہی ہے لیکن ایک ماسی کی اتنی مترنم آواز؟

میں اچانک کمرے میں داخل ہو گیا۔ صفائی کرنے والی لڑکی مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ساکت رہ گئی۔ میں خود بھی ساکت رہ گیا کیونکہ وہ اتنی ہی حسین تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے کمرے میں چاند طلوع ہو گیا ہو۔ اس نے بلیو رنگ کی جینز اور پنک شرٹ پہن رکھی تھی۔ بالوں کو گرد سے بچانے کے لیے اس نے دوپٹے کو اپنے سر پر لپیٹ رکھا تھا لیکن اس دوپٹے کی لباس سے کوئی میچنگ نہیں تھی۔ شاید صفائی کے خیال سے اس نے جو دوپٹا بھی ہاتھ لگا تھا، اسے سر پر لپیٹ لیا تھا۔ اس کے ریشمی بال اس کے شانوں اور سینے پر لہرا رہے تھے۔

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔ "اور یہاں میرے گھر میں کیا کر رہی ہو؟"

وہ بھی حیرت کے جھٹکے سے سنبھل چکی تھی۔ وہ شوخ لہجے میں بولی۔ "میں عالیہ ہوں اور آپ کو نظر نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں؟"

مجھے فوراً ہی یاد آ گیا کہ صفیہ آنٹی کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔ عالیہ اور ثمرہ۔ میں نے ان کے نام سنے تھے یا پھر کبھی کبھار ان کی آوازیں۔ میں نے ان دونوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔

"اچھا تو تم ہو عالیہ؟" میں نے اپنی فائل میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"کیوں، پولیس کو کسی واردات میں میری تلاش ہے جو آپ اس انداز میں پوچھ رہے ہیں؟" وہ خاصی بے باک اور حاضر جواب تھی۔

"لیکن تم یہ صفائی کیوں کر رہی ہو؟ یہ کام تو ماسی بھی کر سکتی ہے۔"

"جو لوگ اچھے لگتے ہیں، ان کا کام کرنے میں بھی مزہ آتا ہے۔" اس نے بے باکی سے کہا۔

"اور اگر تمہاری ماما کو پتا چل گیا تو..."

"انہیں پتا ہے۔ وہ تو آپ سے بہت متاثر ہیں۔ میں ان کے کہنے پر ہی یہاں آتی ہوں۔"

"لیکن عالیہ بی بی! یہ تو زیادتی ہے۔ تم میرے کپڑے بھی دھوتی ہو، ان پر استری بھی کرتی ہو، باتھ روم بھی صاف کرتی ہو اور..."

"بس بس..." عالیہ نے مجھے مزید بولنے سے روک دیا۔ "اور ہاں... کچن میں چائے کا سامان موجود ہے۔ آپ نے اب تک اسے استعمال ہی نہیں کیا۔ کیا آپ کو چائے پینے کی عادت نہیں ہے؟"

"میں جب رات بھر پڑھتا ہوں تو مجھے ہر گھنٹے بعد چائے کی طلب ہوتی تھی، لاہور میں تو میری کزن مجھے چائے دے دیا کرتی تھی لیکن..."

"آپ کو یہاں بھی چائے مل جائے گی۔ آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟"

"لیکن یہ مناسب نہیں ہے عالیہ!" میں نے کہا۔ "راتوں کو کسی لڑکی کا لڑکے کے کمرے میں جانا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

"آپ بھی کس زمانے کی بات کر رہے ہیں؟" وہ منہ بنا کر بولی۔ "پھر کیا آپ کو خود پر اعتماد نہیں ہے یا مجھ پر؟"

"مجھے خود پر بھی اعتماد ہے اور تم پر بھی!" میں نے کہا۔

"لیکن تمہاری امی؟"

"ان کی فکر مت کریں۔ وہ رات کو سوتی ہیں تو صبح ہی کی خبر لاتی ہیں۔ پھر میرا کمرا بھی الگ تھلگ ہے۔ انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں اپنے کمرے میں موجود نہیں ہوں۔ ثمرہ تو یوں بھی بے ہوشی کی نیند سوتی ہے اور اس کا کمرا بھی الگ ہے۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "ٹھہریے... پہلے آپ میرے ہاتھ کی چائے پی کر دیکھیں پھر بات کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی اور مجھے اچانک کمرا خالی خالی لگنے لگا۔ وہ کسی بھی طرح حسن میں صائمہ سے کم نہیں تھی بلکہ اس کی اضافی خوبی اس کی حاضر جوابی اور ذہانت تھی۔ میں نے کراچی آنے کے بعد بھی بے شمار مرتبہ صائمہ کو ٹیلی فون کیا تھا لیکن ہر بار مجھے اس کا فون بند ہی ملا تھا۔ میں نے لینڈ لائن پر بھی کال کی تھی لیکن صائمہ یا تو موجود نہیں ہوتی یا پھر سو رہی ہوتی تھی۔ ایسی بھی کیا ناراضگی تھی؟ مجھے اب صائمہ پر غصہ آنے لگا تھا۔

عالیہ چائے بنا کر لے آئی۔ ٹرے میں دو مگ تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ چائے پیے گی۔ چائے کی خوشبو ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے بہترین چائے بنائی ہے۔

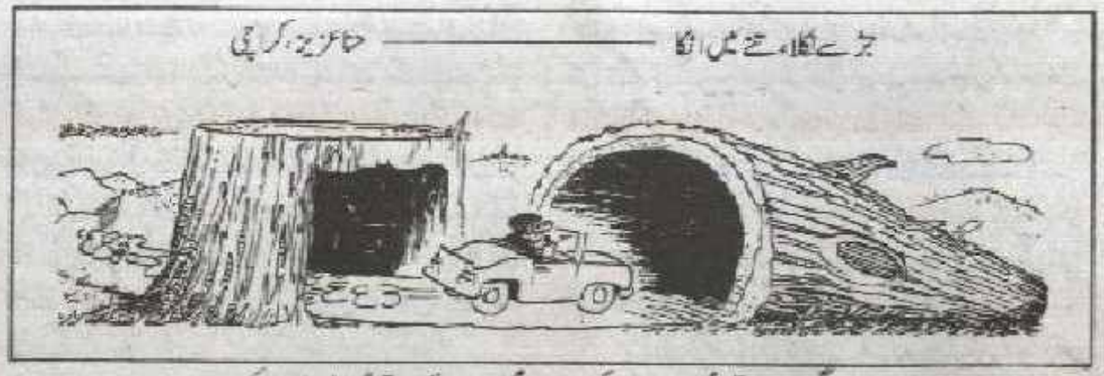

میں نے چائے کا پہلا ہی گھونٹ لیا تو مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ چائے واقعی بہت لذیذ ہے۔ ایسی چائے تو صائمہ بھی نہیں بناتی تھی۔

یہ عالیہ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ پھر ایک سال پلک جھپکتے میں بیت گیا۔ میں نے انجینئرنگ کے پہلے سال میں بھی حسب معمول اعلیٰ نمبر حاصل کیے۔

میرے ساتھ ساتھ اس کی خوشی آنٹی صفیہ کو بھی تھی اور عالیہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ اب میں ان کے گھر کے ایک فرد کی طرح تھا۔ محلے میں بھی سبھی میری عزت کرتے تھے۔ اس دن ثمرہ نے ضد کی کہ آج ہم لانگ ڈرائیو پر جائیں گے اور رات کا کھانا بھی باہر کھائیں گے۔

"لیکن میرے پاس تو اپنی گاڑی کیا موٹر سائیکل بھی نہیں ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شاہد بیٹا! ہماری گاڑی تو ویسے بھی فالتو کھڑی رہتی ہے۔ کبھی عالیہ کو شاپنگ کے لیے یا اپنی کسی دوست سے ملنے جانا ہوتا ہے تو یہ گاڑی لے جاتی ہے۔ البتہ کالج میں گاڑی لے کر نہیں جاتی۔ وہاں کچھ حاسد لڑکے اور لڑکیاں گاڑی پر اسکریچ ڈال دیتے ہیں یا پھر اس کی کوئی چیز توڑ دیتے ہیں۔"

مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی لیکن میں نے یہ بات ان لوگوں پر ظاہر نہیں کی۔ میں نے ثمرہ سے کہا۔ "یہ سب تمہاری باجی کی بہانے بازیاں ہیں۔ یہ خود ہی گاڑی نہیں مار دیتی ہوں گی اور نام لگا دیتی ہیں کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کا۔"

"جی نہیں، میں تین سال سے ڈرائیونگ کر رہی ہوں۔" عالیہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تو پھر آج تمہارا امتحان ہو جائے۔ آج بھی گاڑی تم ہی ڈرائیو کرو گی۔ میں بھی تو دیکھوں کہ تم کتنی ماہر ڈرائیور ہو؟"

"مجھے منظور ہے۔" عالیہ نے کہا۔

پھر ہم لوگ لانگ ڈرائیو پر نکل گئے۔ محلے کے کچھ لوگوں نے حیرت سے اور لڑکوں نے حسد بھری نظروں سے مجھے عالیہ کے ساتھ گاڑی میں دیکھا۔

اس دن رات گئے ہم گھر پہنچے تو میں نے عالیہ سے کہا۔ "بھئی، آج تو میں صرف سوؤں گا۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ آج چائے بنانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ وہ روزانہ میرے لیے کئی دفعہ چائے بناتی تھی اور زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ اس دوران وہ اوپر ہی موجود رہتی تھی۔ ایسے میں بعض اوقات مشکل مقام بھی آئے لیکن میں نے بروقت اپنے جذبات کے بے لگام گھوڑے کو سنبھال لیا۔

میں اوپر پہنچ کر کپڑے بدلنے جا ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ "یہ رات کو بارہ بجے کس کا فون آ گیا؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے سیل فون جیب سے نکالا تو اسکرین پر ابو کا نام دیکھ کر حیران رہ گیا۔

میں نے فوراً ہی بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ "السلام علیکم ابو! خیریت تو ہے؟ اس وقت..."

"بیٹا! ہم پر ایک قیامت گزر گئی ہے۔" ابو کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

میں بھی گھبرا گیا اور بولا۔ "کیا ہوا ابو! گھر میں تو سب خیریت ہے؟"

"خیریت نہیں ہے بیٹا!" ابو نے کہا۔ "راشد اور حامد ایک جھگڑے میں شدید زخمی ہو گئے ہیں۔ راشد کی حالت بہت نازک ہے۔ اسے سات گولیاں لگی ہیں۔ بس تو خدا سے دعا کر کہ وہ بچ جائے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں ابو!" میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ رات کے اس پہر مجھے بہاولپور جانے کے لیے کون سی گاڑی ملے گی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں بس کے ذریعے چلا جاؤں گا۔ ممکن ہے مجھے کوئی بس مل ہی جائے۔

http://digestpk.blogspot.com/

میں نے اپنے دو تین جوڑے اور ضرورت کا سامان ایک بیگ میں ڈالا اور آنٹی کو اطلاع دینے کے لیے نیچے گیا کہ میں ابھی اور اسی وقت جا رہا ہوں۔ وہ لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ آنٹی مجھے بیگ کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

میں نے انہیں بتایا کہ میرے بھائی زمین کے ایک تنازع پر شدید زخمی ہوگئے ہیں۔ خاص طور پر راشد بھائی کی حالت نازک ہے۔ یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''پریشان مت ہو بیٹا!'' آنٹی صفیہ نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ کرم کرے گا اور اس نے چاہا تو تمہارے بھائیوں کو کچھ نہیں ہوگا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ ''تم ایسا کرو، میری گاڑی لے جاؤ۔''

''نہیں آنٹی، اس حالت میں مجھ سے ڈرائیونگ نہیں ہو گی۔ میں کسی نہ کسی طرح چلا ہی جاؤں گا۔''

میری آواز سن کر عالیہ اور ثمرہ بھی کمرے سے نکل آئی تھیں۔

''شاہد! آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' عالیہ نے کہا۔

''میرا ایک جوان بھائی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور دوسرا بھی شدید زخمی ہے۔ ایسے میں آنسوؤں کا اختیار کسے ہوتا ہے؟'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ اس وقت ڈرائیونگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو میں گاڑی ڈرائیو کرلوں؟'' عالیہ نے کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو؟ وہ بہاولپور ہے، کراچی نہیں ہے۔ میرے سارے محلے والے اور رشتے دار سب سے پہلے مجھ سے یہی پوچھیں گے کہ یہ لڑکی کون ہے؟ چھوٹے لوگوں کی ذہنیت سے بھی تم واقف ہو، وہ لوگ سو باتیں بنائیں گے۔''

''شاہد ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' صفیہ آنٹی نے کہا۔ پھر چونک کر بولیں۔ ''تم ماجد کے ساتھ کیوں نہیں چلے جاتے؟ اس کے پاس گاڑی بھی ہے۔''

مجھے ماجد کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میں نے اسی وقت اسے ٹیلی فون کیا اور مختصراً اسے سب کچھ بتا دیا۔

ماجد پندرہ منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گیا۔ اس کی گاڑی کی ایک ہیڈ لائٹ کام نہیں کر رہی تھی اس لیے صفیہ آنٹی نے ہمیں اپنی ہی ہنڈا سوک دے دی۔

راشد آندھی طوفان کی طرح روانہ ہوگیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''انکل نے کچھ بتایا کہ ان لوگوں کا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟''

''ابو نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں تھے ہی نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ میرے بھائیوں کو سلامت رکھے۔'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

ہم لوگ صبح کاذب کے وقت بہاولپور پہنچ گئے۔

ماجد نے گاڑی میری گلی کی طرف موڑی تو مجھے دور ہی سے اپنے گھر کے سامنے بہت سے لوگ دکھائی دیے۔ گلی میں ایک شامیانہ لگا ہوا تھا اور لوگ دریوں پر بیٹھے تھے۔

میرا دل بیٹھنے لگا اور میں بے اختیار رونے لگا۔

''کیا ہوا شاہد؟'' ماجد نے کہا۔ ''تم نے تو ابھی سے عورتوں کی طرح رونا شروع کردیا۔''

میں گاڑی سے اتر کر گھر کی طرف بڑھا تو مجھے ابو دکھائی دیے۔ وہ گھر کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کا چہرہ مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک بہت بوڑھے ہوگئے ہوں۔

ان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بلکتے ہوئے میری طرف بڑھے اور میرے سینے سے لگ کر بری طرح رونے لگے۔

''پریشان نہ ہوں ابو!'' میں نے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو راشد بھائی بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔''

''ہاں، وہ بالکل ٹھیک ہوگیا ہے۔'' ابو نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''اب اسے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہے بیٹا! راشد مر گیا ہے۔ میرا شیر جوان اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

''صبر کریں انکل!'' ماجد نے کہا۔ ''زندگی تو اللہ کی امانت ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے اپنی امانت واپس لے لے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا!'' ابو نے کہا۔ ''لیکن جانے کے دن تو میرے تھے۔ وہ کیوں چلا گیا؟'' ابو پھر رونے لگے۔

ماجد نے انہیں تسلی دی اور حامد کی خیریت پوچھی۔

''حامد اب ٹھیک ہے۔ اس کی ران میں گولی لگی تھی۔ وہ دو ایک روز میں گھر آجائے گا لیکن تم...؟''

''ابو! یہ میرا دوست ماجد ہے۔ میں کراچی سے اس کی گاڑی میں یہاں آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

پھر میں گھر میں داخل ہوا تو ایک کہرام مچ گیا۔ امی مجھے دیکھ کر اس بری طرح روئیں کہ میں بھی رونے لگا۔ میری بہنیں سلمیٰ اور عذرا بھی رو رو کر ہلکان ہوگئیں۔

☆☆☆

راشد بھائی کے سوئم والے دن حامد بھی اسپتال سے آگیا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر رو دیا۔ نہ کسی اور نے اس کی آنکھ

میں آنسو دیکھے۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں مجھے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا اس لیے لوگوں نے اسے گھر میں لے جا کر چارپائی پر بٹھا دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گھر میں چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر پھٹ پڑا۔ باہر تو شاید وہ دوسرے لوگوں کی وجہ سے خاموش تھا۔ ''جانتے ہیں شاہد بھائی کہ راشد بھائی کی جان کیوں گئی ہے؟'' اس نے کہا۔ ''صرف آپ کی وجہ سے۔ وہ آپ کی وجہ سے قتل ہوئے ہیں۔''

''میری وجہ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، آپ کی وجہ سے۔'' حامد نے کہا۔ ''آپ کو چودھری اسلم کا بیٹا مظہر یاد ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''آپ تو دشمنی کی بنیاد ڈال کر یہاں سے چلے گئے۔ بعد میں اس دشمنی کو بھگتنا ہمیں پڑا۔ چودھری اسلم ٹرانسپورٹر ہے اور بدمعاش آدمی ہے۔ اس نے کئی دفعہ راشد بھائی پر حملہ کرایا لیکن راشد بھائی نے ہر دفعہ اس کے آدمیوں کو شدید زخمی کیا۔ ابو نے تو آپ کو ان جھگڑوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ اس مرتبہ وہ لوگ پوری چانک سے آئے تھے اور گھات لگا کر بیٹھے تھے۔ اس دن اتفاق سے میں بھی راشد بھائی کے ساتھ تھا۔ ہم لوگ موٹر سائیکل پر سوار تھے۔ ہم جونہی مین روڈ سے اپنے گھر کے راستے پر مڑے، وہ اچانک سامنے آگئے اور بولے... راشد! آج تو بچ نہیں سکتا۔

''موٹر سائیکل رکتے ہی میں نے چھلانگ لگا دی اور ایک درخت کی اوٹ میں ہوگیا تھا۔ راشد بھائی نے پھرتی سے موٹر سائیکل سے چھلانگ لگائی اور اس کے ساتھ ہی اپنا پستول بھی نکال لیا۔ پھر انہوں نے لگاتار پانچ فائر کیے اور ان کے پانچ آدمیوں کو ٹھنڈا کردیا۔ انہیں چھٹا فائر کرنے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ چودھری اسلم کے ایک آدمی نے کلاشنکوف کا برسٹ مارا تھا۔ ان سبھی کے ہاتھوں میں کلاشنکوف اور رائفلیں تھیں۔ میں بالکل نہتا تھا۔ میں اندھیرے میں کھسکتا ہوا ایک لاش تک پہنچا اور اس کی کلاشنکوف اٹھا کر حملہ آوروں پر برسٹ مارا۔ کئی چیخیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے میری دائیں ران میں کسی نے لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخ اتار دی ہو۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اسی وقت پولیس کو ٹیلی فون کیا اور ابو کو بھی اطلاع دے دی۔ راشد بھائی کو فوراً اسپتال لے جایا گیا لیکن ان کا خون بہت زیادہ ضائع ہوگیا تھا پھر ان کے جسم میں سات

گولیاں لگی تھیں۔ ابو نے جب آپ کو ٹیلی فون کیا تھا، اس کے دس منٹ بعد ہی انہوں نے دم توڑ دیا تھا۔'' یہ کہہ کر حامد زار و قطار رونے لگا۔

غصے کی وجہ سے میرے دماغ کی رگیں گویا پھٹی جارہی تھیں۔ میں نے جوشیلے انداز میں کہا۔ ''میں راشد بھائی کا انتقام لوں گا اور چودھری اسلم اور مظہر کو اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔''

''آپ؟'' حامد نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ ماریں گے انہیں؟''

میری بات سن کر سلمیٰ اور عذرا بھی افسردہ ہونے کے باوجود ہنسنے لگیں اور بولیں۔ ''آپ سے ایک چھپکلی اور چوہیا تو مرتی نہیں ہے، آپ ان دونوں کو مارنے کی بات کررہے ہیں؟''

''راشد بھائی میرے لیے باپ سے بڑھ کر تھے۔'' میں نے کہا۔ ''میں ان کا خون معاف نہیں کروں گا۔''

''بس رہنے دیں شاہد بھائی!'' حامد نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ کام اب میں کروں گا۔''

''نہیں حامد!'' میں نے غصے سے کہا۔ ''تم اب ان لوگوں سے نہیں الجھو گے۔''

''میں نہیں الجھوں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کے سات آدمی مارے گئے ہیں اور تین شدید زخمی ہیں۔ میں نے اس کلاشنکوف سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کے بعد وہ راشد بھائی کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔ میں نے ان کا پستول بھی وہیں چھوڑ دیا تھا تاکہ پولیس مجھے بھی گرفتار نہ کرلے۔''

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ ابو نے مجھ سے کہا۔ ''شاہد بیٹا! اب تو واپس چلا جا۔ اب تو یہاں رہ کر کرے گا بھی کیا؟ تیری پڑھائی کا بھی نقصان ہوگا۔ راشد کے چالیسویں کے موقع پر آجانا۔''

''لیکن ابو! میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''تو یہاں رہ کر کیا راشد کو زندہ کرسکتا ہے؟'' ابو نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ''تیرا دوست بھی اپنے سب کام چھوڑ کر یہاں پڑا ہوا ہے۔ بس تو صبح نکل جا، ہمارا اللہ مالک ہے۔ اب تو بیٹا، تیری ہی ذات سے امید ہے۔ راشد تو اب رہا نہیں۔ اس کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔''

''ابو! آپ فکر نہ کریں۔ بس دو ہی سال کی تو بات ہے۔

http://digestpk.blogspot.com/

جاؤں گا۔"

میں نے عالیہ کو فون پر بتایا کہ راشد بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔

"یہ زمین کے تنازع بہت خطرناک ہوتے ہیں شاہد!" عالیہ نے کہا۔ "آپ اپنا خیال رکھیے گا۔" اس کی آواز آنسوؤں میں گندھی ہوئی تھی۔

"میری فکر مت کرو عالیہ! میری یہاں کسی سے دشمنی نہیں ہے۔"

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ میری ہی وجہ سے میرا کڑیل جوان بھائی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

دوسرے دن میں بوجھل دل کے ساتھ کراچی روانہ ہو گیا۔ راستے بھر، جد مجھے تسلیاں اور دلاسے دیتا رہا۔ صفیہ آنٹی بھی بہت مغموم تھیں۔ وہ بھی دیر تک مجھے تسلی دیتی رہیں۔

رات کو حسب معمول عالیہ آئی تو اس نے بھی مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔ "عالیہ پلیز! اب اس موضوع کو مت چھیڑو۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کوئی اور بات کرو۔"

"سوری شاہد! میں نے تو آپ کا غم بٹانے کی خاطر..." پھر اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور جبراً مسکرا کر بولی۔ "میں آپ کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

چائے پیتے ہوئے اس نے اچانک کہا۔ "شاہد! انجینئرنگ کے بعد آپ جاب کریں گے تو ہمارا گھر بھی چھوڑ دیں گے؟"

"کیوں بھئی، یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟"

"بھئی بہاولپور میں آپ کی نجلی ہے۔ کیا آپ ان لوگوں کو تنہا چھوڑ دیں گے؟"

"ہاں، بات تو تمہاری درست ہے۔" میں نے کہا۔ "میں جاب کرتے ہی ان سب کو کراچی بلا لوں گا۔"

"آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ میرا کیا ہوگا؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں تو آپ کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ میں مر جاؤں گی شاہد... میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔"

"مریں تمہارے دشمن!" میں نے بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا۔

"تو پھر وعدہ کریں کہ کبھی مجھے نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ تم پر آج کیا بھوت سوار ہو گیا ہے؟ ابھی تو میں دو سال یہیں ہوں۔ تم تو ایسی باتیں کر رہی ہو جیسے میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں بھی تو تمہارا عادی ہو گیا ہوں۔ مجھے اتنی بہترین چائے کون پلائے گا؟"

میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

"اب تم جاؤ عالیہ! بہت رات ہو گئی ہے اور میں بھی تھکا ہوا ہوں۔"

وہ لہراتی، بل کھاتی وہاں سے چلی گئی۔

اب میں اس جذباتی لڑکی کو کیسے بتاتا کہ میں تو پہلے ہی کسی اور سے منسوب ہوں۔ یہ بات الگ تھی کہ صائمہ نے دو سال سے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اگر عالیہ نہ ہوتی تو شاید میں اپنی پڑھائی پر بھی توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ عالیہ ہی تھی جس نے صائمہ کی یادوں اور باتوں کو دھندلایا تھا۔

پھر میرے لیے بہت کٹھن دور آ گیا۔ اب تک تو راشد بھائی مجھے اچھی خاصی رقم بھیج دیا کرتے تھے۔ حامد ان کے ساتھ کام ضرور کرتا تھا لیکن اس میں ابھی اتنی سمجھ بوجھ نہیں تھی اس لیے آمدنی بھی آدھی رہ گئی تھی۔

میں نے ابو سے کہہ دیا کہ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں نے یہاں کئی ٹیوشنز کر لی ہیں اور میرے اخراجات آرام سے پورے ہو جاتے ہیں۔

پھر میں واقعی ٹیوشن پڑھانے لگا۔ ڈیفنس اور کلفٹن کے علاقے میں اچھی ٹیوشنز مل جاتی تھیں۔ میں نے انہی علاقوں میں چار ٹیوشنز کا بندوبست کر لیا۔ اب میں یونیورسٹی سے نکل کر پہلے ٹیوشن پڑھاتا پھر گھر آنے کے بعد اپنی پڑھائی میں لگ جاتا۔

ایک دن میں رات کے وقت گھر میں داخل ہوا تو صفیہ آنٹی نے آواز دے کر مجھے روک لیا اور بولیں۔ "شاہد! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں سمجھا کہ انہیں عالیہ کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ وہ راتوں کو میرے پاس آتی ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "آنٹی... میں سمجھا نہیں۔"

"بھئی، تم اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیوشن پڑھاتے ہو۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تمہارے اخراجات تمہارا بھائی پورا کرتا تھا۔ اگر واقعی تم مجھے اپنا سمجھتے ہو تو آج کے بعد مکان کا کرایہ نہیں دو گے اور کھانا بھی ہمارے ساتھ کھاؤ گے۔"

"آنٹی! میری بھی ایک شرط ہے۔ آپ وہ تمام اخراجات لکھتی جائیں۔ میں اسے قرضِ حسنہ سمجھ کر قبول کر لوں

گا۔ ہاں، اپنے دوسرے اخراجات تو میں خود ہی اٹھا لوں گا۔ چار کے بجائے میں دو ٹیوشنز کر لوں گا۔"

"چلو، مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ ہاں، جب بھی تمہیں پیسوں کی ضرورت پڑے، بلا جھجک مجھ سے مانگ لینا۔" پھر وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔ "لیکن ان باتوں کی بھنک بھی عالیہ کے باپ کے کان میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ انتہائی گھٹیا ذہنیت کا آدمی ہے۔" صفیہ آنٹی نے پہلی دفعہ اپنے شوہر کا ذکر کیا تھا، وہ بھی اس انداز میں۔

"مجھے یہاں رہتے ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں نے تو انہیں آج تک دیکھا بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ارے وہ آوارہ اور عیاش آدمی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے وہاں دوسری شادی کر لی ہے۔ ہاں، وہ اتنا ضرور کرتا ہے کہ ہر ماہ ایک خطیر رقم کا ڈرافٹ بھجوا دیتا ہے یا مہینے میں ایک آدھ دفعہ ٹیلی فون پر بات کر لیتا ہے۔ وہ یہاں نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ جب تک یہاں رہتا ہے، ہمارے ساتھ ساتھ محلے والوں کی زندگی بھی اجیرن کر دیتا ہے۔ اگر وہ آ جائے تو تم اس سے یہی کہنا کہ تمہاری بہنیں اور والدہ آج کل بہاولپور گئی ہوئی ہیں ورنہ وہ تمہاری زندگی بھی عذاب کر دے گا اور ہماری بھی کہ جوان لڑکیوں کے ہوتے ہوئے تم نے ایک غیر لڑکے کو اپنے گھر میں کیوں رکھا ہے؟"

"آپ پریشان نہ ہوں آنٹی!" میں نے کہا۔ "میں ان سے وہی کہوں گا جو آپ نے سمجھایا ہے۔"

میرا انجینئرنگ کا تیسرا سال بھی پورا ہو رہا تھا۔ اب عالیہ مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئی تھی۔

میں نے بہاولپور سے آنے کے بعد پہلا کام تو یہ کیا کہ ایک ڈرائیونگ اسکول میں داخلہ لے کر ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ اب عالیہ اکثر میرے ساتھ اکیلی بھی لانگ ڈرائیو پر چلی جاتی تھی۔

میری عقل پر بھی شاید پتھر پڑ گئے تھے۔ محلے کے سنجیدہ لوگ میری عزت کرتے تھے لیکن لڑکے اب مجھ سے حسد کرنے لگے تھے۔ ان میں سے کئی کی نظریں عالیہ پر تھیں۔

ایک دن میں ٹیوشن پڑھا رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ابو کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا مگر فون پر ابو نہیں بلکہ امی تھیں۔

"السلام علیکم امی!" میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

"بیٹا! یہ صائمہ تو بہت بے غیرت نکلی۔"

"کیوں امی! کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں اور تمہارے ابو لاہور گئے تھے۔ اس بے حیا نے اپنے ماں باپ کے سامنے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ تم جیسے بزدل شخص ..... سے شادی نہیں کرے گی۔ اس نے منگنی کی انگوٹھی بھی اتار کر پھینک دی۔ بھائی صاحب اور بھابی بھی خاموش رہے۔ انہوں نے صائمہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس بے حیا اور بے شرم لڑکی نے سب کے سامنے کہہ دیا کہ میں پولیس کے ایک افسر سے شادی کر رہی ہوں۔"

"لعنت بھیجیں امی! صائمہ کوئی آخری لڑکی تو تھی نہیں۔"

"مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ بھائی صاحب نے ایک دفعہ بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ تم فکر مت کرو، میں صائمہ کو سمجھاؤں گا۔"

"امی! اگر اب وہ راضی بھی ہو جائے گی تو میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ مجھے ایسی بے حیا لڑکی سے شادی نہیں کرنا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ آپ پریشان نہ ہوں، مجھے رتی بھر بھی افسوس نہیں ہوا۔"

اس دن گویا میرے ذہن سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ اب میں عالیہ سے کہہ سکتا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا اور ضرور کروں گا۔

ایک رات عالیہ آئی تو میں نے اس سے کہا۔ "عالیہ! آج میں نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟" اس نے پوچھا۔

"ایسے نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور آج میں چائے نہیں بلکہ کافی پیوں گا۔"

دو کافی بنا کر لائی تو میں نے اس سے کہا۔ "عالیہ! میں بھی سوچتا ہوں کہ یہاں سے جانے کے بعد مجھے اتنی بہترین چائے اتنی چاہت اور اپنائیت سے کون دے گا؟ مجھے تو اس کا ایک ہی حل نظر آتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"شاہد! یہ بات سننے کے لیے تو میرے کان برسوں سے ترس رہے تھے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔ "آپ بہت اچھے ہیں شاہد! ویری گریٹ۔"

اچانک لائٹ چلی گئی۔ میں نے ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ میرے اوپر آن گری۔ وہ جذبات سے بے قابو ہو رہی تھی۔ میری بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم حد سے گزرتے، لائٹ دوبارہ آ گئی۔

http://digestpk.blogspot.com/

"عالیہ! تم تو کہتی تھیں کہ تمہیں اپنی ذات پر اعتماد ہے؟"

"مجھے آپ کی ذات پر اعتماد ہے شاہد!" وہ سر جھکا کر بولی۔

"کیا کہنے ہیں آپ کے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا بس۔" وہ سر جھکا کر بولی۔ "آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

اس نے میرے سینے پر ہلکا سا گھونسا مارا اور خمار آلود نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

میں نے انجینئرنگ کی ڈگری بھی اعزاز کے ساتھ حاصل کرلی تھی۔ ڈگری ملتے ہی کئی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں سے مجھے ملازمت کی پیشکش ہوئی۔

میں نے ماجد کے والد سے مشورے کے بعد ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت قبول کرلی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی اور وہ گاڑی کے علاوہ مکان کا کرایہ بھی دے رہے تھے۔

مجھے ابھی ملازمت کرتے ہوئے دو مہینے ہوئے تھے اور میں چاہتا تھا کہ کوئی اچھا سا مکان دیکھ کر امی ابو اور سب لوگوں کو کراچی بلا لوں۔ ایک دن آنٹی نے بتایا کہ سلطان آرہا ہے۔

"سلطان؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اچھا آپ کے شوہر... تو آنے دیں۔ میں تو اب ویسے بھی جانے والا ہوں۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟"

"مجھے تمہاری وجہ سے پریشانی نہیں ہے بیٹا!" آنٹی نے کہا۔ "وہ جتنے دن یہاں رہے گا، ہماری زندگیاں جہنم بنی رہیں گی۔ وہ نشے میں ایسی فحش گالیاں بکتا ہے کہ محلے والے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ وہ تو اکثر مجھ پر اور لڑکیوں پر ہاتھ بھی اٹھا لیتا ہے۔ خیر، میں کوشش کروں گی کہ ایسا کوئی موقع بھی نہ آئے کہ وہ تم پر ہاتھ اٹھائے۔"

دو دن بعد سلطان آگیا۔ وہ بھاری تن و توش کا لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ مجھے تو وہ پہلی ہی نظر میں اچھا نہیں لگا۔

اس نے حقارت سے پوچھا۔ "یہ لڑکا کون ہے؟"

"یہ ہمارا کرایہ دار ہے۔ آج کل اس کی بہنیں اور والدہ بہاولپور گئی ہوئی ہیں۔ وہ لوگ عید ہمیشہ وہیں مناتی ہیں۔"

ان دنوں رمضان شروع ہو چکے تھے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، کبھی روزہ نہیں چھوڑا تھا۔

شاید وہ پندرھواں روزہ تھا جب سلطان دندناتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور بولا۔ "شاہد صاحب! اب آپ اپنے رہنے کا بندوبست کہیں اور کرلیں تو اچھا ہے۔ میں آپ کو ایک مہینے کی مہلت دے رہا ہوں۔ ایک مہینے بعد آپ مجھے اس مکان میں نظر نہ آئیں ورنہ میں آپ کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔"

مجھے اس کی باتوں سے غصہ تو بہت آیا لیکن میں تو بچپن ہی سے غصہ پینے کا عادی تھا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "میں تو پہلے ہی مکان ڈھونڈ رہا ہوں۔ ایک مہینا تو بہت ہے، میں تو عید کے فوراً بعد یہاں سے منتقل ہو جاؤں گا۔"

وہ دھمکی آمیز انداز میں مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ مجھے راشد بھائی یاد آگئے۔ میری جگہ اگر وہ ہوتے تو کہتے کہ جب کوئی مکان مل جائے گا، خالی کر دوں گا اور یہ مہلت وغیرہ اپنے پاس ہی رکھو۔ لیکن میں ایسا نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے خاموش ہوگیا۔

سلطان کے آتے ہی مسائل شروع ہو چکے تھے۔ وہ رات کو شراب پی کر آتا اور اتنی فحش گالیاں دیتا کہ میں بھی شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ پھر عالیہ اور ثمرہ کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ محلے کے دوسرے گھروں میں بھی خواتین تھیں۔ وہ اتنی بلند آواز میں چیختا تھا کہ اس کی آواز دور تک جاتی تھی۔

ایک دن میں تراویح پڑھ کر واپس آرہا تھا کہ سلطان مجھے نظر آگیا۔ میں نے اسے سلام کیا جس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ غرا کر بولا۔ "کیا بات ہے... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"سلطان صاحب!" میں نے کہا۔ "رمضان المبارک کا مہینا ہے۔ لوگ عبادت میں مصروف ہوتے ہیں اور آپ شراب پی کر بلند آواز میں فحش قسم کی گالیاں دیتے ہیں۔"

"اب تو مجھے نصیحت کرے گا کہ میں شراب پینا چھوڑ دوں؟" وہ غرا کر بولا۔ "میں شراب تیرے باپ کے پیسوں سے نہیں پیتا، اپنے پیسوں سے پیتا ہوں۔"

"میں آپ کو شراب پینے سے منع نہیں کر رہا۔" میں نے کہا۔ "میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ آپ گالیاں نہ دیا کریں۔ لوگوں کی عبادت میں خلل پڑتا ہے۔"

"جن کی عبادت میں خلل پڑتا ہے، وہ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیں۔"

اس نے ایک ہی سانس میں کئی انتہائی فحش قسم کی گالیاں دے ڈالیں۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، دوسرے نمازیوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ میں بوجھل قدموں سے گھر آگیا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے راشد بھائی شدت سے یاد آئے۔ وہ کسی کی ذرا سی بھی غلط بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ ہوتے تو اب تک سلطان کے ہاتھ پاؤں توڑ چکے ہوتے۔ ایک لمحے کو تو مجھے خیال آیا کہ میں حامد کو دو چار روز کے لیے یہاں بلا لوں، پھر اپنی خود غرضی اور بزدلی پر خود ہی ندامت ہوئی۔ وہ آکر سلطان سے مار پیٹ کرتا۔ اس مار پیٹ میں حامد کا نقصان بھی ہو سکتا تھا اور سلطان کی جان بھی جا سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں اپنے ارادے سے باز رہا۔ میں کبھی کبھی سوچتا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا بزدل کیوں بنایا ہے۔ میرا ڈیل ڈول اور شخصیت ایسی تھی کہ اگر میں کسی کو ڈانٹ بھی دیتا تو وہ سہم جاتا۔ اس بزدلی نے صائمہ کو مجھ سے چھینا تھا، راشد بھائی کو مجھ سے چھینا تھا اور حامد کو زخمی کیا تھا۔ میں اگر مظہر کو اس وقت دو چار تھپڑ مار دیتا تو بات اتنی نہ بڑھتی۔

☆☆☆

رمضان المبارک کی ستائیسویں شب تھی۔ مسجدوں میں چراغاں ہو رہا تھا اور ہر طرف گویا نور ہو رہا تھا۔ میں تراویح اور تلاوت کلام پاک کرنے کے بعد گھر پہنچا تو وہ منحوس سلطان اپنی مکروہ آواز میں گالیاں بک رہا تھا۔

اس نے صفیہ آنٹی کو انتہائی غلیظ گالی دی اور بولا۔ "ادھر آ... جلدی... میں گھنٹوں سے کھانا مانگ رہا ہوں... تو کہاں مری ہوئی ہے؟"

"میں نفل پڑھ رہی تھی۔ آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

"وہ دونوں کہاں ہیں؟" سلطان نے کہا۔ "باپ کو کھانا تو وہ بھی دے سکتی ہیں۔"

"وہ دونوں اس وقت عبادت کر رہی ہیں۔" آنٹی نے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں انہیں۔" اس نے بپھر کر کہا اور عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اوپر کی گیلری سے ان کے صحن کا منظر صاف نظر آتا تھا۔

"میں کھانا دے تو رہی ہوں۔" صفیہ آنٹی نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

اس نے جواب میں آنٹی کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا اور انہیں اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ بری طرح سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئیں۔

پھر وہ دندناتا ہوا عالیہ کے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے ہاتھ میں عالیہ کے بال تھے۔

"تو کیا بہری ہو گئی ہے؟" سلطان دہاڑا۔ "میں کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں لیکن ماں اور بیٹیوں کے کان پر جوں نہیں رینگ رہی ہے۔ تیرے لیے باپ کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

عالیہ نے ہمت کر کے کہا۔ "میرے لیے یہ کلام زیادہ اہم ہے۔"

اس نے پہلے تو عالیہ کو تھپڑوں، لاتوں اور گھونسوں سے مارا۔ میں بزدلی کی تصویر بنا یہ منظر دیکھتا رہا۔ اس نے انتہائی ناقابل برداشت حرکت کی۔ وہ مقدس کلام کی بے حرمتی کرنے لگا۔

اس وقت جانے مجھے کیا ہوا، میں انتہائی طیش کے عالم میں نیچے آیا، سلطان کی طرف بڑھا اور بولا۔ "تیری یہ جرأت کہ تو میرے سامنے اس مقدس کلام کی بے حرمتی کرے۔"

"کیا کرے گا تو، تیری تو..." اس نے انتہائی حقارت سے مجھے گالی دے کر کہا۔

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک کونے میں مجھے خاصا بھاری ایک ہتھوڑا پڑا نظر آگیا۔ میں نے جھپٹ کر وہ ہتھوڑا اٹھالیا اور پوری قوت سے سلطان کے سر پر وار کیا۔ اس کے سر سے بری طرح خون بہنے لگا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ پے در پے کئی وار اس کے سر پر رسید کر دیے۔ وہ چکر کھا کر زمین پر گر پڑا اور مغلظات بکنے لگا۔

اس کی بکواس نے گویا میرے اندر آگ لگا دی اور میں نے اس کے سر پر ہتھوڑوں کی برسات کردی۔ مجھ پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا۔

ہنگامہ اور چیخ پکار سن کر محلے کے کچھ لوگ بھی اندر آگئے تھے۔

کچھ لوگوں نے زبردستی مجھے روکا اور ایک صاحب مجھ سے بولے۔ "بس کرو بیٹا! تم نے تو سلطان کے سر کا بھرکس نکال دیا۔"

میں جیسے ایک دم ہوش میں آگیا۔ میرے سامنے سلطان کی لاش پڑی تھی۔ اس کا مغز صحن میں بکھرا ہوا تھا اور صحن کا فرش خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا جب خون دیکھ کر نہ میرے ہاتھ پاؤں کانپے، نہ میرا جسم لرزا۔ بس ایک خلش سی تھی کہ میں نے ایک جیتے جاگتے انسان کا خون کر دیا۔

وہ منظر ایسا تھا کہ مجھے قے ہوگئی۔ پھر میں ہتھوڑے سمیت باہر نکلا تو لوگ مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ عالیہ اور

http://digestpk.blogspot.com/

ٹھہرہ بُری طرح چیخ رہی تھیں۔ میرا رخ علاقے کے پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔ میں سیدھا ڈیوٹی افسر کے کمرے میں پہنچا اور اس سے کہا۔ ”میں نے ایک آدمی کا خون کر دیا ہے اور میں گرفتاری پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ کرسی پر سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ میری بات سن کر اچانک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم نے کس کا خون کیا ہے اور کیوں؟“

میں نے جواب میں اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے بٹھوڑے کو احتیاط سے ایک کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیا اور ایک مرتبہ پھر مجھ سے سارے واقعات پوچھے۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا۔

پھر اس نے وہ کاغذ میری طرف بڑھایا اور کہا۔ ”یہ تمہارا بیان ہے۔ اسے غور سے پڑھ کر دستخط کر دو۔“

میں نے سرسری نظر اس کاغذ پر ڈالی۔ اس نے وہی کچھ لکھا تھا جو میں نے بتایا تھا۔ میں نے اس پر دستخط کر دیے۔ اس نے ایک پولیس والے سے کہا کہ ملزم کو لاک اپ کر دو۔ میں جائے واردات پر تفتیش کے لیے جا رہا ہوں۔

ایک پولیس والے نے مجھے حوالات میں بند کر دیا لیکن اس کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ میرا بیان وہ بھی سن چکا تھا۔

اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسے لوگ تو ہوتے ہی واجب القتل ہیں۔ تم نے ایک نیک کام کیا ہے۔“ پھر وہ ایک کانسٹیبل کو بلا کر بولا۔ ”جا، دو کپ چائے بنا کر لا۔ شاہد صاحب ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی ضمانت بھی کل ہی ہو جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ مجسٹریٹ انہیں پہلی ہی پیشی میں باعزت بری کر دے۔“

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دوسرے حوالاتی بھی مجھے توصیف آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہی ایک کانسٹیبل آیا اور بولا۔ ”شاہد کون ہے؟ اسے صاحب نے بلایا ہے۔“

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے ہتھکڑی پہنائی اور ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔

ایس ایچ او نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”یار! مجھے تو سب کچھ سچ سچ بتا دے۔“

”میں نے جو کچھ بھی بتایا ہے، وہ بالکل سچ ہے۔“ میں نے کہا۔

”سلطان سے تیری دشمنی نہیں تھی؟“

”نہیں، میں تو اس سے زیادہ بات بھی نہیں کرتا تھا۔ پورے محلے والے اس بات کے گواہ ہیں کہ قتل کا یہ واقعہ کیسے پیش آیا۔“

”چھوڑ یار! تیری کہانی تو بہت اچھی ہے لیکن یہ چلے گی نہیں۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”محلے والوں نے تو یہ بھی بتایا ہے کہ ابھی کچھ دن پہلے تیری اس سے تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ محلے کے چند افراد نے آ کر بیچ بچاؤ کرایا تھا۔“

”وہ انتہائی گھٹیا آدمی تھا۔“ میں نے کہا۔ پھر اسے بتایا کہ اس سے میری تلخ کلامی کس بات پر ہوئی تھی۔

”کیا تیرا اس کی بیٹی کے ساتھ چکر نہیں چل رہا تھا؟“ ایس ایچ او نے آگے جھک کر رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

”میرا اس کے ساتھ کوئی چکر نہیں چل رہا تھا۔“ میں نے برہمی سے جواب دیا۔

”اوئے، تو یوں..... اسے گاڑی میں ساتھ لے کر گھومتا تھا؟“ ایس ایچ او نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیا گاڑی میں گھومنے سے کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر چل جاتا ہے؟ میں تو سلطان کی بیوی کو لے کر بھی جاتا تھا۔ تو کیا اس کے ساتھ بھی میرا کوئی چکر تھا؟“

”اوئے بات کو گھمانے کی کوشش مت کر۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”ساری بات یہ ہے کہ تو نے چار سال وہاں رہ کر عیاشی کی۔ جب لڑکی کا باپ آیا تو اسے ان باتوں کا علم ہوا۔ اس نے تجھے روکا۔ تیری اس سے تلخ کلامی ہوئی لیکن لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ آج تجھے موقع مل گیا۔ سلطان نے شراب پی کر غل غپاڑا کیا۔ اپنی بیوی اور بیٹی کو زدوکوب کیا۔ تجھ سے اپنی معشوقہ پر ظلم برداشت نہیں ہوا اور تو نے طیش میں آ کر بٹھوڑے سے اس کا سر کچل دیا۔“ اس نے مکروہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”یہ ہے اصل کہانی۔“

”انسپکٹر صاحب! آپ ایک ذمے دار افسر ہیں۔ کیا کوئی شخص جو خود کو مسلمان بھی کہتا ہو، ایسا گھناؤنا اور عذاب ناک کام کر سکتا ہے؟“

”تو سلطان کیا مسلمان نہیں تھا..... اس نے وہ کام کیسے کر لیا؟“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”یہ بتا کیا اسے تیرے علاوہ کسی اور نے بھی دیکھا ہے، اس کی بیوی اور لڑکیوں کے علاوہ؟“

”وہاں ان کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا لیکن پورے محلے نے سب کچھ سنا تھا۔“

”محلے والوں کا بیان بھی ہو جائے گا۔“ وہ طنزیہ انداز میں ہنس کر بولا۔ ”تو بہت لائق بندہ ہے، بہت اچھی نوکری کر رہا ہے۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ تیری عزت بھی محفوظ

http://digestpk.blogspot.com/

رہے اور نوکری بھی۔ اگر تجھے سزا ہوگئی تو عزت تو خیر جائے گی ہی، نوکری بھی چلی جائے گی پھر تجھے ایسی نوکری نہیں ملے گی۔ کسی سزا یافتہ انسان کو ملازمت ملتی ہی کب ہے؟"

"تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟ صاف صاف بات کریں۔" میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تو باعزت بری ہو جائے لیکن اس کے لیے تجھے کچھ قیمت تو چکانا پڑے گی نا!"

"کتنی قیمت؟" میں نے پوچھا۔

"چل تو دس لاکھ دے دے۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"اتنے پیسے میرے پاس کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔ "مجھے ملازمت کرتے ہوئے ابھی صرف دو مہینے ہوئے ہیں۔"

"تیری مرضی!" ایس ایچ او نے کہا۔ "تُو چاہتا ہے کہ تجھے لمبی سزا ہو جائے تو ٹھیک ہے۔"

میں اٹھنے لگا تو وہ بولا۔ "چل میں تجھے کچھ رعایت دے دیتا ہوں۔ تُو صرف سات لاکھ دے دے۔"

"میرے پاس سات لاکھ تو کیا سات ہزار بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"کھڑا ہو جا۔" وہ گرج کر بولا۔ پھر اس نے کانسٹیبل کو بلایا اور کہا کہ اسے لے جا کر بند کر دو۔

کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی کا دوسرا سرا پکڑا اور مجھے حوالات کی طرف لے چلا۔

وہ چلتے چلتے بولا۔ "صاحب جی! میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ آپ سات لاکھ اس کے منہ پر مارو اور اپنی عزت اور نوکری بچا لو ورنہ حاکم شاہ بہت ظالم آدمی ہے۔ یہ آپ کو بھی سزا کرا دے گا۔"

"تو کرا دے۔" میں نے کہا۔ "پیسے تو میرے پاس ہیں نہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور ہتھکڑی کھول کر مجھے اندر دھکا دے دیا۔

میں ایک مرتبہ پھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

صبح ہوتے ہی ماجد ایک وکیل کے ساتھ آ گیا۔ وکیل نے سب کچھ مجھ سے ایک مرتبہ پھر تفصیل سے پوچھا اور بولا۔ "شاہد صاحب! دیکھیے اس کے سوا کوئی اور بات بھی ہے تو مجھے بتا دیں تاکہ میں عدالت میں بہتر انداز میں آپ کا دفاع کر سکوں۔"

"اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"محلے والوں نے کا بیان ہے کہ آپ مقتول کی بیٹی کے ساتھ گھومتے تھے۔ سلطان غصے والا آدمی تھا، اس نے آپ کو فحش قسم کی گالیاں دیں۔ آپ نے جیش میں آ کر اسے قتل کر دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے جو کچھ آپ کو بتایا، وہی اپنے بیان میں بھی لکھوایا ہے۔ سلطان نے کلام پاک کی بے حرمتی کی تو میں نے مشتعل ہو کر اسے مار دیا۔"

"او کے مسٹر شاہد! آپ فکر نہ کریں، میں ایک دو دن ہی میں آپ کی ضمانت کرا لوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

پھر مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ میں نے وہاں بھی وہی بیان دیا۔ سرکاری وکیل نے عابدہ کے معاملے کو اچھالنے کی کوشش کی لیکن میرے وکیل نے اسے بات کرنے سے روک دیا اور کہا کہ فاضل وکیل فضول باتوں میں عدالت کا وقت ضائع نہ کریں۔

پھر پیشیوں پر پیشیاں پڑتی رہیں۔ مجھے ان دنوں احساس ہوا کہ انصاف کا حصول اس ملک میں کتنا مشکل اور مہنگا ہے۔ بعض اوقات لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی عدالت سے انصاف نہیں ملتا۔

کیس دو سال تک چلتا رہا۔ اس چکر میں میری عزت بھی گئی اور نوکری بھی۔

وکیل نے اتنا ضرور کیا کہ دوسرے ہی دن میری ضمانت کرا دی تھی۔

میں بچوں کو ٹیوشن تو پڑھا ہی رہا تھا، اب دو چار ٹیوشنز کا مزید اضافہ کر دیا اور کراچی کی ایک پس ماندہ بستی میں ایک کمرے کے ایک کوارٹر میں رہنے لگا۔ مالک مکان نے اس شرط پر کرائے میں رعایت کی کہ میں اس کے بچوں کو بھی پڑھاؤں گا۔

دو سال بعد مجھے عدالت سے سات سال کی سزا ہوگئی۔

اس دوران میں کئی دفعہ امی، ابو اور حامد آئے۔ وہ سب لوگ حیران تھے کہ مجھ جیسا آدمی جو ایک چوہا مارتے ہوئے ڈرتا تھا، گائے یا بکرا ذبح ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا، اس نے ایک جیتے جاگتے انسان کو موت کے گھاٹ کیسے اتار دیا۔

☆☆☆

میری سزا کا تیسرا سال تھا کہ جیل میں ایک قیدی آیا۔ وہ جیل میں یوں داخل ہوا تھا جیسے اپنی سسرال میں آیا ہو۔ بیرک کا ہر قیدی اس کے قدموں میں بچھا جا رہا تھا۔ کوئی اس کے ہاتھ دبا رہا تھا، کوئی پیر دبا رہا تھا۔

میں اپنی دری پر ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا، پھر اس نے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔ "تُو بہت دیر سے فالتو بیٹھا ہے، ذرا میرے پیر دبا۔"

"کیا اتنے لوگ کافی نہیں ہیں؟"

"میں نے تجھ سے کہا ہے۔" اس نے پیر دبانے والے کو ایک لات مار کے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "چل ہٹ، اب پیر یہ دبائے گا۔"

"میں پیر نہیں دباؤں گا بلکہ اس آدمی سے کہو کہ میرے پیر دبائے۔" مجھ میں اس وقت اتنی جرأت نہ جانے کہاں سے آگئی تھی۔

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "تُو کیا معذور ہو کر اس جیل سے جانا چاہتا ہے؟"

میں راشد بھائی کے انداز میں مسکرا دیا جیسے وہ تضحیک آمیز انداز میں مسکرایا کرتے تھے۔

وہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس کا قد مجھ سے بھی نکلتا ہوا تھا اور وزن بھی مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ ہاتھ پیر مضبوط تھے اور بدن کسرتی تھا۔

اس نے حقارت سے پوچھا۔ "کیا کہا تُو نے؟"

"تم کیا بہرے بھی ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے اچانک ہاتھ گھمایا۔ راشد بھائی کی طرح میں بھی اچانک نیچے بیٹھ گیا۔ وہ اپنے ہی زور سے بائیں طرف گھوم گیا۔

میں نے بیٹھے ہی بیٹھے اس کی پنڈلی پر زوردار ٹھوکر ماری۔ تھپڑ کا وار خالی جانے کی وجہ سے وہ پہلے ہی غیر متوازن تھا اس لیے دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ میں اٹھ کر اچانک اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس وقت راشد بھائی کا ایک ایک ایکشن یاد آ رہا تھا۔ میں انہیں بارہا لڑتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے راشد بھائی کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہو۔ میری مثال اس شخص کی سی تھی جسے تھیوری کا تو پوری طرح علم ہو مگر عملی تجربہ نہ ہو۔

اس کی پشت پر سوار ہو کر میں نے اپنے مضبوط ہاتھ سے پشت سے اس کی کھوپڑی پکڑی اور اس کا چہرہ کھردرے فرش پر رگڑ دیا۔

اس کے منہ سے کرب آمیز آواز کے ساتھ ہی گالیوں کا طوفان امڈ پڑا۔ وہ پھرتی سے پلٹ کر سیدھا ہوا تو میں اچھل کر دور ہٹ گیا۔ اس کے چہرے کی کھال ادھڑ گئی تھی اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ خون دیکھ کر نہ مجھ پر خوف طاری ہوا، نہ میرے ہاتھ پاؤں کانپے۔

وہ پھر میری طرف بڑھا لیکن اب اس کے انداز میں کچھ جھجکاہٹ تھی۔

میں نے اچانک دوڑ کر اس کے پیٹ میں بھینسے کی طرح ٹکر مار دی۔ وہ پھر الٹ کر گرا تو میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اس کے لمبے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر فرش پر دے مارا۔

اسی وقت چند سنتری بیرک میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک چیخ کر بولا۔ "دونوں الگ ہٹ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

میں اسے چھوڑ کر ہٹ گیا۔

"کیوں اوئے حمید خان! تُو آتے ہی پھر لڑنے لگا؟" ایک سنتری نے پوچھا۔

"اچھا اب زیادہ تقریر مت کر، بات ختم ہو گئی۔ اور ہاں، یہ بات باہر نہیں جانا چاہیے، سمجھ گیا نا ورنہ۔۔۔"

"چلو اوئے، یہ نہیں سدھرے گا۔" یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے۔

میرا خیال تھا کہ سنتریوں کے جانے کے بعد وہ پھر مجھے مارنے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے کونے میں رکھے ہوئے بڑے سے مٹکے سے پانی نکال کر منہ دھویا۔ قمیص کے دامن سے منہ صاف کیا تو اس کا دامن بھی خون سے داغ دار ہو گیا پھر اس نے دو گلاس پانی کے پیے اور دوبارہ اپنے بستر کی طرف آنے لگا۔ میں بھی چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

دوسرے قیدی بھی سہمے ہوئے انداز میں ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ آج اس بیرک میں ایک قتل ہوگا اور وہ قتل میرا ہوگا۔

حمید خان نے اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھ کر مجھے ایک مرتبہ پھر اشارے سے بلایا۔ میں نے چند لمحے تک اسے گھورا پھر اٹھ کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

"ادھر بیٹھ!" اس نے اپنے بستر کے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں الجھن آمیز انداز میں بیٹھ گیا لیکن اس کی طرف سے چوکنا تھا کہ مبادا وہ کوئی چھری یا چاقو میری پشت میں گھونپ دے۔

"تُو واقعی جی دار آدمی ہے۔" اس نے توصیفی انداز میں کہا۔

مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ اب سے تین برس پہلے تک میں خون دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ مجھ میں کچھ آ گیا...

http://digestpk.blogspot.com

"میری بات کو مذاق مت سمجھو۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "تو نے جس جی داری سے میرا مقابلہ کیا ہے، وہ کسی عام آدمی کا کام نہیں ہے۔ لوگ تو میرا نام سن کر ہی لرزنے لگتے ہیں۔ نام کیا ہے تیرا؟" اس نے پوچھا۔

"میرا نام بھی شاہد تھا لیکن اب تو قیدی نمبر 311 ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"جیل کس جرم میں آیا ہے؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میں نے ایک آدمی کو ہتھوڑے مار مار کے ختم کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"آج سے تو میرا دوست ہے۔" اس نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بھی بغیر سوچے سمجھے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر حمید خان دوسرے قیدیوں سے مخاطب ہوا۔ "سنو اوئے، آج کے بعد میرے دوست کو کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ سب کو اس کا ہر حکم ماننا ہوگا۔" پھر وہ ایک قیدی سے مخاطب ہوا۔ "او بالے، ادھر آ... شاہد کے پیر دبا۔"

"نہیں حمید بھائی، ابھی میری اتنی عمر نہیں ہے کہ میں پیر دبواؤں۔"

"چل اوئے بالے، تو نے سنا نہیں۔" بالے نے فوراً میرے پیر دبانا شروع کر دیے۔

یہ حمید خان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے حمید خان جیسے آدمی سے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ اسے ہولہان بھی کر دیا۔ نہ جانے میرے ذہن میں پڑی ہوئی وہ نفسیاتی گرہ کیسے حل گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ پہلا قتل کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، پھر تو کسی کو قتل کرنا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتا۔

میرے ساتھ مسئلہ مختلف تھا۔ میں نے کسی کو کسی لڑائی جھگڑے یا غنڈا گردی میں قتل نہیں کیا تھا۔ مجھ سے تو وہ قتل اضطراری انداز میں ہوا تھا۔ تو کیا اسی ایک قتل سے میری وہ نفسیاتی گرہ کھل گئی تھی جس کی وجہ سے میں اپنے گھر والوں اور جاننے والوں میں بزدل اور ڈرپوک مشہور تھا؟ میری اس نفسیاتی کمزوری نے مجھے صائمہ کے سامنے ذلیل کیا تھا۔ وہ مجھے مدد کے لیے بلاتی رہی لیکن میں بے بسی کی تصویر بنا کھڑا رہا۔

صائمہ یاد آئی تو اس کے ساتھ ساتھ مجھے عالیہ بھی یاد آ گئی۔ عالیہ وہ دوسری لڑکی تھی جس نے میرے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا بلکہ میرے جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

آنٹی صفیہ کے گھر سے کوئی بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ یہ بھی انہوں نے عقل مندی ہی کی تھی ورنہ محلے والے ان کا جینا حرام کر دیتے اور اس بات کی تصدیق ہو جاتی کہ سلطان، عالیہ ہی کی وجہ سے مارا گیا ہے۔

میں جانتا تھا کہ عالیہ مجھے یاد کرتی ہوگی، میری یاد میں آنسو بہاتی ہوگی لیکن وہ مجبور تھی۔

میں ابھی تک کراچی ہی کی سینٹرل جیل میں تھا ورنہ عموماً قیدیوں کو دوسری جیلوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

میں پڑھا لکھا قیدی تھا اس لیے جیل سپرنٹنڈنٹ کا سلوک بھی میرے ساتھ اچھا تھا۔

میں نے جیل ہی میں رہتے ہوئے سولر انرجی سے چلنے والا الیکٹرک سسٹم بنایا تھا جس کی وجہ سے میری اور بھی زیادہ قدر ہو گئی۔ میرے اچھے چال چلن کی وجہ سے میری سزا میں بھی تخفیف ہوتی رہتی۔

امی اور ابو ہر دو مہینے بعد مجھ سے ملنے کراچی آتے تھے۔ وہ بے چارے ہر ہفتے تو کیا دو مہینے میں بھی ایک بار مشکل سے آ پاتے تھے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کی عنایت اور مہربانی کی وجہ سے مجھے ان سے جیلر کے آفس میں ملنے کی رعایت تھی۔ وہ بے چارے دو دو گھنٹے میرے ساتھ گزارتے تھے۔ اکثر ان کے ساتھ حامد بھی ہوتا تھا۔

اس دفعہ ابو آئے تو وہ مجھے پہلے سے بھی کہیں زیادہ بوڑھے لگے۔ ان کے چہرے پر دبیز غریم کا چشمہ تھا اور وہ دونوں کہنیاں میز پر لگائے اور اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو نچلے ہونٹ پر جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ امی تو خیر جب بھی آتی تھیں، روتی ہوئی آتی تھیں اور روتی ہوئی جاتی تھیں۔

میں نے ابو سے پوچھا۔ "کیا بات ہے ابو! آپ کس سوچ میں گم ہیں اور اس مرتبہ تو حامد کو بھی نہ لائے؟"

ابو نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا، ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ انہوں نے چشمہ اتار کر اپنے آنسو ہتھیلی کی پشت سے پونچھے اور بولے۔ "کچھ نہیں بیٹا! بس تجھے اس حال میں دیکھ کر رونا آ گیا تھا۔ میں نے تیرے لیے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ میرے تو پورے خاندان کو کسی کی نظر کھا گئی۔"

"ابو! اب تو میری سزا میں صرف چھ ماہ رہ گئے ہیں، اب آپ کیوں پریشان ہیں؟ میں جیل سے نکلوں گا تو سب کچھ صحیح ہو جائے گا۔"

"کچھ بھی صحیح نہیں ہوگا۔ سلمیٰ اور عذرا اب جوان ہو گئی

ہیں بلکہ سلمیٰ کی سہیلیوں کی تو شادیاں بھی ہو گئی ہیں۔ کون ان سے شادی کرے گا؟ ایک بھائی سات آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد خود بھی قتل ہو گیا۔ دوسرا بھائی قتل کے الزام میں سزا کاٹ رہا ہے اور تیسرا بھائی..." ابو کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"کیا ہوا تیسرے بھائی کو؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

"اسے چودھری اسلم کے آدمیوں نے ایک مرتبہ پھر جان سے مارنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ معمولی سا زخمی ہوا ہے۔"

"ابو! مجھے سچ سچ بتائیں، حامد کو کیا ہوا ہے؟"

"حامد صرف زخمی ہے۔" ابو نے کہا۔ "ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس سے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے گردے محفوظ رہے لیکن اسے کم سے کم تین مہینے اسپتال میں رہنا ہوگا۔"

"ابو! آپ پریشان نہ ہوں۔ بس چھ ہی مہینے کی تو بات ہے پھر میں یہاں سے نکل کر کوئی بھی نوکری کر لوں گا اور آپ لوگوں کو بھی یہاں بلا لوں گا۔"

ابو نے ایک طویل سانس لی اور بولے۔ "شاہد بیٹا! میں نے تیس سال تک سرکاری نوکری کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی سزا یافتہ انسان کو اچھی نوکری نہیں ملتی۔"

"ابو! سرکاری نوکری نہیں ملتی ہوگی۔ مجھے سرکاری نوکری کرنا بھی نہیں ہے۔ میں کوالیفائیڈ انجینئر ہوں۔ میں نے اسٹیٹ پوزیشن سے انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا ہے۔ مجھے بہت بہترین نہ سہی اچھی جاب تو مل ہی جائے گی۔"

☆☆☆

اس دن میں اپنی بیرک میں بیٹھا تھا کہ سنتری نے آ کر آواز لگائی۔ "تین سو گیارہ... تمہاری ملاقات آئی ہے۔"

"میری ملاقات؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ہاں، تمہاری ملاقات۔" سنتری نے کہا اور چلا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ امی، ابو تو ابھی دو ہفتے پہلے ہی مل کر گئے ہیں۔ وہ تو اتنی جلدی نہیں آ سکتے پھر یہ ملاقاتی کون ہو سکتا ہے؟

یہی سوچتا ہوا میں اس طرف بڑھا جہاں عام قیدی ملاقات کرتے تھے۔ وہ منظر بھی عجیب ہوتا تھا۔ قیدیوں کے سامنے سلاخیں ہوتی تھیں۔

مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خصوصی رعایت دے رکھی تھی، اس لیے میری ملاقات یا تو جیلر کے ائرکنڈیشنڈ آفس میں ہوتی تھی یا پھر کسی دوسرے کمرے میں جہاں وقت کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔

مجھے عام قیدیوں کی طرف بڑھتا دیکھ کر سنتری نے کہا۔ "آپ وہاں کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کا ملاقاتی اس کمرے میں بیٹھا ہے۔" اس نے جیلر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ جیلر اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے عہدوں میں فرق ہوتا ہے۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو ماجد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔

"تو امریکا سے کب آیا؟" میں نے پوچھا۔ اس کے والد نے اپنے آفس کی ایک برانچ ورجینیا میں بھی کھولی تھی۔ ماجد وہاں سے نہ صرف امریکا بلکہ یورپ کے تمام ملکوں سے بھی ڈیل کرتا تھا۔

"میں آج صبح ہی آیا ہوں۔" ماجد نے تاسف سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا پھر بولا۔ "یار شاہد! جو کچھ ہم سوچتے ہیں، وہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ تجھ جیسے ذہین اور بہترین انجینئر ان حالوں میں ہوگا... لیکن میری ایک بات یاد رکھنا۔ اللہ تعالیٰ تیری اس قربانی کو رائگاں نہیں جانے دے گا۔ دلوں کے بھید تو وہی جانتا ہے۔"

"مجھے بھی اس بات پر کامل یقین ہے ماجد!" میں نے کہا۔ "میری کوئی سفارش نہیں ہے، میں نے کسی کو رشوت نہیں دی ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یہاں وہ مراعات حاصل ہیں جیسے میں کوئی وی آئی پی ہوں۔"

"وی آئی پی تو خیر تو ہے۔ تو نے قتل کسی دنیاوی لالچ، دولت یا جائداد کے لیے نہیں کیا ہے بلکہ صرف اور صرف اس مقدس کتاب کی خاطر کیا ہے جس کی بے حرمتی کرنے والا واجب القتل ہوتا ہے۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "یار! وہ صفیہ آنٹی بھی آج ہمارے گھر آئی تھیں۔"

"وہ ٹھیک تو ہیں... عالیہ اور ثمرہ تو خیریت سے ہیں؟"

"یار! وہ کیسے ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ صفیہ آنٹی نے کچھ ایسا پس انداز کر رکھا تھا، انہوں نے اوپر کے حصے میں دو مزید کمرے بنا کر انہیں کرائے پر اٹھا دیا ہے۔ عالیہ کسی فرم میں جاب کر رہی ہے اور ثمرہ ابھی بی اے کر کے فارغ ہوئی ہے۔"

"ثمرہ نے بی اے کر لیا... اس چھوٹی سی لڑکی نے جو بات بات پر روٹھ جایا کرتی تھی؟"

"سات سال میں بہت کچھ بدل جاتا ہے شاہد!" ماجد نے کہا۔ "تیری دونوں بہنیں بھی تو اس وقت بہت چھوٹی تھیں، اب..."

http://digestpk.blogspot.com/

"یارا صفیہ آنٹی مجھے تو بہت ..... بددعائیں دیتی ہوں گی۔ میں نے ان کا سہاگ جو اجاڑ دیا اور عالیہ تو میری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوگی؟"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" ماجد نے کہا۔ "صفیہ آنٹی تو تجھے دعائیں دیتی ہیں کہ تُو نے ایک عذاب سے ان کی اور ان کی بیٹیوں کی جان چھڑا دی۔ ہاں، عالیہ اور ثمرہ کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے کیونکہ ابھی تک میری ملاقات صرف صفیہ آنٹی سے ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب ہے... سلطان کے قتل کے بعد تُو ان کے گھر گیا ہی نہیں؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"یارا پہلے تو میں تیری وجہ سے مصروف رہا۔ وکیل کا بندوبست، بھاگ دوڑ، فکریں اور پریشانیاں۔" ماجد نے کہا۔ "پھر اچانک ہی ابو نے امریکا میں آفس کھولنے کا ارادہ کرلیا۔ تیری ضمانت تو ہو ہی چکی تھی۔ مجھے امید تھی کہ عدالت تجھے باعزت بری بھی کردے گی اس لیے میں امریکا چلا گیا۔ ہاں، کل شام کو میں صفیہ آنٹی کے گھر جاؤں گا۔"

ماجد کو سنتری نے چائے بھی پلائی اور خاصی دیر تک بیٹھنے بھی دیا۔

وہ ہنس کر بولا۔ "واقعی یارا تُو تو وی آئی پی کی طرح یہاں رہ رہا ہے۔"

جیل میں سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ دوسرے قیدی بھی مجھ سے ڈرتے تھے کہ میں حمید خان جیسے آدمی کا دوست تھا۔

حمید خان نے ایک دن مجھ سے پوچھا۔ "یار شاہد! تیری رہائی میں اب زیادہ دن نہیں رہے ہیں... تُو جیل سے نکل کر کیا کرے گا؟"

"میں نوکری کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "نوکری ہی کروں گا۔"

"اب تو نوکری کو بھول جا۔" اس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "سزایافتہ انسان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہاں تو بڑی بڑی ڈگریوں والے بھی نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔" پھر وہ آہستہ سے بولا۔ "لی مارکیٹ پر ہوٹل شہزاد ہے۔ وہ وہاں کا مشہور ہوٹل ہے۔ وہاں کاؤنٹر پر پہنچ کر کہنا کہ مجھے حمید خان نے بھیجا ہے اور میرا نام شاہد ہے۔ تیرا کام بن جائے گا۔" حمید خان ہنس کر بولا۔ "میں نے سیٹھ کو پہلے ہی تیرے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ تُو میرا دوست ہے۔"

"اچھا یارا پہلے میں یہاں سے نکل تو جاؤں۔" میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔

میری سزا میں اب صرف تین مہینے باقی تھے کہ چودہ اگست آگئی۔ وزیراعظم کے حکم سے ایسے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا جن کی سزا میں تین مہینے یا اس سے کم باقی تھے۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے میرا سامان میرے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بھاری لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے سر؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا سولر انرجی سسٹم ڈی آئی جی جیل خانہ جات کو بہت پسند آیا ہے۔ اب اگر لائٹ چلی بھی جائے تو ان کا گھر روشن رہتا ہے۔ انہوں نے خوش ہو کر تمہیں یہ ایک لاکھ روپے انعام میں دیے ہیں۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "ہاں، اپنا سامان چیک کرلو، تمہارا سیل فون، سم کارڈ، نقدی، کپڑے سب موجود ہیں۔" میں نے اس سامان کو اخبار میں لپیٹنا چاہا تو وہ مسکرایا اور اس نے ایک نیا اور قیمتی بریف کیس میرے حوالے کر دیا۔ "یہ چھوٹا سا گفٹ میری طرف سے۔ میں تمہاری دل سے قدر کرتا ہوں شاید!" اس نے کہا۔ "اس لیے نہیں کہ تم بے انتہا ذہین اور کوالیفائیڈ انجینئر ہو۔ صرف اس لیے کہ تم نے کلام پاک کی بے حرمتی کرنے والے شخص کے ساتھ جو سلوک کیا، شاید میں نہ کرسکتا۔" پھر اس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم سے یہ کہنا تو فضول ہے کہ آئندہ یہاں نہ آنا کیونکہ تم کوئی عادی مجرم نہیں ہو... وش یو بیسٹ آف لک۔" اس نے کہا۔

☆☆☆

میں جیل سے رہا ہو کر سیدھا بہاولپور پہنچا۔ وہاں جانے سے پہلے میں نے ماجد سے ملاقات کرلی تھی۔

ابو مجھے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے، پھر میرے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رونے لگے۔

"ابو! اب آپ کیوں رو رہے ہیں؟ اب تو میں آگیا ہوں۔"

سلمیٰ اور عذرا بھی آکر مجھ سے لپٹ گئیں۔ وہ دونوں ماشاءاللہ بہت بڑی ہوگئی تھیں اور ان کے حسین چہروں پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اصل میں امی اور ابو دونوں ہی پُرکشش شخصیت کے مالک تھے، خوب رو تھے اس لیے ہم بھی بہن بھائیوں کو انہی سے یہ خوب صورتی ورثے میں ملی تھی۔

فوراً ہی امی بھی آگئیں۔ وہ صحن میں کہیں گئی ہوئی تھیں۔

"حامد کہاں ہے ابو؟" میں نے پوچھا۔ "وہ ابھی تک نظر نہیں آیا۔"

ابو پھر رونے لگے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "ابو! آپ

بتاتے کیوں نہیں، آخر بات کیا ہے؟ آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

"حامد بھی راشد کے پاس چلا گیا بیٹا!" ابو نے کہا۔ "چودھری اسلم کے آدمیوں نے ایک دن گھات لگا کر اسے بھی مار دیا۔"

"اسے بھی مار دیا؟" میں نے وحشت بھرے انداز میں پوچھا۔ "لیکن اس کا قصور کیا تھا ابو؟"

"اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ راشد کا بھائی تھا، تیرا بھائی تھا۔ راشد نے اس کے سات آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ ان میں سے اس کے دو چچازاد بھی تھے۔ وہ انہی کا انتقام لے رہا ہے۔ میں تو کہتا ہوں بیٹا تو بھی فوراً یہاں سے نکل جا۔ چودھری اسلم کے آدمیوں کو معلوم ہوگیا کہ تُو کراچی سے یہاں آیا ہوا ہے تو وہ تجھے بھی..."

"ابو! اب میں وہ پہلے والا شاید نہیں ہوں۔ اب میری نہیں ان کی باری ہے۔ میں کم سے کم چودھری اسلم اور اس کے بیٹے کو تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"نہیں بیٹا!" امی نے روتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے دو جوان بیٹے کھو چکی ہوں۔ اب تُو ہی تو ہمارا سہارا ہے۔ انہیں مارنے کے بعد تُو کون سا بچ جائے گا؟ پھر جیل تیرا مقدر ہوگی۔"

"میں نے اس مکان کا سودا کرلیا ہے۔ ایک مہینے بعد خریدنے والا ادائیگی بھی کردے گا۔" ابو نے کہا۔ "میرا تو خیال تھا کہ تُو تین مہینے بعد آئے گا ورنہ میں اس سے فوری طور پر رقم لے لیتا۔"

"یہ آپ نے اچھا فیصلہ کیا ہے ابو۔" میں نے کہا۔ "میں کراچی جا کر کوئی مکان دیکھتا ہوں۔ کچھ پیسے میرے پاس بھی ہیں۔ اس رقم میں کوئی چھوٹا سودا مکان تو مل ہی جائے گا۔ کراچی میں سر چھپانے کا ٹھکانا مل گیا تو پھر میں نوکری کر کے کسی اچھے مکان کا بندوبست کرلوں گا۔"

میں بہ مشکل تمام دو دن بہاولپور میں رہا۔ اس دوران بھی ابو نے مجھے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا اور تیسرے ہی دن زبردستی مجھے وہاں سے روانہ کردیا۔

"ابو! آپ اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "چودھری اسلم کوئی شیر تو ہے نہیں جو مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔"

"تُو کچھ نہیں جانتا بیٹا!" ابو نے کہا۔ "چودھری اسلم نے اس دوران میں اپنی دولت اور طاقت میں بہت اضافہ کرلیا ہے۔ اس کے پاس بدمعاشوں کی ایک فوج ہے۔ تُو ان کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ اور وہ لوگ تو بزدل ہیں، ہمیشہ بےخبری میں وار کرتے ہیں ورنہ راشد اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں تھا۔"

کراچی آکر میں نے مکان کی تلاش شروع کردی۔ جلد ہی شاہ فیصل کالونی میں مجھے دو کمروں کا معمولی سا ایک کوارٹر مل گیا۔ اس کی قیمت بھی مالک زیادہ نہیں مانگ رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر اسے بیعانے کے طور پر وہ ایک لاکھ روپے دے دیے جو مجھے جیل سپرنٹنڈنٹ نے دیے تھے اور اس سے وعدہ کیا کہ میں بقیہ رقم دو مہینے بعد ادا کروں گا۔

وہ بےچارہ اتنا شریف آدمی تھا کہ اس نے فوری طور پر مجھے اس مکان میں رہنے کی اجازت دے دی۔

ماجد ابھی پاکستان ہی میں تھا۔ اس نے کہا کہ اس مکان میں فرنیچر اور مرمت کا کام میری طرف سے ہوگا اور اگر تُو نے انکار کیا تو تیری میری دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔

اس نے ایک ہی ہفتے میں مکان کی مرمت کرادی، اس میں نیا رنگ و روغن کرایا۔ نئی کھڑکیاں اور دروازے لگائے اور پردوں سے لے کر کارپٹ اور صوفے تک سبھی کچھ وہی لایا۔

میں دوسرے دن امی ابو وغیرہ کو لینے بہاولپور جانے والا تھا۔ رات کو اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھا کہ ماجد ہوگا۔ وہی وقت بےوقت مجھے ٹیلی فون کرتا رہتا تھا۔

اسکرین پر ابو کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

"جی ابو!" میں نے کہا۔ "خیریت تو ہے... آپ اس وقت تک جاگ رہے ہیں؟"

"بیٹا! چودھری اسلم کے آدمی سلمیٰ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ شاید خود کو ہمارے حوالے کردے۔ ہم تمہاری بیٹی کو واپس کردیں گے۔"

میرا خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں نے ابو سے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں، میں بہاولپور آرہا ہوں۔"

"نہیں بیٹا..."

میں نے ان کی بات سنے بغیر نہ صرف لائن کاٹ دی بلکہ اپنا سیل فون بھی بند کردیا۔ وہ مجھ سے یہی کہتے کہ تم یہاں مت آؤ، تمہاری جان کو خطرہ ہے۔

میرا ذہن مفلوج ہوکر رہ گیا۔ چودھری اسلم سلمیٰ کو لے کر کہاں جاسکتا تھا؟ جانے کو تو وہ کہیں بھی جاسکتا تھا لیکن میرے لیے یہ سوال اہم تھا کہ وہ اسے کہاں لے گیا ہوگا؟ میرا اندازہ تھا کہ ابھی سلمیٰ بہاولپور ہی میں ہوگی۔ اس لیے تو

http://digestpk.blogspot.com/

وہ ابو سے سودے بازی کر رہا تھا۔
میں نے پہلے سوچا کہ مجد کو اطلاع دوں لیکن وہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا تھا۔ وہ فضول میں پریشان ہو جاتا۔
اچانک مجھے حمید خان کا خیال آیا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ لی مارکیٹ کا وہ ہوٹل ساری رات کھلا رہتا ہے۔
میں نے گھر سے نکل کر اسی وقت ٹیکسی پکڑی اور لی مارکیٹ روانہ ہو گیا۔
لی مارکیٹ میں ہر طرف سناٹا تھا لیکن ہوٹل کھلا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد پان، سگریٹ... کولڈ ڈرنک اور آئس کریم کی دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔
کاؤنٹر پر گھنگھرالے بالوں والا ایک چالیس، بیالیس سال کا آدمی موجود تھا۔
"جی واجہ پھر ماڑ، ام تمہاری کیا خدمت کرے؟" اس نے اپنی مخصوص اردو میں کہا۔
"مجھے حمید خان نے یہاں بھیجا ہے۔ سیف اللہ آپ ہی کا نام ہے؟ میرا نام شاہد ہے۔"
"اڑے تو پھر ادھر کیا کھڑا ہے۔" وہ کاؤنٹر سے نکل کر میرے سامنے آ گیا اور مجھ سے بہت پرجوش انداز میں مصافحہ کیا۔ "اڑے، تم لوگ بڑا دیر سے آیا۔ ام تو تمہارا ایک مہینے سے انتظار کر رہا تھا۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "آؤ، ہمارے ساتھ آؤ۔"
وہ اندر کی طرف بڑھا تو مجھے ایک زینہ نظر آیا۔ وہ زینہ چڑھ کر اوپر جا رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اوپر کے حصے میں آمنے سامنے چار کمرے بنے تھے اور بیچ میں خاصا بڑا کوریڈور تھا۔
ایک کمرے سے باتیں کرنے اور ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سیف اللہ نے دروازے پر دستک دی تو اندر ایک دم خاموشی چھا گئی۔
پھر کوئی ورنگ لہجے میں بولا۔ "کون ہے؟"
"واجہ ام ہوں سیف اللہ... یہ حمید خان کا مہمان آیا ہے۔"
فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ایک شخص اٹھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔
میں حیران رہ گیا۔ وہ حمید خان تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔ "مجھے یقین تھا کہ ایک دن تم یہاں ضرور آؤ گے۔"
"تم جیل سے رہا کب ہوئے؟" میں نے پوچھا۔
"یارا! ابھی تک ایسی کوئی جیل نہیں بنی جو حمید خان کو زیادہ دن تک قید رکھ سکے۔" اس نے کہا۔ "اور جیل بھی میں

کسی مصلحت کے تحت گیا تھا ورنہ کس میں اتنی جرأت ہے کہ وہ حمید خان کو گرفتار کرے۔" پھر وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے شاہد... تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"
میں نے اسے بتایا کہ میرے شہر کے ایک بدمعاش نے میری بہن کو اغوا کر لیا ہے۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ چوہدری اسلم نے کیسے میرے بھائی کو مارا تھا پھر اس نے میرے چھوٹے بھائی کو بھی مار دیا۔ اب اس نے میری بہن کو اغوا کر لیا ہے اور ابو سے مطالبہ کیا ہے کہ شاہد کو ہمارے حوالے کر دو اور اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔"
"یہ کب کی بات ہے؟" اس نے پوچھا۔
"ابھی کچھ دیر پہلے ابو کا ٹیلی فون آیا تھا۔" میں نے کہا۔
کمرے میں حمید خان سمیت چھ افراد موجود تھے۔ حمید خان نے ہنس کر کہا۔ "میں شاہد کی باتوں میں تم لوگوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ یہ محمد علی ہے۔" اس نے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ درمیانے قد اور سرتی جسم کا مالک تھا اور جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ وہ اگر امریکن لہجے میں انگلش بولتا تو لوگ اسے امریکن نیگرو سمجھتے۔
"یہ کریم خان ہے۔" اس نے دوسرے آدمی سے میرا تعارف کرایا۔ کریم خان، حمید خان کی طرح لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس نے سفید کلف دار شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو مجھے اس کی قوت کا اندازہ ہوا۔ پھر باری باری اس نے نصیر عرف ٹائیگر، جانو اور محمود عرف مودے کا تعارف بھی کرایا۔ وہ سبھی کراچی کے چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ قسمت بھی مجھے کہاں لے آئی تھی۔
کریم خان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "چوہدری اسلم وہی تو نہیں جو ٹرانسپورٹر ہے؟"
"ہاں، یہ وہی چوہدری اسلم ہے۔"
"اس نے تو اوپر کی کمائی سے کئی ٹرک، بسیں اور ایک درجن سے زیادہ ٹیکسیاں خرید لی ہیں اور آج کل منشیات کا دھندا بھی شروع کر دیا ہے۔ میں ابھی معلوم کر لیتا ہوں کہ اس نے تمہاری بہن کو کہاں رکھا ہے۔"
"واجہ! تم چوہدری اسلم کو جانتے ہو؟" حمید خان نے پوچھا۔
"میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ معمولی رکشا ڈرائیور تھا اور یہیں کراچی میں رکشا چلاتا تھا۔ وہ رکشا بھی اس کا اپنا نہیں تھا بلکہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ میرا ایک

اعتبار کا آدمی اس کے پاس کام کرتا ہے۔ ایسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے اپنے آدمی تو وہاں رکھنا پڑتے ہیں۔ وہ اب ہمارے دھندے میں بھی ہاتھ ڈالنے کی تیاری کر رہا ہے۔"
پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ملا کر بولا۔ "سوتے ہو یا مر جاتے ہو؟ اچھا زیادہ بات نہیں... میری بات غور سے سنو اور بتاؤ... چوہدری نے آج ایک لڑکی کو اغوا کیا ہے، وہ کہاں ہے؟... اچھا... اور چوہدری خود کہاں ہے؟... ٹھیک ہے۔ ہم لوگ وہاں آ رہے ہیں۔ چوہدری اگر وہاں سے جانے کی کوشش کرے یا لڑکی کو کہیں اور لے جائے تو مجھے اسی وقت اطلاع دینا... کیا تو جانتا ہے کہ میں سوتے میں بھی اپنی ایک آنکھ اور کان کھلا رکھتا ہوں... ہاں، تو مجھے کسی بھی وقت ٹیلی فون کر سکتا ہے۔"
میں پُرامید نظروں سے کریم خان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی یک طرفہ گفتگو سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے سلمٰی کے بارے میں علم ہو گیا ہے اس لیے وہ وہاں جانے کی بات کر رہا ہے۔
"لڑکی ابھی بہاولپور ہی میں ہے۔" کریم خان نے کہا۔ پھر مودے سے کہا۔ "میری گاڑی نکال۔"
مودا، فوراً ہی اٹھ کر باہر چلا گیا۔
"ہم ابھی اور اسی وقت بہاولپور جا رہے ہیں۔" کریم خان نے کہا۔ "اس چوہدری سے تو مجھے اپنا پرانا حساب بھی بے باق کرنا ہے۔ ٹائیگر، حمید خان، جانو! تم سب میرے ساتھ چلو گے۔"
"واجہ! ہم لوگ ڈبل کیبن پک اپ نکال لیں؟"
"نہیں، دو گاڑیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ چھ آدمی ہیں، ساتواں یہ شاہد بھائی ہے۔ اتنے آدمی تو میری گاڑی میں بھی آ جائیں گے۔"
مودا کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "واجہ! ہم نے گاڑی نکال دیا ہے۔ اس کا تیل پانی اور ٹائر بھی چیک کر لیا ہے۔"
"چلو، پھر اٹھو۔" کریم خان کھڑا ہو گیا۔
حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ وہ سب ہنستے تھے۔ کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی پریشانی تھی کہ اتنا لمبا سفر ہم لوگ ایک گاڑی میں کیسے طے کریں گے؟
ہم لوگ نیچے پہنچے تو گاڑی دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ وہ ٹویوٹا کی جدید ماڈل کی ہائی ایس تھی۔
ڈرائیونگ سیٹ پر مودا تھا۔ وہ واقعی بہت ماہر ڈرائیور بھی تھا۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ گاڑی کا انجن بھی خصوصی طور پر

شکایت سننے کا وقت نہیں ہے۔ میں بہت ضروری میٹنگ میں مصروف ہوں ———— کراچی سے میمونہ عزیز کا تعاون

بنایا گیا ہے کیونکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی گاڑی میں نہیں بلکہ جیٹ فائٹر میں بیٹھا ہوں۔

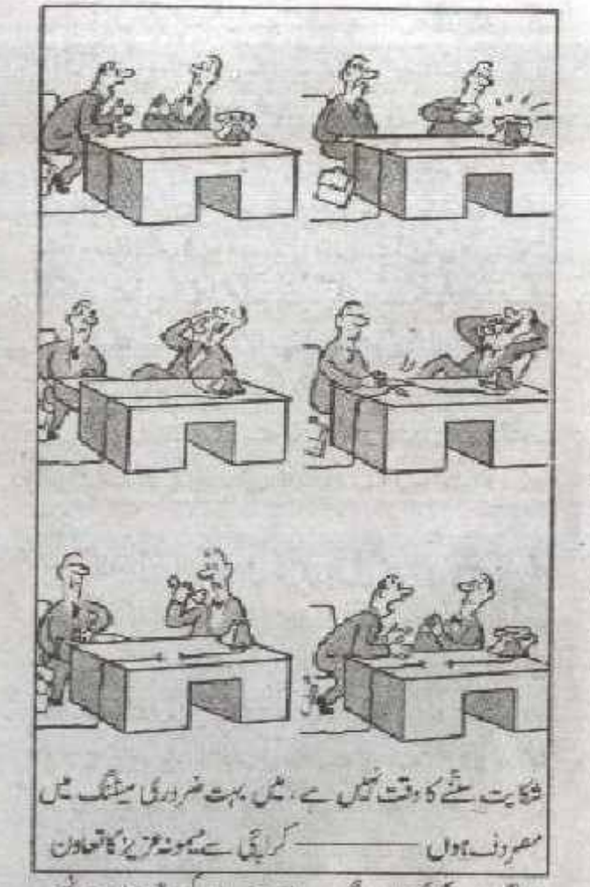

☆☆☆

ہم بہاولپور پہنچے تو ابھی صبح ہونے میں کافی دیر تھی۔ کریم خان کی ہدایت پر مودے نے گاڑی جھاڑیوں کی آڑ میں روک دی۔
پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گاڑی کی سیٹوں کے نیچے بنے ہوئے خفیہ خانوں سے ان لوگوں نے اسلحہ نکالنا شروع کر دیا۔ اس میں دور مار فولڈنگ رائفلیں بھی تھیں، مشین پسٹل بھی تھے، ریوالور بھی تھے... حتیٰ کہ دستی بم اور اسموک بم بھی تھے۔
ان سب نے ہتھیار اپنے شانوں سے لٹکائے اور بہت آہستگی سے، بے آواز انداز میں چلتے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگے۔
وہ علاقہ بہاولپور شہر میں نہیں بلکہ اس کے کسی گاؤں میں تھا۔ ایک مکان کے نزدیک پہنچ کر کریم خان رک گیا اور اپنے ساتھیوں کو جھاڑیوں میں چھپنے کا اشارہ کیا۔
پھر وہ خود بھی ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور جیب سے

http://dlgealpk.blogspot.com

بولا۔ ”ہاں، کیا پوزیشن ہے؟... اچھا، اس مکان میں کتنے آدمی ہیں؟... اور باہر کے گیٹ پر؟... ٹھیک ہے... ہاں، یہاں کتے تو نہیں ہیں... ٹھیک ہے... ہاں، میں یہاں پہنچ چکا ہوں اور مکان کے باہر کھڑا ہوں... نہیں، ابھی تجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے... ہاں... چودھری موجود ہے؟... اور اس کا بیٹا؟... لڑکی کہاں ہے؟ یہاں کوئی تہ خانہ تو نہیں ہے؟... اچھا ٹھیک ہے۔“ اس نے سیل فون آف کر دیا۔ پھر مجھ سے بولا۔ ”تم اپنے اپنے موبائل فون سائیلنٹ پر لگالو۔ کبھی کبھی یہ موبائل فون بھی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔“

پھر اس نے ٹائیگر سے کہا۔ ”مین گیٹ کی طرف چلو۔ یہاں صرف دو چوکیدار ہیں اور دونوں اس وقت سو رہے ہیں۔“

مکان کی چار دیواری خاصی اونچی تھی لیکن ٹائیگر، کریم خان کے کندھوں پر کھڑا ہوا اور ایک چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے دیوار کی منڈیر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں پر جسم کا پورا وزن ڈال کر خود کو اوپر اٹھایا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ ہاتھوں کی مدد سے پورے جسم کا بوجھ اٹھا کر کسی دیوار پر چڑھنا انتہائی مشکل کام ہے۔ راشد بھائی بھی اسی طرح دیوار پر چڑھ جایا کرتے تھے اور ہم سے شرط لگاتے تھے کہ کوئی بھی میری طرح دیوار پر چڑھ کر دکھا دے تو میں اسے سو روپے دوں گا۔

ٹائیگر تھوڑی دیر دیوار پر لمبائی میں چھپکلی کی طرح چپکا رہا، پھر اس نے اسی حالت میں دیوار پر رینگنا شروع کر دیا۔ شاید چوکیدار اس کے نزدیک ہی تھے اس لیے وہ دوسری سمت میں جا رہا تھا۔

کچھ ہی فاصلے پر جا کر اس نے اپنی کمر سے بندھا ہوا خنجر نکالا۔ چاندنی میں اس کی دھار چمک رہی تھی۔ اس خنجر کا پھل بھی خاصا بڑا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اس کی دھار بھی اتنی ہی خوف ناک ہوگی جتنا خوف ناک وہ خنجر تھا۔

اس نے خنجر کو دانتوں میں پکڑا اور دیوار پر اندر کی جانب لٹک گیا۔ پھر ہلکی سی دھپ کی آواز آئی۔ اندر چند لمحے خاموشی رہی، پھر اندر سے اچانک ایسی آواز آئی جیسے کوئی بُری طرح پھڑپھڑا رہا ہو۔ چند لمحوں بعد وہ آوازیں بھی معدوم ہوگئیں۔

پھر بڑا گیٹ بہت آہستگی سے کھلا اور مجھے ٹائیگر کا چہرہ نظر آیا۔

کریم خان نے اپنے آدمیوں کو مخصوص اشارہ کیا اور وہ سب پھرتی سے اندر داخل ہوگئے۔ میں شاید وہیں کھڑا سوچتا رہ جاتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حمید خان نے میرا بازو پکڑا اور مجھے بھی اندر کی طرف کھینچ لیا پھر اس نے مجھے ایک ریوالور دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر ذرا سا بھی خطرہ محسوس ہو تو بے دریغ فائر کر دینا۔“

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ ریوالور میں نے زندگی میں پہلی بار ہاتھ میں پکڑا ہے۔ میں ان کی طرح عادی مجرم اور ڈکیت تو تھا نہیں۔ ٹائیگر کی مہارت سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اس قسم کے کام پہلے بھی کرتا رہا ہے۔

اندر کا منظر بہت ہولناک تھا۔ ٹائیگر نے دونوں چوکیداروں کو سانس تک لینے کا موقع نہیں دیا تھا اور بہت مہارت سے ان کی گردن پر خنجر پھیر دیا تھا۔ ان کی چارپائیوں کے نیچے.... خون کا تالاب سا بن گیا تھا۔ دونوں جوان آدمی تھے اور خاصے صحت مند بھی تھے۔ ان کی گردنوں سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔

کریم خان محتاط انداز میں آگے بڑھا تو اسے برآمدے میں ایک سایہ سا نظر آیا۔ ٹائیگر بھی کریم خان کے ساتھ تھا۔

اس نے اچانک اس سائے پر زقند لگا دی۔ اچانک کوئی سرگوشی میں بولا۔ ”مار نا مت، یہ میں ہوں ہاشم خان!“

وہ کریم خان کا آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی مکان کے سب سے آخری کمرے میں بند ہے۔ راہداری کے بائیں طرف کے دوسرے کمرے میں چودھری اسلم تھا اور بائیں طرف کے پہلے کمرے میں اس کا بیٹا مظہر تھا۔

”واجہ۔“ کریم خان نے مودے سے کہا۔ ”تم لڑکی کے کمرے کی طرف جاؤ اور تالا کھولو۔“ پھر وہ حمید خان سے مخاطب ہوا۔ ”حمیدے، تو میرے ساتھ آ۔ ٹائیگر! تو اس کمرے کا دھیان رکھنا۔“ اس نے مظہر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اچانک راہداری کے بائیں طرف کے درمیانی کمرے کا دروازہ کھلا اور مجھے ایسا لگا جیسے بجلی سی کوند گئی ہو۔

کسی نے میرے سینے پر چاقو سے وار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اضطراری طور پر بروقت دائیں جانب جھک گیا اس لیے اس کا چاقو میرے شانے کا گوشت کاٹتا ہوا نکل گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں سرخیں سی بھر گئی ہوں۔

اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا، میں نے اس کی ٹانگوں کے درمیان زوردار انداز میں گھٹنا دے مارا۔ یہ بھی راشد بھائی کا اسٹائل تھا۔ میں انہیں لڑتا دیکھ کر تھیوری میں تو طاق ہو گیا تھا، کبھی عمل کی نوبت نہیں آئی تھی۔

مجھ پر وار کرنے والا الٹ کر پیچھے گرا، پھر جیسے کوئی اڑتا ہوا اس پر آ پڑا۔ وہ ٹائیگر تھا۔ اس کے خنجر نے اس حملہ آور کا نرخرا بھی کاٹ دیا۔

اس کے حلق سے خرخر کی آوازیں نکلیں اور وہ لمحوں میں ٹھنڈا ہو گیا۔

اس کے گلے سے بہنے والا خون میرے پیروں کی طرف آنے لگا۔ میرے شانے میں سے بھی بہت تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

ٹائیگر اس کمرے میں گھس گیا جس میں سے چاقو بردار برآمد ہوا تھا۔ واپسی میں اس کے ہاتھ میں ایک چادر تھی۔ اس نے چادر کی ایک بڑی سی پٹی پھاڑی اور اسے سختی سے میرے بازو پر باندھ دیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میرا خون بہنا بند ہو گیا۔

ٹائیگر ایک مرتبہ پھر مظہر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاشم خان سے کہا۔ ”تو نے تو کہا تھا کہ صرف دو چوکیدار ہیں۔ یہ تیسرا کہاں سے آ گیا؟“

”میں نے واجہ کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔“ ہاشم خان نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا کیونکہ ٹائیگر کے تیور اس وقت بہت خطرناک تھے۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ مزید بھیانک لگ رہا تھا۔ اس کے کپڑے اور چہرہ خون میں تر تھا۔

”تُو نے کمروں کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس کمرے میں بھی ایک آدمی موجود ہے؟ اگر شاہد بھائی کو کچھ ہو جاتا تو واجہ ہم سب کی کھال میں بھس بھر دیتا۔ اب بھی سوچ لے، کوئی اور آدمی تو نہیں ہے؟“

وہ خاصا غائب دماغ آدمی لگ رہا تھا۔ کریم خان نے نہ جانے کیوں اسے وہاں تعینات رکھا تھا۔

وہ سوچ کر بولا۔ ”ہاں، ایک آدمی اور ہے جو لڑکی والے کمرے کے نزدیک باہر سو رہا ہے۔“

ٹائیگر نے پھر کہا۔ ”دل تو چاہ رہا ہے کہ تیرے گلے پر بھی خنجر پھیر دوں لیکن پہلے میں واجہ سے بات کر لوں، پھر تیرا حساب کتاب کروں گا۔“ اس نے مجھ سے کہا۔ ”شاہد بھائی! آپ یہیں ٹھہریں۔ آپ کے پاس ریوالور تو ہے۔ اگر مظہر باہر بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے فوراً گولی مار دیں۔“ یہ کہہ کر وہ اس سمت بڑھ گیا جہاں ہاشم نے ایک اور آدمی کی نشان دہی کی تھی۔

مودے نے شاید ابھی تک سلمیٰ کے کمرے کا تالا نہیں کھولا تھا۔

ٹائیگر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر چیتے کی پھرتی سے آگے بڑھا لیکن باہر سونے والا شاید ہوشیار ہو گیا تھا اور وہ دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔

ٹائیگر جیسے ہی آگے بڑھا، اس نے اپنی ٹانگ اڑا دی۔ ٹائیگر اپنے ہی زور میں گرا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے رائفل کی نال ٹائیگر کے سینے پر رکھ دی اور گرج کر بولا۔ ”اگر تو نے اپنی جگہ سے حرکت بھی کی تو تیرے سینے میں سوراخ ہو جائے گا۔“

راہداری کے دوسرے سرے پر بھی لالٹین جل رہی تھی جس کی لو مودے نے اونچی کر دی تھی تاکہ اپنا کام احتیاط اور اطمینان سے کر سکے۔ باہر والا چوکیدار شاید لالٹین کی روشنی یا مودے کی کھنکار پر سے جاگا تھا۔ مودے کو اگر علم ہوتا کہ ادھر بھی کوئی چوکیدار ہے تو وہ پہلے اس چوکیدار کا کوئی بندوبست کرتا۔

ٹائیگر کو زمین پر گرا دیکھ کر مودا بھی ہوشیار ہو گیا۔ چوکیدار نے بھی اسے دیکھ لیا تھا، اس لیے وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور مودے اور ٹائیگر دونوں کو اپنی رائفل کی زد پر لے لیا۔

ٹائیگر اسی طرح زمین پر پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی وہ خنجر تھا جس نے اب تک تین جیتے جاگتے انسانوں کو خون میں نہلا دیا تھا۔

اس نے اچانک وہ خنجر رائفل والے کی طرف پھینکا اور خود قلابازی کھا کر دوسری طرف چلا گیا۔ خنجر رائفل بردار کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔ ٹائیگر نے اتنی قوت سے خنجر پھینکا کہ مجھے صرف اس کا دستہ نظر آ رہا تھا۔

رائفل بردار کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی اور وہ گویا سلوموشن میں نیچے گرنے لگا۔

ٹائیگر نے جھپٹ کر اسے سنبھالا اور زمین پر لٹا دیا۔ پھر اس نے انتہائی صفائی سے رائفل بردار کے سینے میں پیوست خنجر کھینچ لیا۔ اس میں شاید ابھی تھوڑی بہت جان باقی تھی۔ خنجر سینے سے نکلتے ہی اس کے سینے سے بھی خون کا فوارہ سا نکلا۔ پھر اس نے زور سے ہچکی لی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

”مودے! تُو اپنا کام کر... میں مظہر کے کمرے کی طرف جا رہا ہوں۔“

کریم خان اور حمید دونوں ابھی تک چودھری اسلم کے دروازے پر کھڑے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ دروازے پر دستک دیں یا کر...

http://digestpk.blogspot.com/

کریم خان نے ہاشم کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا اور اسے سرگوشی میں کچھ سمجھایا، پھر کریم خان اور حمید دونوں دروازے کے دونوں طرف دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔

ہاشم خان نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک اس نے زیادہ زور سے دی۔ فوراً ہی اندر سے آواز آئی۔

''کون ہے اوئے؟''

''میں ہاشم خان ہوں جی۔ مجھے ایسے لگا ہے کہ کوئی اندر کودا ہے۔ دونوں چوکیدار بھی اپنی چارپائی پر موجود نہیں ہیں۔''

''تم سب ہڈحرام ہو گئے ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا۔ ہاشم خان سامنے ہی کھڑا تھا۔

''تو یہ لالٹین لیے کہاں پھر رہا ہے؟'' چودھری اسلم نے پوچھا۔

''میں لالٹین لے کر اس کودنے والے کو دیکھ رہا تھا۔''

''چل میرے ساتھ آ۔'' یہ کہہ کر چودھری اسلم باہر نکلا۔ وہ اب تک ویسے کا ویسا ہی تھا۔ بس جسم کچھ فربہ ہو گیا تھا اور سر کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے۔

اس نے جیسے ہی کمرے سے باہر قدم رکھا، کریم خان اور حمید نے اپنی اپنی گنیں اس کی کنپٹی پر رکھ دیں۔ پھر کریم خان گرج کر بولا۔ ''بس اوئے بیرو دی اولاد! حرکت کی تو نو کی نو گولیاں کھوپڑی میں اتار دوں گا۔''

اس دن مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ پستول میں نو گولیاں بھی ہوتی ہیں۔ چودھری اسلم گویا سکتے میں رہ گیا۔

''تو کیا سمجھتا تھا... تو راشد کی بہن کو اٹھا لائے گا اور ہم تجھ تک پہنچ نہیں سکیں گے؟'' حمید خان نے کہا۔

''مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ واجد! آپ... نے کئی سال پہلے میرے ساتھ کام بھی کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سلمٰی، راشد کی بہن ہے۔''

''معلوم ہوتا تو کسی بھی لڑکی کو اٹھا لے گا؟'' کریم خان نے کہا۔ ''اور یہ تو نے لڑکیوں کو اغوا کرنا کب سے شروع کر دیا؟''

اسی وقت سلمٰی دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

''اب کیوں رو رہی ہے گڑیا؟'' میں نے کہا۔ ''اب تو میں آ گیا ہوں۔''

''اس نے تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی بیٹا!'' کریم خان نے پوچھا۔

''اس نے مجھے تھپڑ مارے ہیں۔'' سلمٰی نے یوں کہا جیسے کوئی بچی اپنی ٹیچر سے کسی دوسری لڑکی کی شکایت کرے۔

''ٹھیک ہے، ہم اس کے منہ کے بجائے گلے پر تھپڑ ماریں گے۔'' کریم خان نے کہا اور مجھ سے بولا۔ ''آپ اپنی بہن کو لے کر باہر جا کر گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ ہم ابھی دس منٹ میں آتے ہیں۔''

دروازے کے ساتھ ہی چوکیداروں کی گردن بریدہ لاشیں پڑی تھیں۔ سلمٰی تو وہ منظر دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتی۔ کریم خان بھی شاید میری ہچکچاہٹ سمجھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''بیٹا! تم اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لو، بعد میں پولیس کا چکر پڑے تو تم کہہ دینا کہ وہ لوگ تو مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے تھے اور یہ لوگ مجھے اسی حالت میں نکال لائے۔ میں اس جگہ کی نشان دہی نہیں کر سکتی۔''

سلمٰی بہت بھولی اور معصوم تھی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے خود ہی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی اور میں اسے لے کر عجلت میں گاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اچانک مجھے چودھری اسلم کی دل خراش چیخ سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ کریم خان نے ٹائیگر سے کہا ہو گا کہ اسے فوراً ہی مت مارنا، تڑپا تڑپا کر مارنا۔ اب ٹائیگر اس کے جسم میں اپنا وہ خوف ناک خنجر گھونپ رہا ہو گا اور چرکے لگا رہا ہو گا۔

پھر چودھری کی آواز آنا بند ہو گئی۔ لگتا تھا کہ ٹائیگر نے اسے بھی ذبح کر دیا ہے۔

پھر مجھے مظہر کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہو تم لوگ اور...'' پھر اس کی آواز حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

میں سلمٰی کو لے کر تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گیا۔

پھر باقی لوگ بھی عجلت میں وہاں آ گئے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر اس دفعہ بھی ٹائیگر تھا لیکن اب وہ گاڑی کو جیٹ فائٹر کی طرح نہیں دوڑا رہا تھا۔ میں نے اس سے کراچی کے بجائے بہاول پور چلنے کو کہا۔

بہاولپور پہنچ کر میں نے بہت کوشش کی کہ کریم خان اور اس کے ساتھی کچھ دن میرے مہمان رہ جائیں لیکن ان لوگوں کو کراچی میں زیادہ اہم کام تھے اس لیے وہ صرف ناشتا کر کے رخصت ہو گئے۔

ابو، سلمٰی کو سینے سے لگائے دیر تک روتے رہے۔ امی اور عذرا بھی رو رہی تھیں۔

میں نے ماحول بدلنے کو کہا۔ ''یہ کیا تم لوگوں نے گھر کو ماتم کدہ بنا رکھا ہے... اب کیوں رو رہی ہو؟''

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں شاہد بھائی!'' عذرا نے کہا۔

''تم لوگوں کے آنسو بھی عجیب ہیں۔ خوشی کے موقع پر بھی بہنے لگتے ہیں اور غم کے موقع پر بھی۔''

پھر وہ لوگ آہستہ آہستہ نارمل ہو گئے۔

ابو نے تفصیل پوچھنا چاہی تو میں نے بتا دیا کہ میرے ان دوستوں میں سے ایک چودھری اسلم کا ٹھکانا جانتا تھا۔ بس پھر ہم لوگ سیدھے وہیں پہنچے اور سلمٰی کو چھڑا کر لے آئے۔

پھر میں نے ابو سے کہا۔ ''ابو! اب آپ بھی میرے ساتھ کراچی چلیں۔ مکان کا بندوبست ہو گیا ہے۔ جس خریدار سے آپ نے مکان کا سودا کیا ہے، اس سے پیسے بعد میں بھی تو لے سکتے ہیں۔ آدمی تو بھروسے کا ہے نا؟''

''ہاں، تو بھروسے کی بات کر رہا ہے۔ وہ مکان میں نے شہاب الدین کو بیچا ہے۔''

چاچا شہاب الدین ابو کے بچپن کے دوست تھے۔ پھر ہم نے سامان سمیٹا اور دوسرے دن ہی کراچی روانہ ہو گئے۔

کراچی پہنچتے ہی میں ملازمت کی تلاش میں نکل گیا۔ ہر جگہ سے مجھے نفی میں جواب ملا۔ وجہ یہی کہ وہ لوگ پہلے میری ڈگری دیکھ کر راضی تو ہو جاتے تھے لیکن جب میں انھیں یہ بتاتا تھا کہ میں نے اشتعال میں آ کر ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا تو وہ انکار کر دیتے۔

واجد کہتا تھا کہ تو یہ بات انھیں بتاتا ہی کیوں ہے؟

''میں انھیں دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔'' میں جواب دیتا۔ ''انھیں کبھی یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ مجھے ذلیل کر کے وہاں سے نکالیں گے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ سچ بول کر اپنی عزت بچاؤں۔''

جب دو مہینے تک دفتروں کے دھکے کھانے کے بعد بھی مجھے جاب نہیں ملی تو میں نے سوچا کہ میں اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ہی کر لوں۔ میں نے اس خیال کا تذکرہ واجد سے نہیں کیا ورنہ اس کے ابو فوراً سرمائے کی آفر کر دیتے۔

گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے میں زیادہ سے زیادہ ٹیوشنز پڑھا رہا تھا۔ ایک دن واجد آیا تو بہت سنجیدہ تھا۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے یار! کیا انکل سے ڈانٹ کھا کر آئے ہو یا پھر کوئی اور بات ہے؟''

''میں پرسوں واپس امریکا جا رہا ہوں۔'' واجد نے کہا۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یار! ایک آئیڈیا ہے۔ کیوں نہ تو بھی میرے ساتھ امریکا چل۔ تو ہماری فرم کے ٹیکنیکل معاملات ہینڈل کر لینا۔''

''تم کیا ہیوی مشینری یا مشینوں کے اسپیئر پارٹس پاکستان میں ایکسپورٹ کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
فروری 2011ء
خوشگوار لمحات کے لیے بہترین انتخاب

نفس کا قیدی
انسان کے سب سے بڑے دشمن ''نفس'' کی کارفرمائیوں کا لرزہ خیز احوال...... آخری صفحات پر مبین مرزا کا تحفۂ خاص

تخت نشین، بزم نشین
ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے چند بادشاہ گروں کا قصۂ عبرت...... وہ آنے والے کل سے بے خبر اپنی طاقت پر گھمنڈ کیے بیٹھے تھے۔

امداد غیبی
بہتے ہوؤں کو جب تنکے کا سہارا مل جائے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے...... ملک صفدر حیات کی حیرت انگیز کارگزاری

حضرت الیاس
حیات انبیا اور پیغام خدا کے سلسلے کی ایک اور عبرت اثر تحریر

اس کے علاوہ
واپسی، ٹائری، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

سرورق
ایم اے راحت، منظر امام، مختار آزاد، سلیم انور اور تنویر ریاض کے دلکش شاہکار آپ کے منتظر

http://digestpk.blogspot.com/

"نہیں یار! یہ تو اربوں روپے کا کھیل ہے۔ ہمارے پاس ابھی اتنا پیسا نہیں ہے۔"

"تو پھر تمہاری کمپنی کے کون سے ٹیکنیکل معاملات ہیں؟"

"یہ تو میں صرف تیرے ویزے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تو وہاں کاروبار میں میری مدد بھی تو کر سکتا ہے۔ تو پڑھا لکھا اور ذہین آدمی ہے۔ تیرے لیے کیا مشکل ہے؟"

"مشکل یہ ہے کہ یہاں امی، ابو اور بہنیں بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔ تو پریشان مت ہو۔ مجھے آج نہیں تو کل کوئی جاب مل ہی جائے گی۔ میں صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگ اس سچ کو کب تک قبول نہیں کرتے۔"

"یہی دیکھتے دیکھتے تیری عمر گزر جائے گی۔ تو پاکستان میں رہتا ہے، امریکا میں نہیں۔ یہاں تو چھوٹے چھوٹے معاملات میں جھوٹ چلتا ہے۔ لوگ دس دس روپے کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھا لیتے ہیں۔ تو کیا کسی اور ملک سے آیا ہے؟ اب اپنے ہی کیس کو دیکھ لے اگر وہ خبیث انسپکٹر تیرا کیس نہ بگاڑتا تو تو باعزت بری ہو جاتا لیکن اس نے محلے میں کچھ گواہ ایسے پیدا کر لیے جنہوں نے حلفیہ بیان دیا کہ تیرے اور عالیہ کے ناجائز تعلقات ہیں۔ عالیہ بے چاری الگ بدنام ہوئی اور تجھے اپنی زندگی کے سات قیمتی سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑے۔ تجھے اب بھی عقل نہیں آئی؟"

"میرے پاس عقل ہے تبھی تو میں جھوٹ بول کر جاب حاصل کرنا نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے، پھرتا رہ سچ کی تلاش۔ جب تجھے سچ مل جائے تو مجھے بھی بتانا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "ہاں، آنٹی صفیہ نے وہ مکان بیچ کر گلشن اقبال میں فلیٹ لے لیا ہے۔ میں نے ان کا ایڈریس لے لیا تھا۔ اب تو وہاں جا سکتا ہے۔ وہاں تو تجھے کوئی نہیں جانتا۔" اس نے جیب سے پاکٹ ڈائری نکالی اور اس میں سے ایک کاغذ پھاڑ کر مجھے صفیہ آنٹی کا ایڈریس دے دیا۔

پھر وہ خاصا افسردہ اور اداس سا رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی مزید ڈپریس ہو گیا۔ اب وہ بلاناغہ مجھے امریکا سے ٹیلی فون کرتا۔ لیکن ٹیلی فون میں وہ بات کہاں ہوتی ہے، جو ملاقات میں ہوتی ہے۔

ایک دفعہ تو میرے دل میں آئی کہ میں امریکا چلا ہی جاؤں۔ وہاں جا کر مجھے کسی بھی ادارے میں ملازمت مل جائے گی لیکن میں ماجد کا مزید احسان لینا نہیں چاہتا تھا۔ کیس کے سلسلے میں اس نے مجھ پر لاکھوں روپے خرچ کر دیے تھے۔ میرے مکان کے سلسلے میں بھی اس کا اچھا خاصا خرچہ ہو گیا تھا۔

پھر وہ بہانے بہانے سے ابو..... کو پیسے دے جایا کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے مزید زیر بار کروں۔ امریکا میں اس کے والد میرے لیے کوئی جگہ زبردستی بناتے۔ اس سے ان کے اخراجات میں اضافہ ہوتا۔ بزنس مین تو ایک روپیہ خرچ کر کے دو روپے کمانا چاہتے ہیں۔ میرا اس فرم میں آؤٹ پٹ ہی کیا ہوتا؟ یہی سب کچھ سوچ کر میں نے امریکا جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا۔

ایک دن میں گلشن اقبال کے علاقے سے ٹیوشن پڑھا کر واپس جا رہا تھا کہ اچانک مجھے صفیہ آنٹی کا خیال آ گیا۔ پھر نہ جانے کب اور کیسے میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

ڈور بیل بجانے پر دروازہ ثمرہ نے کھولا۔ میں تو پہلی نظر میں اسے پہچانا ہی نہیں۔ وہ ماشاء اللہ کافی بڑی ہو گئی تھی اور عالیہ کی طرح وہ بھی بلا کی حسین تھی۔

وہ چند لمحے تک پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھتی رہی، پھر چیخ کر بولی۔ "امی! عالیہ باجی... دیکھیے کون آیا ہے؟"

صفیہ آنٹی اور عالیہ فوراً ہی باہر نکل آئیں۔ میں نے آنٹی کو سلام کیا تو انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں۔

"آپ کیسی ہیں مس عالیہ؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"واہ بھئی واہ!" ثمرہ شوخ لہجے میں بولی۔ "اب عالیہ باجی "تم" سے آپ اور مس ہو گئیں۔"

"یہ تو یہاں آ گئے، یہی ان کا احسان ہے۔" عالیہ نے منہ بنا کر کہا۔

"عالیہ! تم بھی جانتی ہو کہ میں تمہارے گھر کیوں نہیں آتا تھا؟"

"جانتی ہوں۔" عالیہ نے کہا۔ "لیکن یہاں شفٹ ہوئے بھی ہمیں دو مہینے ہو گئے ہیں۔ یہاں تو آپ آ سکتے تھے؟"

"یہاں کا ایڈریس ماجد نے مجھے جانے سے پہلے دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم..... لڑتی ہی رہو گی یا شاہد سے بیٹھنے کو بھی کہو گی؟" صفیہ آنٹی نے کہا۔ پھر وہ مجھ سے بولیں۔ "شاہد بیٹا! تم بیٹھو، آج تم میرے ہاتھ کی کافی پیو۔" یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئیں۔

"اگر اجازت ہو تو میں بھی اپنا کچھ ضروری کام کر لوں؟" ثمرہ نے کہا۔ "آپ کافی پئیں، میں ابھی آتی ہوں۔" وہ جان بوجھ کر ہمیں اکیلا چھوڑ گئی۔

"شاہد!" عالیہ نے کہا۔ "آپ اب بھی کیوں آئے؟"

"کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا؟" میں نے کہا۔ پھر میں

سنجیدہ ہو کر بولا۔ "سچی بات تو یہ ہے عالیہ کہ میں تمہارے باپ کا قاتل ہوں۔ تم بھی اس قتل کی چشم دید گواہ ہو اور قتل بھی کیسے بھیانک انداز میں کیا تھا۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی تم لوگوں کا سامنا کرنے کی... باپ کتنا بھی برا ہو، آخر باپ ہوتا ہے اور بیٹیاں تو کسی کے منہ سے اپنے باپ کی ذرا سی برائی بھی برداشت نہیں کرتیں، میں نے تو تمہارے سامنے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا۔ میں آنٹی کا سامنا کرتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ شوہر چاہے جیسا بھی ہو، ہوتا تو عورت کا سہاگ ہے۔"

اسی وقت آنٹی کافی لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے میرا آخری جملہ سن لیا تھا۔ انہوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "سہاگ! تم کس سہاگ کی بات کر رہے ہو؟ تم جانتے ہو سلطان کیا چاہتا تھا؟"

"چھوڑیں امی!" عالیہ نے کہا۔

"کیسے چھوڑوں؟" آنٹی نے کہا۔ "شاہد نے تو ہم پر احسان کیا ہے۔ جانتے ہو، وہ پاکستان کیوں آیا تھا؟ وہ ثمرہ اور عالیہ کو اپنے ساتھ کویت لے جانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں ایک عیاش شیخ کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھے بھی بیچ دیتا۔ ایسا ہوتا ہے سہاگ اور ایسا ہوتا ہے باپ؟ پھر اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ وہ تو تھا ہی واجب القتل۔ تم نے تو اسے قتل کر کے ثواب کا کام کیا ہے بیٹا! تم اس پر شرمندہ کیوں ہو؟" وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھیں پھر وہ بولیں۔ "تم لوگ باتیں کرو، میں ذرا کچن دیکھ لوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر چلی گئیں۔

"شاہد! تمہیں وہ راتیں یاد ہیں جب میں تمہارے لیے چائے بناتی تھی؟"

"مجھے ایک ایک پل یاد ہے عالیہ۔" پھر میں نے اچانک پوچھا۔ "یہ بتاؤ، میں اپنی امی کو تمہارے گھر کب بھیجوں؟ ویسے میں آج کل بے روزگار ہوں، جاب کی تلاش ہے اور ٹیوشن پر گزارہ ہے۔"

"اب تم بھی ایسی غیروں والی بات کرو گے؟" وہ غیر محسوس طریقے سے "آپ" سے تم پر آ گئی۔ "جب چاہو، تم آنٹی کو بھیج دو۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

پھر ایک دن میں امی اور بہنوں کو لے کر صفیہ آنٹی کے گھر پہنچ گیا۔ امی عالیہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ صفیہ آنٹی بھی امی سے یوں مل لیں جیسے برسوں سے جانتی ہوں۔ تسلی اور عذرا کو بھی عالیہ بہت اچھی لگی تھی۔

وہاں سے واپسی پر وہ امی کے گن گا رہی تھیں۔

دوسرے دن سلمٰی نے مجھ سے کہا۔ "شاہد بھائی! ایک بات کہوں، آپ عالیہ باجی کو ہماری بھابی بنا دیں۔"

"یہ بات تم میرے بجائے امی سے کرو۔" میں نے کہا۔

"واؤ... اس کا مطلب ہے کہ آپ راضی ہیں؟"

"میں تو تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

میں مستقل اخبارات دیکھتا رہتا تھا۔

سنڈے کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی طرف سے ایک ویکنسی کا اشتہار آیا۔ میں نے بھی وہاں درخواست بھیج دی۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے انٹرویو کے لیے ضرور بلائیں گے۔ اس کی ضمانت تو میری ڈگری تھی یا پھر تھوڑا بہت اس بین الاقوامی کمپنی کا تجربہ تھا جس میں، میں نے جاب کی تھی۔ ایک ہفتے بعد ہی انٹرویو کا بلاوا آ گیا۔

میں تیار ہو کر عین وقت پر انٹرویو کے لیے پہنچ گیا۔ استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے مجھے ایک ٹوکن دے دیا کہ آپ کا نمبر ساتواں ہے۔ آپ ویٹر روم میں تشریف رکھیں۔

اس کے بعد ایک صاحب ایم ڈی کے کمرے سے نکلے اور انہوں نے استقبالیہ کلرک سے کہا۔ "مس نورین! ایم ڈی صاحب کہہ رہے ہیں کہ اب انٹرویو کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اب کوئی امیدوار آئے تو اسے واپس کر دیں۔"

میرا نمبر آیا تو میں بہت بااعتماد انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں تین افراد تھے۔ درمیان میں باوقار شخصیت کے ایک باریش صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی دائیں طرف ایک نوجوان بیٹھا تھا جو غالباً ان صاحب کا بیٹا تھا کیونکہ ان کی شکلوں میں خاصی مشابہت تھی۔ بائیں طرف ادھیڑ عمر کے ایک صاحب اور بیٹھے تھے جو اپنی شخصیت ہی سے بہت تجربہ کار لگ رہے تھے۔

"مسٹر شاہد!" چیئرمین صاحب نے کہا۔ "تشریف رکھیے۔"

میں ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

انہوں نے میری فائل کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے شروع سے لے کر آخر تک فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے؟"

"جی سر!" میں نے کہا۔

"اور انٹرنگ میں بھی آپ کی پوزیشن تھی؟"

"جی سر!" میں نے پھر مختصر جواب دیا۔

"آپ نے ایک معروف بین الاقوامی فرم میں بہت اچھی پوسٹ پر جاب چھوڑ کیوں دی؟ اس کے بعد سات سال تک آپ کیا کرتے رہے؟"

http://digestpk.blogspot.com/

”سر! میں اس دوران میں جیل میں تھا۔“ میں نے کہا۔
”میرے ہاتھ سے ایک قتل ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا۔
میرے الفاظ گویا بم تھے جو ان تینوں کے حواس پر گر پڑے۔

چیئرمین صاحب نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے مرڈر کیا تھا اور آپ کو سات سال قید کی سزا ہوئی تھی؟“

”یس سر!“ میں نے کہا۔ پھر میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ میں نے وہ قتل کیوں کیا تھا؟ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ پولیس انسپکٹر نے مجھ سے سات لاکھ روپے طلب کیے تھے جو میرے پاس نہیں تھے اور اگر ہوتے تب بھی تو میں نہ دیتا۔ اس نے میرا کیس بگاڑ دیا اور مجھے سزا ہو گئی۔

وہ صاحب چند لمحے تک سکتے کی حالت میں بیٹھے رہے، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھے تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے اچانک مجھے گلے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے پھر وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔ ”آپ نے تو اپنے لیے جنت میں جگہ بنا لی بیٹا!“ انہوں نے میرے ہاتھ چومے تو مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔

ادھیڑ عمر صاحب بھی چونک کر بولے۔ ”سر! مجھے بھی اخبارات کی وہ خبر یاد آ رہی ہے کہ ایک نوجوان نے کلام پاک کی بے حرمتی پر ہتھوڑے سے ایک شخص کو مار مار کے اس کی جان لے لی تھی۔“

”شاہد بیٹا!“ چیئرمین صاحب نے کہا۔ ”آپ جو سیلری اور مراعات پرانی کمپنی میں لیتے تھے وہی یہاں بھی ملیں گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے لیے اور اس کمپنی کے لیے ایک اثاثہ ثابت ہوں گے۔“

☆☆☆

مجھے جاب کیا ملی، ہمارے تو دن ہی پھر گئے۔ میں نے ٹیلی فون پر اس کی اطلاع ماجد کو دی تو وہ تیسرے ہی دن پاکستان پہنچ گیا۔

”ماجد! دیکھو مجھے سچ کا صلہ مل گیا۔“

”یار! واقعی تو بہت مستقل مزاج ہے۔“ پھر میں نے اسے امی سے بھی ملایا۔ اسے سلمٰی اتنی پسند آئی کہ اس نے دوسرے ہی ہفتے اپنی امی اور ابو کو رشتے کے لیے ہمارے گھر بھیج دیا۔

اس دوران میں امی نے بھی عالیہ کے گھر جا کر میرے رشتے کی بات پکی کر لی تھی۔ پھر طے یہ ہوا کہ میری اور ماجد کی شادی ایک ساتھ ہو گی۔ شادی کے لیے ایک ماہ بعد کی تاریخ رکھی گئی۔

☆☆☆

شادی کے بعد ماجد، سلمٰی کو لے کر امریکا چلا گیا اور میں عالیہ کو اپنے گھر لے آیا۔ ہم ہنی مون کے لیے سوات، مری اور کاغان چلے گئے۔

میں ایک دن آفس سے واپس آیا تو عالیہ موجود نہیں تھی۔ امی نے بتایا کہ وہ اپنے گھر گئی ہے۔ ایک دو دن وہاں رہے گی۔ امی نے کہا۔ ”میں بھی ذرا پڑوس میں جا رہی ہوں۔ تم چائے پینا چاہو تو بنا دوں؟“

”نہیں امی! میں ذرا پہلے گرم گرم پانی سے نہا کر اپنی تھکن اتاروں گا۔“ میں نے کہا۔

امی کو گئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ”اس وقت کون آ گیا؟“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ میرے سامنے صائمہ کھڑی تھی لیکن وہ اس صائمہ سے بہت مختلف تھی جسے میں جانتا تھا۔ وہ اجڑی اجڑی سی اندر آ گئی اور بولی۔ ”شاہد! میں تو لٹ گئی۔ محسن پچھلے سال ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ میں تمہارے در پر آج بھکارن بن کر آئی ہوں۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گے اور اپنی محبت کی بھیک نہیں دو گے؟“

”ارے میں تو بزدل، ڈرپوک قسم کا آدمی ہوں۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ مجھ میں تو مردوں والی کوئی خصوصیت ہی نہیں ہے۔“

”تم بزدل نہیں ہو۔“ صائمہ نے کہا۔ ”اگر بزدل ہوتے تو...“

”وہ قتل نہ کرتا۔“ میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ ”نہیں صائمہ! اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ پلوں کے نیچے سے بہت پانی گزر چکا ہے۔ میں گزشتہ مہینے شادی کر چکا ہوں۔ تم نے رابطہ کرنے میں بہت دیر کر دی۔“

”اپنی بیوی سے تو ملاؤ۔“ اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔

”وہ آج ہی اپنے میکے گئی ہے۔ ہاں، میں امی کو بلاتا ہوں۔ وہ پڑوس میں گئی ہیں۔“

”نہیں شاہد! میں خود غرض ہوں، میں نے اس وقت تم لوگوں کی کوئی خبر نہیں لی جب راشد بھائی کا قتل ہوا، جب تم جیل گئے اور جب حامد کا قتل ہوا۔ اب میں کس منہ سے ان کا سامنا کروں گی؟“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور شکستہ قدموں سے باہر نکل گئی۔ مجھے اس کی سینڈل کی کھٹ پٹ دور تک سنائی دیتی رہی۔ پھر وہ آہٹ بھی صائمہ کی طرح ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئی۔

●●

http://digestpk.blogspot.com/